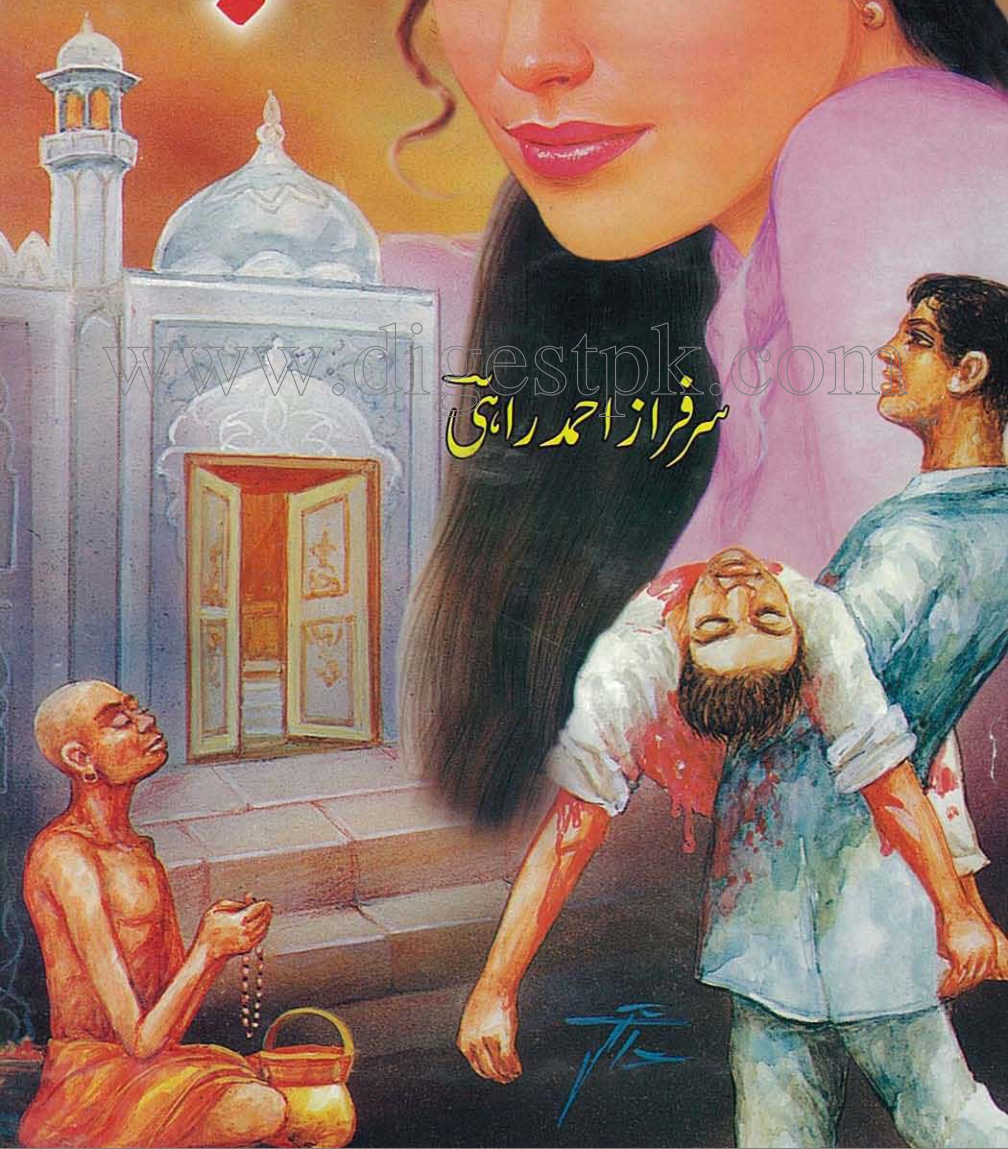


پکار



www.digestpk.com

سفر از احمد راہتی

زُرخِ قبولیت پر پڑے اس حجاب کا قصہ جس کے اٹھنے سے پہلے ہر نادان
اپنی دُعا کی نامقبولیت کے گمان کا شکار ہو کر بغاوت اور من مانی پر اتر آتا ہے



www.digestpk.com

سرفراز احمد راہتی

پبلیکیشنز

شعبہ بابا فرید ضلع کچہری لاہور

Ph: 2311965

Aftabpublication@hotmail.com



پکارنے والا اور پکار سننے والا

”عشق کا قاف“ کو میرے اللہ نے اپنے حبیب کریم ﷺ کے صدقے میں جو مقبولیت بخشی، میں اس کے لئے اس رحیم و کریم کا جتنا بھی شکر ادا کروں، کم ہے۔ اس انمول تحریر کے بعد چاہتا تھا کہ کچھ ایسا لکھا جائے جو مجھے ”عشق کا قاف“ کے سحر سے آزاد کرنے کے بجائے مزید سحر آلودہ، مزید سرور انگیز کر دے اور یہ تو طے ہے کہ جو شمار اور مستی اس رؤف العفو کے ساتھ نسبت میں ہے اس کے محبوب یکتا ﷺ سے تعلق میں ہے، وہ کسی اور رشتے میں ممکن ہی نہیں۔ تب زیرِ نظر کہانی کا تانا بانا بننا گیا۔ دل اور دماغ جب ایک نکتے پر متفق ہو جاتے ہیں سوچ اور فکر کے راستے جب ایک ہو جاتے ہیں یقین اور بھروسہ جب باہم شیر و شکر ہو جاتے ہیں۔۔۔ تب ”پکار“ کا نزول ہوتا ہے۔۔۔ یہ کہنے کی نہیں محسوس کرنے اور تسلیم کر لینے کی بات ہے، جس کی توقع مجھے اپنے ہر اس قاری سے ہے جسے اپنے اللہ کے سمیع و بصیر، علیم و خبیر، محیب الدعوات و منعم ہونے کا ادراک بھی ہے اور اس کے دادرس ہونے کا فہم بھی۔

جب ہم اپنے اللہ کو اس کے حبیب کریم ﷺ کے واسطے سے پکارتے ہیں تو ہمارے ایمان اور یقین کا تقاضا یہ ہے کہ پھر اس پکار کے جواب میں ہمارے لئے اپنے رب کے حضور سے دیر آئے یا سویر، نوید آئے یا (بظاہر) غم، دکھ ملے یا سناٹھ، اپنے دامن میں اسے شکر ادا کرتے ہوئے سمیٹ لیں۔ ”دینے والا جو دے رہا ہے وہی ہمارے لئے بہتر ہے“ یہ ایسا اعتقاد ہے جو مانگنے والے کے دل میں جلدی جڑ نہیں پکڑتا مگر اصل میں یہی اعتقاد بندے اور خالق کے درمیان تعلق کی مضبوطی کا پل استوار کرتا ہے۔ جب تک ہم یہ نہ سمجھ لیں اس پر یقین کا پہرہ نہ بنھادیں، یہ نہ مان لیں کہ اپنی پکار اپنی دعا اور اپنی فریاد کے جواب میں ہمیں کب ملنا چاہئے، اس کا صحیح وقت اور جو کچھ ملنا چاہئے اس کے بارے میں وہی خالق و مالک بہتر جانتا ہے، تب تک ہم اعتبار کی اس منزل کا سفر شروع ہی نہیں کر سکتے، جس کا اختتام صرف اور صرف خیر پر ہوتا ہے۔

اور۔۔۔ سوچئے، سمجھئے کی بات تو یہ ہے لوگو!

کہ جس سے مانگا جا رہا ہے، جسے پکارا جا رہا ہے، وہ تو قادرِ مطلق ہے۔ ہماری ان مُرادوں کا حال بھی جانتا ہے جن کے لئے زبان پر سوال لاتا ہے، ہمیں خود سے بھی شرم آ جاتی ہے۔ وہ سراپا کریم تو جو چاہے عطا کر سکتا ہے مگر۔۔۔ جو اس سے مانگ رہا ہے، اسے پکار رہا ہے اس کا کیا حال ہے؟ کیا وہ ان سب شرائط پر پورا ملتا رہتا ہے جس کے بعد دامن حاجت اپنے اللہ کے حضور پھیلا

سکے؟ نہیں ناں! تو پھر کیا یہ اچھا نہیں کہ جب ہم اس کے حضور دعا کے لئے قضاے حاجت کے لئے سائل ہوں تو ہماری جگہ ریز پیشانیوں پر:

”کریم جہاں (ﷺ) کا خطا کار امتی۔ امیدوارِ رحمت“

کے الفاظ ان ندامت بھرے آنسوؤں سے تحریر ہوں جو بارگاہِ کریم میں مقبولیت کے لئے شفاعتِ نبوی (ﷺ) کے بعد سب سے بڑا درجہ رکھتے ہیں۔

یاد رکھئے! اس کی رحمت اس کے غضب پر حاوی ہے یہ سچ ہے۔ اس کی رحمت ہم جیسے خطا کاروں اور گناہ گاروں ہی کے لئے ہے یہ بھی سچ ہے مگر۔۔۔ اس کی رحمت پر دھڑلے سے ہمارا کوئی حق نہیں ہے۔ اپنی رحمت سے وہ ہمیں نواز دے یہ اس کے محبوب (ﷺ) کے صدقے میں ممکن تو ہے مگر اس پر ہم اپنا حق نہیں جتا سکتے۔ یہ ہمارا حصہ ہے تو صرف اس لئے کہ وہ رحیم ہے کریم ہے اور ہم اس کے حبیبِ رؤف الرحیم الکرم (ﷺ) کے امتی ہیں اور بس۔

یہ بھی یاد رہے کہ ہمارے لئے اسے پکارنا اس لئے ضروری ہے کہ صرف وہی ہے جو پکار سکتا ہے۔۔۔ اور ہماری پکار کا جواب کب کیسے اور کیونکر آتا ہے؟ اس کے لئے فقط اس کی رحمت پر نظر رکھئے۔ اسے یہ بھانا کہ ہماری پکار کا پھل ہمارے کہنے کے عین مطابق عطا کرے اس کا مشیر بننے کی کوشش کرنے کے برابر ہے اور یہ ایسا شرک ہے جس کے ہم زندگی بھر پل پل مر ٹکب ہوتے ہیں۔۔۔ اور کیا مجھے یہ بتانا ہوگا کہ شرک ہی وہ جرم ہے جس کی اس کریم کے ہاں کوئی معافی نہیں ہے۔ وہ گناہ ہے جس کی معافی کی اس رحیم کے ہاں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس شرک سے خود بچتے۔ میرے اور ساری امت کے لئے اس شرک سے اللہ کی امان میں رہنے کی دعا کیجئے۔۔۔ پھر اسے آقا و مولا (ﷺ) کے وسیلے سے پکاریے اور انتظار کیجئے اس کی رحمت کے نزول کا۔۔۔ آپ کو اپنی طلب سے سوانہ ملے تو میرا ذمہ۔ اللہ حافظ!

شاخوان کریم (ﷺ)

(سرفراز احمد راہی)

عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور

فون: 0333-4304938

E MAIL: sarfarazahmedraahi @ yahoo.com

”میرے مالک۔۔۔ تُو رحمن ہے تُو رحیم ہے۔ تیری رحمتوں کا کوئی شمار نہیں۔ تیرا فضل نیکراں ہے۔ تُو قادرِ مطلق ہے۔۔۔ میں تیرا ایک عاجز، خطا کار، گنہگار اور کمترین بندہ تیرے دربارِ رحمت میں آس و امید کا دامن پھیلائے سر بسجود ہوں۔ میں نے کبھی تیری عطا میں کمی نہیں پائی میرے مولا۔ میں کل بھی تجھی سے مانگتا تھا۔ آج بھی تیرے ہی در پر سائل ہوں۔ میری آہ کو بے اثر ہونے سے بچالے میرے مالک۔ میری فریاد سن۔ اپنے پیارے حبیب (ﷺ) کے صدقے میں میری جھولی میں میری راجیہ اور جنت کی خیرات ڈال دے۔ ان کی زندگی کا چراغ گل ہونے سے بچالے میرے خالق۔ زندگی اور موت تیرے ہی ہاتھ میں ہے تُو ہر شے کا مالک اور ہر امر پر قدرت رکھتا ہے۔ اگر تقدیر اٹل ہے تو وہ تیری ہی لکھی ہوئی ہے۔ میرا ایمان ہے کہ اس تقدیر کو تیرے محبوب اور میرے آقا (ﷺ) کے صدقے میں ہو جانے والا تیرا ایک اشارہ بدل سکتا ہے۔ تُو اندھیرے سے اجالا اور موت سے زندگی پیدا کرنے والا ہے۔ تیرے لئے کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ مجھ ناچیز کی امید پر اپنی بخشش کی نظر ڈال۔ مجھ خطا کار کی آس پر اپنی عطا کی بارش برسا۔ تُو جانتا ہے راجیہ اور جنت ہی سے میری خارزار زندگی میں بہار ہے۔ تُو نے مجھے تنہائیوں سے نکال کر گلستانِ حیات کی رونقوں میں جینا سکھایا۔ اب دوبارہ مجھے تنہائی کی خزاں نہ دے میرے مالک۔ میری دعا سن۔ میری فریاد پر نگاہِ کرم ڈال۔ تیرا فرمان ہے کہ جو تجھے دل سے پکارے تُو اس کی ضرورت مند ہے۔ دیکھ میرا دل میری آنکھ سے بہتے آنسوؤں میں قطرہ قطرہ ٹپک رہا ہے۔ تُو نیتوں کا حال جانتا ہے۔ تُو وہ بھی جانتا ہے جو کوئی بندہ اپنے بارے میں نہیں جانتا۔ میں صدقِ دل سے تیرے آگے جگہ میں پڑا ہوں اس کا ثبوت دینے کی مجھے کوئی ضرورت ہے نہ تجھے اس کی حاجت۔ تُو میرے دل کی سچی پکار کا شہید ہے۔ تو سمجھ و بصیرتِ علیم ہے۔ سب کچھ سنا ہے۔ دیکھتا ہے۔ جانتا ہے۔ میرے خالی دامن میں اپنی بخشش کی اپنی عطا کی خیرات ڈال دے میرے مالک۔ میرے مالک۔ میرے مالک! تُو رحیم ہے۔ تُو کریم ہے۔ میرا توکل صرف اور صرف تجھ پر ہے۔ مجھے میری

معلومہ اور غیر معلومہ سب خطاؤں کی معافی دے۔ مجھ سے میری زندگی کی خوشیاں نہ چھین۔ مجھے زندگی دی ہے تو زندہ بھی رہنے دے۔ مجھے زندہ لاش نہ بنا۔ مجھے معاف فرما دے۔ میری راجیہ اور جنت کو زندگی بخش دے۔ ان کی ذوقی سانسوں کو ٹوٹی نبضوں کو موت کے پنجے سے آزاد فرما دے میرے مالک۔۔۔!“

فائق رزاقی کی جگر خراش آہ و فغاں زمین کا سینہ چھلی کر رہی تھی۔ اس زمین کا سینہ جس پر موجود مسجد کے صحن میں سجدے میں سر رکھے وہ اپنے خالق و مالک کے حضور گڑ گڑا رہا تھا۔ اس کے آنسو تھے کہ لوگوں کے دلوں کو چھید رہے تھے۔ الفاظ تھے کہ ہر سننے والے کو اپنے ساتھ ڈلا رہے تھے۔ مسجد سے باہر کھلے میدان میں پورا گاؤں اشک فشاں سر جھکائے کھڑا تھا۔ ہر نفس ہاتھ باندھے اپنے گاؤں کے مالک کی آہ و زاری میں شریک تھا۔ مردوں، عورتوں، بوزھوں، بچوں اور جوانوں سب کے لبوں پر دعائیں تھیں یا رزاقی کے ہر لفظ کے ساتھ ”آمین“ کی صدا جو اس بات کا ثبوت تھی کہ گاؤں کے ہر نفس کے دل میں رزاقی دھڑکتا ہے۔

اسی وقت دھول اڑاتی ہوئی ایک تیز رفتار پچارو مسجد کے قریب آ کر رکی۔ اس میں سے ایک تیس بتیس سالہ مضبوط بدن کا گورا چٹا آدمی اترا۔ ایک نظر گاؤں والوں کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بے حد پُرکشش مگر اس وقت یوں سنا ہوا تھا جیسے اس پر خزاں نے افسوں پھونک دیا ہو۔ گاؤں کے چند جوان اور بوڑھے اس کی طرف بڑھے مگر اس نے ہاتھ اٹھا کر ان سب کو روک دیا۔ پھر وہ تھکے تھکے قدم اٹھاتا سیڑھیاں چڑھا۔ جوتے پاؤں سے اتارے اور مسجد کے صحن میں داخل ہو گیا۔

”میرے کریم۔ کرم فرما دے۔ میرے رحیم۔ رحم فرما دے۔ میرے مالک تیرا کمزور بندہ یہ دکھ جھیلنے کے قابل نہیں ہے۔ تیرا فرمان ہے کہ ٹوکھی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ میں خود اقرار کرتا ہوں۔ تیرے گھر میں تیرے سامنے سجدے میں سر رکھ کر اقرار کرتا ہوں کہ میں بہت کمزور اور ناتواں ہوں۔ مجھ میں اتنی ہمت ہے نہ طاقت کہ تیرا ڈالا ہوا بوجھ برداشت کر سکوں۔ مجھ میں اتنی قوت نہیں کہ تیری طرف سے لی گئی کسی آزمائش اور امتحان میں پورا اتر سکوں۔ میں اس قابل نہیں کہ تیری طرف سے آئی ہوئی کسی سختی، آفت یا مصیبت کو سہہ سکوں۔ اس لئے میرے رب کریم! مجھ کو کمزور کو مت آزما۔ مجھ ناتواں کو کسی آزمائش، کسی امتحان، کسی مصیبت میں نہ ڈال کہ میں اسے برداشت نہ کر سکوں گا۔ مجھے بخش دے۔ مجھے معاف فرما دے۔ مجھے اپنے حبیب ﷺ کے صدقے میں معاف فرما دے۔ مجھے میری راجیہ بخش دے۔ میری جنت بخش دے۔ میری پکار سن۔ میری فریاد سن میرے مالک۔۔۔“

”رزاقی۔۔۔!“ آنے والے نے آنسو پینے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اس کے

کندھے پر ہاتھ رکھتا تو آواز ہی نہیں اس کا پورا بدن بھی لرز رہا تھا۔

”میرے مالک۔۔۔“ آنسوؤں سے تر فرش سے رزاقی نے سر اٹھایا تو اس کا چہرہ شبنم میں دھلے پھول کی طرح نکھر ا ہوا تھا مگر یہ پھول سرسوں کا لگتا تھا۔ زردی نے اس پر پوری طرح سایہ کر رکھا تھا۔

”مونس۔“ اس کے لب تھر تھرائے۔ بندھے ہوئے ہاتھ سینے پر رکھ کر اس نے آنے والے کی طرف بڑی امید بھری نظروں سے دیکھا۔

”صبر کرو رزاقی۔“ مونس نے اس کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے کہا اور ہونٹ بھیج لئے۔ اس کے حلق میں درد کا گولہ سا ٹپک گیا جس نے اسے مزید بولنے سے روک دیا۔

”صبر!“ رزاقی نے اسے بے اعتباری سے دیکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ مونس بھی اس کے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا۔ ”تم مجھے صبر کرنے کو کہہ رہے ہو مونس! مجھے۔۔۔“ اس نے تھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”جانتے ہو۔ صبر کرنے سے پہلے عذاب بھیلنا پڑتا ہے۔ صبر تو کیا ہی عذاب آنے پر جاتا ہے مونس۔“

”تو سمجھ لو۔۔۔ عذاب آچکا رزاقی۔“ مونس کی چیخیں نکل گئیں۔ وہ بچوں کی طرح آنکھوں پر بازو رکھ کر دھاڑیں مارنے لگا۔

”کیا؟“ رزاقی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

”ہاں۔ کسی ڈاکٹر کی کوئی کوشش بھابی اور جنت کو نہیں بچا سکی رزاقی۔“ وہ گھٹنوں کے بل فرش پر گر پڑا۔

”مگر میری دعائیں۔۔۔“ وہ پھر سا گیا۔ ”وہ دعائیں جو میں نے سچے دل سے اپنے خالق و مالک کے حضور کرتے ہوئے سازی رات گزار دی مونس۔ کیا وہ سب رائیگاں ہو گئیں؟“ پلٹ کر اس نے مسجد کے بلند و بالا میناروں کی طرف دیکھا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے سچے دل سے اسے پکارا ہے مونس۔ وہ میری دعا کو رد کر ہی نہیں سکتا۔ وہ میری راجیہ اور جنت کو مجھ سے نہیں چھین سکتا۔“ پانگوں کی طرح بڑبڑاتا ہوا وہ آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ ”کیا تو اپنے ہی کہے ہوئے سے پھر گیا میرے مالک۔ میں تجھ سے رحم مانگتا رہا اور تو میرے لئے عذاب سوچتا رہا۔ یہ تو تیرے نیک بندوں کی پہچان ہے کہ ٹو ان کو آزما تا ہے۔ دکھ دیتا ہے۔ ان کی ثابت قدمی کا امتحان لیتا ہے۔ ان کی قوت ایمانی کو پرکھتا ہے۔ میں توازل سے تیرا کمزور ترین بندہ ہوں۔ تیرے حبیب ﷺ کا گنہگار ترین امتی ہوں۔ میں نے تو کبھی اپنی کسی نیکی پر فخر نہیں کیا۔ خود کو کبھی تیری آزمائش کے قابل نہیں سمجھا۔ ہمیشہ کسی بھی امتحان کے لمحے سے تیری پناہ تیری امان مانگتا رہا۔ پھر تو زبردستی مجھ پر اپنی رضا کیوں مسلط کر رہا ہے۔ کیوں؟“ وہ چیخ اٹھا۔ اس کے ہاتھ آسمان کی طرف پھیلے۔ آنکھیں دور خلاؤں میں جم گئیں۔ آنسو شاید آخری بار اس

طرف چل پڑا۔ مونس اس کے ساتھ ساتھ تھا۔
 صحن سے پاؤں اس نے اس کھلی جگہ پر رکھا جہاں اس نے جوتے اتارے تھے۔ جوتے پہن کر اس نے ایک بار پھر اس عظیم الشان مسجد کی اندرونی عمارت کو پلٹ کر دیکھا اور دروازہ پار کر کے پہلی سیڑھی پر آ کھڑا ہوا۔

لوگ باگ اب بھی وہیں کھڑے تھے۔ اسے دیکھ کر کئی عورتوں کی سسکیاں ابل پڑیں۔ ماؤں کو روتا دیکھ کر بچے بھی پُپ نہ رہ سکے۔ بوزھوں نے جوانوں کا سہارا لئے لئے دیکھا۔ بلند قامت پُڑ شکوہ اور بارعب فائق رزاقی مسجد کی سیڑھیاں ایک ایک کر کے یوں اتر رہا تھا جیسے لڑکھڑا کر کبھی بھی گر پڑے گا۔ نیچے آ کر اس نے کسی کی طرف دیکھے بغیر قدم آگے بڑھا دیے۔
 مونس جوتے پہن کر تیزی سے اس کے قریب آیا۔

”رزاقی۔ میرے ساتھ جیب میں چلو۔“ اس نے رزاقی کا بازو تھام کر اسے روک لیا۔
 ”نہیں۔“ وہ نفی میں سر ہلا کر بولا۔ ”کہتے ہیں قبرستان کی طرف جاؤ تو پیدل جانا چاہئے۔“ وہ پھر چل پڑا۔

”مگر ابھی تو تمہیں حویلی جانا ہے!“ مونس اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔
 ”حویلی ہو یا پورا گاؤں۔ میرے لئے اب ایک قبرستان ہے۔ مونس۔ راجیہ نہیں رہی۔ جنت نہیں رہی۔ رزاقی سے میرا ناظم ختم ہو گیا۔“ وہ اس سے بازو چھڑا کر آگے چل پڑا۔
 ”رزاقی۔“ مونس کے دل پر چوٹ سی پڑی۔ اس نے نکلا ہونٹ دانتوں میں دب لیا۔ چند لمحے

اس پہاڑ کو حویلی کی طرف جانے والے راستے پر ڈولتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر آنکھوں میں جھلملاتے ننکین پانی میں جب رزاقی کا جیشہ تھر تھرایا تو وہ سسک کر رہ گیا۔ پورا گاؤں رزاقی کے پیچھے یوں سسکتا بلکتا حویلی کی طرف جا رہا تھا جیسے کوئی ماتمی جلوس رواں ہو۔

”شوکت۔“ مونس نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں مسل کر سارے آنسو نکال دیے۔

”جی مونس بابو۔“ ایک نوجوان دوڑ کر اس کے قریب چلا آیا۔

”جیب حویلی لے آنا۔“ مونس نے کہا اور شوکت کا جواب سے بغیر تیز تیز قدموں سے رزاقی کے قریب پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔ جھوم اسے راستہ دیتا جا رہا تھا۔

☆=====☆

سارا دن ایک عجیب سے ہنگامے میں گزر گیا۔

رزاقی حویلی کے مردان خانے میں آیا اور وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ مردوں اور عورتوں کا تانتا بندھ گیا۔ عورتیں اندر زنان خانے میں چلی جاتیں اور مرد اس کے پاس رک جاتے۔ مونس نے دو گھنٹے تک

کی آنکھوں سے بہہ کر رخساروں پر آئے اور مسجد کے فرش پر گر کر پھیل گئے۔ ان موتیوں کی طرح جو یقین کی مالاٹوٹے سے بکھر جاتے ہیں۔

”رزاقی۔“ مونس نے اس کے قریب آ کر کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”تم بتاؤ۔۔۔ تم تو اپنے خدا کے بڑے چہیتے ہو۔ اس نے میری فریاد کیوں نہ سنی؟ کیوں اس نے میرے خالی دامن میں اپنی رحمت کی بھیک نہ ڈالی؟ کیا میری نیت میں فتور تھا؟ کیا میری طلب سچی نہیں تھی؟ کیا میں اس کے علاوہ کسی اور سے مانگ رہا تھا؟“

”ایسا کچھ بھی نہیں ہے رزاقی۔“ مونس نے دوسرے ہاتھ سے اپنی آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا۔ ”جب موت کا وقت آ جاتا ہے ناں تو کوئی دعا، کوئی تدبیر کام نہیں آتی۔“

”میں نہیں مانتا تمہاری اس بات کو۔“ رزاقی نے اس کا ہاتھ کندھے سے جھٹک دیا۔ ”جب وہ خود کو قادر مطلق کہتا ہے تو وہ موت کا وقت بھی بدل سکتا ہے۔“

”بالکل بدل سکتا ہے۔ وہ تقدیر لکھنے والا ہے اور تقدیر بدل بھی سکتا ہے۔“ مونس نے اس کی تائید کی۔

”تو پھر آج میری دعا کے جواب میں اس کی قدرت کیوں خاموش رہی؟“ رزاقی کا لہجہ باغیانہ ہو گیا۔

”تم ایک عام آدمی، ایک عام انسان ہو رزاقی۔“ مونس نے اسے سمجھانا چاہا۔ ”ایک گنہگار انسان۔ تمہارے لئے وہ مجھ کو دکھانے کا پابند ہے کیا؟“

”نہیں۔“ رزاقی نے اسی لہجے میں کہا۔ ”یہ میں نے کبھی نہیں کہا۔ آج بھی نہیں چاہا۔ میں تو اس کی رحمت کو پکار رہا تھا مگر اس کی رحمت جوش میں کیوں نہیں آئی جبکہ میری پکار میں کوئی کھوٹ بھی نہیں تھا!“

”یہ بھی اس کی مصلحت ہے رزاقی۔ جو اس وقت تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ اس کا ہر کام وقت اور مصلحت پر مبنی ہوتا ہے۔“

”اسے وقت کی پابندیوں سے مطلب؟“ رزاقی چیخا۔ ”وہ تو قادر مطلق ہے۔ اسے مصلحت سے کیا کام؟“

”رزاقی۔“ مونس نے اسے سامنے آ کر بازوؤں سے تھام لیا۔ ”یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں ہے۔ ہاسپٹل سے بھابی اور جنت کو حویلی لایا جا چکا ہے۔“

”راجیہ۔۔۔ اور۔۔۔ جنت!“ وہ ایک دم جیسے خواب سے چونک پڑا۔ ہونٹ بھیج کر اس نے آسمان کی طرف بڑی عجیب نظروں سے دیکھا جہاں بادلوں کے چند سفید وسیا کھڑے شاید اس کی حالت پر بے چین ہو کر متحرک تھے۔ پھر بائیں ہاتھ کی پشت سے آنکھوں کو خشک کیا اور خاموشی سے باہر کی

اس کے خون میں تھا اور اسے وراثت میں ملا تھا اور مونس کے لئے اگر دنیا شروع رزاقی سے ہوتی تھی تو ختم بھی اسی پر ہو جاتی تھی۔

راجیہ کو بھی رزاقی کے لئے مونس ہی نے تلاش کیا تھا۔ راجیہ ایک سوشل ورکر تھی۔ خالق نگر میں آئی تو اپنے کام کے سلسلے میں تھی مگر وہیں کی ہو کر رہ گئی۔ مونس نے اس کے کام میں اس کی بے لوث مدد کی تو وہ اس کی گرویدہ ہو گئی۔ پھر اس سے پہلے کہ رزاقی کچھ پھر پھر کرتا، مونس نے ایک دن رزاقی کی والدہ بیگم کشور سلطانہ کی آنکھوں کے راستے راجیہ کو ان کے دل میں اتار دیا۔ دنوں میں بات آگے بڑھی اور ہفتوں میں راجیہ ان کی دلہن بن گئی تاہم وہ اس کے ناز زیادہ دیر نہ اٹھا سکیں اور تین ماہ بعد ہی چل بیسیں۔

ماں کی وفات نے رزاقی کو بے حد اکیلا کر دیا مگر جب راجیہ نے اس کی اداسیوں میں جنت کا پھول کھلا دیا تو وہ ایک بار پھر زندگی کی دلچسپیوں کی طرف لوٹ آیا اور اس سارے عمل میں مونس پس پردہ اور سامنے رہ کر جو مثبت کردار ادا کرتا رہا وہ اس سے بخوبی واقف تھا۔

گزشتہ صبح راجیہ گاڑی پر جنت کے لئے کچھ خریداری کی غرض سے شہر گئی۔ واپسی پر ڈرائیور کی بے احتیاطی سے یا سامنے سے آنے والے تیز رفتار ٹرک کی غلطی سے گاڑی کا ایک ٹیڈٹ ہو گیا اور ڈرائیور تو موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ راجیہ اور جنت کو شدید زخمی حالت میں گاڑی کے قریب ہی ٹیڈٹ پر واقع جرنل ہاسپتال میں داخل کرنے کے بعد رزاقی کو اطلاع دی گئی۔ وہ اور مونس اڑتے ہوئے ہاسپتال پہنچے۔

راجیہ اور جنت دونوں آپریشن تھیر میں تھیں۔ ان کی حالت اس قدر خراب تھی کہ خون زیادہ بہہ جانے اور پسلیاں ٹوٹ جانے کے باعث راجیہ اور سر پر گہرا زخم آنے کے باعث جنت مسلسل بے ہوش تھی۔ رزاقی نے بے حد معروف شخصیت کا مالک تھا۔ ہر جگہ اس کا نام ہی وہی آئی پی سمجھا جاتا تھا۔ راجیہ اور جنت اس کی بیوی اور بیٹی کی حیثیت سے اس علاقے میں پوری طرح جانی پہچانی جاتی تھیں۔ ڈاکٹروں اور سرجنوں نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ صبح ساڑھے گیارہ سے رات دو بجے تک وہ جان لڑاتے رہے۔ مونس نے مطلوبہ خون کی بوتلوں کا ڈھیر لگا دیا۔ رزاقی نے روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ دو بجے رات جب راجیہ اور جنت کو آئی سی یو میں منتقل کیا گیا تو رزاقی کو صرف یہ تسلی دی گئی کہ:

”اگر صبح سات بجے تک ہوش آ گیا تو حالت خطرے سے باہر سمجھی جائے گی۔ ہماری کوششیں اپنی حدود پار کرنے کے بعد آپ کی بیگم اور بیٹی کو تنفس میں روانی کی منزل تک لے آئی ہیں۔ اب خدا سے دعا کیجئے کہ وہ ان کی سانسوں کو زندگی کی نوید سے جوڑ دے۔“

رزاقی نے شخصے کی دیوار کے پار سفید پیٹیوں میں گھری راجیہ اور جنت کی طرف دیکھا۔ سرجن

ٹیلی فون سنبھالے رکھا۔ جہاں فون کی سہولت تھی وہاں فون کیا۔ موبائل سے کام لیا۔ جہاں یہ سہولت میسر نہ تھی وہاں بندوں کو دوڑایا۔ صبح کے سات بجے تھے جب اس نے یہ کام شروع کیا اور نو بجے جب وہ ٹیلی فون ایک طرف سر کا رکھا تو اس کی انگلیاں شل ہو چکی تھیں۔

اسے حوصلہ نہ ہو رہا تھا کہ مردان خانے میں جا کر رزاقی سے کہے کہ اندر جا کر اپنی راجیہ اور جنت کو ایک نظر دیکھ تو لے۔ وہ تین چار بار مردان خانے کے دروازے تک گیا اور کسی اور طرف نکل گیا! درجنوں لوگوں کے بیچ سر جھکائے رزاقی یوں بیٹھا تھا جیسے اس کی کل کائنات لٹ گئی ہو۔ اور یہ بات غلط بھی نہ تھی۔

خالق نگر دو سو پچاس مربعوں سے زائد رقبے پر مشتمل ایک ایسا گاؤں تھا جس سے صرف چھ میل دور پاک بھارت سرحد واقع تھی۔ گاؤں کے کھیت اس باؤنڈری وال تک بکھرے ہوئے تھے جو دونوں ملکوں کے درمیان حد فاصل تھی۔ فائق رزاقی اپنے والدین کی سب سے بڑی اولاد تھا۔ چار سال پہلے اس کے سب سے چھوٹے بھائی کا انتقال ہوا تو اس کے غم میں گھل گھل کر پہلے باپ اور اس کے دو سال بعد ماں ملک عدم کو سدھا رہ گئی۔ دونوں چھوٹے بھائی اپنے اپنے حصے سمیٹ کر بیرون ملک جا بے اور خوشی غمی میں شرکت سے بھی ہاتھ کھینچ لیا۔ خاندان کے چند گئے چنے گئے تھے جن سے رزاقی کا میل جول تھا مگر جب دو سال پہلے اس نے کروڑ پتی خاندان کی بیشر انرا یوں کو چھوڑ کر بے پایاں اور بے آسرا راجیہ سے شادی کر لی تو ان آنکھوں میں بھی بے مروتی آ کر آئی جو اپنی بیٹیوں کے لئے اس پر لگی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رشتوں نا طوں کا دامن اور چھوٹا ہو گیا۔ اس نے بھی کسی کو خاص طور پر ملنے کی کوشش نہیں کی تھی کیونکہ راجیہ نے جو بھری دنیا میں تنہا تھی اسے ایک سال بعد جنت جیسا کھلونہ دے کر اس کی دنیا مکمل کر دی۔ اسے راجیہ اور جنت سے آگے کوئی دکھائی ہی نہ دیتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کو ان دونوں تک محدود کر لیا اور دن رات خوشیوں سے آنکھ پھولی کھیلنے لگا۔ وقت اس قدر مہربان تھا کہ وہ آنکھوں پر پٹی باندھ کر بھی دائیں بائیں ہاتھ مارتا تو کسی نے کسی خوشی کو گرفت میں لے لیتا۔

مونس اس کا پہلے دوست تھا پھر حویلی اور خالق نگر کا منتظم۔ دونوں بچپن کے دوست تھے۔ وہ اب تک غیر شادی شدہ تھا۔ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اور ان کے مرنے کے بعد رزاقی ہی اس کا سب کچھ تھا۔ راجیہ سے بھی پہلے اگر کسی کو اس کے مزاج میں دخل کا حق تھا تو وہ مونس ہی تھا۔ رزاقی اس پر اندھا اعتماد کرتا تھا اور اس اعتماد کی عمارت مونس کی دوستی، ایمانداری، محنت اور خلوص کے چار ستونوں پر استوار تھی۔ ان کی دوستی ایسی مضبوط بنیادوں پر پروان چڑھی تھی کہ اگر دونوں میں سے کسی ایک کو جان کی بھی ضرورت پڑتی تو دوسرا سبب جانے بغیر دے دیتا۔ ایک دوسرے کے لئے دل و جان سے سر تسلیم خم کئے رکھنے کا سبب رزاقی کے نزدیک تو یہ تھا کہ وہ مونس کی دوستی اور وفا کا قدر دان تھا۔ دوست نوازی کا وصف

”ہے کہاں وہ؟“ بی بی سکی۔

”مردان خانے میں سر جھکائے بیٹھا ہے!“

”اسے کہنا تھا ایک بار آ کر اپنی کائنات پر نظر تو ڈال لے۔“ بی بی نے مین کرنے کے انداز میں کہا۔
”میرا حوصلہ نہیں ہوتا بی بی۔“ مونس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”تم بلاؤ اسے۔ رات بھر مسجد میں سجدے میں پڑا رہتا رہا ہے مگر جب سے راجیہ اور جنت کی خبر سنی ہے پتھر بن گیا ہے۔“
”ہائے میں مر جاؤں۔“ بی بی نے سینے پر ہاتھ مارا۔ ”اس طرح تو دل پھٹ جائے گا میرے باؤ۔“

”غم کا بوجھ دل پر بڑھ گیا تو کچھ بھی ہو سکتا ہے بی بی۔ اسے کسی طرح یہاں بلواؤ۔ بھابی اور جنت کو دیکھ کر وہ چار آنسو بہا لے گا تو اندر کا غبار نکل جائے گا ورنہ۔۔۔ یہ غبار اس کی دھڑکنوں کی روانی میں ایسی رکاوٹ بن کر جم جائے گا کہ۔۔۔“

”اللہ نہ کرے بیٹا۔ چلو۔ میں خود چلتی ہوں۔ اسے لے کر آتی ہوں۔ چلو۔“ بی بی روتی ہوئی بے تابانہ اس کے آگے آگے چل پڑی۔

مردان خانے کے دروازے میں دو تین آدمی کھڑے تھے۔ بی بی اور مونس کو دیکھ کر وہ سلام کرتے ہوئے ایک طرف ہٹ گئے۔ بی بی نے دسویں و عریض مردان خانے میں جھانک کر دیکھا۔ رزاتی کو بے شمار مردوں کے درمیان کسی یتیم و سیر کی طرح سر جھکائے بیٹھا دیکھ کر بوڑھی بی بی کے دل پر آ رہے چل گئے۔

”باؤ۔“ اس کے ہونٹ پھڑکے مگر آواز نہ نکلی۔ آنکھیں ساون بھاؤں کی طرح برس پڑیں۔

اسی وقت کسی نے رزاتی کو دروازے کی طرف متوجہ کیا۔ اس نے دھیرے سے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں بسی وہ ویرانی تھی کہ شبیر خوشاں کا سکوت۔ مونس نے گھبرا کر فطریں پھیر لیں اور تھوک نکل کر رہ گیا۔ بی بی نے بمشکل ہاتھ اٹھا کر اشارے سے اسے پاس بلایا۔

رزاتی نے اس کا اشارہ دیکھا اور سر جھکالیا۔ چند لمحے بیٹھا رہا۔ پھر بڑی مشکل سے اٹھا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا بی بی کے پاس آن کھڑا ہوا۔

”باؤ۔“ بی بی نے روتے ہوئے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا ماتھے کو چھوا تو وہ انگارے کی طرح دھبہ رہا تھا۔ ”ارے۔ تجھے تو تیز بخار ہے۔“

یہ سن کر مونس قدم بڑھا کر رزاتی کے پاس چلا آیا۔

”کیوں بلایا تھا بی بی؟“ اس کی بات آن سی کر کے رزاتی نے بے ذہنی سے پوچھا۔

”صبح سے وہ دونوں تیری راہ تک رہی ہیں۔“ بی بی نے ٹوٹی آواز میں کہا۔ ”کیا ان کو دیکھ گاہ

ڈاکٹر صدانی کی طرف تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھا اور مونس کے ساتھ باہر چلا آیا۔

”مونس۔“ وہ سر اٹھا کر آسمان پر ٹٹماتے تاروں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں گاؤں جا رہا ہوں۔ تم یہیں رکو۔ میں اپنے اللہ سے راجیہ اور جنت کی روٹختی ہوئی زندگی کی ضمانت لینے کے بعد ہی اس کے گھر سے نکلوں گا۔ جو نبی راجیہ یا جنت کو ہوش آئے مجھے اطلاع دینا۔“
وہ موبائل فون جیب میں رکھتے ہوئے گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ شوکت نے اس کے لئے دروازہ کھول دیا۔

مونس نے جواب میں صرف سر ہلا دیا۔ پھر رزاتی کی گاڑی نے ہاسپٹل کا گیٹ پار کیا تو وہ کاریڈور میں مودب کھڑے پانچ چھ ملازموں کی طرف آیا جو صبح سے اس کے ساتھ ہلکان ہو رہے تھے۔
”شوکت۔ سب لوگوں کو کنٹین پر لے جاؤ۔ صبح سے کسی نے شاید چائے بھی نہیں پی۔ میں اندر ڈاکٹر صدانی کے کمرے میں موجود ہوں۔“

”نہیں سر۔۔۔“ شوکت نے کہا اور سب کو ساتھ لے کر کاریڈور سے کنٹین کی طرف نکل گیا۔
مونس ڈاکٹر صدانی کے کمرے میں چلا آیا۔

رات سو اوپر بجے صبح مونس کی آمد تک اگر رزاتی گاؤں کی مسجد کے صحن میں سرسبز و گلزار ہا تو گاؤں والے اس کے اس حکم پر مسجد سے باہر سرایا دعا گو رہے کہ۔۔۔ ”اندر کوئی نہ آئے۔ آج میں اپنے اللہ سے تنہائی میں فریاد کرنا چاہتا ہوں۔“

اور۔۔۔ مونس۔۔۔ صبح جب آیا تو خیر کی بجائے عذاب کی خبر لایا۔ رزاتی کے لئے یہ صورتحال اس قدر ناقابل برداشت تھی کہ اس کا یقین ڈول گیا۔ اس نے جس طرح دل سے اپنے رب کو پکارا تھا اس کا جواب وہ صرف اور صرف نزول رحمت کی شکل میں چاہتا تھا۔۔۔ اور رحمت تو راجیہ اور جنت کی زندگی کی نوید سے مشروط تھی۔ اپنے بھروسے امید اور اعتماد کی یہ نفی اس سے کسی نہ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اندر سے اس بری طرح شکست و ریخت کا شکار ہوا کہ اس ٹوٹ پھوٹ کے آثار اس کے اجڑے ہوئے چہرے پر بھی صاف دکھائی دے رہے تھے۔

☆=====☆

”بی بی۔۔۔“ مونس نے زنان خانے کی واحد اور بااختیار ہستی سردار بی بی کو پکارا تو وہ انگلیاں آنکھوں کے ساتھ عورتوں کے درمیان سے اٹھ کر اس کے پاس چلی آئی۔

”باؤ کہاں ہے؟“ وہ فائق کو ہمیشہ اسی نام سے پکارتی تھی۔ رزاتی کو اس نے گودوں کھلایا تھا اور وہ اس کا ماں ہی کی طرح احترام کرتا تھا۔ بی بی کو گھر بھر پر ایک ماں ہی جیسی حکومت حاصل تھی۔

”بی بی۔۔۔“ مونس کے ہونٹ لرزے۔ ”وہ بالکل ٹوٹ گیا ہے۔“

نہیں آ کر؟

”نہ۔۔۔ نہ بی بی نہ۔۔۔“ وہ پگلوں کے انداز میں زور زور سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میرا کچھ پھٹ جائے گا۔“ اس کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔ اس نے دل کو یوں جکڑ لیا جیسے سینے سے نکل آنے کو تڑپ رہا ہو۔

”ایک بار باؤ۔“ بی بی نے اس کا بازو زور سے تھام لیا۔ ”ایک بار دیکھ لے ان کو۔ دیکھ تیری آنکھیں بخر ہو گئی ہیں۔ اپنے پیاروں کو دیکھے گا تو سوتے پھوٹ پڑیں گے۔ رو لے گا تو دل ہلکا ہو جائے گا۔ صبر آ جائے گا۔“

”صبر۔“ وہ حیرت سے بولا۔ ”صبر اتنی جلدی کیسے آئے گا بی بی۔ ابھی تو عذاب آیا ہے۔ میں اس کی رحمت کو پکارتا رہا۔ اس نے مجھ پر عذاب نازل کر دیا۔ اب اس کی نیچھی ہوئی سوغات کو کہاں رکھوں بی بی۔ دل میں تو جگہ نہیں کہ وہاں میری راجیہ اور جنت دھڑک رہی ہیں۔ یقین کا دامن چاک ہو گیا۔ اس میں سمیٹ نہیں سکتا۔ بھروسہ دم توڑ گیا۔ اس کی میت پہلے اٹھاؤں یا اپنی کائنات کی۔ میں کیا کروں بی بی؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ تم کہتی ہو راجیہ اور جنت کو جا کر دیکھ لوں۔ وہ جو کل تک معصوم پرندوں کی طرح چبکتی پھرتی تھیں آج ان کو موت کی آغوش میں مہر جھائے پھولوں کی طرح پڑا دیں۔ اتنی ہمت مجھ میں نہیں ہے ابھی۔۔۔ ابھی نہیں بی بی۔ ابھی نہیں۔“ وہ ہاتھ اور سر نفی میں لہراتا واپس پلٹ گیا۔

”باؤ۔“ بی بی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ مونس دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے بلک رہا تھا۔ ”میرے باؤ کا کچھ کرو بیٹا۔ وہ تو پہاڑ تھا۔ اپنی جگہ سے کیسے ہل گیا!“ بی بی کہتی ہوئی مڑی اور ہچکیاں لیتی زنان خانے کی طرف بڑھ گئی۔

کچھ دیر بعد زنان خانے سے بین کی آوازیں ابھریں۔ پھر ان میں شدت آتی گئی۔ مردانے میں ان آوازوں کا شور پہنچا تو کتنے ہی جوانمرد تنکے کے بہانے آنکھیں ملنے پر مجبور ہو گئے۔

☆=====☆

راجیہ اور جنت کو قفن دے دیا گیا۔

ان کی میتیں زنان خانے کے صحن میں رکھی تھیں۔ میتوں کے ارد گرد عورتوں کی بھیڑ جمع تھی۔ اگر بیویوں کی مہک، کافور کی خوشبو، سسکیوں، آہوں اور بین کرنے کی آوازوں نے ایک ماتم کدہ بنا دیا تھا حویلی کو۔ قبرستان سے اطلاع آ چکی تھی کہ ان دو معصوم جانوں کے لئے آخری آرام گاہیں تیار ہو چکی ہیں۔ دور و نزدیک کے رشتے دار آ چکے تھے۔ کسی کا انتظار نہیں تھا۔

شام آئی۔ گہری ہوئی اور رات میں ڈھل گئی۔

عشاء کی نماز کے بعد خالق مگر کی عظیم الشان مسجد کے امام اور خطیب قاری خادم حسین نے جنازے اٹھالینے کا عندیہ دیا۔

”رزاتی۔“ مونس نے دل کو مضبوط کر کے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ جواب میں رزاتی نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔

”قاری صاحب کہہ رہے ہیں کہ اب دیر کرنا مناسب نہیں۔ سب لوگ آ چکے ہیں۔ اب کسی کا انتظار بھی نہیں۔“ وہ آہستہ آہستہ کہتا رہا۔

رزاتی نے اس کی بات سنتے سنتے پھر سر جھکا لیا۔ آنکھیں موند لیں اور دائیں بائیں نکلے ہاتھوں پر اس کے جسم کا بوجھ اور بڑھ گیا۔

چند لمبے اسی خاموشی میں گزر گئے۔ مردان خانے میں موجود سب لوگ اس کی طرف سے کسی حکم کی بات، کسی اظہار کے منتظر تھے۔

”رزاتی۔“ دوبارہ مونس نے زبان کھولی مگر اس کے مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی رزاتی نے اپنے ہاتھ فرش سے اٹھالئے۔ ایک دو پل ہاتھوں کو گود میں رکھے بیٹھا رہا پھر اپنی جگہ چھوڑ دی۔

اس کے ساتھ ہی مردان خانے میں موجود ہر شخص اٹھ گیا۔ مونس اس کے کندھے سے کندھا ملائے لوگوں کے درمیان سے گزر کر کارڈیور میں آ گیا۔ کمرے سے باہر آتے ہی رزاتی رک گیا۔

مونس نے اس کے ویران چہرے پر نظر ڈالی۔ پھر اس کی بے روح نظروں سے نظریں ٹکراتے ہی وہ بے گل سا ہو گیا۔ اس کا جی چاہا، وہ رزاتی کا ہاتھ تھام کر راجیہ اور جنت کے پاس لے جائے۔ ان دونوں کو دیکھ کر اس کی پھر آنکھوں سے شاید غم کے چشمے پھوٹ بہتے۔ یہ رزاتی کی زندگی کے لئے بے حد ضروری تھا۔

”مونس۔“ سپاٹ سی آواز رزاتی کے لبوں سے نکلی۔ مونس چونک پڑا۔ وہ پہلے ہی رزاتی کی طرف دیکھ رہا تھا اس کی آواز پر ہمہ تن گوش ہو گیا۔

”زنان خانہ خالی کراؤ۔“

”مطلب؟“ مونس کی سمجھ میں نہ آیا کہ رزاتی کیا چاہتا ہے۔

”میں راجیہ اور جنت کو اکیلے میں دیکھنا چاہتا ہوں۔“ کہہ کر اس نے رخ پھیر لیا اور دیوار سے پشت لگا کر یوں گہرے گہرے سانس لینے لگا جیسے اس نے چند الفاظ ادا نہ کئے ہوں، میلوں کی دوڑ لگا کر آیا ہو۔ نقاہت نے اسے ایک ہی دن میں پہاڑ سے ریت کی دیوار بنا دیا تھا۔ یہ دیوار کب گر جاتی، کوئی نہ کہہ سکتا تھا!

مونس نے ایک پل کے لئے کچھ سوچا۔ پھر تیزی سے زنان خانے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

چند لمحوں بعد اندر سے عورتیں باہر نکلتا شروع ہو گئیں۔ سب سے آخر میں بی بی نے کارڈور میں قدم رکھا۔ تب تک سارے مرد اور عورتیں حویلی کے صحن میں جا چکے تھے۔ مونس رزاتی کے پاس آیا تو بی بی اس کے ساتھ تھی۔

”باؤ۔“ بی بی نے رزاتی کے رخسار کو چھوا۔

”بی بی۔“ اس نے آنکھیں کھولیں۔ سرخ سرخ، سوچی ہوئی ویران اور بے لصر آنکھیں۔

”جا۔ اندر جا۔ صبح سے وہ تیری راہ تک رہی ہیں۔ ان سے مل لے جا کر۔ پھر انہیں رخصت ہونا ہے تیرے کندھوں پر۔ جا بیٹا۔ دیر نہ کر۔“ بی بی دوپٹے میں چپچپائی ایک طرف پڑے موڑھوں میں سے ایک پر گر پڑی۔

رزاتی نے اس کی حالت پر دھیان نہ دیتے ہوئے قدم زنان خانے کی طرف بڑھا دیے۔ مونس اس کے پیچھے تھا۔

”بس مونس۔ تم یہیں رکو۔ میں اپنی راجیہ سے تنہائی میں چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“ دروازے پر رک کر وہ بولا۔

مونس گھبرا سا گیا۔

”مگر۔۔۔“ اس نے کہنا چاہا۔

”گھبراؤ نہیں۔ جنازے دو ہی اٹھیں گے۔ میں خودکشی کر کے اس عذاب سے جان نہیں چھڑاؤں گا جو تمہارے خدا کی طرف سے مجھ پر مسلط کر دیا گیا ہے۔ بس۔ یہ آخری ملاقات ہم تینوں کے درمیان ہو۔ کوئی چوتھا اس میں شامل نہ ہو، میں اتنا ہی چاہتا ہوں۔“

وہ مونس کے جواب کا انتظار کئے بغیر زنان خانے میں داخل ہوا اور دروازہ بند کر لیا۔ مونس بے قرار ہو کر آگے بڑھا۔ پھر دروازے پر ماتھا ٹیک کر رہ گیا۔

☆=====☆

رزاتی بند دروازے سے پشت لگائے چند لمحوں تک خاموش کھڑا سوچ و عریض صحن کے عین درمیان رکھی اس چارپائی کو دیکھتا رہا جس پر راجیہ اور اس کے پہلو میں تھپی جنت سفید کفن میں ملبوس پڑی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے حرکت کی اور لرزتے ڈولتے قدموں سے آگے بڑھا۔ اس کے دماغ میں سائیں سائیں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ زمین پیروں تلے ڈمگ رہی تھی۔ آنکھوں میں پتنگے سے اڑ رہے تھے۔ پھر جب وہ چارپائی کے قریب پہنچ کر رکا تو کھڑا نہ رہ سکا۔ اس کی طاقت جواب دے گئی۔ بے اختیار وہ فرش پر بیٹھتا چلا گیا کا پتے ہاتھوں سے اس نے چارپائی کی پٹی کو تھاما اور پیشانی اس پر ٹکا کر یوں ہانپنے لگا جیسے کوسوں کی چڑھائی سے بے حال ہو گیا ہو۔

کتنے ہی پل گہری گہری سانسوں کے تعاقب میں گرتے پڑتے گزر گئے۔

تب اس نے سر اٹھایا۔ آنکھیں کھولیں اور جیسے ڈرتے ڈرتے اپنے پیاروں پر نگاہ کی۔

ہر وقت مسکراتی رہنے والی راجیہ کا چہرہ اب بھی پُر سکون تھا، یوں جیسے وہ ابھی ہنس دے گی۔ اسے ”صاحب“ کہہ کر پکار دے گی۔ اس کے پہلو میں جنت سورہی تھی۔ ہر وقت قلعاریاں مارنے والی دو سالہ معصوم جنت، جس نے اپنی زبان سے سب سے پہلا لفظ ”پاپا“ ادا کیا تھا، یوں بے حس و حرکت تھی جیسے کبھی جاگ ہی نہ ہو۔ جنت ایسی بے آباد بھی ہو سکتی ہے، یہ تو اس نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔

وہ کتنی ہی دیر تک ان دونوں کو پتھرائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ ان کے بولنے کا منتظر رہا، لیکن جب جواب میں مسلسل خاموشی اسے حیرانی سے نکلتی رہی تو اس کا ضبط ٹوٹ گیا۔

”راجیہ۔“ رزاتی کے ہونٹ لرزے۔ ”بے وفا ہوتم۔“ سرگوشی نے اس کا ساتھ دیا۔ ”مجھے اکیلا

چھوڑ کر چل دیں۔ کس کے سہارے؟ تم جانتی تھیں، میں تمہارے بغیر ادھورا ہوں۔ میری زندگی میں جس دن سے تم آئیں، اس کے بعد کوئی اور نہیں آیا۔ میں نے اپنی چھوٹی سی کائنات میں صرف تمہیں اور جنت

کو آباد کر لیا تھا۔ جب تم جانتی تھیں کہ میری دنیا صرف تم دونوں سے ہے تو پھر تمہیں کیا حق تھا مجھے یوں تنہا کر کے چلے جانے کا۔ بولو۔ اب میں کس کے سہارے زندگی کے بے ماہ و سال، بے سرکوبی، گاجنی میں کوئی

امید، کوئی آرزو، کوئی انگ باقی نہیں؟ راجیہ۔ اتنے تھوڑے دنوں کے لئے آنا تھا تو کیوں میری دنیا میں آئیں؟ مجھ سے مرتے دم تک کا ساتھ نبھانے کے تمہارے وعدے ریت کی دیوار ہو گئے۔ تم نے ایک پل کو بھی نہ سوچا کہ میں جو تمہارے بغیر پانی کا گھونٹ نہیں پیتا، تنہائی اور نامرادی کا زہر کس

طرح گھونٹ گھونٹ پی سکوں گا۔ راجیہ! تم بے وفا ہو۔ جھوٹی ہوتم۔ اپنے کسی وعدے کی بات پر قائم نہیں رہیں تم۔۔۔ اور جنت! میری بیٹی! میری جان! تم نے تو ابھی جی بھر کر مجھے کھیلنے بھی نہیں دیا اور ٹوٹ گئیں۔ سو ہٹا! میں تو ابھی تمہارے لئے وہ سارے کھلونے بھی نہیں خرید پایا تھا جن سے کھیل کر تم مجھے

نہال کر دیتیں۔ تمہیں تو سرخ جوڑے میں میرے گھر سے رخصت ہونا تھا جنت! تم نے یہ سفید کفن کیوں پہن لیا۔ شاید اس لئے کہ تمہاری ماں نے بھی اسی رنگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اور بیٹیاں تو باپ سے بڑھ کر

ماں سے پیار کرتی ہیں ناں! اسی لئے تم نے میرے سرخ جوڑا اسلانی سے پہلے ہی ماں کے ساتھ سفید کفن پہن لیا۔ کیسی بے مروت ہو تم دونوں ماں بیٹی کہ میری کسی بات کا جواب بھی نہیں دے

ریں۔ کیوں؟ کیا ایک ہی پل میں سارے بندھن، سارے ناطے، سارے رشتے ٹوٹ گئے؟ راجیہ۔ جنت۔ کچھ تو بولو۔ کچھ تو کہو۔ ارے۔ جاتے ہوئے مجھے خدا حافظ کہہ کر اس خدا کے حوالے ہی

کر جاتیں جس نے تمہیں مجھ سے چھین لیا، مگر نہیں۔۔۔ ایک دم وہ پھر گیا۔ اپنی جگہ سے اٹھا اور آسمان کی دستکوں کو گھورتے ہوئے مٹھیاں بھیج کر بولا۔ ”اس خدا کی حفاظت میں دینے سے فائدہ، جس نے

میری ایک نہ سنی۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ دیتا ہے تو واپس نہیں لیتا، اس لئے صرف اسی سے مانگنا چاہئے مگر۔۔۔ تم دونوں کو میری ہزار فریادوں کے باوجود اس نے مجھ سے واپس لے لیا۔ پھر اب میں اس سے اور کیا مانگوں اور کس بھروسے پر مانگوں؟ اور راجیہ۔۔۔ پیارگی نے اچانک اسے پھر اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس کے چہرے پر خنزاں نے بال کھول دیئے۔ خشک اور ویران آنکھوں میں درد کے کانٹے چھین دیئے لگے۔“ میں اب تم دونوں کے بغیر جی کر کروں گا بھی کیا! کیا کروں گا؟“ اس کی آواز ٹوٹ گئی۔

اس کا سر جھکا اور ایک ٹک وہ راجیہ کو دیکھنے لگا۔ نچلا ہونٹ دانتوں تلے اس زور سے دبایا کہ خون رس پڑا مگر اسے اس اذیت کا احساس ہی نہ ہوا۔ ”کاش۔ کوئی ایسا طریقہ ہوتا راجیہ۔ کوئی ایسا راستہ ہوتا جس پر چل کر میں تمہیں اس سونے پن اس ابدی خاموشی سے چھڑا لیتا۔ تمہاری رکی ہوئی سانسون کو زندگی سے جوڑ دیتا۔ کاش۔۔۔“ وہ راجیہ پر جھک گیا۔

”سنو راجیہ۔ میں نہیں جانتا۔ ابھی میرے اور تمہارے درمیان فرقت کی دیوار کتنی دیر تک حائل رہے گی۔“ وہ اسے والہانہ نہکتے ہوئے بولا۔ ”مگر میں چاہوں گا کہ یہ جدائی جتنی جلدی ہو سکے، ختم ہو جائے۔ کانٹوں کے بستر پر نیند آتی ہے نہ زندگی جلد گزرتی ہے راجیہ۔ اور میری تو پوری آنے والے زندگی کا سنوں کا بستر بن گئی ہے۔ تمہارے بغیر اب میں پل پل جیوں گا، پل پل مروں گا۔ میں نے تمہیں بے وفا کہا راجیہ۔ غلط کہا میں نے۔ تم بے وفا نہیں ہو، مجبور ہو۔ اپنے اس خدا کے سامنے مجبور ہو، جس کے سامنے میں بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ تم نے کبھی نہ چاہا ہو گا کہ مجھے یوں تو چھوڑ کر چلی جاؤ مگر اس کے حکم کے آگے بے بس ہو گئی ہوگی۔ میں اس کے سامنے سر سجدو دگر کڑا تار ہا۔ اسے صدیوں پر محیط پوری رات پکارتا رہا مگر اس نے میری ایک نہ سنی۔ جیسے میں اس کے سامنے بے مایہ ہوں راجیہ ویسے ہی تم بھی لاچار ہو۔ بے وفا تو تب ہو تیں جب رک سکتیں اور نہ رکتیں۔ وہ جو بڑا ہے۔ بے نیاز ہے۔ ہم جیسے ناچیز اس کے کھلونے ہیں جن سے وہ کھیلتا ہے۔ توڑ دیتا ہے۔۔۔ اور کیسی عجیب بات ہے راجیہ کہ جوڑنے کے لئے اس نے محشر کا میدان انتخاب کر رکھا ہے۔ اس وقفے میں وہ ہم کھلونوں کی تڑپ، اذیت، جلن اور فراق کا تماشا دیکھتا ہے۔ جو زیادہ اچھا رکھ کر لے اسے انعام دینے کا وعدہ کر لیتا ہے۔ جو مجھ جیسے یقین کے ماروں کی طرح اپنی بات پراڑ جائے، ناکامی کا طوق اس کے گلے میں ڈال دیتا ہے۔ میں اس کا وہ کھلونا ہوں راجیہ جسے اس نے چابی بھر کر اپنی رضا کے فرش پر چھوڑ دیا مگر اس پر اعتماد اور اپنی دعا کی قبولیت کے یقین نے مجھے رضا کی منزل سے پہلے نامرادی کے پڑاؤ پر روک لیا۔ میں اس پڑاؤ پر کب تک رکا رہوں گا؟ میں خود نہیں جانتا۔ اس لئے کہ ابھی تک میں اس کے فرمائے ہوئے کسی ایک قول کا بھی حتمی مطلب نہیں سمجھ سکا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ جو کہے اس کا مطلب کچھ اور نکلے۔ سچے دل سے مانگی ہوئی دعا اگر وہ قبول کرنے کا دعویٰ کرتا ہے تو تم دونوں کے لئے میری وہ دعائیں قبول کیوں نہ ہوئیں جو

گچی طلب کے دوش پر چو پروا تھیں۔ نہیں راجیہ نہیں۔ اس نے میرا مان توڑ دیا۔ مجھے اپنے گھر سے خالی ہاتھ لوٹا دیا۔ بلکہ جو میرے دامن میں تھا وہ بھی چھین لیا۔ اب میں اس سے کچھ بھی مانگنے کا حوصلہ خود میں نہیں پاتا اور تم دونوں کے بعد تو مانگنے کو رہا بھی کچھ نہیں۔۔۔ تو بس۔۔۔ آج تم دونوں کو اس کے سپرد کر کے میں اس سے اپنا ہر ناطہ توڑ لوں گا۔ کوشش کروں گا کہ اسے اب کوئی زحمت نہ دوں۔ اس کی دی ہوئی بات کی زندگی اسی کی عطا کردہ اذیت اور دکھ کے صحرائیں برہنہ پا چلتے ہوئے گزاردوں۔“

اس کے لہجے میں عجیب سی وحشت ابھر آئی۔

”لوگ کہتے ہیں مجھے رونا چاہئے ورنہ میرا دل غم سے پھٹ جائے گا۔“ جنونیوں کے سے انداز میں وہ ہولے سے یوں ہنسا جیسے چیخوں پر پردہ ڈال رہا ہو۔ ”پلگے ہیں۔ نہیں جانتے کہ میں نے سارے آنسو اس قادر مطلق کے گھر میں اس کے سامنے ماتھا رکھتے ہوئے بہا دیئے۔ کوئی ایک آنسو بھی بچا ہوتا تو میں تمہاری نذر ضرور کرتا راجیہ۔ مجھے معاف کر دینا۔۔۔ اور جنت! میری جان! تم بھی اپنے پاپا سے یہ شکوہ کبھی نہ کرنا کہ اس نے تم سے جدائی کے زخم پر اشکوں کا مرہم نہ رکھا۔ آنسو تو وہ انمول موتی ہوتے ہیں سو ہنا! جو خوشی اور غم دونوں موقعوں پر لٹائے جاتے ہیں۔ میں نے سب کے سب اپنے اور تمہارے خالق کے حضور پچھا اور کر دیئے کہ وہ مجھے خوشی بخش دے غم سے بچا لے مگر۔۔۔“ اس نے بڑی خشکی سے سرنگی میں ہلایا۔ ”اس نے میرے آنسو قبول ہی نہیں کئے۔ میں اب تک سمجھ نہیں پایا کہ میری دعا، میری طلب میری فغاں میرے آنسوؤں میں کہاں کھوٹ تھا کہ سب کچھ اس کے حضور نا قبول ہو گیا۔“ ایک آہ بھر کر وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔

”میں اپنے پیاروں کو تیرے حوالے کرنے کے لئے آ رہا ہوں۔“ اس نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”ان معصوموں کو سنبھال رکھنا۔ یہ کل بھی تیرے تھے۔ آج بھی تیرے ہیں۔ میں نے کبھی ان پر اپنا حق نہیں جتایا مگر تو نے ان کو مجھ سے اس طرح کیوں چھین لیا، اس کا جواب مجھے اب تک نہیں ملا۔“ کہہ کر اس نے آنکھیں راجیہ کے چہرے پر جمادیں۔ کتنی ہی دیر وہ اس تلخ چہرے کو دل میں اتارتا رہا جو کل تک اس کی دھڑکنوں کا باعث تھا۔ اس کے لئے پھول کی طرح کھلا رہتا تھا۔ اس کے نام پر سانس لیتا تھا۔

پھر آہستہ آہستہ وہ جھکا۔

اس کے سر دلوں نے جنت۔۔۔ اپنی معصوم بیٹی کی پیشانی کا بوسہ لیا۔

تب اس نے راجیہ کے منکراتے ہوئے چہرے کو نگاہوں کے احاطے میں لے لیا۔ چند لمحے اسے والہانہ دیکھتے رہنے کے بعد اس نے باری باری اس کے دونوں رخساروں پر پیار کر لیا۔ اس کی پیشانی کو چوم اور بے اختیار اس کے ہونٹوں پر اپنے لرزتے ہونٹ رکھ دیئے۔

ایک طویل مہر محبت ثابت کرنے کے بعد جب اس نے سراٹھایا تو اس کے چہرے پر عجیب سا اطمینان، سکون اور ٹھہراؤ جنم لے چکا تھا۔

”الوداع راجیہ۔ میری محبت! الوداع جنت! میری کائنات! الوداع۔“

کہتے ہوئے وہ اٹنے پاؤں پیچھے ہٹا اور دروازے تک آ گیا۔ اب راجیہ اور جنت کے چہرے اس کی نظروں کے احاطے میں نہ رہے تھے۔ ایک سرد آہ اس کے لبوں پر چلی اور اس کی نظروں کے تعاقب میں آسمان کی وسعتوں میں گم ہو گئی۔

پلٹ کر اس نے دروازہ کھولا۔ مونس مضطرب سا اس کے سامنے کھڑا تھا۔ رزاتی کو بخیریت دیکھ کر اس کے چہرے پر اطمینان پھیل گیا۔ آنکھوں میں ناجتنی اندیشوں بھری وحشت دم توڑ گئی۔

”بی بی سے کہو۔ سب لوگ آخری دیدار کر لیں۔“ رزاتی نے مونس کی متورم آنکھوں میں دیکھا۔

مونس برداشت نہ کر سکا اور بے اختیار رزاتی کے سینے سے لگ گیا۔ اسے باہوں میں بھر لیا اور خود سبک پڑا۔ رزاتی کسی بے جان پتھر کی طرح اس کے بازوؤں کے گھیرے میں خاموش کھڑا تھا۔ یوں جیسے ہر قسم کے جذبات سے اس کا رشتہ ختم ہو گیا ہو۔

☆=====☆

راجیہ اور جنت رزاتی کے کندھوں پر اپنی ادبی آرام گاہ تک آئیں۔ اپنے ہاتھوں ان دونوں کو پاس پاس سپرد خاک کرنے کے بعد اس نے دونوں کی قبروں پر پھول چڑھائے۔ لوگوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو اس نے بھی ایسا ہی کیا۔ قاری خادم حسین دعا کراتے رہے۔ لوگ آمین آمین کی لرزتی صداؤں میں اپنے معبود کی قبولیت کو پکارتے رہے مگر رزاتی کے ہونٹ بے حس و حرکت رہے۔

مونس اس کے پہلو میں کھڑا سب کچھ دیکھتا رہا۔ اکثریت کی آنکھیں اب بھی نم تھیں۔ رزاتی اب بھی بے غم تھا۔

قبرستان سے باہر آ کر ایک بار پھر دعا کی گئی۔ دعا سے فارغ ہوئے تو مونس نے قاری خادم حسین کے استفسار پر رزاتی کی طرف رجوع کیا۔

”کل دعائے خیر کہاں اور کس وقت رکھی جائے رزاتی؟“

”مسجد میں۔ صبح فجر کے بعد۔“ رزاتی جیسے پہلے ہی فیصلہ کئے بیٹھا تھا۔

”اتنی صبح؟“ مونس جھجکا۔

”ہاں۔ اور اعلان کر دو کہ کوئی غیر حاضر نہ رہے۔ یہ میری خواہش ہے!“

”ٹھیک ہے۔“ مونس نے اس سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور قاری خادم حسین کی طرف بڑھ

گیا۔ انہوں نے رزاتی کے کہنے کے مطابق اعلان کر دیا کہ کل گاؤں کی اکلوتی مسجد میں نماز فجر کے بعد راجیہ اور جنت کے لئے دعائے خیر ہوگی اور ہر ایک کا وہاں آنا لازم ٹھہرا ہے۔

لوگوں نے سنا، پلے باندھا اور رخصت ہونے لگے۔ جو قاری اور مونس کے ساتھ واپس جانا چاہتے تھے وہ رے کر رہے۔

”تم اب کدھر جا رہے ہو؟“ مونس نے رزاتی کو واپس قبرستان کے اندر جاتے دیکھ کر جلدی سے اسے جالیا۔

”ابھی لوٹ آؤں گا۔ تم لوگ جاؤ۔“ وہ آگے بڑھ گیا۔

”رزاتی۔ رات کا وقت ہے۔ قبرستان میں تم اکیلے۔۔۔“ مونس نے اسے روکنا چاہا۔

”میں نے تم سے کہا تھا مونس۔ اب یہ پوری دنیا میرے لئے قبرستان ہے اور پھر میں اپنی راجیہ اور جنت کے پاس جا رہا ہوں۔ خوف کس بات کا؟“

”فاق بابو۔“ قاری خادم حسین نے دخل دیتے ہوئے کہا۔ ”ابھی آپ کا واپس ان کی قبروں پر جانا مناسب نہیں۔ یہ وقت قبر میں نکیرین کی آمد کا ہوتا ہے۔ ہمیں اس وقت لوٹ جانا چاہئے۔ صبح آپ جس وقت چاہے آجائے گا۔“

رزاتی نے سنا اور کوئی ضد نہ کی۔ خاموشی سے پلٹ آیا۔ سب لوگوں کے ساتھ وہ پیرل جویلی کی طرف چل پڑا۔

”پنڈت لوگ پُرسہ کے لئے آنا چاہتے ہیں۔“ مونس نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

”کب؟“ وہ سر جھکائے چلتا رہا۔

”جب تم اجازت دو۔“

”کل دوپہر کے بعد۔“

”ٹھیک ہے۔ میں کہہ دوں گا۔“ مونس بولا اور خاموشی ان کے عقب میں آتے لوگوں کے قدموں کی ٹلی جلی آوازوں سے مجروح ہونے لگی۔

☆=====☆

لاڈلے مہمان کے آنے پر ہی کھولا جاتا۔ مندر میں جہاں بت رکھے گئے تھے ان کے بائیں ہاتھ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی جہاں پنڈت آرام کرنے کے لئے اکثر جا لیتا۔

مندر کے عقب میں تقریباً تین فرلانگ دور ایک شمشان گھاٹ شروع سے موجود تھا جہاں کبھی کبھار مردے کی چتا جلانے کے لئے ہی لوگ باگ جاتے۔ یہاں لکڑیاں، تیل کے پیسے اور استھیاں اٹھانے کے لئے کچی مٹی کے ہانڈی نما برتن ایک طرف جمع رہتے جنہیں کسی چور سے کوئی خطرہ نہ تھا۔

عبدالرزاق صاحب کی وفات کے بعد جب فائق رزاقی نے ان کی جگہ گاؤں کا انتظام پوری طرح ہاتھ میں لیا تو ایک بار پنڈت گردھاری لال اپنے ساتھ دس ہندو مردوں کو لے کر اس غرض سے رزاقی کے درشن کرنے آیا کہ ان لوگوں پر عبدالرزاق صاحب کی طرف سے عائد دونوں پابندیوں کو ہٹایا جائے مگر رزاقی نے بڑی سختی سے انکار کر دیا اور آئندہ کے لئے انہیں اس موضوع پر کوئی بات کرنے سے بھی روک دیا۔

”ہمیں کھاس موقعوں پر ہی سکھ بجانے کی اجازت دے دیں مہاراج۔“ پنڈت نے رزاقی کی طرف متوجہ نظروں سے دیکھ کر کہا تھا۔

”کن خاص موقعوں پر؟“ رزاقی کے بجائے مونس نے پوچھا۔

”دیوالی۔ ہوئی۔۔۔“

”ہرگز نہیں۔“ رزاقی اسی درستی سے بولا ”اس اجازت کا مطلب یہ ہوگا کہ دیوار میں نقب لگانے کے لئے ایک اینٹ اکھاڑ لینے دی جائے۔ کل کو دوسرا مطالبہ پھر تیسری التجا اور بالآخر مندر کی تعمیر نہیں پنڈت جی۔ آپ جس طرح اپنے خاص تہوار کبھی یہاں اور کبھی سرحد پار جا کر اپنے عزیزوں کے رشتے داروں کے ساتھ مناتے ہیں وہی طریقہ ٹھیک ہے۔ اسے بدلنے کی خواہش اپنے دل سے ختم کر دیجئے۔“

گردھاری لال نے مایوس ہو کر سر جھکایا اور اپنے آدمیوں کے ساتھ لوٹ گیا۔ تب سے اب تک کبھی دوبارہ اس موضوع پر بحث ہوئی نہ کوئی اور شوشہ چھوڑا گیا۔ ان لوگوں کو یقین ہو گیا کہ عبدالرزاق صاحب کی طرح فائق رزاقی بھی اس مسئلے پر سمجھوتے کی زبان سے نا آشنا ہے۔ سرحد پار جانے یا وہاں سے ان کے رشتے داروں کے یہاں آنے پر کوئی پابندی نہ تھی مگر یہ سب قانون کے حدود میں رہ کر ہوتا تھا۔ یہ ممکن ہی نہ تھا کہ خالق نگر کی طرف سے کوئی غیر مسلم یا مسلمان غیر قانونی طور پر سرحد پار کر کے ادھر چلا جائے یا وہاں سے ادھر آجائے۔ ریجنرز کے ساتھ خالق نگر کے مالک یعنی فائق رزاقی کی طرف سے بھی رضا کاروں کی ایک خاص تعداد کنٹرول لائن پر رات دن ڈیوٹی دیتی تھی۔ ان کی خواہش خالق نگر کے ذمے تھیں۔ شوکت نورے اور غلام حسین جیسے کتنے ہی لوگ تھے جو انتہائی خفیہ طریقے سے عبدالرزاق

خالق نگر ایک سرحدی گاؤں تھا۔ اس میں آزادی سے پہلے کچھ ہندو گھرانے آباد تھے جنہوں نے گاؤں کے مغربی کونے میں آٹھ دس گھروں پر مشتمل اپنی ایک الگ ”ہندو بستی“ بسا رکھی تھی جو اب چالیس پچاس مکانوں پر محیط ہو چکی تھی۔ فائق کے والد عبدالرزاق صاحب نے فائق کے دادا عبدالخالق کے بعد جب خالق نگر کا انتظام و انصرام سنبھالا تو اس میں کسی قسم کی تبدیلی سے مکمل گریز کیا۔ وہ ایک انتہائی دیندار اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ انہوں نے ان ہندو گھرانوں کے ساتھ ہمیشہ مربیانہ سلوک کیا۔ اپنی زندگی میں انہوں نے کبھی ان لوگوں سے کبھی نہ کوئی زیادتی کی نہ ہونے دی۔ ان ہندوؤں کو اپنے گھروں کے اندر رہ کر پوری مذہبی آزادی حاصل تھی۔ دیوالی اور دوسرے تہوار وہ اپنی حدود میں رہ کر کھلے دل سے مناتے مگر ان پر دیوبانڈیاں پہلے دن سے عائد تھیں۔

ایک تو وہ سکھ گھنٹے اور ناقوس نہیں بجا سکتے تھے۔

دوسرے ان کو گاؤں میں مندر بنانے کی اجازت نہ تھی۔

اپنی مذہبی رسومات کی ادائیگی کے لئے انہوں نے بستی کے شروع میں ایک مکان کو اندر سے مندر کی طرح سجایا تھا۔ وہیں اندر ہی رہ کر وہ اپنے پتھر کے بھگوانوں کی پوجا کرتے۔ اس نام نہاد مندر میں گردھاری لال نامی ایک پنڈت کو متعین کر دیا گیا۔ وہ مکان کے بڑے کمرے میں موجود شیو کالی اور درگا کے بتوں کے سامنے فرش پر دھونی رمائے بیٹھا رہتا۔ ہندو مرد عورتیں اور بچے وہاں آتے۔ پوجا کے نام پر اپنی رسومات ادا کرتے۔ پرشاد لیتے اور رخصت ہو جاتے۔ پنڈت کی عزت اور اہمیت وہاں کسی بھی مطلق العنان حاکم سے کم نہیں تھی۔ تقریباً دو سو ہندو مرد عورتوں کی وہ آبادی پنڈت کی رعایا جیسی تھی اور اس کے ہر حکم پر سر جھکانا ان سب کا دھرم۔

مندر نما مکان کے ساتھ تین چار کمروں کا ایک چھوٹا سا احاطہ تھا جہاں پنڈت گردھاری لال کے چیلے چائے پیتے رہتے تھے۔ یہیں پر بھارت سے مخصوص مواقع پر آنے والوں کے عارضی طور پر رہنے کا انتظام کیا جاتا۔ ان میں سے ایک کمرہ بڑے اہتمام سے سجایا گیا تھا جو کسی خاص اور اہم پنڈت پجاری یا

دھیرے سکوت چھا گیا۔

مونس اس کے کمرے کے دروازے تک آیا۔ دروازہ صرف بھڑا ہوا تھا۔ اس نے رک کر چند لمحوں تک کچھ سوچا پھر اندر آنے کا ارادہ ترک کر کے بی بی کی طرف چلا گیا جو دور نزدیک سے آئے ہوئے رشتے داروں کی شب بصری کے انتظامات سے فارغ ہو کر زنان خانے کے صحن میں چند بوڑھی عورتوں کے ہمراہ سو گوار بیٹھی تھی۔ اسے رزاقی کا بتا کر مونس حویلی سے نکل آیا۔

مونس کی اپنی رہائش گاہ اور آفس ایک ہی جگہ کے دو نام تھے۔ یہ بے حد خوبصورت اور جدید طرز تعمیر کا شاہکار ایک چھوٹی سی عمارت تھی جو حویلی کے ساتھ واقع تھی۔ یہاں اس کی ذاتی گاڑی ہر وقت اس کی خدمت کے لئے آنکھیں فرش راہ کئے موجود رہتی۔ رزاقی اور بی بی کے بارہا کہنے پر بھی وہ حویلی کے اندر رہنے پر راضی نہ ہوا تاہم اس کی رہائش گاہ اس طرح بنائی گئی کہ اسے حویلی میں آنے جانے کے لئے اندر ہی سے راستہ دے دیا گیا۔ اس طرح اس کی رہائش گاہ ایک طرح سے حویلی ہی میں واقع تھی۔ یہیں آفس نما ایک کمرے میں بیٹھ کر وہ زمینوں، مزارعوں، گاؤں اور قانونی و غیر قانونی معاملات سے نمٹتا تھا۔ جس معاملے کا رزاقی تک جانا ضروری ہوتا، ساتھ ہی واقع رزاقی کے آفس اور ملاقات کے مشرک کمرے میں صرف وہی معاملہ پہنچتا اور نہ نوے فیصد معاملات وہ خود ہی منڈالتا۔ نور نے غلام حسین اور شوکت جیسے وفادار ملازموں کا ساتھ اسے بے شمار الجھنوں سے بچائے لیکن بیحد معاون تھا۔ رزاقی نے کمرے کے دروازے پر مونس کے رکنے کی آہٹ سی تو فرش کو مسلسل روندتے قدم روک لئے۔ پھر جب تھوڑی دیر بعد مونس اندر آنے کی بجائے لوٹ گیا تو دوبارہ اس کے قدم حرکت میں آ گئے۔ اسے اپنا خوبصورت اور آرام دہ بستر راجیہ کے بغیر جنت کی عدم موجودگی میں آگ جدائی کی نہ بھنڈوالی آگ سے گھر انظر آ رہا تھا۔

کبھی تھک کر وہ کرسی پر بیٹھ جاتا۔ کبھی دیوار سے ٹیک لگا کر ویران ویران آنکھوں سے بستر کو گھورنے لگتا جس پر آج کوئی اس کا منتظر نہ تھا۔ کبھی باتھ روم میں جا کر اپنی جلتی ہوئی آنکھوں پر سرد پانی کے چھینٹے مارتا مگر ایک پل چین نہ تھا۔ ایک لمحہ قرار نہ تھا۔ اس کے دل و دماغ پر گزشتہ چوبیس گھنٹوں کا بوجھ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ سر پھٹنے کو آ گیا۔ کپنیاں چننے لگیں۔ جسم دھکنے لگا مگر بے قراری تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی۔ بے چینی تھی کہ آخری حدوں کو چھو رہی تھی۔ اضطراب تھا کہ دل کو کچھ کے لگا رہا تھا۔ ایک کشمکش تھی جو اندر ہی اندر اسے نوج رہی تھی۔

ایک سوچ تھی جو اس کے دل و دماغ کو آتش بیل کی طرح پلیٹ میں لے رہی تھی۔

ایک ناراضگی تھی جو اس کے اور اس کے خالق کے درمیان دیوار کھڑی کرنے کے جواز ڈھونڈ رہی تھی۔

صاحب کے زمانے ہی سے گاؤں بھر پر نظر رکھتے اور وہاں آنے جانے والوں کو پرکھتے تھے تاکہ حکومت کی طرف سے جو مذہب داریاں برساہارس سے خالق نگر کے مالکوں پر ڈالی گئی تھیں ان پر کسی شکایت غیر ذمہ داری یا تاویل کا بہ نہ لگ پائے۔

خالق نگر میں کوئی پولیس چوکی نہ تھی۔ عبدالرزاق صاحب کے آباؤ اجداد کے زمانے سے یہاں ایک مخصوص نظام کا رفرما تھا۔ معمولی جھگڑے سے لے کر اغواء اور قتل تک کے فیصلے حویلی میں ہوتے تھے۔ خالق نگر کا ہر دور کا مالک انصاف کی روایات پر پورا اترتے ہوئے ہر فیصلہ خود کرنے کا پابند تھا اور اس کے لئے حکومت سے مدد لینے یا وہاں تھا نہ چوکی قائم کرنے پر کبھی کوئی سمجھوتہ نہ ہو پایا تھا۔ پھر حکومت کو بھی اس پر اعتراض اس لئے نہ تھا کہ وہاں کبھی کوئی ایسی قابل ذکر واردات ہوئی ہی نہ تھی جو پولیس کے لئے دراندازی کی متقاضی ہوتی اور اگر کبھی ایسا ہوا بھی تو ایسے سنگین مقدمے کا فیصلہ کر کے مجرم کو خالق نگر سے پانچ کلومیٹر باہر جی ٹی روڈ پر واقع پولیس چوکی پر پہنچا دیا جاتا۔ پھر اس کے مقدمے کے اندراج سے سزائے مرگ پر خالق نگر کے مالک کی رضامندی حاصل کرنے کے بعد ملکی قانون کے ذریعے طے پاتے۔ اگر خالق نگر کوئی مجرم مفروہ ہو کر یا کسی اور چکر میں پولیس کے چھتے چڑھ جاتا تو وہ اپنی کارروائی سے پہلے اسے خالق نگر کے مالکوں کی حویلی میں لانے کے پابند تھے۔ حویلی سے جو فیصلہ صادر ہوتا اس کے مطابق وہ اسے وہاں چھوڑ جانے یا ساتھ لے جانے کے مجاز قرار پاتے۔

اچانک مونس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ وہ حویلی کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ اندر سے عورتوں کے رونے کی آوازیں ایک بار بار پوری شدت سے ابھریں۔ ان میں بی بی کے بکین سب سے نمایاں تھے۔ حویلی کے باہر وسیع میدان میں کھانے کا انتظام تھا۔ کسی گاؤں والے کو کھانا کھائے بغیر گھر جانے کی اجازت تھی نہ جرات۔ اس لئے مرد تو کھانے کے پنڈال کی طرف چلے گئے۔ رزاقی مردان خانے میں اور مونس شوکت اور نورے کے ساتھ قاری خادم حسین کی ہمراہی میں کھانے کے انتظام کا جائزہ لینے کے لئے اس طرف بڑھ گیا جہاں سعید سلمانی دیکس چڑھائے کفگیر چلا رہا تھا۔

☆=====☆

ہجر کی رات کیا ہوتی ہے؟ فراق کس بلا کا نام ہے اور کائناتوں کا بستر کسے کہتے ہیں؟ رزاقی کو ان کیفیات کا ادراک آج پہلی بار ہوا۔

راجیہ اور جنت کو سپرد خاک کرنے کے بعد جب وہ حویلی لوٹا تو صرف چند لمحے مردان خانے میں رکا۔ پھر جو بی بی مونس وہاں آیا اس نے سب کچھ اسے سنہالنے کا کہہ کر اپنے کمرے کی راہ لی۔ آدھی رات تک وہ باہر لوگوں کے آنے جانے، بیٹھنے اٹھنے اور باتیں کرنے کی آوازیں سنتا رہا۔ پھر دھیرے

ایک غصہ تھا جو ساری مثبت دلیلوں کو بھسم کرنے پر تیار ہوا تھا۔

اور۔۔۔

یہ سب صرف اس لئے اس کے خیالوں پر شب خون مار رہے تھے کہ اسے پہنچنے والی تکلیف اپنی زندگی کی سب سے بڑی اور دوسروں کی ہر تکلیف سے سوا محسوس ہو رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا اس کے ساتھ اس کے اللہ نے اچھا نہیں کیا۔ اس کی پکار اس کی دعاؤں اس کی التجاؤں فریادوں آہوں اور غصاں کو بے ثمر کر کے اس کے بھروسے یقین اور اعتماد کو ایسی ٹھیس پہنچائی تھی جس نے اس کے عقائد کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔

اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ جس چنگی اور راسخ العقیدگی کے ساتھ اللہ کے حضور گڑ گڑایا تھا اس کا جواب نفی، انکار یا نظر انداز کر دینے کی صورت میں ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ہونا ہی نہیں چاہئے تھا۔ اس کا دکھ کوئی انوکھا دکھ نہیں تھا۔ اس کا غم دنیا کا سب سے بڑا غم نہیں تھا۔ اس کے ساتھ پیش آنے والا سانحہ اپنی نوعیت کا واحد سانحہ نہیں تھا مگر اسے لگ رہا تھا جیسے اللہ نے اسے تہی دامان لوٹا کر اسے بھری کائنات میں اکیلا کر دیا ہے۔ تنہا کر دیا ہے۔ وہ مسلسل اپنے خیالات کی تہوں کو ٹٹولتے ہوئے وہ وہ تلاش کر رہا تھا جو اس کی دعاؤں کے لئے ناقبولیت کا باعث بن گئی تھی مگر اسے اپنی کوئی خطا، کوئی غلطی ایسی نہ مل رہی تھی جو اسے مبینہ سلوک کا سزاوار گردانتی۔ وہ اپنے خالق و مالک کی رضا کے بارے میں سوچنے پر تیار ہی نہ تھا۔ وہ تو صرف اس بحث میں الجھا ہوا تھا کہ جب وہ اپنے رب کی رضا پر راضی رہنے کی منزل میں تھا تو نہیں، تو زبردستی وہ اسے اس راستے کا مسافر کیوں بنانا چاہ رہا ہے؟ اپنے دکھ کے شدید تر احساس نے اسے ایک طرف سوچ کا شکار کر دیا تھا۔ اسے اپنا وجود ایک ایسے مظلوم انسان کا وجود لگ رہا تھا جس پر کوہ غم ٹوٹ گرنے کو تھا۔ اس عالم میں وہ اپنے خدا کو پکار پکار کر بے حال ہو گیا مگر اس کے مالک نے اس کی ایک نہ سنی، کوہ الم اس پر گر اور وہ اس کے نیچے پس کر رہ گیا۔

”سب وہم ہے۔ سب گمان ہے۔ سچے دل کی پکار بھی اگر اسے اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتی تو پھر اور کون سی کسوٹی ہے جو اس کی رحمت نے بندے کو پرکھنے کے لئے مقرر کر رکھی ہے؟“ وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا اور کھڑکی میں جا کھڑ ہوا۔

باہر اندھیرے کا کھل راج تھا۔ دور دور تک کھیتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ آسمان پر ستارے غنما رہے تھے۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔

اس کی آنکھیں دور دکھائی دیتی گاؤں کی اکوٹی، مرکزی اور جامع مسجد کی خوبصورت عمارت پر جم گئیں جس کے بلند و بالا مینار اس خالق و مالک کی عظمت و بزرگی کے شاہد تھے۔ جس سے شکوہ و شکایت کرتے کرتے رزاقی کے احساسات کا گلا خشک ہو گیا تھا۔

اس کے والد عبدالرزاق صاحب نے یہ عظیم الشان مسجد بڑے چاؤ سے بنوائی تھی اور اس کی خدمت کے لئے جن کرامات ایسے عالم فاضل اور درویش منش انسان کو مقرر کیا تھا جو آگے اور دین فہمی کے ساتھ ساتھ تصوف میں بھی قدم رکھتے تھے۔ حافظ قاری خادم حسین کے اہل و عیال ان کے آبائی شہر و ہاڑی میں تھے جہاں ان کی کچھ زمین بھی موجود تھی۔ وہ مہینے میں ایک آدھ چکر گھر لگا آیا کرتے تھے۔ عبدالرزاق صاحب کی زندگی ہی سے وہ اس مسجد کے خطیب، امام اور منتظم کے فرائض سرانجام دے رہے تھے اور مسجد کے ساتھ بے حد نصیب رہائش گاہ میں مقیم تھے۔ ان کے ساتھ چالیس سالہ راشد ملتان موذن اور تیس سالہ نذیر مسجد کے خادم کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ انہیں قاری خادم حسین کے گھر کے ساتھ بنے الگ الگ کمرے میں رہنے کی سہولت میسر تھی۔

اچانک آسمان پر کوئی تار اٹھنا۔

چونک کر رزاقی نے روشنی کے اس گولے کو دیکھا جو دوسرے ہی پل آسمان سے زمین کی طرف گرتے ہوئے معدوم ہو گیا۔ اسے خیال آیا کہ دینی روایات کے مطابق یہ آگ کا وہ کوڑا ہوتا ہے جو شیطان کو اس وقت رسید کیا جاتا ہے جب وہ آسمان کے دروازوں کے پاس کن سونیاں لینے کے لئے آن موجود ہوتا ہے۔ اسے اختیار اس کے دماغ میں ایک خیال آدھکا۔

”ابلیس نے بھی تو اپنے رب کی محبت میں آدم کو مجبور کرنے سے انکار کیا تھا مگر خدا نے اس کی محبت کو ہیبت نہ دی۔ اپنے حکم کی تعمیل کو لازم گردانے ہوئے اسے ماندہ درگاہ قرار دے کر اپنی حدود و کرم سے نکال دیا۔ کیا ابلیس واقعی اس سزا کا مستحق تھا؟ اگر وہ اللہ کے حکم پر آدم کو مجبور نہ کرتا تو اس کے لئے سب اچھا ہی اچھا تھا مگر اپنے جذبہ صادق کے باوجود وہ صرف اس لئے ملعون ہو گیا کہ اس نے اپنے رب کی نافرمانی کی۔ اس کی رضا پر سر نہ جھکایا۔ میں بھی تو اسی جرم کا ارتکاب کر رہا ہوں۔ میں بھی تو اس کی رضا پر سر جھکانے کے بجائے اس سے گلے شکوے کرنے میں مصروف ہوں۔“ اس کے دل نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”نہیں نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔“ جذبات کی آنچ ایک دم تیز ہو گئی۔ دکھ کا الاؤ شدت سے دہک اٹھا۔ ”ابلیس اس کے مقرئین میں سے تھا۔ نیک تھا۔ فرشتوں کا استاد تھا۔ اس کو آزمائش میں ڈالا گیا تھا۔ وہ بہک گیا۔ ملعون ٹھہرا۔ میں تو ایک گنہگار انسان ہوں۔ کبھی خود کو اس کی آزمائش اور امتحان کے قابل نہیں سمجھا۔ یہ میری آزمائش نہیں تھی یہ اس اُن جانے نا کردہ گناہ کی وہ سزا ہے جو ابھی تک میرے فہم سے بالاتر ہے۔ میں تو اپنی سچی پکار سچی طلب کے جواب میں بے ثمر رہنے کی وجہ جانتا چاہتا ہوں اور جب تک مجھے اپنے سوال کا جواب اپنی سزا کا جواز اپنے دکھ کا باعث نہیں مل جاتا، میں اس کی رحمت اس کی بخشش اس کے شہرگ سے قریب ہونے کے احساس سے نا بلند رہوں گا۔ جب وہ کہتا ہے کہ دعا قضا

فجر کی نماز کے بعد راجیہ اور جنت کے لئے دعائے خیر و مغفرت ہو چکی تو گاؤں بھر کے لوگوں نے مسجد سے رخصت ہونا چاہا۔ رزاتی اور مونس سب سے اگلی صف میں تھے۔ آہستہ سے رزاتی اپنی جگہ سے اٹھا اور لوگوں کی طرف رخ کر کے کھڑا ہو گیا۔ اٹھتے اور جانے کے لئے پر تو لے لوگ اپنی اپنی جگہ ٹھہر کر اس کی جانب دیکھنے لگے۔ قاری خادم حسین صاحب اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے رزاتی کی طرف متوجہ ہوئے۔

”سب لوگ مسجد سے باہر کیسے۔ میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“ کہتے ہوئے رزاتی پلٹا اور قاری خادم حسین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ”میں چاہتا ہوں قاری صاحب کہ آپ بھی باہر میرے ساتھ موجود ہیں۔“

”ضرور ضرور رزاتی بابو۔ چلئے۔۔۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور راشد اور نذیر کے ہمراہ دوسرے لوگوں کے پیچھے باہر جانے کے لئے چل پڑے۔

”بات کیا ہے؟“ مونس نے رزاتی کا ہاتھ تھام لیا۔ ”کیا کہنا چاہتے ہو گاؤں والوں سے؟“ ”ابھی سب کے سامنے کہوں گا تو تم بھی سن لینا۔“ رزاتی نے سپاٹ لہجے میں کہا تو مونس کا دل دھڑک اٹھا۔ رزاتی کے بولنے کا انداز عجیب سا تھا۔

”پھر بھی کچھ پتہ تو چلے۔۔۔“

”آؤ۔ باہر چلیں۔“ رزاتی نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا اور اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ ”میرے قریب رہنا مونس۔ اس وقت مجھے تمہاری بہت ضرورت ہے۔“

”رزاتی۔۔۔“ مونس نے خالی ہوتی مسجد کے صحن پر ایک نگاہ دوڑائی۔ ”نجانے کیوں میرا دل گھبرا رہا ہے یا۔۔۔“

”ارے نہیں مونس۔“ رزاتی نے جیسے اسے تسلی دی۔ ”تم اپنے خدا سے دعا کرو کہ جو بھی ہوا چھا ہی ہو۔ وہ تمہاری ضرورتیں لے گا۔“

کوٹال دیتی ہے تو مجھے بتائے کہ میری دعائیں کہاں نقص تھا؟ کہاں جھول تھا؟ کہاں کی تھی جو قصا کے تیر کا رخ نہ موڑ سکی۔ وہ اپنے فرمان کے خلاف کیسے کر سکتا ہے؟ اگر مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے تو کیوں؟ اس کیوں کا جواب مل جانے تک مجھے ناراضگی اور رخ پھیر لینے کا حق ہے اور اس حق کو استعمال کرنا میرے لئے یوں بھی لازم ہے کہ میرے دامن میں ایسا کچھ باقی ہی نہیں رہا جس کے لئے میں اس کی طرف رجوع کروں۔ کس کے لئے اس سے کیا مانگوں؟ بس۔۔۔ تو فیصلہ ہو گیا کہ جس طرح وہ تنہا ہے اسی طرح آج سے میں بھی تنہا ہوں۔ تنہا اور اکیلا۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ خالق ہے مالک ہے۔ قادر مطلق ہے۔ اپنی مرضی کا مالک ہے اور میں۔۔۔ مجبور ہوں، مقہور ہوں، مجبور ہوں۔ بے بس ہوں بے بس ہوں بے مایہ ہوں۔ اس نے مجھے بہت کچھ دے کر بھی سب کچھ چھین لیا۔ اب میں اس سے کچھ نہ مانگ کر زندہ رہنے کی کوشش کروں گا۔ وہ سب کچھ ہے۔ میں کچھ بھی نہیں ہوں مگر دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کب تک میرے سوال کے جواب سے محروم رکھتا ہے۔ اگر مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا تو میں اس کے حضور ماتھا ٹیک کر معافی مانگ لوں گا اور تب تک۔۔۔“

اور اس ”تب تک“ سے آگے اس کے خیالات کی رو بہک گئی۔ اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ اس کے دل و دماغ پر فانی گر گیا۔ سوچوں نے حیرت سے دانتوں میں الٹی داب لی۔ رگوں میں دوڑتے لہو میں بے یقینی کی سرپھر سرایت کر گئی۔ ایک ناقابلِ توجیہ فیصلے کے اس لمحے نے سر پھین لیا۔ وقت نے لرزہ بر اندام ہو کر منہ چھپا لیا۔

اسی وقت مسجد سے ”اللہ اکبر“ کی صدا بلند ہوئی۔

وہ چونکا نہیں۔ پتھر کا بت بنا خاموشی سے اذان سنتا رہا۔

پھر جب ”لا الہ الا اللہ“ کے الفاظ پر موزن نے اس ازلی وابدی دعوت صادق کی تکمیل کی تو بڑی عجیب نظروں سے رزاتی نے ایک بار پھر آسمان کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد مسجد پر نگاہ ڈالی۔ چند لمحے اسی عالم میں گزر گئے۔ تب اس نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کے پٹ بند کر دیے۔ چٹنی چڑھائی اور بڑے بڑے تلے قدموں سے چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

بستر کے پاس پڑی تپائی پر فریم شدہ تصویر میں راجیہ اور جنت جیسے اسے بڑی خوفزدہ نظروں سے باہر جاتا دیکھ رہی تھیں۔

☆=====☆=====☆

”یہ تم اپنے خدا اپنے خدا کی کیا رٹ لگائے ہوئے ہوکل سے۔ کیا وہ تمہارا خدا نہیں ہے؟“
مونس کے لہجے میں تلخی ابھر آئی۔

”ہے کیوں نہیں بھائی۔ ضرور ہے۔“ رزاتی نے نرمی سے جواب دیا۔ ”اس کا میرا خدا ہونا تو وہ روزِ اول سے طے ہے اور ابد لاۓ باد تک وہی میرا خالق و مالک اور معبود رہے گا۔ میں مشرک ہو رہا ہوں نہ کافر۔۔۔ تاہم مجھے اس کے ساتھ اپنا تعلق اب کیسا رکھنا ہے یہ میرا اور اس کا آپس کا معاملہ ہے۔ اس میں کوئی دخل نہ دے یہی بہتر ہے۔“

”رزاتی۔۔۔“ مونس نے کہنا چاہا۔

”آؤ۔ اچھا نہیں لگتا کہ سب لوگ باہر میرا انتظار کرتے رہیں اور میں یہاں تمہارے ساتھ کسی بے نتیجہ بحث میں الجھا رہوں۔“ رزاتی نے کہتے ہوئے سوچ بورد کی طرف قدم بڑھایا اور سارے سوچ آن کر دیے۔ مسجد اندر سے باہر تک روشنیوں سے جگمگاٹھی۔

”یہ کیا۔۔۔“ مونس نے حیرت سے کہنا چاہا مگر رزاتی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر مسجد کی کھڑکیاں بند کرنے لگا۔

”رزاتی۔۔۔“ مونس لپک کر اس کے قریب چلا آیا۔ ”یہ سب کام تمہارے کرنے کے نہیں ہیں اور یہ تم نے ساری مسجد کی لائسنس کیوں چلا دی؟“
”ابھی بتا دوں گا کیا تو ہے۔“ رزاتی نے اسے بازو سے تھما اور مسجد کے ہال سے باہر صحن میں چلا آیا۔ صحن کے پار مسجد کے بڑے دروازے کے پاس قاری خادم حسین راشد اور نذیر کے ساتھ کھڑے الجھی ہوئی نظروں سے رزاتی اور مونس کو اپنی طرف آتا دیکھ رہے تھے۔ وہ بھی یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ ساری مسجد کی لائسنس آن کیوں کر دی گئیں؟ اور رزاتی خود مسجد کی کھڑکیاں دروازے کیوں بند کر رہے؟ صحن پار کر کے رزاتی اور مونس نے جوتے پہنے اور دونوں قاری خادم حسین کے پاس آ کر دروازے کے باہر بیڑھیوں سے نیچے کھلے میدان میں سارے گاؤں کے مرد رزاتی کی آمد کے منتظر کھڑے تھے۔ کوئی ایک فرد بھی وہاں سے جانے کی جرات کر سکتا تھا نہ ہمت جب تک رزاتی انہیں اجازت نہ دے دیتا۔

”آئیے قاری صاحب۔“ رزاتی نے ان کا ہاتھ بڑی نرمی سے تھما اور دروازے سے باہر کھلی جگہ پر لے آیا۔ یہ تقریباً بارہ فٹ سطح حصہ تھا جس کے بعد نیچے جانے کے لئے سیڑھیاں شروع ہو جاتی تھیں۔ راشد اور نذیر رزاتی، مونس اور قاری صاحب سے ذرا پرے ہٹ گئے اور بڑی گہری نظروں سے رزاتی کی جانب دیکھنے لگے۔ رزاتی کے دائیں ہاتھ مونس اور بائیں طرف قاری صاحب کھڑے تھے۔ قاری صاحب کسی سوچ میں گم تھے جبکہ مونس اضطراب سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ رزاتی کیا

کہنا اور کرنا چاہتا ہے مگر اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ کوئی انہونی پیا ہونے کو ہے۔
چند لمحوں تک رزاتی خاموش کھڑا نیچے موجود جوم کو تکتا رہا۔ پھر اس نے ایک طویل گہری سانس لی اور ہاتھ سینے پر باندھ لئے۔

”خالق نگر والو!“ اس کی سپاٹ آواز ابھری تو سب لوگ ہمہ تن گوش ہو گئے۔ ان کی نظریں رزاتی کے چہرے پر جم گئیں اور دل اس کی آواز کے زیر و بم کے ساتھ دھڑکنے لگے۔

”میں کچھ زیادہ نہیں کہنا چاہتا۔“ رزاتی نے بڑی گھمبیر آواز میں کہنا شروع کیا۔ ”آپ سب لوگوں کو یہاں روکنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ میں اپنے ایک ذاتی فیصلے سے آپ لوگوں کو آگاہ کر دینا چاہتا ہوں۔ یہ فیصلہ میں نے خالق نگر کا پیشینہ مالک ہونے کے ناطے پورے ہوش و حواس میں رہ کر کیا ہے اور اس کے لئے جہاں میں کسی کو جواب دہ نہیں ہوں وہیں میں اس پر کسی قسم کے اعتراض، بحث یا فتوے کو قبول کرنے سے بھی قاصر ہوں۔“

وہ ایک پل کو رکا۔ قاری صاحب نے اس کی باتوں سے کچھ اخذ کرنا چاہا مگر یہ جاننے میں مونس کی طرح ناکام رہے کہ رزاتی کیا کہنے والا ہے۔ مونس نے مضطر بنا کر اپنے ایک پاؤں کا وزن دوسرے پاؤں پر منتقل کیا اور رزاتی کی جانب دیکھا جو اپنی بات دوبارہ شروع کر چکا تھا۔

”یہ عالیشان خانہ خدا۔۔۔“ رزاتی نے وہاں ہاتھ بلند کرتے ہوئے اپنے پیچھے موجود مسجد کی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ ”آپ سب جاننے ہیں کہ میرے والد مرحوم عبدالرزاق صاحب نے تعمیر کرایا تھا۔ ان کے بعد میں نے بھی اس گھر کی خدمت میں حتی الامکان کوئی غفلت نہیں برتی۔ اپنے خالق و مالک کے گھر کی یہ خدمت میرے لئے ایک سعادت تھی جسے میں بصد فخر بجالاتا رہا۔ چونکہ یہ مسجد میرے پڑھوں کی بنائی ہوئی ہے اس لئے اس پر کسی بھی دوسرے شخص سے پہلے اور کسی بھی دوسرے فرد سے زیادہ میرا حق فائق اور مسلم ہے۔ اپنے اس حق کا آزادانہ اور بااختیار استعمال کرتے ہوئے آج میں اس مسجد کا دروازہ اپنے ہاتھ سے آپ سب پر بند کرتا ہوں۔“

یہ کہہ کر رزاتی نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور پلٹ کر مسجد کا دروازہ بند کر دیا۔

ایک دم جیسے مجمعے کو سانپ سونگھ گیا۔ ان کی نگاہوں میں حیرت اور لیوں پر ارتعاش ظاہر کرتا تھا کہ وہ رزاتی کے اس عمل پر بھونچے رہ گئے ہیں۔ قاری خادم حسین اور راشد کے ساتھ نذیر بھی انگشت بدنداں کھڑے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے گھور رہے تھے۔۔۔ اور وہ گیا مونس۔۔۔ تو اسے جیسے اپنی سماعت پر یقین نہ رہا تھا۔ وہ ناقابل اعتبار نظروں سے رزاتی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ پھر جو نئی رزاتی مسجد کا دروازہ بند کر کے پلٹا وہ اس کی طرف لپکا۔

”پاگل ہو گئے ہو کیا؟“ اس نے رزاتی کے شانے تھام کر اسے پوری قوت سے جھنجھوڑ ڈالا۔

”میں اسی کے حکم اور رضا سے خالق نگر کا مالک ہوں قاری صاحب جو آپ کے ساتھ ساتھ میرا بھی خدا ہے۔ وہ اس گھر کا مالک ہے تو اس کا منتظم اس نے مجھے بنایا ہے اور میں اسے جب چاہوں کسی بھی معقول وجہ سے کچھ عرصے کے لئے یا ہمیشہ کے لئے لوگوں کی آمد و رفت سے مبرا قرار دے سکتا ہوں۔“

”مثلاً اس وقت کس معقول وجہ کے تحت اسے آپ لوگوں کے لئے ممنوع قرار دے رہے ہیں فائق بابو؟“ قاری صاحب نے چھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

”وقت آنے پر وہ وجہ بھی آپ پر عیاں ہو جائے گی قاری صاحب۔ فی الحال تو میں اس گاؤں میں اذان ہونے دوں گا نہ اس مسجد کا دروازہ کئی کے لئے کھلے گا۔“

”کیا؟“ قاری صاحب کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

”رزاقی۔۔۔ کیا کہہ رہے ہو؟ تم واقعی پاگل ہو گئے ہو۔“ مونس نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر ایک بار پھر جھنجھوڑا۔

”میں پاگل ہی بھلا مونس۔۔۔ لیکن تم کیسے دوست ہو کہ میرے پاگل پن میں میرا ساتھ دینے کے بجائے مجھے پاگل قرار دینے پر تل گئے ہو۔“ رزاقی نے اسے بڑے کھڑکھڑاہٹ سے دیکھا۔

”میں تمہارے لئے جان دے سکتا ہوں رزاقی یہ تم خوب جانتے ہو مگر اس معاملے میں تمہارا ساتھ دینے کا مطلب یہ ہے کہ میں بھی راندہ درگاہ ہو جاؤں۔“

”یعنی تمہیں یقین ہے کہ میں راندہ درگاہ ہو چکا ہوں۔“ رزاقی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ مونس اس پیش کی تاب نہ لا سکا جس نے رزاقی کی نظروں میں الاؤ دہکا دیا تھا۔ دکھ ادا سی فراق اور اب دوست کے الفاظ پر پہنچنے والے صدمے نے غم کی آگ پر جیسے تیل ڈال دیا۔

”میں نے یہ کب کہا رزاقی؟“ مونس کا لہجہ بھیگ گیا۔ ”مگر مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ کہیں ایسا ہونہ جائے۔“

”ایک بات بتاؤ مونس۔“ اچانک رزاقی نے اس کے شانے تھام کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ جواب میں مونس اسے خاموشی سے غم آلود نگاہوں سے تکتا رہا۔

”اگر دوست کسی عیب میں پڑ جائے تو سچے دوست کو کیا کرنا چاہئے؟“

مونس نے اس کی بات کا جواب دینا چاہا مگر اس کے ہونٹ لرز کر رہ گئے۔ اس کے نتھنے پھڑ کے اور آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

”بولو مونس۔ تم جانتے ہو ہم ایک دوسرے کے سچے دوست ہیں اور اگر اس کا ثبوت دینے کی گھڑی آئی گئی ہے تو خاموش مت رہو۔ جو بھی تمہارے دل میں ہے کہہ ڈالو یار۔ مجھے الجھن میں مت

جانتے ہو۔ کیا کر رہے ہو تم؟“

”ہاں۔“ رزاقی نے سپاٹ لہجے میں کہا تو مونس اس کی آنکھوں میں پھیلتی ویرانی دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا۔ ”خوب جانتا ہوں کہ میں کیا کر رہا ہوں۔“

”فائق بابو۔“ اسی وقت قاری صاحب بھی تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے اس کے قریب چلے آئے۔ ان کا سانس دھونکی کی طرح چل رہا تھا۔ ”یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟“

”قاری صاحب۔“ رزاقی نے بڑے ضبط سے کہا۔ ”آپ لوگ مجھے کیوں یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ میں جو کچھ کر اور کہہ رہا ہوں اس سے ناواقف ہوں۔“

”نہیں۔“ قاری صاحب نے اس کی جانب کڑی نظروں سے دیکھا۔ ”آپ جو کہہ رہے ہیں اور جو کر رہے ہیں اس سے پوری طرح واقف ہیں مگر آپ اس کے باوجود اثرات سے آگاہ نہیں ہیں۔“

”میں سب کچھ جانتا اور سمجھتا ہوں قاری صاحب۔“ رزاقی کی آواز بھی تلخ ہو گئی۔ ”آپ جو کہنا چاہتے ہیں میں اس سے بھی آگاہ ہوں اور جس بات سے مجھے ڈرانا چاہتے ہیں وہ بھی میرے شعور میں محفوظ ہے۔۔۔ مگر میں جو فیصلہ کر چکا ہوں وہ خالص میرا اپنا ذاتی فیصلہ ہے اور میں اس پر عمل کرنے اور

کرائے کا حوصلہ بھی رکھتا ہوں۔“

”اللہ کا گھر آپ کے ذاتی فیصلے سے تسلیم نہیں کیا جاسکتا رزاقی بابو۔ آپ کو یہ حق کسی نے دیا کہ آپ ایک مسلمان ہوتے ہوئے مسجد کی تالہ بندی کریں؟“ قاری صاحب کی آواز بلند ہو گئی۔

”اسی نے۔۔۔ اسی نے یہ حق مجھے دیا ہے قاری صاحب جس نے میرے پُرکھوں کو یہ توفیق دی کہ وہ اس کا گھر اس زمین پر بنائیں۔ اسی نے یہ حق مجھے دیا جس نے مجھے برسوں اپنے گھر کی خدمت

کرنے کی سعادت بخشے رکھی اور اسی نے مجھے یہ حق دیا جس نے میری سچی طلب اور سچی پکار کو نظر انداز کرتے ہوئے مجھ سے میری راجیہ اور جنت چھین لی۔۔۔“

”رزاقی۔۔۔“ ایک دم مونس آگے بڑھا اور اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ ”تو تم یہ سب اس غصے اور ناراضگی کے اظہار کے طور پر کر رہے ہو جو تمہیں اپنی دعا کے نام قبول ہونے پر ہے۔“ اس کی آواز میں

حیرت کے ساتھ ساتھ دکھ بھی نمایاں تھا۔

”ایسا ہی سمجھ لو لیکن میں کہہ چکا ہوں کہ یہ میرا اور میرے خالق کا آپس کا معاملہ ہے۔ میں اس میں کسی کو دخل دینے کی اجازت نہیں دوں گا۔“ رزاقی نے سخت اور درشت لہجے میں کہا۔

”آپ کسی بھی طرح کی ناراضگی کا اظہار اس انداز میں نہیں کر سکتے رزاقی بابو جو دین سے متصادم ہوتا ہو۔“ قاری صاحب کے لہجے میں نرمی ابھری۔ انہیں رزاقی کے دکھ اور صدمے کے باعث

ذہنی کیفیت کا خوب اندازہ تھا۔

کی مسجد میں جا کر نماز ادا کرے یا گھر میں پڑھے۔ اس مسجد کا دروازہ میں نے بند کیا ہے اور اگر اس کی مرضی ہوئی، جس کا یہ گھر ہے تو میں ہی اسے دوبارہ آباد کرنے کے لئے کھولوں گا۔ کسی اور شخص نے ایسی کوئی کوشش کی تو خالق نگر میں اس کا رہنا ممکن نہ ہوگا۔ آپ لوگ مجھ سے جو محبت رکھتے ہیں، مجھے اس سے بھی توقع ہے کہ آپ میرے کہے ہوئے کو ہمیشہ کی طرح آج بھی حرف آخر سمجھیں اور اس پر عمل کریں گے۔ شکریہ۔“

اس نے سر جھکائے کھڑے ذہنوں میں الجھن اور دلوں میں ناقابل فہم اہلے جذبات کے حامل گاؤں والوں کو ہاتھ کے اشارے سے جانے کی اجازت دی تو وہ مٹی کے مادھو کا کی کی طرح پھٹے اور اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ رزاتی سینے پر ہاتھ باندھے انہیں خاموش اور سرد نگاہوں سے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

☆=====☆=====☆

”اب ہمارے لئے کیا حکم ہے مونس بابو؟“ قاری صاحب نے عجیب سے لہجے میں اس سے پوچھا تو وہ چونکا۔

”آپ۔۔۔“ مونس نے ایک طویل سانس لی۔ ”آپ کو حکم دینے والا میں کون ہوتا ہوں قاری صاحب۔ میں تو درخواست کر سکتا ہوں کہ یہاں سے جانے کے بارے میں کبھی مت سوچئے گا۔ مسجد کا معاملہ رزاتی اور اس کے اللہ کا معاملہ ہے۔ اس میں دخل نہ دیجئے اور یہیں رہئے۔ نبائے کس وقت آپ کی ضرورت پڑ جائے۔ آپ جیسے اللہ والوں کا یہاں سے جانا اللہ کی ناراضگی بڑھا بھی تو سکتا ہے۔ رزاتی کو اس سے بچائیے۔“

”لیکن میں یہاں رہ کر کروں گا کیا مونس بابو؟“ قاری صاحب نے سوچ بھرے لہجے میں بیچارگی سے پوچھا۔

”آپ یہ بات مجھ سے پوچھ رہے ہیں قاری صاحب؟“ مونس مسکرایا۔ ”مسلمان کے لئے اللہ نے ساری زمین مسجد بنادی ہے۔ آپ اپنے گھر میں خالق نگر کے بچوں کو قرآن اور دین کی تعلیم دیجئے۔ وہیں نماز پڑھائیے۔ کئی لوگ آپ کے پیچھے وہیں رکوع و سجود کے لئے پہنچ جائیں گے۔“

”اور اگر اس پر بھی فائق بابو کو اعتراض ہوا تو؟“

”اس کی ذمہ داری آپ مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ اس کا غصہ اس کے ساتھ رہے گا۔ آپ پر یا کسی اور پر نہیں نکلے گا۔ میں اسے خوب جانتا ہوں قاری صاحب۔ وہ راجیہ بھابی اور جنت کا صدمہ جھیل نہیں سکا۔ وقت کا مرہم اسے ضرور اس درد سے نجات دلا دے گا۔ تب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ بس اس کے لوٹ آنے تک میرا ساتھ دیجئے۔ ہمارا رزاتی بھگ گیا ہے۔ گمراہ نہیں ہوا۔ اسے راندہ درگاہ ہونے سے پہچانا

رکھو۔ بولو۔ دوست عیب دار ہو جائے تو کیا کرنا چاہئے؟“

”دوستی تو یہ کہتی ہے رزاتی۔ دوست کی دوستی سے غرض رکھنی چاہئے اس کے عیبوں سے نہیں مگر۔۔۔“ وہ رک گیا اور آنسو پینے کی کوشش کرنے لگا۔

”مگر۔۔۔ مگر کیا مونس۔ رکومت۔ میری جان تمہارے الفاظ پر انگلی ہوئی ہے یار۔“ اس کے شانوں پر رزاتی کے ہاتھوں کا دباؤ بڑھ گیا اور آواز بھر اگئی۔

”مگر میں اپنے رزاتی میں عیب دیکھ ہی نہیں سکتا۔ یہ میری دوستی کی توہین ہے۔“ ایک دم مونس کا لہجہ صاف ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے دھاروں دھارا آنسو بہہ نکلے۔ تھر تھرتی آواز میں صداقت کا نور سا بھر گیا۔ اس نے رزاتی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”تم جو کرنا چاہتے ہو کرو۔ میری دوستی میں ست ہوا، میری دوستی میں بڑ ہوئی تو ایک دن میں تمہارا یہ عیب دھوڑالوں کا رزاتی۔

میرا ہمیشہ سے دعویٰ ہے کہ میں تمہارا سایہ ہوں۔ اندھیرے میں سایہ جدا نہیں ہوتا، ساتھ ہی رہتا ہے صرف نظر نہیں آتا۔ میں سمجھ لوں گا میرا رزاتی زندگی کا کچھ سفر اندھیرے میں طے کر رہا ہے مگر تم یاد رکھنا کہ میں سائے کی طرح اس اندھیرے میں بھی تمہارے ساتھ ساتھ ہوں۔ جہاں گرنے لگو گئے تھام لوں گا۔ جہاں بھٹکنے لگو گئے آواز دے دوں گا۔ جہاں پھٹنے لگو گئے سینے سے آ لگوں گا۔ میں تمہیں اپنے آقا ﷺ کے صدمے میں اسی اللہ کی امان میں دیتا ہوں رزاتی جس کے آج تم باغی ٹھہرے ہو، اس دن تک کے لئے جس دن تم خود اپنے انہی ہاتھوں سے میرے اور اپنے اللہ کے گھر کا یہ دروازہ کھولو گے، جن سے آج تم نے اسے بند کیا ہے۔“

مونس مسکرایا۔ رزاتی کا ماتھا چومنا اور اٹے پاؤں میڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ پھر ہاتھ ہلاتا ہوا پلٹا اور تیزی سے میڑھیاں اتر گیا۔

رزاتی بُت بنا اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ اس کا دل عجیب سے جذبوں سے سرشار ہوا جا رہا تھا۔ مونس پر اسے ایسا پیار آ رہا تھا کہ کیا کسی کو اپنے محبوب پر آیا ہوگا۔

”فائق بابو۔ ایک بار پھر اپنے فیصلے پر نظر ڈال لیجئے۔“ قاری صاحب کی آواز اس کے قریب سے ابھری تو وہ چونکا۔ حواس لوٹے تو احساسات نے بھی انگڑائی لی۔ کیفیت نے آنکھ کھولی تو وہ اسی مقام پر آ کھڑا ہوا جہاں پر مونس اس سے جدا ہوا تھا۔

”مجھے مجبور نہ کیجئے قاری صاحب۔ میں آپ کا بہت احترام کرتا ہوں اس لئے نہیں چاہتا کہ کوئی ایک ایسا لفظ زبان سے نکل جائے جو آپ کے شایان شان نہ ہو۔“ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور وہیں آ گیا ہوا جہاں چند لمحوں قبل کھڑا وہ نیچے کھڑے جمعے کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر رہا تھا۔

”آج کے بعد یہ مسجد اذان اور نماز کے لئے بند رہے گی۔ خالق نگر کا جو فرد چاہے نزدیکی گاؤں

نہ راشد اور نذیر۔ ہم سب یہیں رہ کر فائق بابو کی دنیا و عاقبت کی خیر کے لئے دعا اور کوشش کریں گے۔ آج سے میرا گھر مسجد کا کام دے گا۔“

”آپ کا بہت بہت شکریہ قاری صاحب۔“ مونس کی آواز بھرا گئی۔ ”آپ نے میرا حوصلہ ٹوٹنے سے بچالیا۔“

”تو مجھے اجازت دیجئے۔“ قاری صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”لیکن مونس بابو۔ کہیں اس معاملے میں کوئی پیچیدگی نہ کھڑی ہو جائے۔ کسی بھی قانون کے تحت فائق بابو مسجد کو سیل نہیں کر سکتے۔ اس کے بارے میں بھی کچھ سوچ رکھئے۔“ جاتے جاتے قاری صاحب نے کہا تو مونس واقعی سوچ میں پڑ گیا۔

پھر جب دن کے گیارہ بجے کے قریب وہ کسی کام سے اپنی گاڑی میں مسجد کے پاس سے گزرا تو ٹھک گیا۔ اس کے پاؤں کا دباؤ بریک پر بڑھ گیا۔ اس نے حیرت سے مسجد کے بند دروازے پر لگے اطلاعی نوٹس پر نگاہ دوڑائی اور زیر لب دہرانے لگا۔ لکھا تھا۔

اطلاع عام

مسجد ہذا ناگزیر و جوہ کی بنا پر

اطلاع فانی بند رہے گی

عرض گزار: فائق رزاقی

☆=====☆=====☆

ہمارا فرض ہے۔ میں اکیلا اس سلسلے میں کمزور پڑ جاؤں گا۔ آپ جیسے اللہ والوں کا ساتھ رہا تو میری ہمت بنی رہے گی۔ کیا میں امید رکھوں کہ آپ مجھے اکیلا نہیں چھوڑیں گے؟“

”نجانے کیوں مجھے لگتا ہے مونس بابو کہ اللہ تعالیٰ نے فائق بابو کو اس کیفیت سے کسی خاص مقصد اور مصلحت کے تحت دوچار کیا ہے۔ وہ ان سے کوئی ایسا کام لینا چاہتا ہے جو کسی اور کے بس کا نہیں۔ جیسے نبی کریم ﷺ کے ایک صحابی حضرت عبداللہ بن ابی سرح مرتد ہو گئے تھے۔ پھر ایک وقت آیا کہ اللہ نے انہیں توفیق دی اور یہ نبی کریم ﷺ سے معافی مانگنے اور توبہ کے لئے پہنچے تو آپ ﷺ خانہ کعبہ کی دیوار کے سائے میں تشریف فرما تھے۔ حضرت ابی سرحؓ معافی مانگتے رہے اور خانہ کعبہ کے غلاف سے لپٹ لپٹ کر آہ وزاری کرتے رہے۔ یہ یاد رہے کہ مرتد کی سزا قتل ہے۔ نبی کریم ﷺ ان کی آہ وزاری اور معافی کے جواب میں مکمل طور پر خاموش رہے تاہم بالآخر انہیں معافی مل گئی۔ وہ خوش خوش لوٹ گئے تو نبی کریم ﷺ نے اپنے اصحاب سے فرمایا:

”تم میں سے کسی نے اسے قتل کیوں نہ کر دیا؟“

اصحاب نے شرمندگی سے عرض کیا۔ ”حضور ﷺ۔ آپ ﷺ نے اس کے قتل کا حکم ہی نہیں دیا۔ ہم تو آپ ﷺ کے حکم کے منتظر تھے۔“

نبی رحمت ﷺ نے فرمایا:

”میں کیسے اس کے قتل کا حکم دیتا جو معافی کے لئے آیا تھا۔ میں تو رحمت للعالمین ﷺ ہوں۔ تمہیں چاہئے تھا کہ اسے قتل کر دیتے کیونکہ مرتد کی سزا یہی ہے۔ مگر حال اب تو وہ دوبارہ مسلمان ہو گیا ہے۔ اب اسے امان ہی امان ہے۔“

یہی حضرت عبداللہ بن ابی سرح بعد میں مسلمانوں کے بڑے جلیل القدر سپہ سالار ہوئے اور بے شمار مہمات میں جہاد کے نام پر دین اسلام کی سر بلندی و اشاعت کے لئے انہوں نے ایسے ایسے محیر العقول کارنامے سر انجام دیے کہ انسانی آنکھ کو یقین نہیں آتا۔ میں یہی سوچ رہا ہوں کہ شاید رزاقی بابو بھی کسی ایسے ہی امتحان سے گزر رہے ہیں۔ شاید اللہ تعالیٰ ان سے بھی کوئی ایسا ہی کام لینا چاہتا ہے جو فی الحال ہماری اور وقت کی آنکھ سے اوجھل ہے۔“

”آپ کے منہ میں کئی شکر قاری صاحب۔“ مونس نے آگے بڑھ کر ان کے دونوں ہاتھ تھام کر سینے سے لگا لئے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک اور ہونٹوں پر والہانہ مسکراہٹ تھی۔ ”آپ نے میرے سینے کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ اب میں زیادہ آسانی اور لگن کے ساتھ رزاقی سے کیا ہوا قول نبھا سکوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ جیسا آپ نے کہا ضرور میرا اللہ ایسا ہی کرنے والا ہے۔“

”انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا مونس بابو۔ میں ہر طرح سے آپ کے ساتھ ہوں۔ میں کہیں جا رہا ہوں

کے مالکوں کے ساتھ تھیں ہندو بستی پر نگرانی تھی۔ بظاہر نوراً شوکت اور غلام حسین حویلی اور مزارعوں کے معاملات کے لئے رکھے گئے تھے مگر ان کاموں میں خالق نگر کی اندرونی اور خاص طور پر دین دھرم کے حوالے سے صورتحال پر نگاہ رکھنا اولین ترجیح تھی۔ یہ تینوں براہ راست رزاقی اور مولوں کو جوابدہ تھے۔ ان کے ماتحتوں میں تقریباً دو درجن افراد شامل تھے اور ان کے اختیارات بہت وسیع تھے۔

☆=====☆

دو پہر ڈھل رہی تھی جب مولوں نے رزاقی کو اطلاع دی کہ ہندوؤں کا چارر کی وفد راجیہ اور جنت کی وفات پر اس سے تعزیت کرنے کے لئے آچکا ہے۔ رزاقی نے اپنے کمرے میں انٹرکام پر اس اطلاع کو وصول کیا اور کرسی سے اٹھ گیا۔

صبح مسجد کے دروازے پر نورے کے ہاتھوں اطلاعی نوٹس چسپاں کروانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلا آیا اور اب تک وہیں تھا۔ دو چار بار انٹرکام پر مولوں نے اس سے رابطہ کر کے کچھ ہلکے پھلکے معاملات ڈسکس کئے اور بس۔ اس نے اب تک کا وقت کمرے میں گزرتے ہوئے کرسی پر بیٹھ کر اور یا پھر راجیہ اور جنت کی تصویر کو دیکھتے ہوئے گزارا تھا۔ بستر اسے کانٹوں کی وہ سچ نظر آتا تھا جس پر لیٹنا اس کے بس سے باہر تھا۔ وہاں راجیہ تھی نہ جنت۔ وہ کس کی آغوش میں سر رکھ کر آرام کرتا اور کسے اپنی آغوش میں لے کر قلعاریاں سنتا۔ آہیں تھیں کہ لبوں پر جھجکی تھیں۔ غم تھا کہ سینے میں برف کی سلی بن کر دھواں دے رہا تھا۔ یادیں تھیں کہ ٹوٹ ٹوٹ کر برسنے لگی تھیں مگر وہ خود پر قابو پائے ہوئے تھا۔ بار بار گزرا ہوا وقت اس کی آنکھوں میں جلن ہی بھردیتا۔ وہ آنکھیں مسلتے مسلتے تھک گیا مگر جلن تھی کہ نہ بی سے گلے ملتی تھی کہ ہم ہو جاتی اور نہ دم توڑتی تھی کہ اسے قرار آ جاتا۔

ہندو پنڈت پجاریوں سے ملنا اگر ضروری نہ ہوتا تو وہ صاف انکار کر دیتا یا اس کا وزن بھی مولوں کے کندھوں پر ڈال دیتا مگر تعزیت چونکہ اسی سے کی جاتی تھی اس لئے مولوں کے اطلاع دینے پر اس نے خاموشی سے کمرہ چھوڑ دیا۔

باہر نکلا تو بی بی سامنے آ گئی۔ وہ اس قدر پرشمرہ ہو رہی تھی کہ رزاقی کو لگا وہ وہی دن میں ادھیڑ عمری سے بڑھاپے کی دہلیز تک آ پہنچی ہے۔

”کہاں جا رہا ہے باؤ؟“ بی بی نے اس کا ہاتھ پکڑا ہوا چہرہ ہاتھوں میں لے لیا۔

”پنڈت گردھاری لال آیا ہے کچھ پجاریوں کے ساتھ بی بی۔ ان سے ملنے جا رہا ہوں۔“ رزاقی نے اس کے ہاتھوں سے ممتا کی گرمی سمیٹتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔

”جلدی آ جانا بی بی صدقے۔ کھانا تیار ہے۔ کب سے بھوکا پھر رہا ہے۔“

”اچھا بی بی۔“ اس نے بحث نہ کی۔ جانتا تھا کہ بی بی اس کی ایک نہ سنے گی اور ہو سکتا ہے کہ

”سرحدی چوکی سے ہمارے رضا کار دستے کا انچارج انوار الحق آیا بیٹھا ہے۔ تم سے ملنا چاہتا ہے۔“ مولوں نے رزاقی کو انٹرکام پر مطلع کیا۔

”اگر کوئی خاص کام نہیں ہے تو اسے تم ہی نمٹا دو۔“ رزاقی نے سنجیدگی سے کہا۔

”کام تو کوئی خاص نہیں ہے۔ بس وہی منتھلی رپورٹ ہے اور تنخواہوں کا چیک۔۔۔“

”تو اس میں مجھے کیا کرنا ہے۔ تم خود بھگتا لو۔“

”ٹھیک ہے۔ اور ہاں۔۔۔“ اچانک مولوں کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔ ”ایک گھنٹے بعد پنڈت

گردھاری لال چند پجاریوں کے ساتھ بڑے سونے کے لئے آنے والا ہے تمہیں بتایا تھا ناں میں نے؟“

”جب وہ لوگ آجائیں تو مجھے اطلاع کر دینا۔ میں مل لوں گا۔“ رزاقی نے جواب دیا اور مولوں نے انٹرکام کنکشن آف کر دیا۔

صبح مسجد سے لوٹنے کے بعد مولوں آفس میں آ بیٹھا۔ اس نے رزاقی کے حویلی آ جانے کے بعد کسی ایسے رد عمل کا اظہار نہ کیا جو صبح کے معاملے پر دوبارہ کسی بد مزگی کو جنم دیتا۔ جتنی بات مسجد میں ہوئی اس کو لے کر اب اسے بڑا سنبھل سنبھل کر قدم اٹھانے کی ضرورت تھی۔ اسی لئے دفتری معمولات کو نمٹاتے ہوئے اس کا ذہن مسلسل آئندہ کا لائحہ عمل ترتیب دینے کے ادھیڑ بن میں مچوٹھا۔

اپنے معمول کے کاموں میں مصروف ہو جانے کے تھوڑی دیر بعد قاری صاحب اس سے ملنے کے لئے آئے اور ان کے بعد اب انوار الحق سرحدی صورتحال کی تازہ رپورٹ دینے اور ان رضا کاروں کی تنخواہوں کا چیک لینے کے لئے آ پہنچا جن کی ذمہ داری خالق نگر کے مالکوں پر تھی۔ یہ تقریباً ایک سو افراد تھے جو رنجرز کے ساتھ سرحد کی اس پٹی کی حفاظت پر مامور تھے جو خالق نگر کے ساتھ لگتی تھی۔ ان کی تنخواہیں یونیفارم اور دیگر اخراجات عبدالخالق رزاقی مرحوم کے زمانے ہی سے اس خاندان کے ذمے تھے۔ خالق نگر کے اندر بھی چند آدمی جو رینڈ فوجی تھے اور ان کی وفاداریاں اول تا آخر خالق نگر اور اس

اسے کھانا کھائے بغیر وہاں سے جانے ہی نہ دے۔

”جامیر یا سو نہیا۔ تیرا اللہ رکھا۔“ بی بی نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہر چلا گیا تو بی بی اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ بستر کی حالت بتاتی تھی کہ رزاقی نے اس پر کمر لگا کر نہیں دیکھی۔ کرسی کے پاس پڑی تپائی پر راجیہ اور جنت کی فریم شدہ تصویر نے اسے سب سمجھا دیا کہ رزاقی جاگتا اور اس تصویر سے باتیں کرتا رہا ہو گا۔ بی بی آہ بھر کر بستر کے کونے پر ٹک گئی اور سر جھکا کر سسکنے لگی۔ وہ بیچاری بوڑھی جان اور کبھی کیا سکتی تھی!

☆=====☆

مونس نے پنڈت گردھاری لال اور اس کے ساتھی پجاریوں کو اپنے آفس میں بیٹھا رکھا تھا۔ رزاقی جب اپنے آفس میں داخل ہوا تو بے اختیار اس کے قدم ڈول گئے۔ سامنے دیوار پر راجیہ اور جنت کی قدیم تصویر ہلکھلا رہی تھی۔ زندگی سے بھرپور ہنسی بولتی وہ تصویر جیسے ابھی کے ابھی اسے آواز دے لیتی۔ چند لمحے وہ کمرے کے درمیان کھڑا اپنے پیاروں کو گھورتا رہا پھر ایک ہوک سی اس کے سینے سے نکلی اور وہ تھکے تھکے قدموں سے آگے بڑھ کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس طرح کہ وہ تصویر والی دیوار اب اس کے بائیں جانب تھی۔ سامنے اور دائیں ہاتھ آنے والوں کے لئے صوفے اور کرسیاں ترتیب سے پڑی تھیں۔

تھوڑی دیر تک وہ سر صوفے کی پشت پر ڈالے اور کھلی آنکھوں سے راجیہ اور جنت کی طرف دیکھتا رہا پھر ایک آہ بھر کر سیدھا ہو بیٹھا۔ پاس تپائی پر پڑے اسٹرکام کا من دبایا۔

”یس۔۔۔“ دوسری جانب سے مونس کی آواز ابھری۔

”مہمانوں کو لے آؤ مونس۔“ اس نے مختصر آکھا اور انگلی بٹن سے ہٹائی۔ پھر ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔

تقریباً ایک منٹ بعد وسیع و عریض کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔ مونس کے عقب میں تھل تھل کرتا پنڈت گردھاری لال اور تین کالے پیلے پجاری گہرے تہہ اور گلے میں لمبے پٹکے ڈالے کھڑے اندر جھانک رہے تھے۔

رزاقی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

مونس نے مہمانوں کو ایک طرف ہو کر راستہ دیا اور ہاتھ دراز کر کے انہیں اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ وہ ہاتھ جوڑے رام رام کرتے اندر چلے آئے۔

”نمستے مہاراج۔“ گردھاری لال نے ہاتھ جوڑے جوڑے سر خم کیا اور رزاقی کے گھٹنے چھونا

چاہے۔

”ایسا نہ کیجئے پنڈت جی۔ بیٹھے۔ آپ بھی تشریف رکھئے۔“ اس نے پنڈت کو روکتے ہوئے باقی پجاریوں سے کہا۔

وہ سب نمستے نمستے کی صدا نئیں بلند کرتے صوفوں پر یوں ٹک گئے جیسے موقع ملتے ہی کوئی نہ کوئی چیز اٹھا کر بھاگ لیں گے۔

”بڑا اچھوس ہوا مہاراج آپ کی بچی کے دیہانت کا سن کر۔“ گردھاری لال نے اپنے منہ سے چہرے پر مزید لعنت طاری کرتے ہوئے افسردگی سے کہا تو مونس کے لئے اس کے مضحکہ خیز چہرے کو دیکھ کر اس غمزدگی کے عالم میں بھی مسکراہٹ ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ اس نے مصنوعی کھانسی کھانستے ہوئے چہرہ گھمایا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ تبھی اس نے محسوس کیا کہ گردھاری لال کے ساتھ آنے والا ایک چہرہ سا پجاری اپنی آنکھیں مسکڑے بڑے غور سے دیوار پر آویزاں راجیہ کی قدیم تصویر کو دیکھ رہا ہے۔ مونس نے اس پر نگاہ جمادی اور غیر محسوس انداز میں اس کی کیفیت کا جائزہ لینے لگا۔

باقی دونوں پجاری سر جھکا کر بیٹھے گردھاری لال اور رزاقی کی گفتگو یوں ڈرے ڈرے سن رہے تھے جیسے اگر کوئی لفظ سننے سے رہ گیا تو رات کا کھانا نہیں ملے گا۔

”مہاراج۔ ہوتا تو وہی ہے جو بھگوان کی اچھیا ہوتی ہے۔ منس تو بے بس ہے۔ کچھ نہیں کر سکتا۔ ہم آپ کو جتنی بھی تسلیاں دیں سب بیکار ہیں۔ جس کی جج گم ہوتی ہے اسی کو یہ بتاتا ہے کہ اسے کتنا ڈکھ ہے۔ پھر بھی ہم آپ کے کم میں برابر کے سر یک ہیں۔ بھگوان آپ کو سانی اور اس ڈکھ کو سہین کرنے کی کتی دے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں پنڈت جی۔ آپ کے آنے کا بہت بہت شکریہ۔“ رزاقی نے مختصر آکھا۔

”اس میں شکریہ کی کون سی بات ہے مہاراج۔ آپ جیسے مالک تو بھگوانوں کو ملتے ہیں۔ ہم آپ کی پر جائیں مہاراج۔ آپ کا ڈکھ ہمیں اپنا ڈکھ لگتا ہے۔“ گردھاری لال نے کہا۔ پھر اس بوڑھے پجاری کی طرف دیکھا جواب بھی راجیہ کی تصویر پر نظریں جمائے بیٹھا کسی سوچ میں گم تھا۔

”یہ آج ہی بنارس سے پدھارے ہیں مہاراج۔ ان کا نام سوامی دھیرج داس ہے۔ یہ کالی ماتا کے بہت بڑے بھگت ہیں۔ میں نے جب یہاں آنے کا بتایا تو یہ بھی تیار ہو گئے کہ میں بھی پُرسہ دینے چلوں گا۔“ گردھاری لال نے اس کالے بھگت استخوانی بوڑھے کا تعارف کرایا جس کی لٹیں چہرے کے دونوں طرف برہنہ شانوں سے نیچے تک لٹک رہی تھیں۔

”ان کی بہت مہربانی ہے پنڈت جی کہ انہوں نے تکلیف کی۔“ رزاقی نے اس کی جانب رخ کیا تو وہ ہولے سے چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

سکا اور ذہن میں الفاظ ترتیب دینے لگا۔
 مونس نے اپنی نشست پر بے چینی سے پہلو بدلا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ رزاقی کو ایسی بحث میں الجھنا پڑے جو اسے راجیہ اور جنت کے حوالے سے مزید ذمہ داری دے مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ پاتا، رزاقی نے کہا۔ ”آتما تو ہمارے اللہ کا امر ہے سو امی جی۔ اس کا حکم ہے۔“
 ”میرا یہ مطلب نہیں تھا مہاراج۔“ سوامی نے رزاقی کی بات سن کر نرمی سے کہا۔ ”میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ کا آتما کی آمد و رفت اسے محسوس کرنے اور اس سے گفتگو کرنے پر وشواس ہے؟“

”یہ بڑا الجھا ہوا مسئلہ ہے سوامی جی۔“ رزاقی نے جان لیا کہ سوامی کی بات طویل ہو گئی تو اس سے جان چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔ ”چند لفظوں یا فقرہوں میں اسے سمیٹنا ممکن نہیں۔ کسی فرصت کے وقت اس پر بات کریں گے۔“

”اور اگر آپ اس موضوع پر مجھ سے گفتگو کرنا پسند کریں تو شاید مسٹر رزاقی کا قیمتی وقت ویسے ہی بچ جائے سوامی جی۔“ ایک دم مونس نے کہا تو سب لوگ چونک پڑے۔
 ”آپ سے نام کی حد تک تو میں جانکاری حاصل کر چکا ہوں مونس مہاراج پرہتو۔“ سوامی نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”مونس اور مجھ میں کوئی فرق نہیں ہے سوامی جی۔ آپ اس کی زبان سے جو بھی سنیں گے وہ میرے ہی الفاظ ہوں گے۔“ رزاقی نے اپنے اور مونس کے ایک ہونے کی تصدیق کی۔

”مہاراج ٹھیک کہہ رہے ہیں سوامی جی۔“ گردھاری لال نے دھوتی کے پلو سے ہونٹ پونچھتے ہوئے سوامی کی طرف دیکھا۔ ”مونس بابو یہاں کے کرتا دھرتا ہیں۔ رجاتی مہاراج کے بعد وہ یہاں سب سے بااقتدار ہیں۔“

”میرے بعد نہیں پنڈت جی۔ مونس میری موجودگی میں بھی یہاں سب سے زیادہ بااقتدار ہے۔“ رزاقی نے ایک ہی فقرے میں مونس کی پوزیشن واضح کر دی۔

”خیر خیر۔“ سوامی نے رزاقی کو اپنی چمکدار آنکھوں کے احاطے میں لیتے ہوئے کہا۔ ”میں تو آپ کی جتنی اور پٹری کے حوالے سے آتما کے بارے میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا تھا مہاراج۔ اس پر بحث کرنا میرا ارادہ نہیں تھا۔ پھر بھی کسی سے اگر مونس بابو سے بات ہو سکی تو یہ میرا سوچا گیا ہوگا۔“

”ضرور ضرور۔“ مونس نے ہر خلوص انداز میں کہتے ہوئے سوامی کی جانب دیکھا۔

”مہاراج۔“ گردھاری لال نے آگے کو جھکتے ہوئے رزاقی کی طرف بڑی خوشامد آنکھوں سے دیکھا اور اپنی آواز میں مزید لوج پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ”بات تو ایسی نہیں ہے جس میں دھل دینا پڑتا

”مہاراج۔“ ہاتھ جوڑ کر جب اس نے رزاقی کو پر نام کیا تو آواز اس کے حلق سے یوں نکلی جیسے کسی نے اچانک کسی مردے کے پیٹ پر لات رسید کر دی ہو۔ بڑی پھٹی پھٹی اور اس کے دبلے پتلے جتنے کے مقابلے میں خاصی نامتعول سی آواز تھی اس کی۔ ”یہ۔۔۔“ اس نے راجیہ کی تصویر کی جانب سوالیہ انداز میں ہاتھ دراز کیا۔

”یہ میری بیوی اور بیٹی کی تصویر ہے جن کا پرسوں انتقال ہوا ہے۔“

”اوہ۔۔۔“ دھیرج داس کے کالے کالے باریک ہونٹ سکڑ گئے اور وہ دوبارہ راجیہ کی تصویر کو آنکھیں جما کر گھورنے لگا۔ پھر ایک دم چونکا اور نظر رزاقی کی طرف پھیر لی۔ ”بہت سندر تھی آپ کی بیٹی اور پٹری مہاراج۔ ایسی اپسرائیں زیادہ دیر اس پلچہ دھرتی پر کیسے رہ سکتی ہیں؟ ان کی آتمائیں تو سورگ کی طرف لوٹ جانے کے لئے بیا کل رہتی ہیں۔ یہ بھی لوٹ گئیں۔ بھگوان آپ کو شانتی دے مہاراج۔ اب تو پرارتھنا ہی کی جاسکتی ہے۔“ وہ بڑی شستہ اور صاف زبان بول رہا تھا۔

”جی ہاں۔“ رزاقی نے کہا۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

”لیں۔“ مونس نے دستک کے جواب میں کہا اور دروازہ کھل گیا۔ ایک ملازم چائے کی ٹرالی

دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوا تو گردھاری لال چل اٹھا۔

”مہاراج۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ یہ کون سا سانس ہے ایسے تلکھات کال۔ ہم آپ کو پرسہ دینے آئے ہیں، جل پان کر رہے ہیں۔“

”کوئی بات نہیں پنڈت جی۔ آپ کی مہمان نوازی کرنا بھی تو لازم ہے ناں ہم پر۔“ رزاقی نے دھیرے سے کہا۔

ملازم نے سب لوگوں کے سامنے میز پر چائے اور دیگر لوازمات سجائے اور رخصت ہو گیا۔ گردھاری لال اور اس کے دونوں چیلوں نے ہر چیز کے ساتھ انصاف کرنا شروع کر دیا جبکہ سوامی دھیرج داس نے صرف چائے پر اکتفا کیا۔ چائے پیتے ہوئے بھی بار بار وہ راجیہ کی تصویر میں کھو کر رہ جاتا اس بات کو مونس نے خاص طور پر اور ایک آدھ بار رزاقی نے بھی محسوس کیا۔

سب سے پہلے سوامی دھیرج داس نے چائے ختم کی۔ خالی کپ میز پر رکھا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسا کر ہاتھ گود میں رکھ لئے اور نظر رزاقی کے چہرے پر جما کر اپنی غیر انسانی آواز میں کہا۔ ”مہاراج۔ آتما کے بارے میں آپ کے کیا چار ہیں؟“

”آتما۔۔۔“ رزاقی نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے صوفے پر آرام دہ انداز میں نیم دراز ہو گیا۔ اس کا جی نہ چاہ رہا تھا کہ اس قسم کی باتوں میں الجھے مگر سوامی دھیرج داس کے لہجے کو وہ نظر انداز نہ کر

چپ کھڑے تھے جیسے ابھی ابھی میا کی چتا جلا کر آ رہے ہوں۔
 ”کوئی بات نہیں سوامی جی۔ آپ لوگ اس بات کو دل پر نہ لیں۔ مسٹر رزاقی ان دنوں اپنی بیوی اور بیٹی کی وفات کے باعث بہت اپ سیٹ ہیں اس لئے کوئی بات کب ان کی برداشت سے باہر ہو جائے، کہا نہیں جاسکتا۔ بہر حال سوامی جی کی یہ بات بالکل درست ہے پنڈت جی کہ آپ کو دوسروں کے معاملات اور خاص طور پر دین دھرم میں دخل نہیں دینا چاہئے۔ کیا آج تک ہم لوگوں نے آپ سے پوچھا ہے کہ آپ اپنی عبادت گاہ میں کبھی صرف کنواری اور کبھی صرف شادی شدہ عورتوں کو رقص کے لئے کیوں بلاتے ہیں؟“

”جی۔۔۔“ پنڈت گردھاری لال کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ یہ اندر کی ایسی بات تھی جس سے سوائے ان کے خاص لوگوں کے اور کوئی واقف نہ تھا۔

”جی۔۔۔“ مونس نے ”جی“ کو کھینچ کر ادا کیا۔ ”ہم سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی اگر خاموش رہتے ہیں تو صرف اس لئے کہ یہ آپ کے اندرونی معاملات ہیں۔ آپ کے دھرم سے ہمیں کیا لینا دینا؟ اسی طرح آپ کو بھی اپنی حد میں رہنا چاہئے۔ کیا میں نے غلط کہا سوامی جی؟“ مونس نے اس کی جانب رخ پھیرا۔

”جی نہیں۔ آپ نے بالکل صحیح کہا۔“ مونس کے ہلکے ہلکے مارے ہوئے جوتوں کے اثرات سوامی دھرج داس کے چہرے پر نمایاں ہو رہے تھے۔ ”میں ایک بار پھر شما چاہوں گا۔ رزاقی بابو سے بھی میری طرف سے ہاتھ جوڑ کر بتی کیجئے گا کہ دل میں کوئی بات نہ رہیں۔ مورکھ پن کی وجہ سے پنڈت جی نے جو کہا اس میں ان کی کسی بدنیتی کو دخل نہیں تھا، تو آپ بھی سمجھتے ہیں مونس بابو۔“

”جی جی۔ میں سمجھتا ہوں اور مسٹر رزاقی کو بھی سمجھا دوں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔“ مونس نے اسے تسلی دی۔

”اب چلیں مہاشے؟“ سوامی نے گردھاری لال کو لال لال آنکھوں سے گھورا۔

”جی جی۔ چلئے۔“ گردھاری لال کے لئے دھوتی سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔

”اچھا مونس بابو۔ آ گیا دیجئے۔ میں ابھی چند دن یہیں ہوں۔ چاہوں گا کہ جانے سے پہلے آپ اور رزاقی بابو سے اچھے ماحول میں ایک اور بھینٹ ضرور ہو۔“

”میں کوشش کروں گا کہ آپ کی خواہش پوری کر سکوں سوامی جی۔“ مونس نے اس کی چمکدار آنکھوں میں بے خوفی سے جھانکتے ہوئے کہا۔

”نہتے۔“ سوامی دھرج داس نے ہاتھ جوڑ دیے۔

”جی۔“ مونس نے ہاتھ پشت پر باندھ لئے۔

ہو پرنتو ایسی بھی نہیں ہے کہ اسے پھینک دیا جائے۔ اگر آپ برانہ مائیں تو میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ نے اپنے اللہ کے گھر کا دروازہ پرارتھنا کے لئے بند کیوں کر دیا؟“

”ایسا کیا؟“ ایکدم سوامی دھرج داس جیسے اچھل پڑا۔

”پنڈت جی۔“ رزاقی کا لہجہ ناخوشگوار تھا۔ ”یہ ایسا مسئلہ نہیں ہے جو آپ کے لئے پریشانی کا باعث بن سکے اور نہ ہی اس سے آپ کا کوئی تعلق ہے۔ اس لئے میں چاہوں گا کہ آپ اس سلسلے میں کسی بھی قسم کی گواہی افشانی سے پرہیز کریں۔“

”مہاراج۔“ گردھاری لال گھبرا گیا۔ ”میں تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ یہ آپ کا جاتی معاملہ ہے۔ میں تو یونہی۔۔۔“

”جب یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے پنڈت گردھاری لال تو آپ کو اس کے بارے میں زبان کھولنا ہی نہیں چاہئے تھی۔“ سوامی دھرج داس نے اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے سرزنش کے لہجے میں کہا تو گردھاری لال بالکل ہی ہنگامی بن گیا۔ ”میں آپ سے شما چاہتا ہوں مہاراج کہ پنڈت جی کی بات سے آپ کے من کو ٹھیس پہنچی۔“ اس نے رزاقی کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”یہ بالکل آپ کا اپنا معاملہ ہے اور اس میں کسی دوسرے دھرم کاری کو دخل دینا شوبھ نہیں دیتا۔“

مونس نے صاف محسوس کیا کہ سوامی کہنا کچھ اور چاہتا ہے اور کہہ کچھ اور رہا ہے۔ اس کے لہجے میں چھپی کوئی ایسی بات ضرور تھی جو اس وقت مونس سمجھ نہ پا رہا تھا۔ رزاقی کا موڈ بہر حال خراب ہو گیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

”آپ کے آنے کا بہت بہت شکریہ مہاراج۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیے گا۔ میں اب اجازت چاہوں گا۔“

گردھاری لال اپنے چیلوں سمیت تیزی سے اٹھا کہ رزاقی کو نمستے کر سکے مگر وہ اتنی دیر میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا کمرے کے دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ پھر جب تک پنڈت کے لبوں سے ”نہتے“ کے الفاظ ادا ہوتے وہ باہر نکل گیا۔

ان سب کے ساتھ ہی سوامی بھی اپنی نشست سے کھڑا ہو گیا۔ رزاقی کے جانے کے انداز سے اس کی ناراضگی کا صاف پتہ چل رہا تھا۔ سوامی نے کڑی نظروں سے پنڈت گردھاری لال کی جانب دیکھا۔

”آپ آلو کے آلو ہی رہیں گے پنڈت جی۔“ اس کا لہجہ بیدخل تھا۔ ”آپ کو کیا ضرورت تھی ایسی بات کہنے کی جس سے رزاقی مہاراج کو غصہ آ جائے۔“

”میں نے تو یونہی۔۔۔“ پنڈت گڑبڑا کر پیلا پڑ گیا۔ اس کے چیلے سر جھکائے ہاتھ جوڑے یوں

میرے ہاتھ سے چھین کر اس مسئلے کی ناراضگی کے ہاتھ میں دے دی۔ وہ میری باتوں کے چھل میں آنے سے پہلے ہی اٹھ بھاگا۔۔۔ اور یہ سب تمہارے کارن ہوا۔ صرف تمہارے کارن۔“ وہ ایک بار پھر غصے میں لال بھوکا ہو کر پنڈت پر الٹ پڑا۔ ”اگر تم مسجد بند ہونے کی بات نہ چھیڑتے یا وہاں جانے سے پہلے تم نے مجھے اس بکھیڑے سے آگاہ کر دیا ہوتا تو میں اس مننے کو بھی وہاں کھاٹے راؤ کے کھاٹے کی طرح استعمال کرتا۔ پھر یہ اسمبھو تھا کہ میرا بان خالی جاتا۔“

”مجھے شاکجے سوامی جی۔“ پنڈت نے اس کے پاؤں تھام لئے۔ ”اب مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ کے من میں کیا ہے؟ اگر مجھے اس کی جراثیمی بھوک پڑ جاتی تو میں آپ کے ساتھ جانے سے پہلے یہاں سے سب تیاری کر کے جاتا۔“

”بس بس۔“ چھوڑو میرے چرن۔“ سوامی نے اسے پرے دھکیل دیا۔ ”یہ آخری بار ہے پنڈت۔ اب اگر تم سے کوئی مورکھتا ہوئی تو میں کسی وچن کا پالن نہیں کروں گا۔ تمہیں یہاں سے اٹھا کر باہر پھینکوں گا اور تمہاری جگہ کسی من مرضی کے آلو کے پٹھے کو لا بٹھاؤں گا۔ سمجھ۔“

”ایسا ازتم نہ کیجئے گا سوامی جی۔ ورنہ میں جیتے جی مر جاؤں گا۔ میں آپ کی ہر اچھیا کا پورا پورا پہرہ دوں گا۔ آپ کو کبھی مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“ پنڈت بلبلاتا اٹھا۔

”ایسا ہی ہوتا چاہئے۔“ سوامی کے لہجے میں ٹھہراؤ آ گیا۔ ”بہر حال اب تک جو ہوا سو ہوا۔ آگے خیال رکھنا۔“

”کچھ اپنے منصوبے کے بارے میں مجھے بھی بتائیے سوامی جی۔“ پنڈت اس کے پاؤں دابنے لگا۔

”تم ہو تو بیوقوف پنڈت مگر تمہیں بتائے بنا بات بنے گی نہیں۔“ سوامی نے پھیلے ہوئے اپنے پیچھے دیوار کے ساتھ دھرے کشن سے ٹیک لگالی۔ ”سنو۔۔۔ تم نے رزاتی کی پتی کی تصویر دیکھی تھی وہاں کمرے کی دیوار پر لگی ہوئی۔“

”تصویر کی کیا بات ہے جی۔ میں نے اس کو ویسے بھی چندہ حالت میں درجنوں بار دیکھا تھا۔ وہ کون سا پردہ کرتی تھی!“

”ہوں۔۔۔“ سوامی نے پلکیں موند لیں اور کسی خیال میں ڈوبے لہجے میں بولا۔ ”میں چاہتا ہوں رزاتی کی پتی۔۔۔ کیا نام تھا اس کا؟“

”کس کا نام؟“ پنڈت اس کے پاؤں دباتے دباتے چونکا۔

”رزاتی کی پتی کا۔“ سوامی نے صبر سے کہا۔ اس نے پنڈت کی بے دھیانی پر کسی غصے کا اظہار نہ کیا۔ شاید وہ اس کی اول جلول طبیعت کو سمجھ چکا تھا۔

رام رام کی گردان کرتے وہ تینوں اور ”جے کالی“ زیر لب بڑبڑاتا سوامی دھیرج داس رخصت ہو گیا۔ منوں ان کے جانے کے بعد کچھ دیر تک خالی دروازے کو گھورتا رہا۔ سوچ رہا تھا کہ رزاتی کا مسجد کو بند کرنا کوئی ایشو نہ بن جائے۔ تاہم جب اسے مسجد کے دروازے پر رزاتی کی طرف سے لگائے گئے نوٹس کا خیال آیا تو کچھ اطمینان ہو گیا۔ پھر بھی اس کا ذہن اس بارے میں کوئی ٹھوس لائحہ عمل سوچنے میں لگا رہا۔

☆=====☆

”آپ سے بڑا آلو کا پٹھا میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا پنڈت جی۔“ سوامی دھیرج داس بے تکان گردھاری لال پر برس رہا تھا۔ ”کیا ضرورت تھی آپ کو ایسی عقلمندی کی بات منہ سے نکالنے کی جسے سن کر وہ بھڑک اٹھا اور میری ساری چترائی لپیٹ کر میرے ہاتھ میں تھا گیا۔ میرا سارا منصوبہ غارت کر دیا آپ نے۔“

”منصوبہ؟ کیا منصوبہ؟“ پنڈت اپنی ساری بے عزتی بھول کر سوامی کے قریب ہو گیا۔ اس وقت ان دونوں کے سوا اس مندر نما ہال میں اور کوئی نہیں تھا جو ہندو سستی والوں نے اپنی پوجا پاٹ کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ چیلے چانٹوں میں پنڈت کی اجازت کے بغیر وہاں آنے کی ہمت نہ تھی۔ وہ اس مندر ہال میں خاص اوقات میں آتے تھے ورنہ نہ ساتھ والے گھر میں بڑے ایندھے رہتے۔ پھر یہ وقت سستی کے عام لوگوں کے آنے کا تھا بھی نہیں اور ہوتا بھی تو سوامی اس کے ساتھ اپنی سی کر کے رہتا۔ اسے پنڈت پر ایسا غصہ تھا کہ اس کا بس چلتا تو وہ اسے جوتے مارنے سے بھی نہ رکھتا۔

”ایسا منصوبہ پنڈت گردھاری لال۔“ سوامی کا لہجہ اچانک خوابناک ہو گیا۔ اس کی نگاہیں ہال کی چھت پر جم گئیں اور الفاظ ایک خاص سانچے میں ڈھلے ہوئے لبوں سے خارج ہونے لگے۔ ”ایسا منصوبہ۔۔۔ جس کے سینے دیکھتے دیکھتے ہماری تین پشتیں چتا کی آگ میں جل کر راکھ ہو گئیں۔“

”میں اب بھی نہیں سمجھا سوامی جی آپ کس سینے کی بات کر رہے ہیں؟“ پنڈت نے بیچارگی سے کہا۔

”اتنی سمجھ کے مالک ہوتے۔ اتنے دودان ہوتے تو تم اب تک اس ایک کمرے کے مندر نما اصطبل میں نہ سڑ رہے ہوتے بلکہ اب تک یہاں رام مندر بن چکا ہوتا پنڈت۔ یہاں مرلی منوہر کے بھجن گائے جا رہے ہوتے۔ سکھ اور ناقوس کی تانوں میں مسلوں کی اذان دب کر رہ گئی ہوتی۔ اس مندر میں جب جب گھنٹہ گونجتا ان ملچھوں کے دل کانپ کانپ جاتے۔۔۔ میں جتنی دیر وہاں براجمان رہا اپنے پڑکھوں کے اسی سینے کا تانا بانا بٹخا رہا۔۔۔ اور میں نے اس کے لئے بات چھیڑ بھی دی تھی۔ شاید میں اپنے منصوبے کا پہلا پتھر اب تک اس گاؤں کی زمین میں گاڑ بھی چکا ہوتا مگر تمہاری مورکھتا نے اسے کی لگام

”پرتو سب اپنے ہونے چاہئیں پنڈت۔ کسی غیر کو اس کام میں شامل نہیں کرنا۔“
 ”اگر اس کام میں باہر کا کوئی منس شامل ہوگا بھی سوامی مہاراج تو اس کے لئے میری پوری جے داری ہوگی۔ آپ شاید جانتے ہی ہوں گے کہ یہ مسئلے پیسے اور کنیا کے لئے ہر کام کرنے پر راجی ہو جاتے ہیں۔“

”مگر بعض کام ایسے بھی ہیں پنڈت جن کے بارے میں سنتے ہی یہ سامنے والے کاٹینو داوایتے ہیں۔ اس لئے بڑی ہوشیاری سے کام لینا۔ کوشش یہی کرو کہ کسی عیسائی کو ساتھ ملا لو مگر کسی مسئلے کو ساتھ نہ ہی ملانا پڑے تو اچھا ہے۔“

”وہ تو سب ٹھیک ہے سوامی جی مگر اس کے لئے ٹھن ٹھن گوپال کی بڑی جرورت پڑے گی اور یہاں ہم تیس چالیس لوگوں کی جاتی کے پاس اتنا دھن نہیں ہے کہ کھل کر اپنی بھارت ماتا کی کھدمت کر سکیں۔“

”میں سمجھ رہا ہوں پنڈت۔ اس کے لئے ہر مہینے کسی نہ کسی طرح کوئی نہ کوئی تمہیں اتنا کچھ دے جایا کرے گا کہ تم نہال ہو جاؤ گے۔“

”دھنیہ ہو سوامی جی۔ دھنیہ ہو۔“ پنڈت اس کے پیروں پر جھک گیا۔ ”اگر ایسا ہو جائے تو پھر آپ اس سیوک کے چکر وار دیکھئے گا۔“
 ”بس ذرا میں راجیہ کی آتما کا بندوبست کر لوں۔“ سوامی دھیرج داس نے بڑے خیال لہجے میں کہا۔ ”پھر سب کچھ نیکل ہو جائے گا۔“

پنڈت نے سوامی کی بدلتی ہوئی کیفیت دیکھ کر ہاتھ بڑھایا اور اپنے مٹی کے بھگوان کی قدر آدم سورتی کے عقب سے ایک جگ گلاس برآمد کر لیا۔ گلاس میں جگ سے سیال اٹھایا اور دونوں ہاتھوں میں تمام کر بڑے ادب سے سوامی کی طرف بڑھادیا۔

”مدرائے چند گھونٹ آپ کو پرست کر دیں گے سوامی مہاراج۔ آپ کا من سانت ہو جائے گا۔“
 ”تم شاید نہیں جانتے پنڈت کہ مدر اطلق سے اترتے ہی مجھے ناری کی اویٹھکا ہونے لگتی ہے۔“
 ”اس کا بندوبست بھی ہے سوامی جی۔ آپ پھکر کیوں کرتے ہیں؟“ گردھاری لال کے ہونٹوں پر بڑی مکروہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

”کون ہے وہ؟“ سوامی نے گلاس تمام لیا۔

”کل سام یہاں ناچ رہی تھی۔ آپ پھول گئے کیا؟“

”کون۔۔۔ وہ نیلی چولی والی؟“ سوامی نے کہا اور گلاس حلق میں اٹھیل لیا۔

”جی ہاں۔ وہی لال ساڑھی والی۔“ پنڈت شوخی پر اتر آیا۔

”راجیہ۔۔۔ راجیہ نام تھا جی اس کا۔“ پنڈت نے جلدی سے بتایا۔

”ہاں۔۔۔ تو اس راجیہ کی آتما سے کام لیا جائے۔ اسے اپنے دھرم سنگٹ کے لئے برتا جائے۔ راجیہ کی آتما رزاقی کو ہمارے راستے سے ہٹا بھی سکتی ہے اور ہمارے کام کا منس بھی بنا سکتی ہے۔“

”آپ۔۔۔ آپ۔۔۔ راجیہ کی آتما کو پر لوک سے یہاں۔۔۔ پنڈت ہکھلانے لگا۔

”کیوں؟“ سوامی نے ایک دم آنکھیں کھول کر پنڈت کی جانب قہر سے دیکھا۔ ”کیا تمہیں میری شکلیوں پر کوئی شک ہے پنڈت؟ جانتا ہے ناں میں کالی کا بھگت ہوں۔“

”جانتا ہوں سوامی جی جانتا ہوں۔“ پنڈت کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ ”میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ کیا آپ راجیہ کی آتما کو پر لوک سے بلا لیں۔۔۔ میرا مطلب ہے بلائیں گے تو کیا وہ آجائے گی؟“

”تمہیں اس میں شک کیوں ہے پنڈت؟“ سوامی بڑے سرد لہجے میں بولا۔

”وہ مسئلے ہے سوامی جی۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ اس کا دھرم اور ہے اور ہمارا دھرم اور۔ پھر اس کی آتما آپ کے بس میں کیسے آئے گی؟“

”اچھا۔ تو اس بات پر الجھن میں ہو تم؟“ سوامی مزید لبالب لٹ گیا۔ ”یہی تو تمہاری نا سمجھی ہے پنڈت کہ تم میری کالی شکلیوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ آتما کے کتنے روپ ہوتے ہیں اور ان کو کیسے اپنے بس میں کیا جاتا ہے؟ یہ تم اب دیکھو گے۔ بس جیسے میں کہتا ہوں چپ چاپ ویسے کرتے جاؤ۔ بہت جلد وجہ ہماری ہوگی اور اس گاؤں پر راج بھی ہمارا ہی ہوگا تم نہیں جانتے کہ اس گاؤں کی بھارت ماتا کے لئے فوجی نقطہ نظر سے کتنی اور کتنی اہمیت ہے؟ مگر یہ باتیں تمہارے سمجھنے کی نہیں ہیں اور میں بھی کیسا لگدا ہوں کہ تم سے وہ باتیں بھی کئے جا رہا ہوں جن کی تمہیں بھگ بھی نہیں پڑنی چاہئے۔“ وہ اپنے آپ پر ہی بگڑ گیا۔

”آپ گردھاری لال پر پورا پورا دوساں کر سکتے ہیں سوامی جی۔“ ایک دم پنڈت کا لہجہ گھمبیر ہو گیا۔ ”بھارت ماتا کے لئے اپنے دھرم کے لئے میں کس حد تک جاسکتا ہوں کبھی سے آیا تو آپ جان لیں گے۔“

”ایسا کیا؟“ سوامی اٹھا اور آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

”جی سوامی جی۔ ایسا ہی ہے۔“

”تو ٹھیک ہے۔ مجھے بھی تمہارے جیسے ہی دھرم داسوں کی ضرورت ہے پنڈت۔ اگر تم اپنے جیسے چند اور لوگ پیدا کر سکو تو ہم اپنے ارٹھ میں بہت جلد کامیاب ہو سکتے ہیں۔“

”میں آج ہی سے اس پر کام شروع کر دوں گا سوامی مہاراج۔ آپ پھکر نہ کریں۔ جتنے لوگ چاہئیں ہوں گے مل جائیں گے آپ کو۔“

”حویلی؟ کوئی حویلی؟“ سوامی اب بھی نہ سمجھا۔
 ”اب آپ سے کیا چھپا ہے سوامی جی۔“ پنڈت نے مسمیٰ آواز میں کہا۔ ”رجاتی بابو کے گھر
 نوکری کرنا چاہتی ہے جی۔“

”وہ کیوں؟“ سوامی کو جیسے کسی بچھونے کاٹ لیا اور وہ بے اختیار اچھل پڑا۔
 ”اب میں کیا بتاؤں آپ کو سوامی جی۔۔۔“ پنڈت نے نظر جھکا لیا۔
 ”دیکھو پنڈت۔ کچھ مدت چھپاؤ مجھ سے۔ صاف صاف بتاؤ اصل بات کیا ہے؟ وہ ایک ہندو کنیا
 ہے اور نوکری کرنا چاہتی ہے ایک مُسلے کے گھر۔ کیوں؟“ سوامی کی آواز میں غراہٹ سی ابھر آئی۔
 ”وہ جی۔۔۔ وہ۔۔۔“ پنڈت ہٹکایا۔

”جھوٹ نہیں پنڈت۔ جھوٹ نہیں۔ سچ اور صرف سچ۔ جلدی بولو۔“ سوامی نے اپنے استخوانی
 ہاتھوں سے جو اس کے گلے شانے جکڑے تو پنڈت کے چہرے پر درد کے باعث کرب کے آثار نمودار
 ہو گئے۔

”وہ مونس بابو پر مرمی ہے سوامی جی۔۔۔ ہائے میرا کندھا۔۔۔“ وہ کراہا تو سوامی نے ایک جھٹکے
 سے اس کے شانے چھوڑ دیے۔ غصے میں کھولتا وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور فرش پر کسی زنجی درندے کی مانند
 ٹپٹپٹ لگا۔ اس کے ہاتھوں کی مٹھیاں بار بار سچ اور گھل رہی تھیں۔
 ”ایک ہندو ناری ایک مُسلے کے عشق میں مری جا رہی ہے اور تم اس کی سہائتا کے وچن پر اس کے
 مُٹھے لے کر خوش ہو رہے ہو پنڈت۔ جی چاہتا ہے تمہارا گلا دبا دوں۔ ایسی سچ حرکتوں کے بل پر تم
 بھارت ماتا کی سیوا کرنے کے دعوے کر رہے ہو۔“ وہ رکا اور غراتے ہوئے پنڈت کی جانب گھورنے
 لگا۔

”ہم بہت مزبور ہیں سوامی جی۔“ پنڈت نے بیچارگی سے کہتے ہوئے سر جھکا لیا۔ ”وہ مونس بابو
 کے عشق میں بہت آگے جا چکی ہے۔ اب اس سے بڑی کیا بات ہوگی کہ اس کے لئے وہ اپنی اجبت تک
 دینے کو تیار ہو گئی ہے۔ میں نے اسے سمجھانے کی بہت کوس کی مگر وہ تو جان دینے اور جان لینے کی باتیں
 کرنے لگتی ہے جی۔“

”ہوں۔۔۔“ سوامی نے مٹھیاں بھینچ کر آنکھیں بند کر لیں اور سر اوپر اٹھا کر گہرے گہرے
 سانس لینے لگا۔ یوں جیسے کوئی درندہ اپنے شکار کی بو پانے کے لئے فضا سوگھ رہا ہو۔

چند لمحے اسی حالت میں گزر گئے۔ پھر وہ اعتدال پر آ گیا۔ اس نے نگاہیں دروازے کے ساتھ
 پڑی اپنی کھڑاؤں پر جمادیں۔ کچھ دیر سوچتا رہا پھر آگے بڑھا اور اپنی سابقہ جگہ پر آ بیٹھا۔ حیرت انگیز طور
 پر دمہ سکون ہو چکا تھا۔

”مگر تم تو بتا رہے تھے وہ بڑی تیز کناری ہے۔ کسی کو پٹھے پر ہاتھ نہیں دھرنے دیتی۔“
 ”پنڈت سے یہاں کس کا پیٹ چھپا ہے سوامی جی۔ اس ناری کا نام ہے بیلا۔ اس کا ایک عاشق
 ہے نندکار۔ اس کا بڑا مال کھا چکی ہے مگر چو ماچائی سے آگے بڑھنے ہی نہیں دیتی اسے۔ اب تو وہ اسے
 کسی بھی طرح حاصل کرنے پر تیار بیٹھا ہے۔ ادھر بیلا آئی تھی ایک دن میرے پاس کہ میں نندکار سے کسی
 طرح اس کا پنڈا چھڑا دوں۔ تین سو روپے اور تین مُٹھے بھی دے گئی تھی۔“
 ”مُٹھے کیا؟“ سوامی نے دوسرا گلاس بھرتے ہوئے پنڈت کی جانب دیکھا۔ بیلا کے تصور ہی
 سے اس کی آنکھیں سرخ ہو کر تارے لگ گئی تھیں۔

”اب آپ کو بھی سمجھانا پڑے گا سوامی جی۔“ پنڈت جیسے شرمایا گیا۔ ”مُٹھے۔ بیلیاں۔ آپ سمجھ
 جائیے ناں۔“

”اچھا اچھا۔“ سوامی نے سمجھ کر زور سے سر ہلایا۔ ”مگر وہ اس سے آگے کیسے مانے گی؟“
 ”میں نے اسے بتایا ہے کہ آپ مہمان سکتیوں کے مالک ہیں۔ اگر وہ آپ کو گھس کر دے تو نند
 کار سے اس کی جان چھوٹ جائے گی۔ وہ اسے تنگ بھی نہیں کرے گا اور مال بھی دان کرتا رہے گا۔“
 ”یعنی بیلا پر مال نندکار لٹا رہا ہے گا اور مُٹھے تم لیتے رہو گے۔ ہے ناں؟“ سوامی بڑے زور سے
 ہنسا۔
 ”جی سوامی مہاراج۔ بس آپ کچھ ایسا کر دیں کہ وہ نندکار اس بیلا کا بیوک بن کر رہے۔ ڈاکا
 مارنے کی کوس نہ کرے۔“

”ہوں۔۔۔“ تیسرا گلاس بھرتے ہوئے سوامی نے ہنکارا بھرا۔ ”کرتے ہیں کچھ۔۔۔ مگر
 پہلے وہ تو مجھے پرسن کرے۔“

”یہ تو پہلی سرط ہے جی۔ میں نے اسے صاف صاف بتا دیا تھا کہ اس کے بغیر اس کا کام نہیں ہو
 سکتا۔ اور وہ بھی سمجھتی ہے سوامی مہاراج کہ کالی سکتیاں سریر ملاپ کے بغیر کوئی کام نہیں کرتیں۔“
 ”اچھا۔ اتنی سمجھدار ہے وہ کہ ایسی باتیں بھی جانتی ہے؟“ سوامی نے ایک بڑا گھونٹ لیتے ہوئے
 بے یقینی سے کہا۔

”بڑی چھٹال ہے جی۔“ پنڈت نے آواز دہائی۔ ”آپ کیا سمجھتے ہیں کہ مجھے اس نے ایسے ہی
 مُٹھے دے دیے۔ کبھی تھی کہ اگر اس کا ایک اور کام ہو جائے تو وہ پوری ایک رات میرے ساتھ گزارے
 گی۔“

”وہ کونسا کام ہے؟“ سوامی کے کان کھڑے ہوئے۔

”حویلی میں نوکری کرنا چاہتی ہے جی۔“

تو بس۔ کل ہی نندنی کو بلا کر رازداری کے وعدے پر اس سے بات کرلو۔ بیلا کو میں بتاؤں گا کہ اسے حویلی میں اپنے عشق کا کھیل کھیلنے کے ساتھ ساتھ ہمارے لئے کیا کرنا ہے۔“
”اور وہ نندکار۔۔۔“

”اسے جو کہنا ہے میں تمہیں ابھی جانے سے پہلے سمجھا دوں گا۔ اتنے ہی میں اس کے کس بل نکل جائیں گے۔“ سوامی نے لاپرواہی سے کہا۔ ”وہ بیلا پر مایا تو لٹائے گا مگر اسے چھونے کا وچار بھی بھول جائے گا۔“

”ایسا ہو جائے تو میری بے بے کار ہو جائے گی سوامی جی۔“ پنڈت نے خوشامد سے اس کے گھٹنے چھو لئے۔

”تو چلو۔ نندکار کا کام تمہارے نام۔ اسے آج ہی رات کو بلاؤ۔۔۔ مگر ابھی تک تمہاری وہ بیلا نہیں پہنچی۔ اب تو میرا نشہ بھی ٹوٹنے لگا ہے۔“ سوامی نے شکاری کتیا جیسا پتلا منہ آخر تک کھول کر ایک لمبی جھانکی لی۔

”بس آتی ہی ہوگی جی۔ ویسے وہ دیر کرنے والی ہے تو نہیں۔ کوئی جروری کام نہ آ پڑا ہو۔“ پنڈت نے کمرے کے دروازے کی جانب دیکھا۔ پھر چونک پڑا۔ اسی وقت دروازے پر کسی کی پرچھائیں ابھری اور اس کے منہ سے نکلا۔ ”سوامی جی۔ بیلا آگئی۔“
سوامی نے جب اور گلاس ایک طرف سرکا دیے اور نیم دروازہ کھولا۔

”بس پائیں برس کی بیلا کو کسی جج دج کی قطعاً ضرورت نہ تھی پھر بھی اس نے ہلکے ہلکے میک اپ سے وہ قیامت ڈھا رکھی تھی کہ سوامی دھیرج داس کا دھیرج انگڑائیاں لے لے کر دم توڑنے لگا۔ وہ رات والے لباس ہی میں تھی۔ نیلی چولی، سرخ سوتی ساڑھی اور تاروں والی اور ہنسی میں ملبوس وہ نظریں جھکائے آئی اور پنڈت کے اشارے پر سوامی کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

”سوامی جی۔ یہ ہے بیلا جس کی بات میں آپ سے کر رہا تھا۔“

”ہوں۔۔۔“ سوامی نے اس کے حشر انگیز سر اپنے کوٹنگا ہوں ہی نگاہوں میں پیتے ہوئے سیاہ لبوں پر کسی سانپ کی طرح زبان لپلپائی۔ پھر پنڈت کی طرف دیکھا۔ وہ اس کا عندیہ سمجھ کر اٹھا۔

”بیلا۔ سوامی جی سے من کی مراد پانے کے لئے انہیں کھس کر دے۔ ماں کالی کی کرپا سے یہ تیرے سارے کاج سنوار دیں گے۔“ اس نے بیلا کا شانہ دبایا اور باہر کو چل دیا۔

فرادیر بعد مندر کے دروازے کو باہر سے تالا لگنے کی آواز سن کر بیلا کا دل سینے میں اور زور سے دھڑکنے لگا۔

”تو بیلا نام ہے تیرا؟“ سوامی نے وقت ضائع کئے بغیر ہاتھ بڑھا کر بیلا کی ٹھوڑی کو چھوا اور اس کا

”پنڈت۔۔۔“ خالی جگ سے کھیلتے ہوئے سوامی نے نرم لہجے میں کہا تو پنڈت گردھاری لال چونکا۔ اس نے نظر اٹھائی۔ سوامی دھیرج داس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

”بیلا نے ہمارا کام اور آسان کر دیا ہے۔۔۔“

”کیا مطلب؟“ پنڈت حیران ہوا۔

”یہ بتاؤ کہ حویلی میں ایک ہندو کتیا کو نوکری دے گا کون؟“

”وہاں پہلے بھی ہماری دوناریاں کام کرتی ہیں جی۔ ایک تو گنوتا اور بھینسوں کو چارہ ڈالتی ہے اور دوسری حویلی میں اوپری مٹھائی وغیرہ اور کھانا پکانا کرتی ہے۔“

”جو صفائی اور کھانے کا کام کرتی ہے وہ ناری کون ہے؟“

”اپنی بستی کی ایک گریب عورت ہے جی۔ نندنی۔۔۔ کھاوند کھٹو ہے اس لئے کھد کام کاج کر کے گھر گیارہ کرتی ہے۔“

”کیا تنخواہ لیتی ہے وہاں سے؟“

”ہمارے پل جاتے ہیں جی اور کپڑا کھانا لگ سے۔“

”تمہارا اس پر کتنا حکم چلتا ہے؟“

”کسی بات سے انکار نہیں کرتی جی۔“

”اس کے بھی اٹھے لیتے ہو یا۔۔۔؟“ سوامی نے اسے غور سے دیکھا۔

”وہ جی۔۔۔“ پنڈت نے شرابا کر آنکھیں جھکا لیں۔ ”میں اکیلا اور رٹوا ہوں سوامی جی۔ ایسے ہی گیارہ بجارہ کر لیتا ہوں۔“

”ہوں۔۔۔ تو بس کام ہو گیا۔“ سوامی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”نندنی کو بلا کر اس بات پر آمادہ کرو کہ وہ اپنی جگہ کسی بہانے سے بیلا کو نوکری پر رکھوادے۔ اسے ایک ہزار کی جگہ ہر مہینہ پندرہ سو روپے گھر بیٹھ لے جایا کریں گے۔ بولو۔ ایسا کر سکو گے؟“

”کیوں نہیں جی۔۔۔ مگر۔۔۔“

”میں نے کہا ناں پنڈت۔ دھن کی پرواہ مت کرو۔ وہ تمہیں اتنا ملے گا کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ بس یہ یاد رہے کہ اپنی جاتی کے کسی فرد سے ایسا سلوک نہ کرنا کہ وہ ہمارے بجائے منسلکوں کے گن گانے لگے۔ نندنی سے جو کہا ہے اس کے مطابق برتاؤ کرنا۔ کبھی اس کے پیسے نہ روکنا۔ مٹھے لیتے رہو مگر سلوک میں کڑواہٹ کبھی نہ آنے دینا۔ اپنے لوگوں کو بھی تم اسی طرح ہاتھ میں رکھ سکو گے ورنہ تو وہ جس کا کھائیں گے اسی کے بچن گائیں گے۔“

”میں سمجھ گیا سوامی جی۔ آپ جیسا چاہتے ہیں ویسا ہی ہوگا۔“

”اتنی جلدی۔۔۔؟“ وہ حیران ہوئی۔

”اور پرسوں تجھے حویلی میں کام پر جانا ہے۔“

”کیا؟“ بیلا کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

”اب تو میرا پہلا کام کرنے سے پہلے اپنا دوسرا کام سمجھ لے۔“ سوامی نے پوری طرح سے سنجیدگی کا چولا پہن لیا۔

جواب میں بیلا اسے خاموش اور حیران حیران نظروں سے دیکھتی رہی۔ ظاہر ہے اسے سوامی کی باتوں پر دشواں نہ آیا تھا۔ وہ تو اندھا داد کھیلنے آئی تھی۔ اتنا تو جانتی تھی کہ ہندو دھرم میں جادو ٹونہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ کالی شکتیوں کے چسکار بار بار دیکھ چکی تھی۔ اسی لئے اس نے اپنا من پنڈت پر کھول دیا کہ شاید وہ اس کے کسی کام آ سکے۔ پھر جب اس نے پنڈت کی زبانی سوامی دھیرج داس کی کالی شکتیوں کے بارے میں سنا تو یہ سوچ کر کہ کالی کا بھگت اپنی مہان شکتی کے بل پر جو چاہے کر سکتا ہے، اپنا تن داد پر لگا دینے کا کھیل مونس کو جیت لینے کی امید پر کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔ کئی مہینوں سے مونس کی محبت میں یکطرفہ چلتے چلتے اب وہ تھک گئی تھی۔ چاہتی تھی کہ کم از کم مونس کے قریب تو رہ سکے۔ شاید اسی طرح اس کے اندر راتے جانے کا راستہ مل جائے۔

”پہلے یہ بتا کہ تو ایک ہندو ناری ہو کر ایک مسلمے کے پریم میں کیسے گرفتار ہو گئی؟“ سوامی نے اسے چبھتی بولی نظروں سے دیکھا۔

”میں خود نہیں جانتی کہ یہ سب کیسے ہو گیا۔“ بیلا نے صاف گوئی سے کہا۔ ”مجھے تو اس سے پتہ چلا جب اس کے لئے میری راتیں جوگن اور دن بنجارے ہو گئے۔ میری نیندیں مجھ سے چھن گئیں اور میرا چھین مجھ سے روٹھ گیا۔ سوامی جی۔ آپ مجھے اُن دھری کہہ لیں یا انٹ ڈھری۔ میں اب مونس بابو کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ انہیں حاصل کرنا تو شاید میرے نصیب میں نہ ہو، پھر بھی میں ان کے قریب رہ سکوں، میرے لئے اتنا ہی بہت ہے۔“

سوامی اسے خاموشی سے تکتا رہا۔ اسے دشواں تھا کہ بیلا بچ کہہ رہی ہے۔ اس کا لہجہ اور آنکھیں جھوٹ نہیں بول رہی تھیں۔ ایسے سچے لوگوں کو چھل لینا بہت آسان ہوتا ہے، یہ وہ خوب جانتا تھا۔ اپنے مطلب کے لئے بیلا کو استعمال کرنا اسے کوئی مشکل نہ لگا۔ بس ذرا سی ہوشیاری کی ضرورت تھی اور اس کا کام ہو جاتا۔

”ٹھیک ہے بیلا۔ میں ایک کٹر ہندو اور کالی کا بھگت ہونے کے باوجود تیرے راستے میں نہیں آؤں گا۔ ہمارے درمیان سودا یہ ہوتا ہے کہ تو میرا کام کرے گی اور میں تیرا جیسا میں نے کہا کہ تیرے دونوں کام کل اور پرسوں کے دن میں ہو جائیں گے۔۔۔ مگر تجھے میرا جو دوسرا کام کرنا ہے اس کے

چہرہ اوپر اٹھایا۔

”جی۔۔۔“ بیلا کی مدد بھری آنکھیں کیا انھیں سوامی کا دھیرج زمیں بوس ہو گیا۔

”سب کاج کشل ہو جائیں گے تیرے۔ یہ ہمارا دین ہے۔“ اس کی آواز لرز گئی۔

”اور اگر ایسا نہ ہوا تو؟“ بیلا نے پیپا کی سے سوامی کو نظروں میں تو لا۔

”تو ہمارے جنم میں تھوک دینا۔“ سوامی ہنسنے سے اکھڑ گیا۔

”اس سے مجھے کیا فائدہ ہوگا؟“ بیلا نے اسی انداز میں کہا۔

”مطلب؟“ سوامی حیرت سے بولا۔

”مطلب یہ کہ میرا تو کام ہونا چاہئے۔ میں آپ کی مرضی کی قیمت دے رہی ہوں۔ کام میری

مرضی کا ہونا چاہئے۔“

”ہوں۔۔۔“ سوامی نے گہری سانس لی۔ اسے یاد آ گیا کہ پنڈت نے اس کنیا کا ذکر چھٹال

کہہ کر کیا تھا۔ واقعی اس نے درست کہا تھا۔ وہ سودے بازی میں پورے بول تول سے کام لے رہی

تھی۔ ”کام بول اپنا۔“ سوامی بھی سیدھا ہو گیا۔

”پنڈت نے نہیں بتایا آپ کو؟“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

”پنڈت کو چھوڑ۔ تو خود بول۔“

”دو کام ہیں۔“ وہ بھی شاید وقت ضائع نہ کرنا چاہتی تھی۔

”سن رہا ہوں۔۔۔“ سوامی نے پلکیں موند لیں۔

”نندکار میری جان چھوڑ دے۔“

”اور۔۔۔؟“

”حویلی میں نوکری۔“

”تیرے دونوں کام ہو جائیں گے۔۔۔ مگر دو کے بدلے تجھے بھی میرے دو ہی کام کرنا ہوں

گے۔“

”یعنی ایک بار اور آنا پڑے گا مجھے؟“ بیلا نے آہستگی سے پوچھا۔

”نہیں۔ وہ دوسرا کام ہے۔“

”وہ کیا؟“

”بتاتا ہوں۔ ذرا دم لے۔“ سوامی پر خیال لہجے میں بولا۔

”نندکار میری جان کیسے چھوڑے گا؟“

”کل تو خود جان لے گی۔“

بارے میں تجھے وجہ دینا ہوگا کہ تو اس کے بارے میں کبھی زبان نہیں کھولے گی۔۔۔ مونس بابو پر بھی نہیں۔

”ایسا کیا کام ہے وہ؟“ وہ دھیرے سے چوکی۔

”کام تو کام ہے بیلا۔ کیا میں نے تیرے کام کے بارے میں اپنے دھرم پر سمجھوتہ نہیں کیا؟ ایک مسئلے کے ساتھ تیرے ملن کا رستہ کھونا کرنے کے بجائے میں نے تجھے اس تک پہنچانے کا کارن پیدا کرنے کا رستہ لیا ہے۔ کیا اس کے بعد بھی تو میرے کام کے لئے چہر چڑ اور کھوج کھاٹ سے کام لے گی؟ کیا تجھے یہ شوبھا دیتا ہے کہ تو میرے سامنے کیوں اور کیا جیسے شہد منہ سے نکالے؟“

”نہیں۔“ بیلا کا سر جھک گیا۔ ”شنا چاہتی ہوں سوامی جی۔ آپ کہنے مجھے وہاں کیا کرنا ہوگا۔ کیوں ایک بھتی ہے کہ ایسا کوئی کام نہ کہنے گا جو میرے مونس بابو کے خلاف جاتا ہو۔“

”پگلی ہوئی ہے۔“ سوامی نے پیار سے اس کے رخسار پر ہاتھ پھیرا۔ ”میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر سیدھے سبھاؤ ہمارا کام ہو گیا تو شاید میں اپنی شغلی سے کام لے کر مونس بابو کو تیرے ساتھ جوگ کے لئے بھی منادوں۔“

”نہیں۔“ بے یقینی سے بیلا نے کہا اور اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“

”اور اگر ہو گیا تو؟“ سوامی ہولے سے بڑھا۔

”تو میں ساری زندگی آپ کے پاؤں دھو دھو کر پیوں گی سوامی جی۔“ بیلا نے سوامی کے پیر تھام لئے۔

”سوچ لے۔ بہت بڑی بات کہہ رہی ہے تو۔“ سوامی نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”سوچنا کیا ہے سوامی جی۔ بیلا کا سوائے مونس بابو کے پریم کے اور ہے ہی کیا اس جگ میں۔ اسی کی قسم کھاتی ہوں کہ آپ جو کہیں گے میں کروں گی۔ بس مونس بابو کو میرا بناد دیجئے۔“

”کام تو سن لے جو تجھے حویلی میں میرے لئے۔۔۔ نہیں میرے لئے نہیں بھارت ماتا کے نام پر کرنا ہوگا۔“

”میں نے بغیر ہی تیار ہوں سوامی جی۔ سمجھ لیجئے اگر کسی کی جان بھی لینا ہے تو میں مونس بابو کے نام پر ہنس کر لے لوں گی اور اگر جان دینے کی بات ہے تو ابھی لے لیجئے۔“ بیلا نے پنگلوں کے سے انداز میں کہا۔ عشق کی سچائی پوری طرح اس پر حاوی ہو چکی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اس کے حواس پر مونس کا خیال اسے پالینے کی خوش کن امید سوار ہو چکی تھی۔ اسے اور کچھ کیا سو جھتا؟

”تو ہوا سودا؟“ سوامی نے اپنا کالا چرخ ہاتھ آگے بڑھایا۔

”ہوا۔“ بیلا نے اس کا مکروہ ہاتھ اپنے گورے چپے ہاتھ میں مندر کے پرشاد کی طرح تھاما اور

ہونٹوں سے لگا لیا۔ بیلا کی یہ حرکت سوامی کے خشک استخوانی ڈھیر میں ماچس کی جلتی ہوئی تیلی ثابت ہوئی۔ وہ ایک دم آپے سے باہر ہو گیا۔ جھپٹ کر اس نے بیلا کو اپنی باہوں میں لیا اور مر کھنے لگے کی طرح اس پر ٹوٹ پڑا۔

☆=====☆=====☆

نندکار سہا ہوا پنڈت گردھاری لال کے سامنے بیٹھا تھا جو اسے یوں گھر کر رہا تھا جیسے نندکار رنگے ہاتھوں چوری کرتے پکڑا گیا ہو۔

”تو کیا سمجھتا ہے کہ بیلا کو مایا کی چھب دکھا کر اسے اپنی ران تلے دبا لے گا۔ مورکھ۔ وہ سوامی جی کی داسی ہے اور سوامی جی کے بارے میں تو اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ کالی کے بھگت ہیں۔ اگر انہیں پتہ چل گیا اور گھصہ آ گیا تو جانتا ہے وہ تیرا کیا حشر کریں گے؟“

”میں شنا چاہتا ہوں پنڈت جی۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ سوامی جی کی داسی ہے۔ نہ ہی بیلا نے مجھے اس بارے میں بتایا۔ میں تو اب اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھوں گا بھی نہیں۔ بھگوان کے لئے آپ سوامی جی تک یہ بات نہ جانے دینا۔“ نندکار نے پنڈت کے پاؤں پکڑ لئے۔ وہ طیر یا بخار کے مریض کی طرح کانپ رہا تھا۔ رنگ اس کا زہر پڑ گیا اور حلق خشک ہو گیا۔ اس کی آواز میں ایک آنجانا سا خوف نمایاں تھا جو ظاہر ہے سوامی دھیرج داس کے حوالے سے تھا۔ اس کی کالی شکلیاں بھتی کے کسی بھی ہندو مرد یا عورت کو خردہ کر دیتے ہیں۔

”کتنا مال کھلا چکا ہے اب تک اس چھنال کو؟“ پنڈت نے آواز میں طنز بھر کر پوچھا اور اپنے پاؤں پیار دیے۔

”چھوڑیے پنڈت جی۔ خاک ڈالئے اس بات پر۔ میں سمجھوں گا جوئے میں لمبی ہار ہو گئی۔“ نندکار سر جھٹک کر بولا اور پنڈت کے پاؤں دابنے لگا۔

”پھر بھی۔۔۔ کچھ پتہ تو چلے۔ کیسا عشق سوار تھا تجھ پر؟“

”بس یہی۔ پندرہ بیس ہزار۔۔۔“ نندکار نے سر جھکا لیا۔

”پندرہ بیس ہزار۔۔۔“ پنڈت کا سانس رک گیا۔ ”بے بھگوان۔۔۔“ اس نے اپنے گال پیٹ ڈالے۔ ”مورکھ۔ نالائق۔ بیچوے۔۔۔ بھگوان کے نام پر تو کبھی ایک اٹھنی دیتے ہوئے بھی تیرے ہاتھ کا پتہ ہیں اور اس چھنال پر پندرہ بیس ہزار لٹانے کی بات یوں کر رہا ہے جیسے پندرہ بیس چونیوں کی بات ہو۔ بہت تیرے جتنوں کی۔۔۔“ پنڈت نے اس کے لئے جو لینے شروع کئے تو نندکار کی اگلی بچھلی پشتوں نے کانوں میں روٹی ٹھونس لی۔ جوں جوں پنڈت کی زبان کی دھارتیر ہوتی گئی نندکار کے ہاتھ زیادہ شدت سے اس کے پاؤں دابنے لگے۔

”اس اماں پر تو ہر رोज سینکڑوں لٹا تا ہے۔ بھگوان کے نام پر کھرچ کرتے ہوئے جیب پھٹنے لگی ہے۔“ پنڈت نے اس کے پہلو میں کچوکا دیا۔ ”مگر یاد رکھ۔ اگر ٹو ایسا نہیں کرے گا تو میں سوامی جی سے۔۔۔“

”نہیں نہیں پنڈت جی۔ ایسا کچھ نہ کیجئے گا۔ میں تو۔۔۔ میں تو۔۔۔“ نندکار ہکا کر رہ گیا۔
”کیا بکری کی طرح میں میں کر رہا ہے؟ سیدھی طرح بول۔ ہاں کہ نہ؟“ پنڈت نے انگلی اس کی طرف اٹھادی۔

”ہاں پنڈت جی ہاں۔“ نندکار نے جلدی سے کہا۔ ”مگر کچھ میرا بھلا بھی تو ہونا چاہئے۔“ اب وہ کچھ کچھ سنبھل گیا۔

”کیسا بھلا؟“ پنڈت کی پیشانی پر تیوریاں پڑ گئیں۔

”بیلا تو ہاتھ سے لگی پنڈت جی۔ اب۔۔۔“

”ہاں ہاں۔ کہہ ڈال۔ جومن میں ہے کہہ ڈال۔“ پنڈت نے اسے شہ دی۔ وہ ایسے معاملات میں بڑا گھاگ تھا۔ سمجھ رہا تھا کہ نندکار کسی اور کنیا کی بات کرنے کو ہے۔

”میں بھگوان کے ہاتھ ساتھ آپ کی سیوا بھی الگ سے کرنے کی سوچ رہا ہوں۔ پنڈت جی۔“ نندکار کا خوف کی حد تک دور ہو چکا تھا۔ سوامی سے وہ ضرور خوفزدہ تھا تاہم پنڈت کو قلوب کرنا ہے آسان لگ رہا تھا۔

”ارے تو اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔ بالک۔ میری سیوا کرے گا تو میٹھا پھل ہی ملے گا تجھے۔ اس کا میں وجہ دیتا ہوں۔“ پنڈت کی رال بہہ نکلنے کو تھی۔

”پنڈت جی۔ وہ نندنی ہے ناں۔“ نندکار نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے آواز دبا کر پنڈت کی طرف دیکھا۔

”ہاں ہاں۔“ پنڈت کے کان کھڑے ہوئے۔

”اگر اس سے کچھ چکر چل جائے تو۔۔۔“ نندکار نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”ارے اس میں تو نے کیا دیکھ لیا مورکھ۔ وہ تو دو بچوں کی ماں ہے۔“ پنڈت حیران ہوا۔

”میں نے اسے ایک دن بارش میں بھیگتے ہوئے دیکھا تھا پنڈت جی۔“ نندکار کی آواز جیسے نشے سے بوجھل ہو گئی۔ آنکھوں کے پونے وزنی اور لہجہ خوابناک ہو گیا۔ ”اس کا جسم آپ نے نہیں دیکھا پنڈت جی۔ کیا کسی کنواری کنیا کا جسم ہو گا۔ اگر آپ اس معاملے میں میری کچھ سہاٹا کر سکیں تو میں جی جان سے آپ کی سیوا کرنے کو تیار ہوں۔“

”تو نے تو مجھے کشت میں ڈال دیا نندو۔“ پنڈت سوچ میں پڑ گیا۔ آنکھیں بند کر کے اس نے

”چھوڑ میرے چرن۔۔۔“ جب نندکار صرف پاؤں ہی دایتار ہا تو پنڈت نے اس کے ہاتھوں سے پاؤں ایک جھٹکے سے چھڑا کر دھکا دینا چاہا مگر نندکار کسی جو تک کی طرح پنڈت کے پیروں سے چٹ گیا۔ پنڈت نے اس کی کمر پر دو چار ہاتھ بھی رسید کر ڈالے۔ نندکار مار کھاتا رہا مگر اس نے پنڈت کے پیر نہ چھوڑے۔

”ارے بھک مٹے۔ چھوڑ میرے چرن۔ میں سوامی جی سے کہہ کر تیرا اشتیاق نہ کروادوں تو میرا نام بھی پنڈت گردھاری لال نہیں۔“ پنڈت نے ہانپتے ہوئے ایک بار پھر اسے پرے دھکیلتا چاہا۔
”ایسا نہ کیجئے گا پنڈت جی۔ میں آپ کی ہر طرح سے سیوا کروں گا۔“ نندکار نے پنڈت کے دونوں پیر خوب جکڑ لئے۔

”سیوا؟ تو میری کیا سیوا کرے گا بچے۔ میں تیری سیوا کے چکر میں آنے والا نہیں۔“ ثواب سوامی جی کے گج سے نہیں بچ سکتا۔ نہ نہ۔۔۔ میں ایسا ہونے ہی نہیں دوں گا۔ میں تو سوامی جی سے گھد کہہ کر تجھے برباد کرادوں گا۔“

”بھگوان کے لئے پنڈت جی۔ میں ہمیشہ مندر میں مایا دان کیا کروں گا۔ آپ جیسے کہیں گے ویسا ہی کروں گا مگر سوامی جی سے مجھے کشت نہ دلوائے۔ میں مر جاؤں گا۔“ نندکار باقاعدہ رونے لگا۔

”اگر ٹو سوامی جی کے ڈنڈے سے چٹنا چاہتا ہے تو تجھے میری دو بائیں مانا ہوں گی۔“ پنڈت نے بڑے سخت لہجے میں کہا۔ اب یہ اور بات ہے کہ لہجہ کو سخت بنانے کے چکر میں اس کی آواز سمجھنے ہوئے خچر کی طرح بیٹھ گئی تھی۔

”مجھے منظور ہے پنڈت جی۔ آپ جو کہیں گے میں کروں گا۔ بس آپ۔۔۔“

”تو ٹھیک ہے۔“ پنڈت نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”پہلی بات تو یہ ہے کہ ٹو بیلا سے کسی قسم کا پیر نہیں رکھے گا نہ اس پر بڑی خجڑا لے گا۔ آج سے وہ تیری ماں بہن ہے۔ ساتھ ہی اس پر دھن اسی طرح خرچ کرتا رہے گا جیسے اب تک کرتا آیا ہے۔“

”ٹھ۔۔۔ ٹھیک ہے جی۔ ایسا ہی ہو گا۔“ نندکار نے جلدی سے کہا۔

”اور دوسری بات یہ کہ ہر سنیچر کو ٹو یہاں مندر میں آ کر اپنے ہاتھ سے بھگوان کے نام پر مایا دان کیا کرے گا اور یہ دان کم آج کم سینکڑوں میں ہو گا۔“

”ہر سنیچر کو پنڈت جی۔۔۔؟“ نندکار کی سانس رک گئی۔

”کیوں۔ میا مر گئی؟“ پنڈت نے کسی لڑاکا بڑھیا کی طرح ہاتھ نچاتے ہوئے طنز سے کہا۔

”ابھی تو کہہ رہا تھا کہ جیسا میں کہوں گا تو ویسا ہی کرے گا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے پنڈت جی مگر ہر سنیچر کو اتنا دھن۔۔۔“

لیجئے۔ ان کا ڈراوا ہمارا کام آسان کر دے گا۔
 ”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ پنڈت سر ہلاتے ہوئے سوچ میں پڑ گیا۔ ”واقعی، سوامی جی کو ابھی واپس نہیں جانا چاہئے۔“

”ویسے اس بار وہ کتنی دیر رکیں گے یہاں؟“
 ”دو مہینے کا تو کہہ رہے تھے۔“

”دو مہینے تو بہت ہیں پنڈت جی۔“ نندکار نے دبے دبے جوش سے کہا۔ ”میں سمجھا شاید وہ ہفتے دو ہفتے میں لوٹ جانے والے ہیں۔“

”نہیں۔ دو مہینے سے شاید کچھ اوپر ہی رکیں گے۔ ان کا کام۔۔۔“ پنڈت کہتے کہتے رک گیا۔ اچانک اسے خیال آ گیا کہ سوامی جی نے اسے کچھ لوگوں کا انتظام کرنے کو کہا تھا۔ ”نندو۔ ایک بات تو بتا۔ اس نے اچانک گفتگو کا رخ پھیر دیا۔

”جی پنڈت جی۔“ نندکار نے اس کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
 ”مجھے بھارت ماما اور اپنے دھرم سے کتنا پریم ہے؟“

”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے پنڈت جی۔ میں ایک کٹر ہندو ہوں۔ سبے آیا تو بھارت ماما اور دھرم کے لئے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔“

”نندکار، پنڈت نے آواز دہائی۔ ”بات اپنے تک رکھنے کا بچن دے تو میں کچھ کہوں۔“

”بات اگر دین دھرم کی ہے تو آپ مجھ پر پورا دشاں رکھیں پنڈت جی۔ میں سر سے پاؤں تک کھشتری ہوں۔“

”تو سن نندکار۔“ پنڈت نے مندر کے کھلے دروازے سے باہر نظر دوڑا کر اطمینان کر لیا اور پھر کہا۔ ”سوامی جی یہاں اس بستی میں مندر بنانے کی اچھیا لے کر آئے ہیں اور اس کام کو پورا کرنے کے لئے انہیں چند ایسے لوگوں کی جرورت ہے جو سر دھڑ کی باجی لگا سکیں۔ جندگی کی پرواہ کئے بغیر ان کا ساتھ دے سکیں۔ اس کے لئے انہیں دھن بھی ملے گا اور کام پورا ہونے پر انعام بھی۔“

نندکار منہ پھاڑے پنڈت کی بات سنتا رہا۔ اسے جیسے اپنے کانوں پر دشاں نہ ہو رہا ہو۔ پنڈت خاموش ہوا تو اس کا سینہ میں انکا سانس خارج ہوا۔

”آپ سچ کہہ رہے ہیں پنڈت جی؟“ وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔
 ”سولہ آنے سچ نندکار۔“ پنڈت نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ بیحد سنجیدہ ہو رہا تھا۔ ہر

وقت احسن نظر آنے والا پنڈت اس وقت نجانے کہاں جا سویا تھا۔

”اگر ایسا ہے پنڈت جی تو جیالوں کی آپ فکر نہ کریں۔ ہماری بستی میں دو چار ایسے

بھی خیال ہی خیال میں نندنی کے سراپے کو نندکار کی نظر سے دیکھنا چاہا اور اسے محسوس ہوا کہ شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔

”آپ کے لئے یہ کوئی کشت کا کام نہیں ہے پنڈت جی یہ آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی سمجھتا ہوں۔ آپ جس طرح مجھے بیلا کے راستے سے ہٹا سکتے ہیں اسی طرح نندنی کو بھی راستے پر لا سکتے ہیں۔“ نندکار کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

”ہت۔۔۔“ پنڈت نے اسے ہاتھ دکھایا۔ ”اب تو مجھے ٹکڑے پاٹھ پڑھائے گا مورکھ۔“

”ایسا کہاں ممکن ہے پنڈت جی۔“ کہتے ہوئے نندکار نے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور چار پانچ سرخ نوٹ نکال کر پنڈت کی ران تلے دے دیے۔ ”یہ پہلی قسط ہے آپ کی ادھیری سا جھجھداری کی۔ نندنی کے علاوہ اور بھی ہرنیاں ہیں جن کے شکار میں آپ میری اور میں آپ کی سہانچا کر سکتا ہوں۔“

”ارے۔۔۔“ ران تلے دبے نوٹوں کے احساس سے پنڈت کا موڈ خوشگوار ہو گیا۔ ”تو کیا بستی کے ہر گھر میں ہا ہا کا رنچائے گا؟“

”نہ نہ۔۔۔“ نندکار نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”ساری بستی میں چند دانے ہیں پنڈت جی جنہیں چکھنا بہت ضروری ہے ورنہ وہ پڑے پڑے سڑ جائیں گے۔ یہ سن کا کام ہے کہ ہم جوانیوں کو خراب ہونے بھانڈے سے بچائیں۔ اس میں آپ میرا ساتھ دیں گے تو مایا کے ساتھ ساتھ اکثر کایا کلپ کا موقع بھی ملتا رہے گا۔ آپ بھی تو کتنے ہی سالوں سے اکلے پکڑے کا ڈنڈا بھونگ رہے ہیں۔ کبھی کبھی اس ڈنڈے سے مٹی پالینے میں کیا حرج ہے۔“

”بات تو تیری ٹھیک ہے نندو۔“ پنڈت نے اداس بکرے کی طرح سر جھکا لیا۔ ”آج تک بستی کی کسی استری نے میرے اکلے پے میں قدم ہی نہیں رکھا۔ اب تو نے میرا جی بڑھایا ہے تو سوچ رہا ہوں کہ تیری بات مان ہی لوں۔“

”سوچنا کیسا پنڈت جی۔ بس عمل کر ڈالئے میری بات پر۔“ نندکار نے اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر باتیں آنکھ دہائی۔

”تو بس ٹھیک ہے نندو۔ تو مایا کھرچ کرنے کے لئے نیت باندھ لے ہرنیوں کو تیرے بان کے سامنے میں لے آؤں گا مگر۔۔۔“

”مگر کیا پنڈت جی؟“ نندکار نے بیتابی سے پوچھا۔

”ہر سکر میں میرا حصہ رکھنا ہوگا تجھے۔“ پنڈت کی باجھوں سے رال بہہ نکلی۔

”یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے پنڈت جی۔ بس آپ سوامی جی کو کچھ سے کے لئے یہاں روک

جوان ضرور نکل آئیں گے جو درجنوں پر بھاری پڑیں گے۔“

”اور ٹو کب تک انہیں تلاش کر لے گا؟“ پنڈت نے بیقراری سے پوچھا۔

”بہت جلد۔ یہ میرا آپ سے وچن ہے۔“ نندکار نے پنڈت کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک لہرا رہی تھی۔ ایسی چمک جو اپنے شکار کو تاک کر کسی درندے کی آنکھوں کو بلور کر دیتی ہے۔

”تو تو آج ہی سے کام شروع کر دے نندکار۔ سوامی جی سے جایا نہیں کرنا چاہتے۔“ پنڈت نے اس کے شانے پر تھپکی دی۔ ”اور جیسا میں نے کہا، مایا کی پرواہ نہ کرنا، سوامی جی نے کہا ہے کہ دھن اس کام میں بھاگ لینے والوں پر یوں برے گا کہ کیا ساون کا بادل برستا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے پنڈت جی۔ میں آج ہی سے کام شروع کر دیتا ہوں۔۔۔ مگر اس کام کے ساتھ ساتھ ہمارا دوسرا کام جاری رہنا چاہئے۔۔۔“ نندکار اٹھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولا تو پنڈت کے موٹے موٹے ہونٹوں پر بڑی بھدی مسکراہٹ ابھری۔

”اس کی ٹو فکر نہ کر نندو۔ وہ کام اپنی جگہ اور یہ کام اپنی جگہ۔“

نندکار نے ہاتھ جوڑ کر اسے نمستے کیا اور رخصت ہو گیا۔ پنڈت اس کے جانے کے بعد کسی سوچ میں ڈوبا تھوڑی دیر بیٹھا رہا پھر چونکا تو اس وقت جب اسے دروازے پر کسی کی پرچھائیں کا احساس ہوا۔ اس نے چونک کر ادھر دیکھا۔ سوامی دھیرج داس کھڑا نہیں اٹارتے ہوئے اندر قدم رکھ رہا تھا۔ اس کے رہنے کے لئے مندر کے ساتھ والے مکان کے خاص کمرے میں انتظام کیا گیا تھا جہاں دن رات اسے ہندو عورتیں گھیرے رہتیں۔ ان سے جان چھڑا کر اب وہ پنڈت کے پاس آ رہا تھا۔ پنڈت نے بڑی پھرتی سے ران تلے دبے نوٹ نکال کر دھوتی میں اڑ سے اور ہاتھ جوڑ کر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ اس کے لبوں پر رام رام کے الفاظ یوں تیر رہے تھے جیسے کھڑے پانی کی سطح پر کائی۔

☆=====☆=====☆

گاؤں کے لوگ الجھن کا شکار ہو گئے تھے۔

فاق رزاتی کا کردار اور اس کے ساتھ ہر گاؤں والے کی محبت، راجیہ اور جنت کی افسوسناک موت کے نتیجے میں رزاتی کے ساتھ ان کی ہمدردیاں اپنی جگہ، لیکن خانہ خدا کو اس طرح سیل کر دینا ان کے حلق سے اتر نہ رہا تھا۔ باتیں گھروں کے اندر ہو رہی تھیں یا چوپال میں۔ قاری خادم حسین کے گھر میں قائم ہو جانے والی مسجد میں ہو رہی تھیں یا عورتوں کی محفلوں میں، کوئی سر ہاتھ نہ آ رہا تھا جو انہیں رزاتی کے اس اقدام کو جائز قرار دے دینے کی گرہ کھول دینے کا طریقہ سمجھا دیتا۔ عزیز سبھی کے مرتے رہتے ہیں مگر کوئی اس طرح آپے سے باہر نہیں ہو جاتا کہ اللہ سے مقابلے پر اتر آئے۔ لوگوں کے خیال میں یہ اللہ سے بغاوت بھی تھی اور اس کے سامنے سرکشی کے ساتھ کھڑا ہو جانے کے مترادف بھی تھا۔ تاہم کسی دل میں رزاتی کے لئے محبت میں کمی آئی تھی نہ احترام میں۔ ان کے لئے وہ آج بھی اتنا ہی قابلِ عزت تھا جتنا کل۔ بلکہ ہوا یہ کہ جوں جوں دن گزر رہے تھے، لوگوں کو اس کا دکھ مزید گہرا ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ انہیں لگ رہا تھا کہ کہیں نہ کہیں ضرور رزاتی کے ساتھ ان کے اندر کا محروم اور نا کام انسان سا جھجے دار ہے۔ دعاؤں کا قبول نہ ہونا، ان کا مطلوبہ اثر ظاہر نہ ہونا انسان کو کس ٹوٹ پھوٹ کا شکار کر سکتا ہے یہ انہیں سمجھ بھی آ رہی تھی اور وہ اس کے لئے رزاتی کو بے قصور گردانے پر بھی راضی ہوتے جا رہے تھے۔

مونس اپنے آفس میں بیٹھا کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ یہ سوچ کسی اور کے بارے میں نہیں، صرف سوامی دھیرج داس سے متعلق تھی۔ اسے بنانے کیوں وہ بڑا ہڈ اسرار سا کردار لگا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ ہستی میں ہندوؤں کے تہواروں میں شرکت کے لئے آتا رہا ہو گا، تاہم رزاتی اور مونس سے اس کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ اس کا راجیہ کی تصویر میں اس قدر دلچسپی لینا اسے کھٹک گیا تھا۔ وہ آتما کے چکر میں ڈال کر رزاتی کو کس الجھن کا شکار بنانا چاہتا تھا، مونس اس بارے میں تو ابھی تک کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا تھا تاہم یہ اس کی چھٹی حس کی پکار تھی کہ سوامی جو کچھ نظر آتا ہے اس سے بہت مختلف ہے اور ایسے انسان کے بارے میں اسے ممکنہ معلومات حاصل کرنا بہت ضروری لگ رہا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے سرحدی چوکی

گئے۔ ڈرائیور سر جھکائے کھڑا رہا۔

”بیٹھ جاؤ تم بھی۔“ مونس نے سپاٹ لیجے میں کہا تو ایک سپاہی نے ہتھکڑی کی زنجیر کو ہلکا سا جھکا دیا اور وہ بھی شکستہ سے انداز میں ایک کرسی پر ٹپک گیا۔

”غلام حسین۔ ان کو چائے پانی پوچھا؟“ مونس نے غلام حسین کی جانب دیکھا جو اس کے حکم کا منتظر کھڑا تھا۔

”جی سر۔“ مظفر ملک بول پڑا۔ ”ہم چائے پی چکے ہیں۔ بہت شکریہ۔ یہ حادثے کی رپورٹ ہے۔“ اس نے ایک بند لٹافہ مونس کی طرف بڑھا دیا۔

مونس نے لٹافہ تھام لیا۔ کھولنے لگا۔ پھر رک گیا۔ کچھ سوچا اور ایک گہری سانس لے کر غلام حسین کی طرف دیکھا۔

”رزاقی بابو کو خبر کرو اور ان سے پوچھو کہ وہ ان لوگوں سے کہاں ملنا پسند کریں گے؟“

”لیس سر۔“ غلام حسین باہر نکل گیا۔

پھر چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ انٹر کام چیج اٹھا۔ مونس نے ہاتھ بڑھا کر مٹن دیا اور اس کے ”لیس“ کہتے ہی دوسری جانب سے رزاقی کی آواز ابھری۔

”میں ملاقات کے کمرے میں ہوں مونس۔ ان لوگوں کو ہمیں لے آؤ۔“

”ٹھیک ہے۔“ مونس نے کہا اور انگلی ہٹائی۔ اسے رزاقی کی آواز میں بے گلی اور اضطراب سا محسوس ہوا۔ وہ اس کی وجہ سمجھ رہا تھا مگر یہ ضروری تھا کہ ان لوگوں سے رزاقی خود ملتا۔ یہ اس کا خالص ذاتی معاملہ تھا جس میں مونس دخل نہ دینا چاہتا تھا۔

ان لوگوں کو ساتھ لے کر وہ باہر نکلا اور رزاقی کے کمرے میں جا پہنچا۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں چند دن قبل سوامی دھیرج داس سے ان لوگوں نے ملاقات کی تھی۔ یہ کمرہ رزاقی کے آفس اور نجی ملاقاتوں دونوں کاموں کے لئے استعمال ہوتا تھا۔

رزاقی کمرے میں راجیہ اور جنت کی دیوار گیر تصویر سے پشت ٹکائے کھڑا دروازے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ لوگ کمرے میں داخل ہوئے تو بھی وہ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ اب وہ ان سب میں صرف اس ٹرک ڈرائیور کو گھورے جا رہا تھا جو اس کی اجڑی ہوئی حالت اور سر دنگ ہوں کی تاب نہ لا کر فرش پر نظریں جمائے لرز رہا تھا۔

مظفر ملک نے رزاقی سے اپنا تعارف کرایا۔ رزاقی نے اس سے ہاتھ ملانا ضروری خیال نہ کیا اور سر کے اشارے سے اس کے سلام کا جواب دے کر دوبارہ ڈرائیور کی طرف متوجہ ہو گیا جس کی ہتھکڑی ایک سپاہی کی پٹنی سے منسلک تھی اور دوسرا سپاہی بار بار اسے یوں کیڑ توڑ نظروں سے گھورنے لگتا تھا جیسے

والوں سے رابطہ کیا تھا اور انہوں نے بتایا تھا کہ سوامی دھیرج داس دو سال کے عرصے میں تیسری بار خالق مگر آیا ہے۔ کالے علم کا اس سے بڑا تاثر تک بنارس میں اور کوئی نہیں ہے۔ ہتھیلی پر سرسوں جمانے کے انداز میں کام کرتا ہے اور لوگ اس سے منہ مانگے معاوضے پر جائز ناجائز کام کراتے ہیں۔ عورت اور شراب کا رسیا ہے اور بڑے گھرانوں کی ہندو عورتیں خود بھی اس کے گرد منڈلاتی رہتی ہیں۔

یہ معلومات بڑی عام سی تھیں۔ مونس کی ان چند باتوں سے تسلی نہیں ہوئی تھی۔ وہ جو جاننا چاہتا تھا وہ کچھ اور تھا۔ اسے خود سمجھ نہ آ رہی تھی کہ وہ سوامی کے بارے میں کس قسم کی آگاہی چاہتا ہے مگر یہ طے تھا کہ وہ سوامی کی طرف سے ایک عجیب سی بے چینی کا شکار ہو چکا تھا۔

اچانک اس کی سوچوں کا ربط ٹوٹ گیا۔ انٹر کام کا بزر چیج رہا تھا۔ چونک کر وہ اس کی طرف متوجہ ہوا اور مٹن دیا۔ ”لیس۔“

”سر۔“ جی ٹی روڈ پولیس چوکی سے اے ایس آئی ایکسٹنڈ کی رپورٹ کے ساتھ آیا ہے۔

”ٹک ڈرائیور بھی اس کے ساتھ ہے۔“ دوسری جانب سے غلام حسین کی آواز ابھری۔

”اوہ۔۔۔“ اس کے اعصاب تن گئے۔ ”رزاقی کہاں ہے؟“

”اپنے کمرے میں ہوں گے سر۔ ان کا آفس تو بند پڑا ہے۔“

”اچھا۔ ان لوگوں کو کمرے پاس بھیج دو۔“ اس نے مٹن سے انگلی ہٹائی اور سیٹ سے اٹھ گیا۔ یہ اچھا تھا کہ رزاقی کے ساتھ براہ راست ان لوگوں کا سامنا نہ ہوا۔ وہ مضطربانہ انداز میں ٹھہرنے لگا۔

چند لمحوں کے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔

”کم ان۔“ اس نے قدم روک لئے اور آفس ٹیبل کے کونے پر ٹپک گیا۔

دروازہ کھلا۔ غلام حسین کے ساتھ کمرے میں ایک اے ایس آئی اور اس کے پیچھے دو سپاہیوں کے نرغے میں اس منحوس ٹرک کا ڈرائیور اندر داخل ہوا جس کے ساتھ ایکسٹنڈ میں راجیہ اور جنت کی ہلاکت ہوئی تھی۔

”سر۔“ اے ایس آئی نے آگے بڑھ کر ماتھا چھو کر سلام کیا اور ہاتھ مصافحے کے لئے بڑھایا۔

”اے ایس آئی مظفر ملک۔“

”مونس۔“ جواب میں مونس نے مختصر اُ کہا اور اس کا ہاتھ دبا کر چھوڑ دیا۔ اس کی نظریں ہتھکڑیوں میں جکڑے پینتیس چالیس سالہ ٹرک ڈرائیور پر جم گئیں۔ نیلے شلوار قمیض میں ملبوس، شیو بڑھی ہوئی اور چہرہ زرد۔ پریشانی اس کے حواس سے ٹپک رہی تھی۔ ظاہر ہے دو معصوم انسانوں کی جان لینے کا جرم سرزد ہوا تھا اس سے۔ اس کی ہزا کچھ بھی ہو سکتی تھی۔

”بیٹھے۔“ مونس نے کرسیوں کی جانب اشارہ کیا۔ مظفر ملک اور دونوں سپاہی کرسیوں پر بیٹھ

رزاقی کی توجہ چاہتا ہو۔

”آپ لوگ بیٹھے۔“ مونس نے صورتحال سنبھالتے ہوئے مظفر ملک سے کہا تو وہ ”شکریہ“ کہہ کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ دونوں سپاہی بھی منتظر تھے کہ انہیں بھی بیٹھنے کے لئے کہا جائے گا مگر مونس نے ڈرائیور کے ساتھ ہوتے ہوئے رزاقی کے موڈ کی درستی کے خیال سے انہیں بیٹھنے کو نہ کہا۔ صورتحال خاصے تناؤ کا شکار تھی۔ مزید بوجھل پن سے بچنے کے لئے مونس نے مظفر ملک کا دیا ہوا لفافہ رزاقی کی طرف بڑھایا۔

”یہ جائے حادثہ کی رپورٹ ہے۔“

”تم نے دیکھی۔“ رزاقی نے لفافہ تھام لیا۔

”نہیں۔“ مونس نے مختصر کہا۔

جواب میں رزاقی نے خاموشی سے لفافہ چاک کیا اور دو صفحات پر مشتمل رپورٹ پر نظریں دوڑانے لگا۔ پھر چند لمحوں کے بعد اس نے وہ صفحات مونس کی جانب بڑھادیے۔ مونس نے لے کر انہیں پڑھا۔

ایم وی ای کی رپورٹ کے مطابق حادثہ ٹرک ڈرائیور کی غلطی سے ہوا تھا۔ وہ اپنی سائڈ پر صبح آ رہا تھا مگر نیند میں تھا اس لئے اس کا ہاتھ اسٹیرنگ پر بہکا اور ٹرک راجیہ کی گاڑی پر چڑھ دوڑا۔ اپنا جرم اس نے پولیس کے رو برو کی تشدد کے بغیر قبول کر لیا تھا۔

”ہوں۔۔۔“ مونس نے رپورٹ لفافے سمیت میز پر ڈال دی اور رزاقی کی طرف دیکھا جو ڈرائیور کی جانب ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔ ”بات تو صاف ہے۔“

”کیا نام ہے تمہارا؟“ اچانک رزاقی کی سپاٹ آواز ابھری۔ ڈرائیور نے جیسے سنا ہی نہ تھا۔ وہ سر جھکائے کھڑا جوتے کی ٹوہ سے فرش کریدتا رہا۔

”اوئے۔۔۔“ خالی کھڑے سپاہی نے ڈرائیور کی گردن پر دھول رسید کی۔ ”صاحب کچھ پوچھ رہے ہیں تجھ سے ماماں۔ ٹوکس ہیر کے خیالوں میں گم ہے۔“

ڈرائیور گھبرایا۔ کپکپا کر گردن اٹھائی اور یوں جھپک جھپک کر رزاقی کو دیکھنے لگا جیسے چمکاؤ کو سورج کے سامنے کر دیا گیا ہو۔

فوراً ہی رزاقی نے ہاتھ اٹھا کر سپاہی کو مزید ایسی کسی بھی حرکت سے روک دیا۔ وہ کھینا سنا ہوا ہر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ مظفر ملک نے بھی سپاہی کو کڑی نظروں سے دیکھا اور پہلو بدل کر رہ گیا۔

”میں نے پوچھا تھا کیا نام ہے تمہارا؟“ رزاقی نے پھر اسی لہجے میں سوال کیا۔

”لال دین نام ہے جی میرا۔ سب لوگ لالو پھینا کہتے ہیں۔“ اس نے دھیمی آواز میں کہا اور پھر

سر جھکا لیا۔

”کب سے ٹرک چلا رہے ہو؟“

”سات سال سے جی۔“

”اس سے پہلے کتنے لوگوں کو مار چکے ہو؟“ عجیب سا سوال کیا رزاقی نے۔

”مگ۔۔۔ ک۔۔۔ کسی کو بھی نہیں جی۔“ لالو کی مونچھیں پھڑکیں۔ ”یہ پہلی بار ہوا ہے جی۔

میں تین راتوں سے مسلسل ڈیوٹی پر تھا۔ میرا ایک ہی بچہ ہے اور بہت بیمار ہے جی۔ اس کے لئے دوائیاں بہت مہنگی آتی ہیں۔ اسی لئے دن رات ڈیوٹی کر رہا تھا کہ چار پیسے بن جائیں گے۔ کیا پیہ تھا کہ۔۔۔“ وہ خاموش ہو کر ہونٹ کاٹنے لگا۔

”کیا ہوا تمہارے بچے کو؟“ رزاقی نے اسی سرد لہجے میں پوچھا جس میں وہ اب تک بات کرتا آ رہا تھا۔

”اے کالا ریکان ہے جی۔“ لرزتی ہوئی آواز میں لالو نے جواب دیا اور جیسے آنسو پینے کی کوشش کرنے لگا۔

”کتنی عمر ہے اس کی؟“

”چار سال جی۔“ لالو نے کہا اور سسکیاں لینے لگا۔

”شہری جنت کی عمر صرف دو سال تھی جسے تم نے لوٹ لیا۔“ شکستہ سی آواز میں رزاقی نے کہا اور پلٹ کر اپنے جنت کی ہستی ہوئی تصویر کو دیکھا۔ مونس کے دل پر چوٹ سی لگی۔ اس نے نگاہیں پھیر لیں۔

”سر۔“ مظفر ملک نے ہاتھ میں دبی فائل ذرا سا اٹھ کر میز پر رکھی۔ ”اس میں سارے کیس کی تفصیل کے ساتھ آپ کی اوپنیشن کے لئے فارم موجود ہے۔ آپ کا جو فیصلہ ہو اس پر سائن کر دیجئے۔“

مونس نے فائل اٹھائی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔

خالق نگر اور حکومت کے درمیان طے یہ تھا کہ جس جرم کا تعلق خالق نگر سے ہوگا اس کے بارے میں خالق نگر کے مالکان خود تحقیقات اور سزا کا فیصلہ کریں گے۔ سزا ملنے والوں کے مطابق دی جائے گی اور اس کے لئے سرکاری عملہ ان سے پورا پورا تعاون کرنے کا پابند ہوگا۔ اور اگر وہ جرم جی ٹی روڈ کی حدود میں واقع ہوگا تو اس کی تحقیقات سرکاری عملہ کرے گا۔ کیس فائل ہونے پر مجرم یا ملزم سمیت رزاقی (یا اس وقت کے خالق نگر کے مالک) کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اگر وہ اپنی طرف سے ملکی قانون کے مطابق جرم کی سزا تجویز کرے گا تو اس پر پورا پورا عمل کیا جائے گا اور اگر وہ اسے سرکاری عدالت کے سپرد کرنا چاہے گا تو عدالت کی جانب سے سنائی جانے والی سزا پر عملدرآمد کیا جائے گا۔ دونوں صورتوں میں مجرم یا ملزم سرکاری تحویل ہی میں رہے گا۔ کیونکہ خالق نگر میں کسی باقاعدہ جیل یا عقوبت خانے کا وجود نہیں

تھا۔ ہاں فوری اور عارضی نوعیت کے معاملات کے لئے آٹھ دس کمروں پر مشتمل ایک عمارت ضرور موجود تھی جہاں مجرموں یا ملزموں کو اس وقت تک رکھا جاتا تھا جب تک جی ٹی روڈ پولیس چوکی سے عملہ وہاں پہنچ کر انہیں اپنی تحویل میں نہ لے لیتا۔ دوسرے وہاں حویلی کے نیچے تقریباً بیس کنال پر پھیلا ہوا ایک ساؤنڈ پروف تہ خانہ تھا جو بی ایس ون اور ٹو کے نام سے دو حصوں پر مشتمل تھا۔ یہ دونوں حصے الگ الگ کاموں کے لئے استعمال ہوتے تھے۔ بی ایس ون یعنی ”بیسمنٹ سیل ون“ میں خالق نگر کے ان ملزموں اور مجرموں کو رکھا جاتا تھا جنہیں حکومت کے حوالے کرنے کے بجائے گاؤں کا سربراہ خود ان کے جرم پر سزا کا فیصلہ کرتا تھا۔۔۔ اور بی ایس ٹو یعنی ”بیسمنٹ سیل ٹو“ میں خاص قسم کے ان مہمانوں کو ٹھہرایا جاتا جن کو حویلی کے مہمان خانے میں ٹھہرانا مناسب خیال نہ کیا جاتا۔ تاہم آج تک اس عمارت اور بی ایس ون اور ٹو کو استعمال کرنے کی نوبت کم کم ہی آئی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ خالق نگر میں جرائم نہ ہونے کے برابر تھے اور یہ سب اس روایتی سسٹم کے باعث ممکن ہوا تھا جس پر وہاں پوری دیانتداری اور سختی سے عملدرآمد ہوتا تھا۔

مونسن نے دیکھا کہ فائل کا آخری ورق ایک فل سیکیپ فارم پر مشتمل تھا جس میں چند آپشنز دی گئی تھیں:

- ۱۔ چودہ سال فیڈ۔
- ۲۔ سزائے موت۔
- ۳۔ دونوں سزائوں پر یکے بعد دیگرے عمل درآمد۔
- ۴۔ ملکی عدالت میں کیس کی پروسیدنگ اور اس کے نتیجے میں جو بھی فیصلہ ہو اس سے اتفاق۔
- ۵۔ مجرم کو معافی۔

مونسن نے فائل کا تذکرہ صفحہ سامنے کرتے ہوئے فائل رزاتی کی جانب بڑھا دی۔ اس نے فائل لے کر آپشن سلپ پر ایک گہری نگاہ ڈالی۔

کمرے میں ایک دم سکوت سا چھا گیا۔ مظفر ملک کا خیال تھا کہ رزاتی قیدی یا سزا کے سامنے سائن کرے گا۔ دونوں سپاہیوں کا اندازہ تھا کہ رزاتی سزائے موت سے کم پر راضی نہیں ہوگا۔ لالو ساری جان سے لرز رہا تھا کہ نجانے اس کے لئے کیا حکم صادر ہوتا ہے؟

رزاتی نے فائل سے نظر ہٹائی اور لالو کی جانب دیکھا۔ ایک دم لالو آگے بڑھا۔ سپاہی اسے سنبھال ہی نہ سکا اور وہ رزاتی کے قدموں میں جا گرا۔

”میں اپنے بیٹے کی قسم کھاتا ہوں صاحب میں نے یہ ایکسیڈنٹ جان بوجھ کر نہیں کیا۔“ وہ بچوں کی طرح روتے ہوئے گڑگڑانے لگا۔ ”میری ان معصوم جانوں کے ساتھ کیا دشمنی تھی جو میں ان کی جان

لے لیتا۔ میں نیند کے ہاتھوں بے بس ہو چکا تھا جی۔ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب میری آنکھ چپکی اور کب یہ سب ہو گیا۔ مجھے معاف کر دیجئے صاحب۔ میرا بچہ ہسپتال میں ہے۔ میں جیل چلا گیا تو اس کا علاج نہ ہو سکے گا۔ وہ مر جائے گا صاحب۔ آپ کو اپنی بچی کا واسطہ۔ اپنی بہشتی بیگم صاحبہ کا صدقہ مجھے اللہ رسول کے واسطے معاف کر دیجئے صاحب۔ مجھے معاف کر دیجئے۔ میری جان بخش دیجئے۔ مجھے معاف کر دیجئے۔“

”اٹھ بے۔۔۔“ اچانک دونوں سپاہی اس پر چیلوں کی طرح چھپٹے مگر رزاتی نے ہاتھ اٹھا کر انہیں رانے ہی میں روک دیا۔ وہ رزاتی کے قدموں سے لیٹے زار زار روتے لالو کو قہر سے دیکھتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے۔ مظفر ملک اپنی جگہ سے اٹھتے اٹھتے رہ گیا۔ اسے مونسن نے خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا تھا۔

رزاتی لالو کو اپنے قدموں سے ہٹنے کا کہہ رہا تھا نہ اس کے ہاتھوں سے اپنے پاؤں چھڑا رہا تھا۔ مونسن کو یہ بات عجیب سی لگ رہی تھی۔ یہ رزاتی کے مزاج کے خلاف تھا کہ وہ کسی انسان کو اس طرح اپنے پیر چاٹنے دے۔ اسے یہ بھی نہ سمجھ آ رہی تھی کہ رزاتی لالو کے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟ پانچ آپشنز میں سے لالو پہلی چار میں سے کسی کا شکار ہو جائے گا یا پانچویں آپشن کے تحت اسے معافی مل جائے گی۔ اگر وہ رزاتی کے مزاج کا موازنہ کرتا تو اسے یقین تھا کہ وہ لالو کو معاف کر دے گا کیونکہ نظام رزاتی کی سرشت میں ہی تھا لیکن اس کی طبیعت میں اچانک دراڑ آنے والی انتہائی حد تک کا خیال آیا تو مونسن کے لئے اپنی رائے پر قائم رہنا مشکل ہو گیا۔ رزاتی کا فیصلہ کیا ہوگا؟ یہ خیال اس کے لئے ایک الجھن بن گیا۔ ”میرے پیر چھوڑو۔“ اسی وقت رزاتی کی آواز نے اسے اپنے خیالوں کے کھنور سے باہر کھینچ لیا۔

”جب تک آپ مجھے معاف نہیں کریں گے میں آپ کے پاؤں نہیں چھوڑوں گا صاحب۔ آپ اللہ رسول کے واسطے مجھے معاف کر دیجئے۔“

”پاؤں چھوڑو۔“ ایک دم رزاتی کا لہجہ درشت ہو گیا۔ ”کیا میں پابند ہوں تمہارا کہ تم معافی مانگو اور میں تمہیں معاف کر دوں؟ چھوڑو میرے پاؤں اور الگ ہٹ جاؤ۔“

لالو کو جیسے امید کی آخری کرن نے دکھا دے دیا۔ وہ آنسو پونچھتا ہوا اٹھا اور ڈرگاتے قدموں کے ساتھ پیچھے ہٹ کر سپاہیوں کے پاس جا کھڑا ہوا۔ ہتھکڑی کی زنجیر جس سپاہی کی پٹی سے بندھی تھی اس نے دوبارہ زنجیر پٹی میں باندھنے کے بجائے مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑ لی اور بڑی کینہ وری سے لالو کو گھورنے لگا۔

رزاتی نے فائل میز پر ڈالی اور جیب سے قلم نکالنے لگا۔ مونسن اس کے قریب چلا گیا۔ رزاتی نے اسے آنکھ اٹھا کر دیکھا۔

”فیصلہ جو بھی کرو کسی دباؤ یا جذبات میں آ کر نہ کرنا۔ اپنے اندر کی آواز پر دھیان دینا۔ میں یہ

”تم نے وہ کیا جو تمہارے مزاج کے خلاف ہے۔ جو تمہاری سرشت نہیں۔“ مونس اسے سرد نگاہوں سے گھور رہا تھا۔

”یہ سب میں نے تمہارے۔۔۔ نہیں نہیں۔۔۔ تمہارے اور اپنے خدا سے سیکھا ہے مونس۔“ وہ بڑے زخمی لہجے میں بولا۔ ”اس کی بھی تو سنت نہیں ہے ناں کہ کسی سچے دل سے پکارنے والے کو خالی ہاتھ لوٹا دے۔۔۔ لیکن میرے ساتھ اس نے ایسا ہی کیا؟ اپنے وعدے سے ہٹ کر۔۔۔ میں نے بھی اپنی سرشت اپنی فطرت سے ہٹ کر ایک چھوٹا سا کام کر لیا تو کیا برا کیا میں نے؟“

”پاگل ہوتے جا رہے ہو تم۔“ مونس نے تنبیہ کے انداز میں کہا۔ ”اپنے قول و فعل کو اپنے خالق کی مرضی کے ساتھ مت تو لو۔ اپنے لئے اس کی رحمت کا دروازہ دھیرے دھیرے بند کرنے کا یہ عمل ایک دن تمہیں اس سے بہت دور لے جائے گا۔“

”وہ اگر میری شہ رگ سے قریب ہوتا تو میری سن لیتا مونس مگر وہ تو اب مجھ سے بہت دور ہے۔“ رزاتی کے لہجے میں تڑپ جاگی۔ ”اس کے باوجود میں اس جیسا نہ ہوں نہیں ہوں۔ یہ لو۔۔۔ اس نے پیڈ سے کاغذ پھاڑ کر مونس کو تحفہ دیا۔

”یہ کیا ہے؟“ مونس نے اس پر نظر دوڑائی اور چونک اٹھا۔ کاغذ پر لاالو کا نام اور گھر کا پتہ تحریر تھا۔ ”لاالو کا پیڈ۔“ رزاتی نے کرسی پر گرے ہوئے کہا۔ ”میں نے فائل سے لوٹ کر لیا تھا۔ اس پتے پر اس کی بیوی اور بچہ مل جائیں گے۔ اس کے بچے کا مکمل اور کامیاب علاج کرواؤ اور اس کی بیوی کا ماہانہ شہر رکرو۔ لاالو کے جرم کی سزا اس کے بیوی بچوں کو کیوں ملے؟ یہ کام آج ہی کرادو۔“

”رزاتی۔۔۔“ مونس اس کے قریب چلا آیا۔ ”تم کیا تھے اور کیا ہوتے جا رہے ہو؟ جو چاہو کر لو تم اپنے اندر کے انسان کو اپنے ضمیر کو مار سکتے ہو نہ بدل سکتے ہو۔ پھر ایسا کیوں کرتے ہو جو چل پل مجھے اور دوسروں کو تمہارے بارے میں شک گزیدہ کر دیتا ہے؟“

”لاالو کے بچے کو مرنا نہیں چاہئے مونس۔ اس کی بیوی کو کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہئے۔ اس کے لئے اچھے سے وکیل کا بندوبست کرو جو اسے سزا سے بچالے۔“ جواب میں رزاتی نے پھر اپنی بات دہرائی۔

”تم نے خود ہی اسے کیوں نہ معاف کر دیا پگلے؟ یہ سب گھما کر کان پکڑنے والی بات ہی تو ہے۔“ مونس نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

”اس نے مجھے معاف نہیں کیا مونس۔۔۔ میں نے اس سے بہت معافیاں مانگیں۔ بہت معافیاں مانگیں مگر اس نے میری ایک نہ سنی۔ میں نے اسی کیفیت کا مزہ لینا چاہا ہے۔ دیکھنا چاہتا تھا کہ جب کوئی گڑبڑ آتا ہے تو معاف نہ کرنے میں کیا مزہ ملتا ہے۔ کیا سکون ملتا ہے جب معاف کر دینے

بات صرف اس لئے کہہ رہا ہوں کہ بعد میں پچھتاوے کی آگ میں جلنے سے بہتر ہے کہ تم اس وقت خوب اچھی طرح سوچ لو۔ کوئی جلدی نہیں ہے۔ ملک صاحب کو ہم ایک آدھ رات کے لئے مہمان بھی رکھ سکتے ہیں۔“

”جی بالکل۔“ مظفر ملک نے خوشدلی سے کہا۔ ”ہم تو آپ کے خادم ہیں جی۔ جب اور جیسا کہیں گے ہو جائے گا۔“

”میں زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں سمجھتا مونس۔“ رزاتی نے مرکزی قلم کا کیپ ہٹایا۔ ”مجرم اپنا جرم قبول کر چکا ہے۔ آپشنز میں کوئی الجھن نہیں ہے تو پھر ڈگنا کیا؟ رہ گئی بات پچھتاوے کی تواب میرے پاس ہے کیا جس تک پچھتاوے کی تیش پہنچنے کا خوف ہو۔“

رزاتی نے میز پر پڑے پیڈ پر فائل سے کچھ نوٹ کیا۔ پیڈ ایک طرف سرکایا اور آپشن سلپ پر سائن کر کے فائل بند کر دی۔

مونس کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔

رزاتی نے چوتھی آپشن پر سائن کئے تھے۔ یعنی اب ملکی عدالت لاالو کا جو بھی فیصلہ کرتی، وہ اس سے متفق تھا۔

اس نے خیزی سے رزاتی کی جانب نگاہ اٹھائی جو قلم بند کر کے جیب میں لگا رہا تھا۔ رزاتی نے اس کی جانب اور پھر پلٹ کر راجیہ اور جنت کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھا۔ سچا نے کیوں مونس کو لگا کہ ان دونوں کی مسکراہٹ ایک دم پھینکی پڑ گئی ہے۔

ایک گھٹی گھٹی سی آہ بھر کر مونس نے فائل مظفر ملک کو تھائی۔ وہ فائل لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مونس سے ہاتھ ملایا۔ رزاتی کو سلام کیا اور دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

”صاحب۔۔۔ صاحب۔۔۔“ لاالو پلٹ پلٹ کر رزاتی کو پکار رہا تھا۔ ”مجھے معاف کر دیجئے صاحب۔ مجھے معاف کر دیجئے۔ میرا بچہ بہت چھوٹا ہے صاحب۔ وہ ہسپتال میں ہے۔ بہت بیمار ہے صاحب۔ میری بیوی کو کوئی سہارا دینے والا نہیں ہے صاحب۔ میرا شہزادہ دوا کے بغیر مر جائے گا صاحب۔۔۔ صاحب۔۔۔ صاحب۔۔۔“

لاالو کی آواز دھیمی ہوتے ہوتے بالا آخر آس کے دم توڑتے پیچھی کی طرح ڈوب گئی۔ چند لمحوں بعد جیپ اشارت ہونے کی بلکی سی آواز ابھری جو آہستہ آہستہ دور ہوتی چلی گئی۔ مونس کے کانوں میں لاالو کی فریاد ابھری آوازیں اب بھی گونج رہی تھیں۔

”تم نے ایسا کیوں کیا رزاتی؟“ ایک دم وہ اس کے سامنے آ گیا۔

”کیا کیا میں نے؟“ رزاتی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

کی قدرت رکھنے کے باوجود معافی نہیں دی جاتی۔۔۔ مگر پتہ چلا کہ یہ تو اور بھی عذابناک ہے۔ اور بھی اذیت دہ ہے۔ میں انسان ہوں اس لئے فوراً ہی پیچھتاوے کی آگ میں جلنے لگا ہوں۔ وہ خالق ہے۔ مالک ہے۔ قادر مطلق ہے۔ اسے پوچھنے والا کوئی نہیں۔ وہ کسی کو جواہدہ نہیں۔ اس لئے اسے کوئی پیچھتاوا بھی نہیں ہوتا مگر میں تو چند لمحے بھی اس کیفیت کو برداشت نہیں کر سکا۔۔۔ جاؤ منوس۔۔۔ جلدی جاؤ۔ لالو کے لئے کسی اچھے وکیل کا بندوبست کرو۔ اس کے بچے کے لئے دواؤں کا اور اس کی بیوی کے لئے مالی آسودگی کا انتظام کرو۔ میں پیچھتاوے کی آگ میں جلنا نہیں چاہتا۔ جاؤ۔ جلدی جاؤ یا رب۔ جلدی جاؤ۔“

منوس کے کانوں کے رستے دل میں جیسے شبنم کی پھوار اترتی چلی گئی۔ وہ جھکا۔ رزاقی کار خسار چوم کر سیدھا ہوا تو اس کی آنکھیں نم تھیں۔ لالو کے پتے والا کاغذ ہاتھ میں لئے وہ کمرے سے باہر بھاری کے جھونکے کی طرح نکلا اور غلام حسین کی طرف بڑھ گیا جو اس کی گاڑی کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ گاڑی اشارت ہونے اور پھر اس کے انجن کی مدھم ہوتی آواز نے رزاقی کو بتادیا کہ منوس اس کے کہے ہوئے پر عمل کرنے کے لئے روانہ ہو گیا ہے۔ آنکھوں میں پھیلتے غبار کے پار اس نے اپنی راجیہ اور جنت کے چہروں کو دیکھا، جن پر مسکراہٹ کے رنگ لوٹ آئے تھے۔

بیلا نے نندکار کا لایا ہوا قیمتی کپڑوں کا جوڑا اور چھوٹی سی ڈبیا میں بندھوانے کے جھک لے کر نندکار کی طرف بڑی چٹکی نظر سے دیکھا جو اسی کی جانب مگر اس تھا مگر بیلا کے دیکھتے ہی اس نے نظریں چرا لیں۔

”ان چیزوں کے بدلے مجھے کیا کرنا ہوگا نندکار جی؟“ بیلا کے لہجے میں بھرپور طنز تھا۔

”کچھ نہیں بیلا۔۔۔ میں نے یہ سب تمہیں کسی لالچ کے تحت نہیں دیا۔“ نندکار نے دھیرے سے کہا۔ ”میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے دوستی ختم نہ کرو۔“

”دوستی؟“ بیلا نے چمک کر کہا۔ ”ایک طرف تم دوستی کے نام پر میرے کپڑے اتارنا چاہتے ہو نندکار اور دوسری طرف نئے کپڑوں کی آڑ میں اس سمبندھ کو قائم بھی رکھنا چاہتے ہو۔۔۔“

”میں غلطی پر تھا بیلا۔“ نندکار نے اس کی بات کاٹ وی۔ ”میں نے دو ہی دنوں میں جان لیا ہے کہ میں تمہیں دیکھنے پنا، تم سے ملنے ایک پہر بھی نہیں کاٹ سکتا۔ اس لئے میں نے فری لیا ہے کہ اب تمہیں کبھی تنگ نہیں کروں گا بس تم مجھ سے مکھ نہ موڑو۔ ہم اچھے دوستوں کی طرح ملتے رہیں، میرے لئے اتنا ہی بہت ہے۔“

”کیا بات ہے نندو جانی۔“ بیلا کی آنکھوں میں حیرت ابھری۔ ”آج تو بڑی اچھی اچھی باتیں کر

رہے ہو۔ کوئی نئی چال سوچی ہے کیا؟“ بیلا کا لہجہ ذومعنی ہو گیا۔

”نہیں بیلا۔“ نندکار نے نظریں اٹھائیں تو بیلا کو اس کی آنکھوں میں اپنے لئے جھوٹ دکھائی نہ دیا۔ ”کوئی چال نہیں۔ نہ پرانی نہ نئی۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ شاید ہم دونوں کو ایک دن ایک دوسرے پر اعتبار آ جائے اور شاید وہ دن ہمیں۔۔۔“ نندکار نے ایک دم خاموش ہو کر نظر جھکالی۔

”ٹھیک ہے نندو جانی۔“ بیلا نے کپڑوں پر پیار سے ہاتھ پھرتے ہوئے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ ”آزماتے ہیں تمہاری یاری کو۔ اگر اس میں چھل پٹ نہ ہو تو مجھے کیا پیٹ میں مروڑاٹھتے ہیں جو میں تم جیسے اچھے دوست کو گناہوں۔“

”تو دوستی پکی۔“ نندکار نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھایا۔

”ابھی صرف دوستی۔۔۔ کچی پکی کا فیصلہ تو کچھ دن بعد ہوگا۔“ بیلا نے ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”میں تمہارا آبھاری ہوں بیلا کہ تم نے میرا مان نہیں توڑا۔“ نندکار نے اس کا ہاتھ چوم کر چھوڑ دیا۔ ”ہم پہلے ہی کی طرح ملتے رہیں گے اور کوئی بھی ضرورت ہو تم ہمیشہ کی طرح ”تر“ سے کہا کرو گی مجھ سے ٹھیک۔۔۔“

”بالکل ٹھیک۔“ بیلا مسکرا دی۔ ”اب میں چلوں؟“

”اتنی جلدی؟“ نندکار بولا۔

”ہاں کل جلدی آؤں گی۔ پھر خوب باتیں کریں گے۔“

جواب میں نندکار نے مسکراتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا تو بیلا کمر لچکاتی اپنی راہ پر ہوئی۔ نندکار اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں کسی سوچ کی پرچھائیاں گہری ہوتی جا رہی تھیں۔ اور بیلا۔۔۔

اس کے من میں تو لڈو پھوٹ رہے تھے۔ سو امی دھیرج داس کے کہنے کے انوسار ایک ہی دن میں نندکار کی کایا کلپ ہو گئی تھی۔ وہ اس سے ملا تو یوں جیسے اس کا داس ہو۔ بات کی تو یوں جیسے بیلا کا ہر لفظ اس کے لئے حکم کا درجہ رکھتا ہو۔ اس کی نظروں سے ہوس کے سائے ایک دم ناپید ہو گئے تھے۔ بیلا کا دل سو امی کے بارے میں اس وشواس کا شکار ہو گیا کہ اب اسے ایک آدھ دن ہی میں حویلی میں جگہ بھی مل جائے گی۔

وہ ہوا کی طرح اٹھکیلیاں کرتی مندر کے پاس سے گزری تو جی میں آیا کہ اس انہونی کے ناطے جو نندکار کے آج کے رویے کی صورت میں نمودار ہوئی تھی، بھگوان کے درشن کرتی جائے۔ وہ رکی۔ مندر کے اندر جانے کے لئے قدم بڑھایا تو دور سے بھگوان کے چرنوں میں پنڈت کے پاس بیٹھی کسی عورت کی پرچھائیں نظر پڑی۔ اس نے اندر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ کسی تیسرے کے سامنے پنڈت یا سو امی

کر بمشکل روکا اور ہولے ہولے لکھائیں کر یہ ظاہر کیا کہ اسے اچھو لگ گیا ہے۔

”نہیں نہیں پنڈت جی۔ یہ میں نے کب کہا؟“ نندنی نے سرخ ہوتے چہرے سے پلو ہٹایا تو پنڈت کا حال خراب ہو گیا۔ نندنی کچھ اتنی ہی خوبصورت لگ رہی تھی۔ ”مجھے تو اس لئے وشواس نہیں آ رہا کہ برسوں سے کسی اچھی خبر کے لئے میں ترس گئی ہوں۔ اب اچانک ایسی بات سنی ہے تو وشواس نہیں ہو رہا۔“

”بے یقینی والی کوئی بات نہیں ہے نندنی۔“ پنڈت نے آواز نیچی کر لی۔ ”مجھے تو اپنی قدر ہی معلوم نہیں پلگی۔ یہاں سوامی جی کے علاوہ بھی کوئی ہے جو تیرے لئے بہت اچھا اچھا سوچتا رہتا ہے۔“

”وہ کون ہے پنڈت جی؟“ نندنی ایک بار پھر حیران ہوئی۔

”ہے ایک دل جلا۔“ پنڈت نے آہستہ سے اس کے گھٹنے پر بایاں ہاتھ رکھ دیا۔ ”مگر تیری ناراجگی سے ڈرتا ہے۔“

”میری ناراضگی سے؟“ نندنی کا دل زور سے دھڑکا۔ ”وہ کیوں بھلا؟“

”کہ کہیں تو اسے نکا سا جواب نہ دے دے۔۔۔“ پنڈت نے دانہ پھینکا۔

”میں کچھ نہیں سمجھتی پنڈت جی۔“ نندنی کا سینہ دھوکنی بننے بننے رہ گیا۔ وہ ایک عورت تھی۔ دو بچوں کی ماں۔ گھر میں چاکر نوگوں کا میل لگانے والی۔ پنڈت کے اشاروں کنایوں نے اگر اس کے کانوں کی لٹریں سرخ کر دی تھیں تو اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ سب کچھ جان کر بھی انجان بن رہی ہے اور چاہتی ہے کہ پنڈت کھل کر بات کرے۔

”نندکار کو تو جانتی ہے ناں تو؟“ پنڈت نے کھل کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔ ”ارے وہی اپنا نندو جانی۔“

”جی۔۔۔ جی ہاں۔۔۔“ نندنی کا سارا جسم تن گیا۔ اسے نندکار کی بہت کچھ کہتی ایک ایک نگاہ یاد آ گئی جو اسے راہ چلتے اکثر ایک ہی سانس میں پی جانے والی نظروں سے دیکھتا تھا۔

”وہ تیرا سیوک ہے نندنی مگر تو ہے کہ اس کی طرف دیکھتی ہی نہیں۔“ پنڈت نے اس کا گھٹنا دبا دیا اور سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”نندو۔“ نندنی نے دہرایا۔

”ہاں۔ نندو جانی۔۔۔ ایک بار اس سے مل کر تو دیکھ نندنی۔ تیرے سارے دل در دور ہو جائیں گے۔“

”پنڈت جی۔۔۔“ نندنی کی آواز قہرا گئی۔ ”میں۔۔۔ میں۔۔۔“

”گھر انہیں نندنی۔“ پنڈت نے ایک بار پھر اس کا گھٹنا دبا دیا اور ہاتھ کچھ اوپر سر کا دیا۔ ”میں ہوں ناں۔ میرے ہوتے تھے کس بات کا کھوف کھترہ ہے۔ اپنی جوانی کو کیوں لگا رہی ہے دیوانی۔ یہ

سے ملنا نہ چاہتی تھی اس لئے وہ آگے نکلتی چلی گئی۔ اسے اندر نہ آتے پا کر پنڈت کا سانس میں سانس آیا۔ اس لئے کہ اس کے سامنے سر جھکائے بیٹھی عورت نندنی کے علاوہ اور کوئی نہ تھی اور بیلا کا نندنی کو وہاں دیکھ لینا اچھا نہ تھا۔

”ہاں۔۔۔“ پنڈت نے نککیوں سے دروازے کے باہر ہی سے بیلا کو رخصت ہوتے دیکھ کر اطمینان بھرا سانس لیا۔ ”تو میں کہہ رہا تھا نندنی کہ سوامی جی چاہتے ہیں کہ تو اپنی جگہ حویلی میں بیلا کو رکھو دے۔۔۔“

”مگر میں اپنی گزر بسر کیسے کروں گی پنڈت جی۔“ نندنی کے ملائم چہرے پر پریشانی ابھری۔

”آپ تو جانتے ہیں کہ چرنو کوئی کام کاج نہیں کرتا۔ اگر وہ کچھ کرتا ہوتا تو کیا میں اپنا دھرم یوں سنگٹ میں ڈالتی۔ وہ تو رام بھلا کرے حویلی والوں کا کہ وہ کرمی لوگ ہیں ورنہ ایک ہندو استری ہونے کے ناطے میرا وہاں جا کر کام کاج کرنا کہاں مناسب تھا۔ اب اگر یہ آسرا بھی چھوٹ گیا تو۔۔۔“

”پلگی ہے تو نندنی۔“ پنڈت نے پیار سے اسے گھورا۔ ”کیا تو سوامی جی کو اتنا زبردنی جانتی ہے کہ وہ تیرا کھیاں کئے بغیر ہی تجھے حویلی سے نکلا دیں گے۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ تو وہاں سے ایک ہجارت لیتی ہے ناں؟“

”جی۔۔۔“ نندنی نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں اٹھائیں تو پنڈت گڑبڑا کر رہ گیا۔

”تو۔۔۔ تو۔۔۔ سوامی جی کے حکم کے انوسار تجھے گھر بیٹھے ہر مہینے چندہ سول جالیا کریں گے۔ اس کے علاوہ مندر میں جو جنس دان ہوا کرے گا اس میں سے تجھے روج کے روج بچوں کے لئے آن پل پہنچ جالیا کرے گا۔ بس تو اپنے بڑے بیٹے کو سام ہوتے ہی ادھر بھیج دیا کرنا۔“

”کیا؟“ نندنی کو جیسے اعتبار نہ آیا۔ ”ایسا کہا کیا سوامی جی نے؟“

”ہاں۔۔۔“ پنڈت نے لفظ کو بڑی طرح کھینچا۔ ”وہ دل کے بڑے کھرے ہیں نندنی۔ بیلا تو جوان چھوری ہے۔ اسے کام کاج کرنے میں کوئی کشت نہیں ہوگا۔ سوامی جی کو جب تیرے بارے میں پتہ چلا تو ان کا ہر دے بھر آیا۔ انہوں نے ایک دم مجھے حکم دیا کہ پنڈت گردھاری لال۔ کل سے نندنی حویلی نہیں جائے گی۔ بیلا سارا سارا دن دڑنگے مارتی پھرتی ہے اسے حویلی بھیج۔ نندنی کو گھر بیٹھے بٹھائے چندہ ہجارت مہینہ ہماری طرف سے تاجنگی دیا جائے اور وہ تو چرنو کے بارے میں بھی کہہ رہے تھے کہ اس کا چند دنوں میں علاج کر دیں گے۔“

”سچ پنڈت جی۔۔۔“ نندنی کے چہرے پر مسرت کی شفق پھوٹی۔

”اور کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں؟“ پنڈت نے روٹھ جانے کے انداز میں کہا تو اس کا سڑے چقدر جیسا ہو جانے والا چہرہ دیکھ کر بے اختیار نندنی کی ہنسی نکل گئی جسے اس نے ساڑھی کے پلو میں منہ چھپا

جواب میں نندی نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے پنڈت کی جانب دیکھا۔ اس کے حلق میں ایک بار پھر کانٹوں کی باڑاگ آئی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا کہ نہ سکی۔ وزنی ہوتی پلکیں اٹھانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اس نے رخ پھیرا اور باہر جانے کے لئے لرزتے پاؤں کو حرکت دی۔

”کل دوپہر تندو یہیں، پچھلی کوٹھریا میں تمہارا اتجار کرے گاندنی۔ بیلا کو حویلی چھوڑ کر سیدھی یہیں آ جانا۔“

پنڈت کے الفاظ نندی کی سماعت پر کبھی ہتھوڑے اور کبھی پھوار بن کر برستے رہے۔ وہ ساری جان سے کانپتی ہوئے ہوئے چلتی ہوئی مندر سے نکل گئی۔

”واہ پنڈت۔۔۔“ مری بجاتے بھگوان کے پہلو میں موجود چھوٹا سا دروازہ کھلا اور سوامی دھیرج داس نے قدم کوٹھڑی سے باہر رکھا۔ اس کے کالے کالے ہونٹوں پر بڑی پراسرار مسکراہٹ تھی۔ ”میں تو تجھے مٹی کا مادھوی سمجھا تھا مگر تو تو خاصا ہڈی مان نکلا۔“

”سب آپ کی کرپا ہے سوامی جی۔۔۔ ہی ہی ہی۔۔۔“ پنڈت نے آگے بڑھ کر سوامی کے پاؤں چھو لئے۔ ”سب آپ کا آسیر باد ہے۔“

”تیری آج کی کارستانی دیکھ کر میں تجھے بھارت ماتا کی بے بے کار کے لئے اپنے ساتھ ملانے میں جو عجیب محسوس کر رہا تھا وہ خاصی کم ہو گئی ہے۔ میں تجھے اس گدھے کی طرح ہانکنے کی ضرورت ہے جو ڈنڈا کھائے بغیر آگے نہیں بڑھتا۔“

”ہی ہی ہی۔۔۔ مہاراج۔۔۔ مہاراج۔۔۔ آپ ڈنڈا اماریں یا ڈنڈوئیں۔ سب منجور ہے۔ بس اپنے چرنوں سے الگ نہ کیجئے گا۔“

”اس بارے میں تو بے فکر ہو جا پنڈت۔ تو جیسا بھی ہے آدمی کام کا ہے۔ تجھے آگیا کا پالن کرنا آتا ہے چاہے اس کے لئے تجھے کسی کا لباس نوچنا پڑے یا اپنی دھوتی کا بلیڈان دینا پڑے۔ اور ہمارے کام میں یہی دو بنیادی انتہائیں ہیں جن کا پہرہ دینا لازم ہے۔“ سوامی نے پنڈت کی گدی پر آسن جما کر براجمان ہوتے ہوئے کہا تو پنڈت کی ہی ہی ہی پھر اشارت ہو گئی۔ وہ لپک کر سوامی کے چرنوں میں آ بیٹھا اور سر جھک کر اس کے پیر دا بنے لگا۔

”ویسے چیز یہ بھی بڑی نمکین ہے پنڈت۔“ سوامی نے اپنی چوہے کی دم جیسی لکٹی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے معنی خیر لہجے میں کہا تو پنڈت چونکا۔

”کس چیخ کی بات کر رہے ہیں مہاراج؟“

”ارے اسی نندی کی۔“ سوامی کی سانپ جیسی سرخ زبان ہونٹوں پر لپپائی۔

”اچھا اچھا۔ ہی ہی ہی۔۔۔ وہ تو ہے مہاراج۔“

سانجھ سویرے پھر کب لوٹ کر آئیں گے۔ ان کا بجالے اور ساتھ ہی دھن کی چھنا چھن بھی جی بھر کے سن۔۔۔“

”پنڈت جی۔۔۔ میں دو بچوں کی ماں ہوں۔“ نندی نے بیچارگی سے کہا مگر پنڈت نے اس کی بھی بھی آنکھوں میں ایک دم جلتی جوت کو لپک لیا تھا۔ اس کی زبان ایک دم کنار ہو گئی۔

”دو بچوں کی ماں کے سینے میں ہر دے نہیں ہوتا کیا؟ اس کی جوان راتوں میں ایک نسی آگ لگا کر گھد گلی کی موری میں سردیے پڑا رہے تو کیا اس دو بچوں کی ماں کو ساری ساری رات بستر پر اکیلے سنگ سنگ کر رہا کہ ہو جانا چاہئے؟ یہ تو انیائے ہے نندی۔ دھرم بھانا اس کا نام تو نہیں۔ میں تو تجھے اس کی آگیا نہیں دوں گا کہ تو اس طرح اپنا ستیاناس کر لے۔ دیکھ۔۔۔ سوامی جی کی طرح سے تو تجھے ہر مینے چندرہ سول جایا کر کے مگر تیرا بستر تو پھر بھی سونا ہی رہے گا ناں۔ اس کا کیا؟ میری مان تو نندکار سے کبھی کبھار مل لیا کر۔ یہیں اسی جگہ آ جایا کر۔ میں تم دونوں کو دو تین گھنٹوں کے لئے کوٹھڑی کھول دیا کروں گا۔ آرام سے مل ملا کر اپنی اپنی راہ لیا کرنا۔ اور دیکھ۔ مجھے غلط نہ سمجھنا۔ میں تو صرف تجھے یوں جتا مرتا نہیں دیکھ سکا تو اتنی بات کہہ دی۔۔۔ اور وہ اس لئے نندی کہ میں گھد برسوں سے اکلا پے کا سکار ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ پسو کے بغیر استری اور استری کے بغیر پسو کسی کام کا نہیں ہوتا۔“ پنڈت کا ہاتھ اور اوپر سر کا اور اتر کر آگئی۔

”پنڈت جی۔۔۔“ نندی نے اس کا ہاتھ جلدی سے پرے ہٹا دیا۔ اس کا سانس اکڑ سا گیا۔

”جلدی کی کوئی جرورت نہیں نندی۔“ پنڈت نے سنبھل کر کہا۔ ”کھوب سوچ لے۔ سمجھ لے۔“

پھر مجھے بتا دینا۔“

”میں۔۔۔ میں۔۔۔“ نندی کا حلق خشک ہو گیا۔ وہ جان گئی کہ نندکار نے اپنی نظروں کو پنڈت کی زبان دے کر سب کچھ کہہ ڈالا ہے۔ اب اسے جواب دینا تھا۔۔۔ مگر کیا؟ ہاں یا نہ؟ اس بات نے اس کے دل و دماغ میں جنگ چھیڑ دی تھی۔ مہینوں کا پیا سا جو بن پادل کی گھن گرج سن کر ہی بارش کے پہلے قطرے کو لپک لینے کے لئے بیکل ہو رہا تھا اور اسے سمجھ نہ آ رہی تھی کہ وہ اسے کیسے روکے؟ روکے بھی یا نہ؟

اس نے ساڑھی کا پلو سمیٹ کر اٹھ جانا چاہا۔

”تو پھر میں سوامی جی کو کیا جواب دوں نندی؟“ پنڈت نے اسے جانے کے لئے اٹھتا دیکھ کر

جلدی سے کہا۔

”میں کل بیلا کو ساتھ لے جا کر حویلی میں اپنی جگہ رکھوا دوں گی۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اور۔۔۔ وہ دوسری بات۔۔۔“ پنڈت نے بیٹھے بیٹھے اس کی جانب ذومعنی نظروں سے دیکھا۔

”جے ہو۔۔۔۔۔ جے ہو مہاراج کی۔ آپ دھنیہ ہیں سوامی جی۔ میں تو آپ کا جنم جنم کا داس ہوں۔“ پنڈت اس کے قدموں سے لپٹ گیا۔

سوامی نے اطمینان بھرا ایک گہرا سانس لیا اور پنڈت کا شانہ تھکتے ہوئے نگاہیں سامنے خالی دروازے پر جمادیں جس کے ایک طرف اس کی کھڑائیں یوں پڑی تھیں جیسے کوئی خارش زدہ کتیا کسی مکھی کا انتظار کر رہی ہو کہ کب وہ آ کر اس پر سواری گاٹھے اور وہ چوں چوں کرتی روانہ ہو جائے۔

☆=====☆=====☆

مونس، اسی شام شہر سے لالو کی ضمانت کرا کے لوٹ آیا تھا۔
لالو کو اس کے گھر وہ اپنی گاڑی میں چھوڑنے گیا۔ لالو کی بیوی، میٹرک پاس ایک قبول صورت گھریلو عورت تھی جس کے لئے اس کا خاوند ہی سب کچھ تھا۔ لالو کو سامنے پا کر وہ زار زار روئی۔ پھر جب اسے پتہ چلا کہ یہ سب کچھ رزاقی کے کہنے پر ہو رہا ہے تو وہ حیران ہوئی۔
”صاحب۔ اگر لالو کی ضمانت ہی کرنا تھی تو اسے معاف ہی کر دیتے۔“ دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے اس نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

”اگر مجرم کو اس کے جرم کا احساس نہ دلایا جائے بی بی تو وہ دوبارہ بھی ایسی ہی حرکت کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا۔“ مونس نے ساوگی سے مگر بڑے محتاط لہجے میں کہا۔ ”شہر کا ایک بڑا وکیل لالو کا مقدمہ لڑے گا اور امید ہے کہ لاوعدالتی کارروائی کے بعد بری ہو جائے گا۔ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔“

پھر اس نے ان کے بچے کے بارے میں بات کی۔ شہزادہ نام تھا اس کا۔ چار سال کا معصوم بچہ موت سے جنگ لڑتے لڑتے جیسے تھک چکا تھا۔ مونس نے اسے گود میں اٹھالیا۔ غلام حسین نے اس کے لئے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ وہ بچے کو گود میں لئے اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ لالو اور اس کی بیوی پروین پیچھے بیٹھ گئے۔ غلام حسین نے گاڑی آگے بڑھادی۔

مونس نے شہزادے کو شہر کے سب سے بڑے ہاسپٹل میں داخل کرایا۔ بچے کے علاج کے معاملات طے کئے۔ چلتے ہوئے ایک بند لفاؤ شہزادے کے تنیکے کے نیچے سرکاتے ہوئے مونس نے اس کے چہرے پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔

”ان پیسوں سے پھل کھانا بیٹے۔ مٹھائیاں کھانا۔ کھلونے خریدنا۔ اپنے پاپا کو ان میں سے کچھ مت دینا۔ یہ سب تمہارے ہیں۔“

”ٹھیک ہے انکل۔“ شہزادے نے اسے چمکتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”آپ پھر کب آئیں گے؟“ وہ اتنی ہی دیر میں مونس سے مانوس ہو گیا تھا۔

”تو اس نمک کو کھنے کا بندوبست کرو ناں مہاشے۔“ سوامی نے پنڈت کی آنکھوں میں دیکھا۔
”نندکار سے پہلے یا۔۔۔“ پنڈت نے بات ادھوری چھوڑ دی۔
”پہلے ہو جائے تو بہت اچھا ہے اور اگر کوئی مجبوری ہے تو۔۔۔۔۔“
”نہیں مہاراج۔ مزبوری کیسی؟ کل وہ بیلا کو حلی چھوڑ کر سیدھی یہیں آئے گی۔۔۔۔۔“ پنڈت نے سوامی سے نظریں ملائیں۔

”یہ تم اتنے دشواری سے کیسے کہہ سکتے ہو؟“ سوامی کے لہجے میں بڑا غصہ اڑا تھا۔

”اس پر تو میں شرط لگا سکتا ہوں مہاراج۔“ پنڈت نے پورے بھروسے کے ساتھ جواب دیا۔
”میں نے جس جگہ چنگاری پھینکی ہے وہ سوکھی لکڑیوں کا ڈھیر ہے۔ ذرا سی بھی سیلن ہوتی تو اس کے نہ آنے کی بات سوچی جاسکتی تھی مگر یہی ہی ہی۔۔۔۔۔“ پنڈت نے ادھوری بات میں اپنی ہی ہی کا کیل ٹھونک کر اسے پورا کر دیا۔

”ہوں۔۔۔۔۔“ سوامی نے دیوار کے ساتھ رکھی گدی سے ٹیک لگا لی۔ ”اس کا مطلب ہے کہ۔۔۔۔۔“

”کل جب نندنی حویلی سے کوٹھریا میں آئے گی تو وہاں نندکار کی جگہ آپ اسے پہلے مہینے کے پسلی پندرہ سو روپے گھدا اپنے ہاتھ سے دیں گے اور۔۔۔۔۔“

”بالکل ٹھیک۔۔۔۔۔“ سوامی نے اس سے پورا پورا اتفاق کیا۔ ”میں میری ایک بات یاد رکھنا پنڈت۔ کبھی کسی اپنے یا غیر سے دھن کے حوالے سے جو بھی قول قرار کرو اس میں ہیرا پھیری مت کرنا۔ اس وقت یہ ہماری سب سے بڑی مجبوری ہے۔“

”جس دن آپ نے یہ بات پہلی بار کہی تھی مہاراج، میں نے اسی دن اسے دھوتی میں باندھ لیا تھا۔ اس بارے میں آپ چہتا نہ کریں۔“

”دراصل پنڈت۔ میں عورت کے بغیر ایک رات دن سے زیادہ نہیں بٹا سکتا۔ یہ میری کمزوری ہے اور یہاں ان چالیس پینتالیس ہندو گھرانوں میں بمشکل دس بارہ ناریاں ہوں گی جو کسی قابل ہیں۔ باقی تو سب تھل تھل گنوتا ہیں۔ اس لئے بیلا کے بعد نندنی پر دل آ گیا ہے۔“

”آپ چہتا نہ کریں مہاراج۔ جیتا رہے اپنا نندو جانی۔ وہ بڑا ماہر سرکاری ہے۔ میں نے اس کے ساتھ بات طے کر لی ہے۔ وہ جو سرکاری مارے گا وہ آپ کی کھد مت میں پیس ہو جاتا کرے گا۔“ پنڈت نے بڑے خلوص سے کہا۔

”میں تمہاری سفارش بنارس مندر کمیٹی کے سامنے کروں گا پنڈت کہ جب یہاں مندر بنے تو اس کا کرتا دھرتا تمہی کو بنایا جائے۔“

”بہت جلد۔“ مونس مسکرایا اور اس کا ہاتھ چوم کر چھوڑ دیا۔

لالو اور پروین اسے چھوڑنے باہر تک آئے۔

”کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو اس بچے اور فون نمبر پر خبر کرنا پروین بی بی۔ یہ تمہارا ہم پر احسان ہو گا۔“ مونس نے ایک وزینگ کارڈ پروین کو تھما دیا۔ ”اور لالو۔ عدالتی کارروائی میں باقاعدگی سے شریک ہوتے رہنا۔ اللہ بہت بہتر کرے گا۔“ اس نے لالو سے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ لالو نے اس کا ہاتھ تھام کر غم آلود آنکھوں سے لگایا اور بچوں کی طرح سسک پڑا۔

”آپ فرشتے ہو صاحب۔ اپنے مجرم کے ساتھ یہ سلوک کوئی انسان نہیں کر سکتا۔“

”یہ سب کچھ رزاقی بابو کے ایما پر ہو رہا ہے لالو۔“ مونس کی آواز بھیگ گئی۔ ”اس کے دل پر جو زخم آیا ہے تم اس کی گہرائی نہیں جانتے۔ اس کے لئے سکون کی دعا کرنا پروین بی بی۔“ وہ لالو کی بیوی کی طرف متوجہ ہوا۔

”ضرور صاحب جی۔ اللہ ہمارے سکھ بھی انہیں دے دے۔“ بڑے خلوص کے ساتھ پروین نے آنچل پھیلا کر دعا کی۔

”ایسا کبھی نہیں کہتے۔“ مونس نے پھیکے سے انداز میں مسکرا کر اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ ”اس خالق و مالک کے ہاں کس چیز کی کمی ہے جو وہ ہمارے سکھ ایک دوسرے کو منتقل کرتا پھرے۔ بس اس کے دینے کا انداز اور وقت کسی کی کچھ میں نہیں آتا۔“

لالو کا شانہ تھپکے کر مونس گاڑی میں بیٹھا۔ لالو نے غلام حسین سے ہاتھ ملایا اور دونوں میاں بیوی تب تک ہاسپٹل کے گیٹ پر کھڑے ان کے لئے دست بدعا رہے جب تک ان کی گاڑی کی ٹیل لائٹ نظر آتی رہی۔

واپس آ کر اس نے رزاقی کو ساری رپورٹ دی تو ایک اطمینان سا اس کے چہرے پر پھیل گیا۔ اس نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے مونس کو بڑی عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ ان نظروں میں مونس کے لئے محبت اور خیر کروٹیں لے رہا تھا۔ پھر کچھ کہے بغیر اس نے بڑے پیار سے مونس کے شانے کا بوسہ لیا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ مونس آفس کے ساتھ اپنی ریزینسی میں چلا آیا۔

اگلے دن صبح دس بجے کے قریب وہ آفس میں پہنچا تو غلام حسین نے بتایا کہ نندنی اس سے ملنا چاہتی ہے۔ اس نے آفس میں قدم رکھا تو ایک لمحے کو ٹھٹھک کر رہ گیا۔

کمرے میں نندنی کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔ ایک چلبلی سی، حسن کی چلتی پھرتی مورت۔ وہ سادہ لباس میں بھی قیامت ڈھارہی تھی۔ میک اپ کی اسے ضرورت ہی نہیں تھی اور نہ اس نے ایسا کوئی تکلف کیا تھا اور یہ تو طے تھا کہ اسے دیکھ کر دل زور زور سے دھڑکنے لگتا تھا۔

”سلام مونس بابو۔“ نندنی جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی تو اس قیامت نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی۔

”بیٹھو بیٹھو نندنی۔ خیریت ہے ناں؟“ مونس نے اپنی سیٹ سنبھالتے ہوئے ان دونوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”جی ہاں۔ بالکل خیریت ہے۔ بس آپ سے ایک بیتی کرنا تھی۔“ نندنی جانتی تھی کہ مونس کو تمہیدوں اور تکلفات سے گھبراہٹ ہوتی ہے اس لئے اس نے وقت ضائع نہ کیا اور چاہا کہ فوراً ہی اصل بات پر آ جائے۔

”کہو۔“ مونس نے جان بوجھ کر صرف اسی کی جانب نگاہ کی۔

”یہ۔۔۔“ نندنی نے ساتھ بیٹھی لڑکی کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ”بیلا ہے۔“

”ہوں۔۔۔“ مونس نے بیلا کی جانب دیکھا جو مسلسل اسی کو گھورے جا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اسے نظروں ہی نظروں میں پی جانا چاہتی ہو۔ عجیب والہانہ سا انداز تھا اس کا۔ مونس کا دل پھڑک کر رہ گیا۔ اس نے دوسرے ہی پل اس کی طرف سے نظر ہٹائی۔

”میں چاہتی ہوں کہ میری جگہ آپ اسے حویلی میں رکھ لیں۔“ نندنی نے دھیرے سے کہا اور اس کی آواز ڈوب گئی۔ شاید کل کی پنڈت گردھاری لال سے اپنی ملاقات اس کے دھیان میں آ گئی تھی۔

”تم کہیں جا رہی ہو کیا؟“ مونس نے سادگی سے پوچھا۔

”نہیں جی۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔“ جھوٹ بولتے ہوئے نندنی نے سر جھکا لیا۔ ”چرنو جی بہت بیمار رہے تھے۔“ میرا اس کے پاس رہنا بہت ضروری ہے۔ بیلا بہت اچھی لڑکی ہے۔ آپ کو اس سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ یہ میری ذمہ داری ہے۔“

”یہ بات نہیں ہے نندنی۔“ مونس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”تم اسے لائی ہو تو کچھ سوچ کر ہی لائی ہوگی۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر تم چاہو تو چرنو کا علاج جزل ہاسپٹل میں کرایا جاسکتا ہے۔ تمہارے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ تم کام کاج نہیں کرو گی تو گھر بار کیسے چلا پاؤ گی؟“

”اس کا انتظام پنڈت جی نے کر دیا ہے جی۔“ اس نے پوری بات بتانے سے گریز کیا۔

”پھر بھی نندنی۔ صرف روٹی ہی کا مسئلہ نہیں ہوتا۔“ مونس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے سامنے پڑے ایک کارڈ پر کچھ لکھا اور کارڈ نندنی کی طرف بڑھا دیا۔ ”اسے اپنے پاس رکھو۔ ہر ماہ پہلی تاریخ کو کیڈشٹر سے تم اپنی تنخواہ لیتی رہنا۔ رزاقی بابو کو یہ اچھا نہیں لگے گا کہ اس کے کسی ملازم کو معاشی تنگی سے پالا پڑے۔“

”مونس بابو۔۔۔“ نندنی نے اسے حیرت سے دیکھا۔

”ارے بابا یہ تمہارا حق ہے۔ تم برسوں سے یہاں کام کر رہی ہو۔ آج اگر تم کسی وجہ سے کام نہیں

”وہ تو ٹھیک ہے نندنی مگر۔۔۔ تیرے ہوتے مجھے باؤ کا کوئی فکر نہیں تھا۔ تو اس کا سارے کام کاج دیکھ لیتی تھی۔ اب یہ جوان جہان چھو کر بی بی نے۔“ ایک دم بیلا نے زبان کھولی تو بی بی اس کے لہجے پر نہال ہو گئی۔

”آپ مجھے کام بتائیے بی بی۔“ ایک دم بیلا نے زبان کھولی تو بی بی اس کے لہجے پر نہال ہو گئی۔ کچھ اتنے ہی پیار سے بیلا نے اسے مخاطب کیا تھا۔ ”ابھی نندنی دیدی یہیں ہے۔ میں اس کے سامنے ہی آپ کی آگیا کا پالنہ کر کے دکھاتی ہوں تاکہ آپ کا کچھ نہ کچھ تو اطمینان ہو جائے۔“

”اچھا۔“ بی بی نے اسے مسکرا کر دیکھا۔ ”ایسا ہے کیا؟“

”جی۔۔۔“ بیلا نے سر جھکا کر اٹھایا۔

”تو چل۔ سب سے پہلے باؤ کے کمرے کی صفائی سے شروع ہو جا۔ سمجھ لے یہی تیرا امتحان ہے۔“ بی بی نے صاف لہجے میں کہا۔ ”نندنی۔ اسے باؤ کا کمرہ دکھا دے۔“

نندنی اٹھی اور بیلا کو ساتھ لے کر رزاقی کے کمرے کی طرف چل پڑی۔ ”بی بی نے رزاقی بابو اور ان کی سورگباشی بچی جنت کو گودوں کھلایا ہے۔ وہ انہیں باؤ کہتی ہیں۔ اگر تھو نے رزاقی بابو کے کام کاج میں انہیں مطمئن کر دیا تو سمجھ لے یہاں تیرے پوں بارہ ہیں۔“

”وہ کیسے دیدی؟“

”وہ اس طرح کہ پھر بی بی کی ساری خشتوں پر تیرا حق سب سے زیادہ ہو جائے گا۔ میرے کہنے کو چھوڑو۔ تو خود دیکھ لے گی کہ وہ تجھے کیسے کیسے بہانوں سے نہال کرتی ہیں۔“ نندنی نے رزاقی کے کمرے کے دروازے پر قدم روک لئے۔ ”لگتا ہے ابھی صاحب کمرے ہی میں ہیں۔“ اس نے پُر خیال لہجے میں کہا اور ہاتھ اٹھا کر دھیرے سے دستک دی۔

”کون؟“ اندر سے رزاقی کی آواز ابھری۔

”صاحب جی۔ میں ہوں نندنی۔“

جواب میں چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر دروازہ کھل گیا۔ چہرے پر اداسی کی دبیز تہہ لئے رزاقی ان کے سامنے کھڑا تھا۔

”صفائی کرنا تھی جی۔“ نندنی نے کہا۔

”ہوں۔“ رزاقی نے بیلا کا بڑی عام سی نظر سے جائزہ لیا۔ نندنی اس کا مطلب سمجھ گئی۔

”یہ بیلا ہے صاحب جی۔ اب یہی آیا کرے گی میری جگہ۔“

”اچھا۔“ رزاقی نے یوں کہا جیسے اسے نندنی کے جانے اور بیلا کے آنے سے کوئی فرق پڑا ہو نہ اس سے کوئی سروکار ہو۔ پھر وہ باہر نکل گیا۔

بیلا کی نظروں میں جہاں رزاقی کا شاندار مگر اداس سر پادا دیکھ کر پسندیدگی اور تحسین کے جذبات

کر سکتیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تمہارا حقہ پانی بند کر دیا جائے۔“ مونس ہنسا اور کارڈ اس کے سامنے ڈال دیا۔

”جی میں۔۔۔ میں۔۔۔“ نندنی کی آواز ممنونیت سے بھگ گئی۔

”بس۔ زیادہ کچھ نہیں۔ اسے اٹھا کر سنبھال لو۔“ مونس نے کہا تو نندنی نے ہاتھ بڑھا کر کارڈ اٹھالیا۔

”اور کچھ؟“ مونس نے پوچھا۔

”بس مونس بابو۔۔۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔“ نندنی نے بیلا کی جانب دیکھا جو مونس کو ایسی پرستش بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی کہ نندنی کے اندر کوئی تار سا جھنجھٹا اٹھا۔ وہ عورت تھی اور ایسی نظروں کا مطلب خوب سمجھتی تھی۔ پھر اس نے مونس کی جانب دیکھا۔ ”تو بیلا کو بی بی کے پاس چھوڑ آؤں جی؟“

”ہاں ہاں۔ بالکل۔“ مونس نے جلدی سے کہا اور بیلا کی نگاہوں سے اپنا رابطہ توڑ لیا جو اس کے خون میں سنسنی سی پیدا کر رہی تھیں۔

نندنی اٹھ گئی تو بیلا نے بھی اپنی نشست چھوڑ دی۔

”نمستے مونس بابو۔“ نندنی نے کہا اور ہاتھ جوڑ دیے۔ مونس نے جواب میں صرف سر ہلا دیا۔ بیلا نے ہاتھ جوڑ کر مونس کو ابوسے لیتی نظروں سے دیکھا۔ اس کے کمرے کے دروازے آگے۔ پھر وہ نندنی کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ مونس کی نظریں اس کی پچیلی کمر پر جم کر رہ گئیں۔

نندنی باہر نکل گئی۔ بیلا دروازے میں رکی اور پلٹ کر مونس کی جانب دیکھا۔ مونس نے نظر ملی تو اس کے لبوں پر بڑی سی چلی می مسکراہٹ پھیل گئی۔ جواب میں مونس بھی مسکرا دیا مگر فوراً ہی اس کے ہونٹ سمٹ گئے۔ جیسے اسے اپنی غیر ارادی حرکت کا احساس ہو گیا ہو۔ بیلا کی مسکراہٹ ہنسی میں بدل گئی اور وہ سر کے اشارے سے اسے سلام کرتے ہوئے باہر نکل گئی۔ مونس اپنی سیٹ پر کسی ایسے بت کی طرح دم سادھے بیٹھا تھا جس کے سینے میں اچانک دھڑکنوں نے شور مچا دیا ہو۔

نندنی بیلا کو لے کر زانے میں پہنچی۔ بی بی کو مختصر اُپنے جانے اور بیلا کی آمد کا بتایا۔ بی بی نے بیلا کا سر سے پاؤں تک ایک ہی نظر میں جائزہ لے لیا۔ بیلا اسے لا ابا لی سی لگی۔

”بچی۔ کام کاج کر لو گی یا کھیل کود ہی میں بہلائے رکھو گی ہمیں؟“ بی بی نے بڑی سادگی سے بیلا کی شخصیت کا تجزیہ کر ڈالا۔

”نہیں بی بی۔ یہ بڑے کام کی لڑکی ہے۔ سارے کام جانتی ہے۔ ماں نہ باپ۔ بہن نہ بھائی۔ اس کا ہماری جاتی میں رگ سونگندگی کوئی نہیں ہے۔ آپ کو اس سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ یہ میری ذمہ داری پر یہاں رہے گی۔“

گی کہ ٹوندنی سے یہ کام بھی سمجھ لے۔ باؤ کے لئے کافی بنانے اور اسے کمرے میں پہنچانے کے بعد تیری چھٹی۔ کام اتنا ہی ہے۔ ہاں، کبھی اس سے ہٹ کر رات کو بھی رکن پڑ سکتا ہے۔ کیا اس کے لئے ٹو وقت نکال سکے گی؟“

”بی بی۔ آپ اگر مجھے حویلی ہی میں کسی کونے میں پڑا رہنے کو جگہ دے دیں تو میں خود کو بھاگیوں سمجھوں گی۔ میرا کون سا پر یوار ہے جو میری واپسی کی راہ دیکھتا ہے۔“

”اس پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے بیلا۔“ بی بی نے صاف گوئی سے کہا۔ ”مگر تیری ہندو جاتی شاید اس پر راضی نہ ہو کہ ان کی ایک جوان لڑکی حویلی کے نوکر خانے میں دن رات رہے۔“

”مجھے کسی کی پروا نہیں ہے بی بی۔“ بیلا نے سر جھٹکا۔ ”میں اپنی مرضی کی مالک ہوں۔ ہاں۔ اتنی آگیا تو ہوگی کہ میں جب چاہوں اپنی بستی میں جا آ سکوں۔“

”وہ تیری مرضی ہے بیلا۔ کام کے وقت کے علاوہ تو کہاں جاتی ہے اس سے ہمیں کیا لینا دینا۔“

”تو بس بی بی۔ میرا یہیں انتظام کر دیں۔ میں چوتیس گھنٹے آپ کی سیوا میں رہنا چاہتی ہوں۔“ بیلا نے ٹوندنی کی جانب دیکھے بغیر اپنا فیصلہ سنا دیا۔

”کیوں میری عادت بگاڑنے کو آتی ہے بچی۔“ بی بی ہنسی۔ ”تیرا ذرا سا آسرا ہو گیا تو میری پورے بی بیوں آرام طلب ہو جائیں گی۔“

”میں تو میں چاہتی ہوں بی بی کہ آپ آرام کریں۔ بیٹھ کر حکم چلاتی رہیں اور میں دن رات آپ کی صاحب کی اور۔۔۔۔۔“ وہ کہتے کہتے رک گئی۔ پھر جیسے الفاظ بدل دیے۔ ”اور حویلی کی سیوا کرتی رہوں۔“

”دیکھ لے ٹوندنی۔ یہ آتے ہی کیسے میرے مزاج پر سوار ہوئی جا رہی ہے۔“ بی بی نے کہا تو ٹوندنی مسکرا دی۔

”میں تو اسے بیلا کا سو بھاگیہ سمجھتی ہوں بی بی کہ اسے آپ کی چھتر چھایا میں رہنے کا سہ مل رہا ہے۔ میں تو اسی کی حمایت کروں گی۔“

”تو بھی اسی کے ساتھ ہے تو چل ٹھیک ہے۔“ بی بی نے گردن گھما کر ملازمہ کو آواز دی۔ وہ آئی تو بی بی نے کہا۔ ”مونس بابو کے پاس چلی جا۔ انہیں کہہ کہ بیلا کے لئے ایک کوارٹر کھلوادیں۔ یہ اب یہیں رہے گی۔“

”جی بہتر۔“ ملازمہ باہر نکل گئی تو بی بی نے بیلا سے کہا۔

”تو آج کھانا کھا کر جا اور اپنا سامان لے آ۔۔۔ مگر جانے سے پہلے اپنا کوارٹر دیکھ جانا۔ شام سے پہلے سامان لے کر آ جانا۔“

ابھرے وہ ہیں اسے رزاقی کے نظر انداز کر دینے کے رویے پر حیرت بھی ہوئی مگر پھر اس کی حیرانی دور ہو گئی۔ جب اندر داخل ہوتے ہوئے ٹوندنی نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”ہمارے صاحب ایسے نہیں تھے بیلا۔ راجیہ بی بی اور جنت کی موت نے انہیں دنیا بھر کی ہر چیز سے بیزار کر دیا ہے۔“

کمرے میں قدم رکھتے ہی بیلا ٹھٹھک گئی۔ پھر وہ تیزی سے آگے بڑھی اور میر پر پڑی فریم شدہ اس تصویر کے پاس جا کھڑی ہوئی جس میں جنت اور راجیہ کے زندگی سے بھرپور چہرے چہرے چہرے تھے۔ اس نے تصویر اٹھالی اور آنکھوں کے مقابل لاکر اسے غور سے دیکھنے لگی۔

”ایسے جگر گوشے جب زندگی کے چمن سے نکل جائیں تو کس ظالم کا زندہ رہنے کو جی چاہتا ہے دیدی۔“ وہ بڑبڑائی۔

”ٹھیک کہتی ہو بیلا۔“ ٹوندنی نے اس کے ہاتھ سے لے کر تصویر واپس اس کی جگہ رکھ دی۔

”ہمارے صاحب کو ان کا روگ لگ گیا ہے۔ پرارتھنا کرو کہ بھگوان انہیں سکون دے۔“

جواب میں بیلا خاموشی سے کمرے کے شاہانہ ماحول کا جائزہ لینے لگی۔ ایسے کمرے بلاشبہ بادشاہوں ہی کے ہوتے ہوں گے۔ ایسی کون سی آسائش تھی جو وہاں موجود نہ تھی۔ پھر وہ ٹوندنی کے کہنے کے مطابق کمرے کی صفائی میں لگ گئی۔

آدھ گھنٹے بعد جب بیلا کے کہنے پر بی بی کمرے میں آئی تو چم چم کرتے کمرے کو دیکھ کر اس کی طبیعت خوش ہو گئی۔

”واہ۔۔۔“ بی بی نے کسی نخل کا مظاہرہ کئے بغیر تعریفی نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ ”بیلا۔ تم تو پاس ہو گئیں لڑکی۔“ بی بی ہنسی تو ٹوندنی نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”مگر ٹوندنی۔ کہیں تم نے تو یہ سب نہیں کیا؟“

”نہیں بی بی۔ آج تو میں کر کے چلی جاتی مگر کل کیا ہوتا؟ سارا پول کھل جاتا۔ اس لئے میں نے صرف بیلا کو بتایا ہے کہ کیا کچھ کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے۔ اور اتنا تو اسے بتانا ہی چاہئے تھا ناں؟“

”ہاں ہاں۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔“ بی بی بہت خوش تھی۔

ساڑھے بارہ بجے تھے جب بیلا اور ٹوندنی سارے گھر کے کام کاج اور کھانا پکانے سے فارغ ہو کر بی بی کے پاس لوٹ آئیں۔ بی بی نے انہیں انہی کی بنائی ہوئی چائے پلائی اور پاس بٹھالیا۔

”بیلا۔ دیکھ بچی۔ میرا باؤ ان دنوں بہت دکھی ہے۔ اس کی کسی بات کا برا نہ مانا۔ یہ ہو گئی ایک بات۔ دوسری بات یہ کہ صبح نو بجے آ کر تجھے صفائی ستھرائی کرنا ہوگی۔ دوپہر کا کھانا کھا کر تو جا سکتی ہے۔ پھر تجھے شام کو آنا ہے۔ رات کو باؤ نو بجے سو جاتا ہے۔ اسے عادت ہے کہ سونے سے پہلے ٹوندنی کے ہاتھ کی بنی ایک کپ کافی پیتا ہے۔ اب تو ٹوندنی جیسی کافی بنانا پائے گی یا نہیں؟ یہ میں نہیں جانتی مگر چاہوں

”جی بہت اچھا۔“ بیلا نے مختصر کہا۔
تھوڑی دیر بعد ملازمہ لوٹ آئی اور بیلا کو ساتھ لے کر سرونٹ کو ارٹرز کی طرف چلی گئی۔ یہ ساتھ ساتھ بنے آٹھ دس سنگل اسٹوری کوارٹروں کی ایک قطار تھی جن کی چھت سانچی مگر ہر دو کوارٹروں کے درمیان دو تین فٹ کی گلی سی تھی جس میں ہر کوارٹر کی کھڑکی کھلتی تھی۔ بیلا کو صاف ستھرا دو کمروں کا کوارٹر دے دیا گیا۔ اس کے دائیں بائیں کے دو کوارٹر خالی تھے۔ باقیوں میں ملازم اپنے کنبوں کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ اس کا خیال تھا کہ شاید ایک بار پھر مونس کا دیدار ہو جائے مگر وہ اسے ادھر ادھر کہیں نظر نہ آیا۔ تاہم بیلا کے اطمینان کو یہ بہت تھا کہ آتے جاتے اور کام کاج کے بہانے وہ مونس کو دیکھ سکتی تھی۔ کھانا کھا کر جب وہ دونوں حویلی سے نکلیں تو مونس آفس سے نکل کر اپنے رہائشی کمرے کی طرف جا رہا تھا۔۔۔ اور بھی بیلا نے سوچ لیا کہ مونس کے مزید قریب ہونے کے لئے اسے ایک آدھ دن بعد ہی کیا کرنا ہے؟ بیلا کو ایک بار پھر مونس کی جانب والہانہ نظروں سے تکتے پا کر اب نندنی نہ رہ سکی۔ حویلی سے کچھ دور آ کر اس نے قدم سست کر لئے۔ بیلا نے اس کی طرف دیکھا تو نندنی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”دیکھ بیلا۔ مجھ سے جھوٹ نہ بولنا۔ جو پوچھوں سچ بتانا۔“
”میں تم سے جھوٹ کیوں بولوں گی دیدی۔“ بیلا کا دل دھڑک اٹھا۔ ”تم پوچھو کیا بات ہے؟“
”تو حویلی میں مونس بابو کے لئے آئی ہے ناں؟“
”دیدی۔۔۔ اتنی جلدی پوری پڑے جانے پر بیلا بہم بھی گئی اور گھبرا اٹھی گئی۔“ یہ۔۔۔
”یہ۔۔۔ یہ آپ کیا۔۔۔“

”جھوٹ نہیں بیلا۔“ نندنی نے اسے ایک درخت تلے روک لیا۔ ”میں نے تیری آنکھوں میں وہ سب پڑھ لیا ہے جو تو چھپانے کی ذرا بھی کوشش نہیں کرتی۔“
”دیدی۔۔۔“ بیلا کا سر جھک گیا۔

”نگلی۔۔۔ یہ تو کیا کر رہی ہے؟“ نندنی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور سمجھانے کے انداز میں بولی۔ ”ان کا دھرم اور ہے ہمارا اور۔ وہ مالک ہیں ہم ان کے کمیئن داس۔ ان کے ٹکڑوں پر پلنے والے۔ کیا میل ہمارا اور ان کا۔ ذرا تو سمجھ سے کام لے۔“

”سمجھنے سوچنے کا سہ نکل چکا تھا دیدی جب مجھے یہ پتہ چلا کہ میں مونس بابو پر غار ہو چکی ہوں۔“
بیلا نے سر جھکائے جھکائے ہونٹ کاٹتے ہوئے جواب دیا۔ ”تم نے جو کہا وہ سب سچ ہے۔ میں بھی یہ سب جانتی ہوں مگر یہ جودل ہے ناں دیدی۔۔۔ میرے بس میں نہیں ہے۔ میں اس کی داسی ہوں۔ یہ جو چاہتا ہے مجھے کرنا پڑتا ہے۔“

”بیلا۔۔۔“ نندنی نے حیرت سے اس دیوانی کو دیکھا جسے اپنا دھرم تک مونس سے کمتر نظر آ رہا تھا۔
”ہاں دیدی۔۔۔“ بیلا اس کے شانے پر سر رکھ کر سسک پڑی۔ ”میں سچ کہہ رہی ہوں۔ یہ جاننے ہوئے بھی کہ میں مونس بابو کو پائیں سکتی ان کے قریب رہنے کا بہانہ تلاش کرتے کرتے سوامی جی کے پاس جا پہنچی اور انہوں نے ایک ہی دن میں مجھے مونس بابو کے قدموں میں پہنچا دیا۔۔۔ دھنیہ ہیں وہ دیدی۔ میں ان کے چٹکار کی قائل ہو گئی۔“ اس نے سر اٹھایا۔
جواب میں خاموشی سے نندنی نے اس کی آنکھیں اپنے پلو سے خشک کیں اور زبان بند کر لی۔
اب وہ اسے سوامی کے چٹکار کے بارے میں کیا بتاتی، جس نے پنڈت کو مہرے کی طرح استعمال کر کے نندنی کی جگہ بیلا کو حویلی بھجوا دیا اور خود تانترک آسن پر براجمان ہو بیٹھا تھا۔ نندنی کی سمجھ میں ساری بات آ گئی۔ اس نے بیلا کو کمرے بازو کے حلقے میں لے لیا اور چل پڑی۔
مندر کے قریب پہنچیں تو بیلا رک گئی۔

”دیدی۔ میں ذرا سوامی جی سے مل کر ان سے دھنیہ ادا کہنا چاہتی ہوں۔ وہ اس سے مندر ہی میں ہوں گے۔ تم چلو۔ میں بعد میں تم سے ملتی ہوں۔“

”نہیں بیلا۔“ نندنی نے پیار سے اس کا گال چھوا۔ ”مجھے پنڈت جی سے کچھ کام ہے۔ تم سوامی جی سے شام کو ان کے استھان چل لینا۔“

”ٹھیک ہے دیدی۔“ بیلا نے بالکل ضد نہ کی۔ ”تو میں چلوں؟“
”ہاں۔۔۔ اور یاد رکھنا۔ کوئی ایسا قدم نہ اٹھانا جو۔۔۔“ نندنی کہتے کہتے رک گئی پھر ایک لمحے کے بعد بولی۔ ”بھگوان تمہاری سہائتا کرے بیلا۔ حویلی میں سنہیل کر رہنا۔“

”میں خیال رکھوں گی دیدی۔“ بیلا نے نظریں جھکالیں۔ ”تم بات کو اپنے تک ہی رکھنا۔“
”اس کی تم چھتانا کرو۔“ نندنی نے اسے گلے لگا کر رخصت کیا اور خود مندر کی گئی جتنی سیرھیاں پڑھنے لگی۔

☆=====☆=====☆

پنڈت، نندنی کی زبانی ساری بات سن چکا تھا اور پوری طرح مطمئن تھا۔ نندنی کے خاموش ہونے پر اس نے اپنی گرسنہ نگاہوں کو حرکت دی اور نندنی کا سینہ جیسے بہت بڑے بوجھ سے آزاد ہو گیا۔ پنڈت نے زبان ہونٹوں پر پھیرتے ہوئے اس کے چہرے کو نظروں کے ہالے میں لیا۔
”بیلا کہاں ہے؟ وہ کیوں نہیں آئی تیرے ساتھ؟“ پنڈت نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔
”وہ شام کو آئے گی۔ ابھی گھر گئی ہے۔“ نندنی نے پنڈت کو خود سے بتانا مناسب نہ سمجھا کہ بیلا نے اپنے رہنے کا انتظام حویلی ہی میں کر لیا ہے۔

”حویلی والوں کا سلوک تیرے ساتھ اگر اچھا ہے نندنی تو اس میں ان کا کوئی کمال نہیں۔ تو نے ہی ایسی ہے کہ سب تیرا اچھا ہی سوچتے ہیں۔“ پنڈت نے اسے عجیب سی واہیات نظروں سے گھورا۔
”میں اب چلوں پنڈت جی۔“ نندنی نے جیسے اس کی نیت بھانپ لی۔ ”بچے گھر پہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔“

”سوامی جی سے نہیں ملے گی کیا؟“ پنڈت نے اسے اٹھتے دیکھا تو جلدی سے کہا۔
”میں ان کے استھان پر مل لوں گی ان سے۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔

”وہ یہیں ہیں نندنی۔۔۔ اور تیرا انتظار کر رہے ہیں۔“ پنڈت نے معنی خیز نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

”یہاں۔۔۔“ نندنی نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھا مگر ان دونوں کے سوا وہاں اسے اور کوئی نظر نہ پڑا۔ ”یہاں کہاں ہیں وہ؟“

”ادھر۔۔۔“ پنڈت نے مٹی کے مرلی منوہر کے پہلو میں بند دروازے کی جانب آنکھ سے اشارہ کیا۔ ”ادھر اندر براجمان ہیں سوامی جی۔“

”اس کوٹھڑی میں؟“ نندنی نے پوچھا اور اس کا دل دھڑک اٹھا۔

”ہاں۔۔۔“ پنڈت نے بڑا سا کدو جیسا سر ہلایا۔ ”وہ جانتے تھے کہ تو ان کی آگیا کا پالنہ کرنے میں کوئی چرچر نہیں کرے گی۔ حالانکہ لے لے۔ ان سے دھووا دھو بھی کہہ لے اور ان سے اپنے چدرہ مو بھی وصول لے۔“

”پرا بھی تو مہینہ شروع ہوا ہے پنڈت جی۔“ نندنی کھڑے کھڑے بولی۔ ”پھر حویلی والوں نے بھی اس مہینے کی پوری تنخواہ دے دی ہے۔ ابھی مجھے ضرورت نہیں مزید پیسوں کی۔“

”مور کھ۔“ پنڈت کو غصہ آ گیا۔ ”تو سوامی جی کے گب کو آواج دے رہی ہے۔ وہ تجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ تجھے دھن دان کرنا چاہتے ہیں اور تو بہانے بنا رہی ہے۔ اچھا کیا ہے تیری؟ جانتی نہیں اگر سوامی جی کو غصہ آ گیا تو تیرا کیا سر ہو سکتا ہے۔“

”میں نے کوئی بہانہ نہیں بنایا پنڈت جی۔“ ایک دم نندنی سہم گئی۔ سوامی دھیرج داس کی ناراضگی کے خیال ہی سے اس کی جان ہوا ہو گئی۔ اس کی کالی شکلیوں کا خوف نندنی کو سر سے پاؤں تک پسینے میں نہلا دینے کے لئے کافی ثابت ہوا۔ ”میں تو۔۔۔ میں تو۔۔۔“ وہ ہکا کر رہ گئی۔

”بکری کی طرح میں میں نہ کر۔۔۔“ پنڈت نے اسے ڈپٹ دیا۔ اس کی دگرگوں حالت دیکھ کر وہ گیدڑ سے ایک دم ڈم کشا شیر بن گیا۔ ”جا۔ اندر جا کر سوامی جی کے چرن چھو۔ ان کی بات سن۔ ان کی آگیا کا پالنہ کرنا کہ وہ تجھ سے گھس ہو کر تیرے سارے پاپ دھو دیں۔ جا۔ جلدی کر۔“

اور زرد پڑتی نندنی تھوک نکلنے کی ناکام کوشش کرتی کوٹھڑی کی طرف بڑھ گئی۔ پنڈت کے ہونٹوں پر بڑی مکر وہ مسکراہٹ پھیل گئی اور کسی لذت آمیز خیال کے تحت وہ دھوتی کا کونہ مسلنے لگا۔

نندنی ایک پل کے لئے کوٹھڑی کے دروازے پر رکی۔ پھر دھڑ دھڑ دھڑکتے دل پر قابو پانے کی اپنی سی کوشش کرتے ہوئے اس نے دروازے پر ہاتھ رکھا۔ ذرا سے دباؤ پر ہی دروازہ کھل گیا۔ اندر نیم اندھیرا نیم اجالا تھا۔ وہ چند لمحے اس تلکجے ماحول میں آنکھیں گاڑے کھڑی رہی۔ بھی سوامی کی غیر انسانی سی آواز ابھری۔

”چلی آؤ نندنی۔ رک کیوں گئیں؟“ اسے لگا جیسے کوئی درندہ اپنے شکار کو ایسی پیار بھری غراہٹ سے مخاطب کر رہا ہو جس میں تحکم پوشیدہ ہو۔

نندنی نے مشینی انداز میں قدم اٹھایا اور کوٹھڑی میں داخل ہو گئی۔ کوٹھڑی خاصی بڑی تھی بلکہ اسے ایک مناسب سائز کا چھوٹا سا کمرہ کہا جاسکتا تھا۔ سوامی سامنے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے چٹائی پر آلتی پالتی مارے بیٹھا اسے دزدیدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”دروازہ بند کر دو۔“ وہ آگے بڑھی تو سوامی کے دوسرے حکم نے اسے دہلایا مگر پہلے ہی جیسے مشینی انداز میں اس نے کچھ سوچے سمجھے بغیر پلٹ کر دروازہ بند کر دیا۔

”آؤ بیٹھو۔“ تیسرے حکم نے اسے سوامی کے سامنے دوزخ والا بٹھا دیا۔ اس کی ساڑھی کا پلو ڈھلکا ہوا تھا۔ اس نے اسے درست کرنا چاہا تو سوامی نے ہاتھ اٹھا کر دھیرے سے کہا۔ ”رہنے دو۔ اچھا لگ رہا ہے۔“

نندنی کی نگاہیں جھکیں اور ہاتھ بے جان انداز میں گود میں آگرے۔ سوامی کی تیز نظریں اسے اپنے جسم کے آرا پار گزرتی محسوس ہو رہی تھیں۔

”بیلا کو حویلی چھوڑ آئیں؟“ سوامی نے پوچھا۔

”جی۔۔۔“ نندنی نے سر جھکائے جھکائے ڈوبتی آواز میں جواب دیا۔

”یہ لے اپنی تنخواہ۔۔۔“ سوامی نے ران تلے سے کچھ نوٹ نکال کر اس کی جھولی میں ڈال دیے۔ ”ہر ماہ پنڈت سے آکر لے جایا کرنا اور اگر وہ کچھ چرچر کرے تو میرا نام اسے یاد کرا دینا۔“

”جی۔۔۔“ نندنی اب بھی اتنا ہی کہہ سکی۔

”انہیں پلو میں باندھ لے۔“

خاموشی سے اس نے سوامی کے حکم کی تعمیل کی اور نوٹ گئے بغیر ساڑھی کے پلو میں باندھ لئے۔

”یہ نندکار کا کیا قصہ ہے؟“ اچانک سوامی کے سوال نے نندنی کو کسی وحشت زدہ ہرنی کی طرح چونکا دیا۔ اس نے گھبرا کر نگاہیں اٹھائیں اور سوامی کی تیز نظروں نے اس کی آنکھوں میں جیسے نوکیلا برا

گئی۔ نندکار کو اس کی یہ ادا پاگل کر گئی۔ اس نے جذبات پر قابو پاتے ہوئے تحائف کا پیکٹ نندنی کی گود میں ڈال دیا۔

”یہ۔۔۔ کیا ہے؟“ تجھک کر نندنی نے پوچھا۔

”تمہارے حسن کے لئے ایک معمولی سی بھینٹ۔۔۔“ نندکار نے ہولے سے کہا۔ ”اگر سوئیکار کر لو تو بڑا اُپکار ہوگا۔“

”باتیں خوب بنا لیتے ہو۔“ نندنی مسکرائی۔

”مگر ایک بات بھی ایسی نہیں کر سکتا نندنی جو تمہارے حسن کا تول بتا سکے۔“ نندکار نے صاف گوئی سے کام لیا۔

”اچھا!“ نندنی نے آنکھ اٹھا کر اس کی جانب دیکھا تو نندکار کے دل کی دنیا زیور بر ہو گئی۔

”میں سچ کہہ رہا ہوں نندنی۔“ نندکار نے اس کا ہاتھ تھام کر چوم لیا اور بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔ ”بڑی کھٹنائیوں کے بعد تم تک پہنچ پایا ہوں۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ آج میں کتنا خوش ہوں۔“

جواب میں نندنی نے اسے لگاوٹ سے دیکھا مگر نندکار کو نجابنے کیوں لگا کہ اس کی آنکھوں میں ایک سرمہ مہر سی ہے۔ جیسے وہ نندکار کے لئے جو بول رہی ہے، جن جذبات کا اظہار کر رہی ہے، جو ظاہر کر رہی ہے، وہ سب مشینی عمل ہو۔ اس سب کا نندنی کے دل سے اس کے اندر کی خوشی سے کوئی تعلق نہ ہو۔۔۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس نے سر جھٹک کر اس وہم کو دور پھینک دیا۔ نندنی کو پنڈت نے کیسے پتایا اور کیسے اس کے لئے منایا؟ یہ اس کے سوچنے کی بات نہیں تھی۔ اس نے گزرتے وقت کو ضائع ہونے سے بچانے کے خیال سے آہستہ سے نندنی کو اپنی جانب کھینچا تو وہ سیدھی اس کے سینے سے آگئی۔ پھر اس کے بعد نندکار کے لئے کچھ بھی سوچنا ممکن نہ رہا۔ اس کے لئے یہ خیال خام ہو کر رہ گیا کہ یہ سب کیسے ہوا؟ اس کے لئے یہ کافی ہو گیا کہ جو ہو رہا ہے اس کی مہینوں کی پیاس بجھانے کے لئے ہو رہا ہے۔

☆=====☆=====☆

بیلا، سوامی دھیرج داس کے استھان پر پہنچی تو وہ آخری عورت کو جھاڑ پونچھ کر کے فارغ ہوا ہی تھا۔ جاتی ہوئی ادھیڑ عمر عورت نے اپنے تھل تھل کرتے جسم پر چند لمحے پہلے پھرتے سوامی کے ہاتھ کی لذت کا احساس آنکھیں میچھا کر سمیٹا اور کمرے سے نکل گئی۔ بیلا نے اس کے مکان سے باہر چلے جانے کے بعد ہی اندر قدم رکھا۔

”آؤ بیلا۔۔۔“ سوامی نے اسے آتا دیکھ کر خوشدلی سے کہا۔ ”تمہیں تو کل آنا تھا سندرہ۔ میں تمہارا انتظار ہی کرتا رہ گیا۔“

”کل آپ کو بہت سی ناریوں نے گھیر رکھا تھا سوامی جی۔“ اس کے چرن چھوتے ہوئے بیلا نے

اتار دیا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر لگا جیسے اس کی گویائی سلب ہو گئی ہو۔ سوامی کی آنکھوں سے بڑا گہرا اندھیرا خارج ہو رہا تھا۔ ایسا وزنی اور تھپکیاں دیتا اندھیرا جو اسے اپنے حواس سے بیگانہ کئے دے رہا تھا۔ ”وہ ایک اچھا منٹ ہے۔“ سوامی کی آواز میں تحکم پوری شدت سے جاگا۔ ”اس سے دوستی کر لے۔ یہ میرا حکم ہے، سمجھیں؟“

”جی۔۔۔“ نندنی کی آواز بڑی کمزوری سرگوشی پر مبنی تھی۔ اسے بڑا زور لگانا پڑا تھا یہ ایک لفظ ادا کرنے کے لئے۔ دماغ کی نیس کھینچی جا رہی تھیں۔ سر میں اندھیرے جھجھکارے تھے۔ لگتا تھا اسے ابھی قے ہو جائے گی۔ دل تھا کہ طلق میں چلے آئے کو اچھل رہا تھا۔

”جب تک میں یہاں ہوں تو روزانہ آدھی رات کے بعد چپ چاپ یہاں چلی آیا کرے گی۔ بلا ناغہ۔“

”جی۔۔۔“ نندنی کا سر اور آنکھیں اس قدر بوجھل ہو گئیں کہ اس کے لئے اپنے وزن پر بیٹھنا محال ہو گیا۔ اس بار اس کی آواز کسی شرابی کے حلق سے خارج ہونے والی لمبی سی ”جی“ جیسی تھی۔

”نندنی۔۔۔“ ایک دم سوامی کی آواز بھی بھاری ہو گئی۔ جذبات سے لرزتی اس کی آواز سننے میں نندنی کو بڑی دقت ہوئی۔

”جی۔۔۔ سو۔۔۔ جی۔۔۔“ وہ رک رک کر بولی اور اس کی گردن دائیں بائیں ڈول گئی۔

”آؤ۔۔۔“ سوامی نے سوکھے حلق کے ساتھ کہا اور اپنی چرخ بائیں پھیلا دیں۔

جواب میں نندنی کسی ٹٹی ہوئی شاخ کی طرح آگے کو جھکی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ اس کی آغوش میں منہ کے بل ڈھیر ہو جاتی، سوامی نے اس کا گداز سراپا یوں جھپٹ لیا جیسے کوئی بوڑھا آکٹوپس کسی بے خبر مچھلی کو اپنے کلجے بازوؤں میں دیوبچ لے۔

☆=====☆=====☆

نندکار کو حیرت اس بات پر تھی کہ وہ نندنی جو اس کے سائے سے کترا کر گزر جاتی تھی کسی کپے ہوئے پھل کی طرح اس کی جھولی میں کیسے آن گری؟

پنڈت نے اسے چوتھے ہی دن یہ خوشخبری سنا دی کہ نندنی اس کے ساتھ دوستی کرنے کو تیار ہے۔ وہ اسی دن دو پہر کو کچھ تحائف اور سونے کی بالیاں لے کر مندر پہنچ گیا۔ پنڈت نے اسے بتایا کہ نندنی کوٹھڑی میں اس کی منتظر ہے۔ اسے پہلے تو دشواں نہ ہوا مگر جب اس نے کوٹھڑی کا دروازہ کھولا تو سامنے چٹائی پر جچی سجائی نندنی کو بیٹھا دیکھ کر اس کی بے یقینی شدید حیرت میں بدل گئی۔ نندنی نے اسے دیکھا اور خاموشی سے نظر جھکالی۔ نندکار نے پلٹ کر باہر بیٹھے پنڈت کی جانب دیکھا۔ پنڈت نے آنکھ سے بڑا نقش خدا اشارہ کیا تو جھینپ کر اس نے دروازہ بند کر لیا۔ آگے بڑھا اور نندنی کے پاس جا بیٹھا۔ وہ سمٹ

لہریں خارج ہو رہی تھیں سوامی کی سرخ سرخ آنکھوں سے۔ بیلا نے گھبرا کر نظریں چرایلتا چاہیں مگر ناکام رہی۔ سوامی کی آنکھیں کسی جال کی طرح اسے اپنی گرفت میں جکڑتی جا رہی تھیں۔ اسی وقت ایک تیز سسکاری اس کے ہونٹوں سے نکلی اور اس نے تڑپ کر اپنا بایاں پاؤں تھام لیا۔ ساتھ ہی اس کی نظروں کا رابطہ سوامی کی نظروں سے ایک جھٹکے کے ساتھ ٹوٹ گیا۔ اس کا سارے جسم کو واضح طور پر ہل کر رہ گیا۔

”کیا ہوا؟“ سوامی کے ہونٹوں سے کرخت سی آواز برآمد ہوئی جو اس کے جھنجھلا جانے کا مظہر تھی۔
”کسی چیونٹی نے کاٹ لیا ہے شاید۔“ شرمندہ شرمندہ سی بیلا اپنا گورا چہنچہا پر مسلتے ہوئے بولی لیکن سوامی نے صاف محسوس کیا کہ اب وہ اس سے نظر ملانے سے گریز کر رہی ہے۔ سوامی کے جبرے بھینچ گئے۔

”بیلا۔۔۔ میری طرف دیکھو۔“ اس نے تنہا سے کہا۔

”آپ کہتے سوامی جی۔ میں سن رہی ہوں۔“ بیلا نے نظر اب بھی اوپر نہ اٹھائی۔

”بیلا۔۔۔“ سوامی کی لہجہ تلخ ہو گیا۔

”سوامی جی۔۔۔“ گھبرا کر بیلا نے ایک پل کو اوپر دیکھا۔ پھر فوراً ہی سوامی کی نظروں سے ہٹتے ہوئے دوبارہ آنکھیں جھکا لیں۔ ”مجھے۔۔۔ مجھے آپ کی آنکھوں سے اچھے آتا ہے۔“

”اچھے۔۔۔“ سوامی نے کہا اور اس کے سیاہ ہونٹوں پر ایک دم بڑی عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ گھبرا اور خود پسندی میں کشمکش ہوئی ایسی مسکراہٹ جو بتاتی تھی کہ بیلا کی اس بات نے سوامی کے کسی پوشیدہ جذبے کی ذم پر تسکین کا ہاتھ پھیرا ہے۔

”ابھی کیسا بیلا۔۔۔؟ خوف تو اس سے کھایا جاتا ہے جو انجانا ہو۔ ہم تو اچھی طرح ایک دوسرے سے آشنا ہو چکے ہیں۔“ سوامی کا لہجہ پھر ذومعنی ہو گیا۔

”پھر بھی یہ نہیں کیوں سوامی جی۔۔۔ میں آپ کی آنکھوں میں دیکھنے کی شکی نہیں رکھتی۔“ بیلا نے آہستہ سے جواب دیا۔ سوامی کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

”اچھا۔۔۔ جیسے تمہاری اچھیا۔“ کہہ کر وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ ”اب میری باتوں پر دھیان دو۔ سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ حویلی میں تمہاری پہنچ کہاں تک ہوگی؟“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔“ بیلا نے بے دھیانی میں نگاہ اٹھائی اور سوامی سے نظر ملتے ہی فوراً جھکا لی حالانکہ اب سوامی کی آنکھوں میں وہ غیر مرئی کیفیت ناپید تھی جس نے بیلا کے حواس مختل کر دیے تھے۔ اب وہاں صرف وہ سرخی تھی جو آٹھ پہر رہتی تھی، تاہم اس نے خود کو کسی امتحان میں ڈالنے سے بچانے کی نیت پختہ رکھی اور جتنی الامکان سوامی سے نظر ملانے سے گریز اس رہی۔

معنی خیز لہجے میں کہا اور اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ ”میں نے سوچا کہ آپ کو خالی سے ملنا ہی مناسب ہوگا اس لئے اب تک انتظار کرتی رہی۔“

”ارے ہاں۔۔۔ وہ۔۔۔ ہاہا۔۔۔“ سوامی کی آنکھیں گئے وقت کے کسی منظر سے چمک اٹھیں۔ ”مگر تمہیں انتظار کرنے کی کیا ضرورت تھی بیلا۔۔۔ تم تو جب چاہو آ سکتی ہو۔“ سوامی کا لہجہ بھی ذومعنی ہو گیا۔

”یہ تو آپ کی کرپا ہے سوامی جی کہ آپ میرے لئے ایسا سوچتے ہیں۔“ بیلا نے ممنونیت سے جواب دیا۔

”بس۔۔۔“ سوامی نے ہاتھ اٹھا دیا۔ ”کوئی انٹ حثت نہیں۔ مجھے تمہاری اور تمہیں میری ضرورت ہے بیلا۔ تم کہو۔ تمہارے دونوں کام ہو گئے؟“

”جی سوامی جی۔“ بیلا نے اسے تشکر بھری نگاہوں سے دیکھا۔ ”میں آپ کا اڑکا رچکا نہیں سکتی۔“

”مندکار سیدھا ہو گیا؟“ سوامی ہنسا۔

”تیر کی طرح۔۔۔“ بیلا شوخی سے بولی۔

”اور حویلی میں۔۔۔“

”مجھے جگہ بھی مل گئی اور رہنے کو کوڑی بھی۔“ بیلا نے اس کی بات پوری کر دی۔

”کیا مطلب؟“ سوامی بری طرح چونکا۔

”آپ کی کرپا ہے سوامی جی بی بی نے مجھے رہنے کو بھی وہیں جگہ دے دی ہے۔“

”مگر۔۔۔ یہ تو تمہاری اچھیا نہیں تھی۔“ سوامی کا لہجہ الجھ گیا اور وہ کچھ مضطرب سا نظر آنے لگا۔

”لگتا تھا اسے بیلا کی یہ بات ہضم نہیں ہوئی۔“ اور یہ بی بی کون ہے؟“

”بی بی حویلی کی سب کچھ ہے سوامی جی۔ حویلی کا تنکا بھی اس کی آگیا کے بغیر نہیں ہلتا۔ آپ کی کرپا سے میں نے جاتے ہی اسے اپنی منٹھی میں کر لیا۔ جب اسے پتہ چلا کہ میرا پر یوار کے نام پر کوئی نہیں ہے تو اس نے فوراً ہی مجھے رہنے کے لئے کوڑ بھی دے دیا۔ میں تو سمجھتی ہوں یہ بھی آپ ہی کا چٹکار ہے جو مجھے مونٹس بابو کے قریب رہنے کا ایسا موقع مل گیا۔“ بیلا بہت خوش تھی اور یہ خوشی اس کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہو رہی تھی۔

”ہوں۔۔۔“ سوامی نے ایک لمبا ہنکارا بھرا۔ کچھ دیر آنکھیں بند کئے کچھ سوچا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے ماتھے کی سیاہ شکنیں برابر ہو گئیں۔ یوں جیسے اس نے کوئی فیصلہ کر لیا ہو۔ بڑی آہستگی سے اس نے آنکھیں کھولیں اور بیلا کی جانب دیکھا۔ بیلا خاموش ہو کر اسی کی جانب گمراہ تھی۔ سوامی کی نگاہیں جونہی اس کی نگاہوں سے ٹکرائیں اس کے سارے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ عجیب مقناطیسی

لہجہ خوفناک ہوتا چلا گیا۔

”نہیں نہیں سوامی جی۔“ بیلا کو جیسے ہوش آ گیا۔ ”آپ۔۔۔ آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں آپ کے ساتھ چھل کرنے کا وچار بھی من میں کیسے لاسکتی ہوں؟“ وہ ہکلائی اور پھر سنبھل گئی۔ ”اصل میں آپ نے ایک دم زہر کا شبد منہ سے نکالا تو میں گھبرا گئی۔۔۔“ ایک گہرا سانس لے کر بیلا نے جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ ”آپ کہئے۔ مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

”وہ تو میں نے بتا دیا۔۔۔“ سوامی نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ بیلا نے پڑیا اٹھا کر مٹھی میں بند کر لی لیکن اس کے چہرے پر پشیمردگی صاف چھائی ہوئی نظر آرہی تھی۔

”کیا بات ہے بیلا؟ لگتا ہے تم خوشی سے یہ کیا تم نہیں کر رہیں۔“ سوامی نے اسے غور سے دیکھا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں سوامی جی۔“ وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔ ”ایسے ہی اپنے نصیب پر دھیان چلا گیا تھا۔“ اس کا لہجہ بھگ گیا۔

”کھل کر کہو بیلا۔“ سوامی اب بھی جیسے اس کی کیفیت کا مزالے رہا تھا۔

”کھل کر کیا کہوں سوامی جی؟“ بیلا کے ہونٹ لرز گئے۔ ”ابھی میں اپنے مونٹس بابو کے قریب پہنچی نہیں کہ ان سے جدائی کا بل سر پر آ پہنچا۔ کیا بے بھاگ ہیں میرے۔“ اس کی آواز رندھ گئی۔ ”یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ تم مونٹس بابو سے دور ہو جاؤ گی؟“ سوامی نے بڑی سادگی سے پوچھا۔

”سوامی جی۔۔۔“ بیلا بڑے ڈکھ سے ہنسی۔ ”جب میں رزاقی بابو کو زہر دے کر موت کے منہ میں جا پڑوں گی تو۔۔۔“

”مگر یہ بھی تم سے کس نے کہا کہ تم رزاقی بابو کو جان سے مار ڈالو۔“

”سوامی جی۔۔۔“ بیلا بھڑک سی گئی۔ ”تو کیا یہ نہ ہر انہیں امر کرنے کے لئے دیا جا رہا ہے؟“

”شاید۔۔۔“ سوامی اسی سادگی سے بولا۔ ”شاید ایسا ہی ہو۔“

”کیا مطلب؟“ بیلا بڑی طرح سے چوکی۔

”مطلب یہ ہے میری لپٹی بیلا۔۔۔“ سوامی نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھا اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”کہ تم پوری چھٹال ہونے کے باوجود بہت بھولی ہو۔ کیا میں ایسا ہی مورکھ ہوں کہ سیدھے سیدھے تمہارے ہاتھ سے رزاقی بابو کو زہر دلوا کر موت کے گھاٹ اتار دوں اور تمہیں ان ملچھوں کے ہاتھ میں کھلونا بنا کر تھما دوں۔ کہ وہ تم سے رزاقی بابو کو زہر دینے کے الزام میں جو چاہے سلوک کرتے رہیں۔“

”میرا مطلب ہے کہ حویلی میں تمہارے ذمے جو کام ہیں ان کے تحت تم رزاقی بابو کے کتنا قریب جا سکتی ہو؟“ سوامی نے پوچھا پھر بیلا کے چونکنے پر ہاتھ اٹھا کر فوراً ہی کہا۔ ”آں ہاں۔۔۔“ میرا مطلب اس نزدیکی سے نہیں ہے۔۔۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم رزاقی بابو کے لئے کھانے پینے کا۔۔۔“

”جی ہاں۔۔۔“ اچانک بیلا کو کچھ یاد آ گیا اور اس نے سوامی کی بات اچک لی۔ ”بی بی نے کہا تھا کہ مجھے روز اندرات کو رزاقی بابو کے لئے کافی بنا کر ان کے کمرے میں پہنچانا ہوگی۔“

”اوہ۔۔۔“ سوامی مضطرب سا ہو گیا مگر اس بے چینی میں ایک مسرت کا احساس تھا جو بیلا سے چھپا نہ رکھا۔ ”یہ بہت ہے بیلا۔ یہی بہت ہے۔“

”جی۔۔۔؟“ بیلا نے آنکھوں سے سوامی کو دیکھا جو پہلو بدل کر کچھ آگے سرک آیا تھا۔

”سنو بیلا۔۔۔“ سوامی کی آواز دب سی گئی۔ ”یہاں سے میرا دوسرا کام شروع ہوتا ہے جسے کرنے کا تم مجھے وچن دے چکی ہو۔“

”آپ کی آگیا کا پالنا میرا دھرم ہے سوامی جی۔ وچن نہ بھی دیا ہوتا تو آپ نے جو اپکار مجھ پر کیا ہے میں اسے چکانے کے لئے آپ کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں۔“

”تو نہیں۔۔۔“ کچھ لو بھارت ماتا کے لئے کچھ کرنے کا جو وچار میں اپنے دل میں رکھا ہوں۔ تم بھی اس میں بھاگ لینے جا رہی ہو۔“ سر جھکائے بیٹھی بیلا سوامی کی بات سنتی رہی جو کہہ رہا تھا۔ ”تمہیں کرنا یہ ہے کہ اس دوائی کی آدھی چٹکی روز اندر رزاقی بابو کی کافی میں ملا کر اسے پلاتی رہو۔“ سوامی نے ایک پڑیا بیلا کے سامنے ڈال دی۔

”یہ۔۔۔ یہ کیا ہے سوامی جی؟“ بیلا نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔ اس کا رنگ ایک دم زرد پڑ گیا تھا۔ ”زہر۔۔۔“ سوامی نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور اس کی سردی تیز سرگوشی بیلا کے رگ و پے

میں آگ کی لہر کی طرح اترتی چلی گئی۔

”زہر۔۔۔“ خوفزدہ لہجے میں بیلا کے ہونٹوں سے نکلا اور اس بار وہ نظریں نہ چرا سکی۔ وہ بُت بنی سوامی کی آنکھوں میں تکتی رہی جہاں اسے عجیب سی نفرت کے شعلے دھکتے نظر آرہے تھے۔

”ہاں۔۔۔ زہر۔۔۔“ سوامی نے اس کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے جواب دیا تو اس کے ہونٹ بھیج کر رہ گئے۔ ”اور تم میری بات پر حیران کیوں ہو بیلا۔۔۔ یاد ہے تم نے کہا تھا کہ تم مونٹس بابو کے لئے جان لے بھی سکتی ہو اور دے بھی سکتی ہو۔۔۔ کیا وہ صرف اپنا مطلب نکالنے کے لئے شبدوں کا گورکھ دھندا تھا جس میں تم مجھے الجھانا چاہتی تھیں؟ یاد رکھو سوامی دھیرج داس اپنے سے چھل کرنے والے کو وہ ڈنڈ دینا جانتا ہے کہ اس سے کپٹ کرنے والے کی آتما کو پاتال میں بھی جگہ نہیں ملتی۔“ اس کا

”تو پھر۔۔۔“ بیلا الجھ کر رہ گئی۔ ”آپ کیا کرنا چاہتے ہیں سوامی جی؟ مجھ سے کیا کام لینا چاہتے ہیں؟ یہ ہر کیا کام کرے گا میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔“

”میرا خیال ہے کہ تمہیں زیادہ پریشان نہیں کرنا چاہئے۔“ اچانک سوامی مسکرا دیا۔ ”سب سے پہلے تو یہ جان لو کہ اس پڑیا میں زہر نہیں ہے۔“

”تو پھر۔۔۔“ بیلا حیران ہوئی۔

”اس میں ایک ایسی دواوی ہے جو رزاتی بابو کو ہمارے لئے ہموار کر دے گی۔ آہستہ آہستہ مگر بالآخر وہ ہمارے کام کا منٹ ہو کر رہ جائے گا۔“

”یعنی۔۔۔“

”بیلا۔۔۔“ سوامی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”تمہیں یاد ہے تم سے پہلی بھینٹ میں تمہیں نے تم سے بھارت ماتا کی بات کی تھی اور تم نے بات سننے بغیر ہی میرا دوسرا کام کرنے کے لئے ہاں کہہ دی تھی۔ یہ دوسرا کام جو رزاتی بابو کے شریر میں یہ دوا پہنچانے کے نام پر میں تم سے لے رہا ہوں اپنی اور تمہاری بھارت ماتا کے لئے ہے۔“ سوامی نے چند فقروں میں بیلا کو خالق نگر میں مندر بنانے کے اپنے منصوبے سے آگاہ کر دیا۔ بیلا حیرت کے عالم میں اس کی بات سنتی رہی۔ جب وہ خاموش ہوا تو بیلا کے سارے جسم میں پھریریاں سی اٹھ رہی تھیں۔

”تو اس کا مطلب ہے کہ یہاں اس گاؤں میں مندر بنے گا؟“ بیلا ساری بات سننے کے بعد کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

”اوش بنے گا بیلا۔۔۔ اوش بنے گا۔“ سوامی نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”چاہے اس کے لئے مجھے سارے خالق نگر کو شمشان کیوں نہ بنانا پڑے یہاں مندر ضرور بنے گا تاکہ ہماری آنے والی نسلیں ایک دن یہاں بھارت کا ترنگا لہرا سکیں۔ یہ مندر تو خالق نگر کو بھارت ماتا کا حصہ بنانے کے منصوبے کا آغاز ہے۔“

”بڑا کٹھن کام ہے سوامی جی جس کا آپ نے بیڑا اٹھایا ہے۔“ بیلا نے آہستہ سے کہا۔

”تم اس کٹھنالی میں میرے ساتھ ہونا؟“ سوامی نے بیلا کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

”جی جان سے سوامی جی اس میرے منوں بابو کو کچھ نہیں ہونا چاہئے۔ باقی چاہے ساری دنیا کو آگ لگ جائے۔“ بیلا کے لہجے میں وہ خود غرضی اپنی انتہا پر تھی جسے لوگ عشق بھی کہتے ہیں۔

”یہ میرا تم سے وچن ہے کہ منوں بابو کو تمہارا بنا کر رہوں گا بیلا۔ اور یہ تو تم دیکھ ہی چکی ہو کہ میرے لئے کوئی بھی کام اسمبھو نہیں ہے۔“ سوامی نے بیلا کا ہاتھ دبایا۔

”وہ تو میں دیکھ چکی ہوں سوامی مہاراج۔“ بیلا مسکرائی۔ ”دو دن میں میرے دونوں کام کر کے

آپ نے اپنے مہمان شگفتی مان ہونے کا جادو مجھ پر چلا دیا ہے۔“

”تو اب دھیان سے سنو سوامی۔“ سوامی نے اس کا ہاتھ تیسرے مرحلے میں اپنے استخوانی ہاتھ میں جکڑ لیا۔ ”رزاتی بابو کو یہ دوا بتائی ہوئی مقدار سے زیادہ ہرگز نہ دینا۔ دوسرے یہ کہ وہاں کی ساری وہ باتیں جو کسی طرح ہمارے کام کی ہوں تم پنڈت یا مجھ تک برابر پہنچاتی رہو گی۔ تیسرے یہ کہ کچھ دنوں بعد ہوئی ہے اور اس موقع پر دہلی سے تمہاری ایک موسی تم سے ملنے یہاں آ رہی ہے۔ تمہیں اسے اپنے ساتھ اپنے کوارٹر میں رکھنا ہو گا۔“

”میری موسی؟“ بیلا حیرت سے بولی۔

”ہاں۔“ سوامی بڑے پراسرار انداز میں مسکرایا۔ ”تمہاری موسی۔۔۔“

”مگر سوامی جی۔۔۔ میری تو کوئی موسی نہیں ہے۔۔۔“

”مجھے بھی ابھی ابھی پتہ چلا ہے بیلا کہ تمہاری ایک موسی ہے جو دہلی میں رہتی ہے اور ہولی پر تم سے ملنے آ رہی ہے۔“ وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔

”مگر سوامی جی۔۔۔“

”زیادہ نہ تھکاؤ اپنے ننھے سے دماغ کو۔۔۔ موسی ہے اور دہلی میں ہے۔ ہولی پر آ رہی ہے اور تمہارے ساتھ حویلی کے کوارٹر میں ٹھہرے گی۔ یہ بات تم کل ہی سے حویلی والوں کے کانوں میں اتارنا شروع کر دو۔“

اور ایک دم بیلا سوامی کی بات سمجھ گئی۔ چند لمحے وہ اسے منہ پھاڑے نکلتی رہی پھر آہستہ آہستہ نازل ہو گئی۔ آخر میں اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے سوامی کو دیکھا اور سر جھکا لیا۔

”سمجھ گئیں ناں؟“ سوامی نے اس کا نرم و نازک ہاتھ ہونٹوں سے لگا لیا۔

جواب میں بیلا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ہاتھ دھیرے سے واپس کھینچ لیا۔

”کیا یہ بھینٹ خالی جائے گی بیلا؟“ سوامی نے شکایتی لہجے میں پوچھا۔

”میں ان دنوں ٹھیک نہیں ہوں سوامی جی۔“ بیلا نے دھیرے سے کہا اور دھیرج داس کی بیٹیابی پر اوس پڑ گئی۔

”اوہ۔۔۔“ ماپوسی سے کہتے ہوئے سوامی سیدھا ہو بیٹھا۔ پھر ذرا دیر بعد اس نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ ”ساری باتیں سمجھ لیں ناں؟“

”جی ہاں۔۔۔“ بیلا نے جسم سیٹھا۔ ”میں اب چلوں گی۔“ اس نے پڑیا احتیاط سے اپنی ساڑھی کے پلو میں باندھ لی۔

”اب حویلی جاؤ گی کیا؟“

”جی۔۔۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”آ گیا چاہوں گی۔“

”جلدی جلدی ملتی رہنا۔۔۔ کسی خبر اور اطلاع کے بغیر بھی۔۔۔“ سوامی نے رک رک کر بڑے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”جی۔۔۔“ بیلا اس کا مطلب سمجھ کر مختصر ابولی اور اسے پرنام کر کے اٹھنے پاؤں باہر نکل گئی۔

سوامی نے سر جھکا لیا اور کوشش میں جلتے بلب کی زرد روشنی میں کسی بیوہ بدروح کی طرح گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ شاید آنے والے وقت کی آہٹ سننے کی کوشش کر رہا تھا۔

☆=====☆=====☆

بیلا نے چند ہی دنوں میں بی بی کو اپنا گرویدہ کر لیا۔ نندنی کی کمی اس نے یوں پوری کی کہ بی بی کو اس کا ذکر کرنا بھی یاد نہ رہا۔ حویلی کے کمروں اور خاص طور پر رزاتی کے بیدروم کی دیکھ ریکھ سے لے کر رات دن کے آٹھوں پہر بی بی کے ایک ایک حکم کے گرد تعمیل کے چکر کاٹتے ہوئے اس نے یوں گزارنے شروع کئے کہ بی بی کو سوائے زبان ہلانے کے اور کوئی کام ہی نہ رہا۔ نوکر چا کر اب بی بی کے بجائے بیلا کا نام چنے لگے تھے۔ اپنے آپ میں رہتے ہوئے وہ انہیں غیر محسوس انداز میں یوں آسانیاں فراہم کرنے لگی کہ وہ بے اختیار اس کا دم بھرنے لگے۔ وہ دن کا خیال کرتی نہ رات کا۔ ہر وقت بی بی اور رزاتی کی ایک آواز پر حاضر۔ اس تبدیلی کو رزاتی نے بھی محسوس کیا۔ اسے پہلے بھی کبھی کسی کام کے لئے تردد نہ کرنا پڑا تھا مگر بیلا کے آجانے کے بعد اس کے کاموں میں جوا جلا پن اور باقاعدگی آ گئی تھی وہ نندنی کے وقت میں شاید کبھی جس بات نے حاس طور پر اسے بیلا کی آمد کا احساس دلایا وہ سوتے وقت کافی کا کپ تھا۔ نندنی کے ہاتھ کی کافی کا وہ عادی ہو چکا تھا مگر بیلا نے دوسری ہی شب اس کے سر ہانے تپائی پر کافی کا جو کپ لا کر رکھا، اس کے جانے کے بعد اس کے سپ لیتے ہوئے اس نے جانا کہ ایسی اچھی کافی شہر کے کسی بڑے ہوٹل میں ملے تو ملے، کسی گھر میں ایسی کافی کا گھونٹ بڑی انوکھی بات تھی۔ ذائقے کی یہ تبدیلی رزاتی کے لئے سکھ کے چند لمحات کا سندیسہ لائی تو بیلا کو اس وقت نظر بھر دیکھنا اس کے لئے معمول سا بن گیا جب وہ کسی کام سے اس کے کمرے میں آتی۔ چلبلی سی، چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی، ہنستی ہنساتی، اپنی اوقات میں رہتے ہوئے بے تکلفی سے ایک دو فقرے کہہ جاتی بیلا اسے بھاگتی۔ اس کے کسی انداز سے نہ لگتا تھا کہ وہ اپنی حد سے باہر جانا چاہتی ہے۔ یہی اس کے دل میں اتر جانے کا راستہ بنا اور رزاتی نے اسے اپنے پسندیدہ افراد کی فہرست میں رکھ لیا۔ اس بات کا اظہار اس نے ایک آدھ فقرے میں بی بی کے سامنے بھی کیا تو بی بی کا خوشی کے مارے برا حال ہو گیا۔ بہت دنوں بعد اس نے رزاتی کے چہرے پر اداوی کی تہ کو ہلکا ہوتے پایا تھا اور یہ بات اس کے لئے کس قدر سکون کا باعث تھی اس کا پتہ ساری حویلی کو اس وقت بآسانی چل گیا جب بی بی نے بیلا کو بلا کر اس کا ہاتھ چوما اور اسے

رزاتی کے لئے نیک شکون قرار دیتے ہوئے سب ملازموں میں کپڑے اور مٹھائی بانٹنے کو کہا۔

اس کام سے فارغ ہو کر بیلا نے کچھ سوچا اور موقع اچھا جانتے ہوئے بی بی کے قریب آ بیٹھی۔ اسے بتایا کہ سب نوکروں میں بی بی کے حکم کے مطابق نئے کپڑے اور مٹھائی تقسیم کی جا چکی ہے۔ بی بی نے اسے پیار سے دیکھا اور کہا۔

”بیلا۔۔۔ تو میرے باؤ کے لئے بڑی خوش قدم بن کر آئی ہے۔ اس نے تیری تعریف کی اور کہا بی بی! بیلا بڑی اچھی لڑکی ہے۔ میرا بہت خیال رکھتی ہے اور کافی بہت اچھی بناتی ہے۔ نندنی سے بھی اچھی۔“

ایک رنگ سا بیلا کے چہرے پر آ کر گزر گیا۔ کافی کے ذکر پر وہ چپ سی ہو گئی۔۔۔ تاہم ذرا ہی دیر بعد اس نے خود کو سنبھال لیا اور بولی۔ ”بی بی۔ یہ مونس بابو حویلی میں کیوں نہیں رہتے۔ وہ رزاتی بابو کے بھائی ہیں ناں؟“

”بھائی؟“ بی بی اس کے بھولپن پر ہنسی۔ ”ہاں۔۔۔ بھائی بھی ہے وہ باؤ کا۔۔۔ مگر شاید بھائی چھوٹا لفظ ہے بیلا۔ وہ باؤ کا دوست ہے۔ مگر نہیں۔۔۔ یہ بھی نہیں۔۔۔“ بی بی نے اپنا سر نفی میں جھٹکا۔ ”بھائی بھی نہیں۔ دوست بھی نہیں۔ وہ باؤ کا سایہ ہے۔ ہاں۔۔۔“ وہ خوش ہو گئی۔ ”سایہ ہے وہ باؤ کا۔ ایسا سایہ جو اندھیرے میں بھی باؤ کے ساتھ چلتا ہے۔ اسے کبھی اکیلا نہیں چھوڑتا۔ جب مجھ والا واقعہ ہوا ناں تو مونس نے جس طرح باؤ کا ساتھ دیا اور خود کو اللہ کا مجرم ہونے سے بھی بچا لیا، وہ اسی کا کام تھا۔ میں تو آج تک اس موضوع پر باؤ سے بات نہیں کر پائی۔ اس لئے کہ میں جانتی ہوں وہ اندر سے کتنا دیمک زدہ ہے۔ چلتا پھرتا، سوتا جاگتا، کھاتا پیتا بے روح، بے جان جسم ہے وہ۔“ بی بی کی آواز بھر ا گئی۔ ”میں اس کے ساتھ ہوں۔ میں بھی یہی کہتی ہوں کہ اللہ کو باؤ کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔۔۔ جس انسان کی اس قدر آواز داری کے بعد بھی شتوئی نہ ہو وہ اس کے سوا اور کیا کرے کہ چپ ہو جائے۔ اس کے گھر سے نکل آئے اور اس کا دروازہ اپنے پیچھے بند کر دے۔۔۔ میرا باؤ۔۔۔ میرا باؤ۔۔۔“ بی بی نے پلو آنکھوں پر رکھ لیا اور ہچکچکیاں لینے لگی۔

بیلا جلدی سے اٹھی اور بی بی کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ اس نے ہولے ہولے بی بی کے کندھے دبائے شروع کئے اور ساتھ ساتھ اپنے حلق میں گرتے آنسو پینے کی کوشش کرتی رہی جو دین چاہے ہی اچلتے چلے آ رہے تھے۔

”مونس نہ ہوتا ناں بیلا تو باؤ کا نجانے کیا حال ہو جاتا۔“ بی بی نے کچھ دیر بعد آنسو پونچھے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر پاس بٹھالیا۔ ”تو میرے باؤ کا خیال رکھا کر۔ اسے کوئی تکلیف نہ ہو، بس میں یہی چاہتی ہوں۔ جس دن وہ دوبارہ مسکرا دیا ناں، وہ دن اس حویلی میں عید کا دن ہوگا۔ بہار آ جائے گی یہاں ایک

بار پھر۔۔۔ اور نجانے کیوں مجھے لگتا ہے بیلا کہ مونس کے ساتھ ایک ہی اور ہستی ایسی ہے جو میرے باؤ کو زندگی کی رونقوں کی طرف واپس لاسکتی ہے۔“

”وہ کون ہے بی بی۔ مجھے بتائیے۔ میں اس کی منت کر کے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اسے مان لوں گی کہ وہ رزاقی بابو کے لئے جی جان سے کوشش کرے۔۔۔“ بیلا نے بی بی کے ہاتھ تھام لئے۔

”وہ۔۔۔“ بی بی نے اسے کھلکھلاتی نظروں سے دیکھا۔ ”وہ ہستی تو ہے بیلا۔“

”میں۔۔۔؟“ بیلا واقعی حیران رہ گئی۔

”ہاں بیلا۔ تو۔۔۔“ بی بی نے کہا۔ ”میں نے باؤ کی بات سے اندازہ لگایا ہے کہ وہ تجھ سے بہت خوش ہے اور جس سے انسان خوش ہوتا ہے ناں بیلا اس کی موجودگی اسے ویرانوں سے چمن کی طرف کھینچ لاتی ہے۔ اس کی اداسی کو مسکراہٹ میں بدل سکتی ہے۔ اسے زندگی کرنے کا احساس دلا سکتی ہے۔ کیا تو ایسا کرنے میں میری اور مونس کی مدد کرے گی بیلا؟“

”میں۔۔۔ میں پوری کوشش کروں گی بی بی۔“ بیلا نے حواس مجتمع کرتے ہوئے تھوک نگلا۔ ”مگر یہ خیال رکھئے گا کہ آپ نے بڑی کنھن ذمے داری کا بوجھ مجھ پر ڈال دیا ہے۔ کہیں اگر میں لڑکھڑا گئی تو۔۔۔“

”مونس بھی سے اور میں بھی بیلا۔ میں تجھے سنبھال لوں گی۔ مونس تجھے ہاتھ دے لگا۔“ بی بی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”تم اکیلی نہیں ہو۔ ہم سب مل جل کر باؤ کو ایک بار پھر ہنسنے سکھانے پر مجبور کر دیں گے۔ کہو۔۔۔ ایسا ہو گا ناں؟“ بی بی نے بچوں جیسی امید سے پچل کر پوچھا۔

”ہاں بی بی۔“ بیلا نے خوابناک لہجے میں کہا۔ ”ضرور ہو گا۔ ضرور ہو گا۔“

”تو بس۔ سمجھ لے آج سے تیری بی بی اس دن کے انتظار میں گن گن کر سانس لے گی جب اس کا باؤ۔۔۔ ہنستا مسکراتا باؤ۔۔۔ دوبارہ زندگی کی طرف لوٹ آئے گا۔“ بی بی نے کندھے دباتے اس کے ہاتھ تھام لئے۔ بیلا نے بی بی کے چاندی بالوں پر ہونٹ رکھ دیے۔ اس کی آنکھوں سے دو بڑے بڑے آنسوؤں کے موتی ٹوٹ کر گرے اور بی بی کے بالوں میں جذب ہو گئے۔

اس دن بیلا کو دوبارہ بات کرنے کا موقع ہاتھ نہ آیا مگر دوسرے دن اس نے ذرا سی فرصت پاتے ہی بی بی کو داؤ میں لے لیا۔

”بی بی۔ ایک بات کہنا تھی آپ سے۔“ وہ جیسے کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

”کیا؟“ بی بی نے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔

”مونس باور ہے تو دفتر کے ساتھ اپنے گھر میں ہیں مگر میں نے آتے جاتے دیکھا ہے کہ ان کے رہنے کی جگہ کا براہ خیال نہیں رکھا جا رہا۔“

”کون رکھے گا بیلا؟“ بی بی نے آہ بھری۔ ”جب تک راجیہ تھی مونس کا کمرہ چاندی جیسا چم چم کرتا تھا۔ وہ اس کی ہر ضرورت کا جی جان سے خیال رکھتی تھی مگر اس کے جانے کے بعد اب نوکروں کا جو جی چاہتا ہے کرتے ہیں۔ اور وہ خود ایسا ملنگ ہے کہ کسی بات کی طرف دھیان ہی نہیں ہے اس کا۔ اسے بس ایک ہی ذہن ہے کہ کسی طرح باؤ کا دکھ کٹ جائے۔ رہ گیا باؤ تو اسے اپنا ہوش نہیں ہے وہ مونس کا کیا دھیان رکھے گا۔“

”میں کچھ کہوں بی بی۔“ بیلا نے لوہا گرم دیکھ لیا۔

”کیا؟“ بی بی نے دوسری بار پوچھا۔

”اگر آپ اجازت دیں تو میں مونس بابو کا گھر بھی دیکھ لیا کروں۔ ان کے اور رزاقی بابو کے دفتر کی صفائی وغیرہ تو وہاں کے ملازم کر لیتے ہیں مگر میں چاہتی تھی کہ ان کے گھر کی صفائی وغیرہ بھی میں ہی کر دیا کروں۔“

”یہ تو تو نے بہت اچھا سوچا بیلا مگر تجھ پر کام کا بوجھ بڑھ جائے گا۔“ بی بی نے اوپری دل سے کہا۔

”کوئی بوجھ دو جھ نہیں بڑھے گا بی بی۔ بس آپ ہاں کر دیں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا کہ رزاقی بابو کا

بھائیوں سے بڑھ کر دوست اور حویلی کا سب سے بڑا رکھوالا یوں مست ملنگوں جیسی زندگی گزارے اور

کی کو اس کا احساس تک نہ ہو۔“

”بس۔“ بیلا نے رکھوالا کو پروالا ہے بیلا مگر تیری بات اپنی جگہ درست ہے۔ اگر تو مونس کا

کام بھی دیکھ لیا کرے تو میری ایک بڑی فکر دور ہو جائے گی۔“ بی بی اس کے لہجے سے سیدھا متاثر نظر آ رہی

تھی۔

”تو بس۔ سمجھ لیں کہ آپ کی فکر دور ہو گئی۔“ بیلا نے ہاتھ اٹھا کر جیسے اپنا فیصلہ سنایا۔ ”آج سے

مونس بابو کا سارا کام میں خود دیکھا کروں گی۔“

”جیتی رہ بیلا۔“ بی بی نے خوش ہو کر کہا۔ ”تیرے لئے میرے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔ خدا

کرے تیری زندگی میں کبھی دکھ نہ آئے۔“

جواب میں بیلا مسکرا کر خاموش ہو رہی۔ بی بی بیچاری کو کیا معلوم کہ مونس کے گھر میں داخلے کا

پروانہ دے کر اس نے بیلا کے لئے کس جنت کا درکھول دیا ہے۔

دس بجے تھے جب وہ بی بی کو بتا کر حویلی سے نکلی اور مونس کے ہاں جا دمکی۔ یہ وقت تھا جب

روزانہ مونس بیڈروم سے نکل کر آفس کے کمرے چلا آتا اور بیلا اس وقت کے حساب ہی سے وہاں پہنچی

تھی۔ اب یہ اتفاق تھا یا بیلا کا ناپائلا اندازہ کہ جس وقت اس نے قدم مونس کے بیڈروم کے باہر روکے

ٹھیک اسی وقت مونس نے دروازہ کھولا اور سامنے بیلا کو کھڑا دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

”تم؟“ بے اختیار مونس کے لبوں سے نکلا۔

”جی۔۔۔ میں؟“ بیلا نے اسے اک نگاہ غلط انداز سے دیکھا۔

”خیریت؟“ مونس نے سنبھالا لیا۔

”مجھے آپ کے کمرے کی صفائی کرنی ہے۔“ بیلا نے ساڑھی کے پلو کے کونے سے کھیلتے ہوئے مونس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”کوئی ضرورت نہیں۔ یہاں ملازم ہیں جو آفس کے ساتھ میرے کمرے کی دیکھ بھال بھی کرتے ہیں۔“ مونس نے باہر قدم رکھا۔

”مجھے بی بی نے خاص طور پر اس کام کے لئے کہا ہے۔“ بیلا نے اسی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس کی نظریں اب تک مونس کے چہرے سے ایک پل کونہ بٹتی تھیں۔

”مگر۔۔۔“ مونس جھنجھلا سا گیا۔ وہ بیلا کی پیباک نگاہوں سے بچنا چاہتا تھا مگر اب تک ناکام رہا تھا۔ شاید یہی غصہ نکالنے کے لئے اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

”تو کیا میں بی بی سے جا کر کہہ دوں کہ آپ ان کی بات سے بہت نہیں ہیں؟“ بیلا نے نگاہوں کی فتنہ گری کو لہجے کی معصومیت میں لپیٹتے ہوئے کہا۔

”ایسا کیوں کہو گی تم؟“ مونس گڑبڑا گیا۔

”تو پھر کیا میں اندر جاؤں؟“ بیلا نے ایک دم کمرے کے دروازے کی جانب ہاتھ اٹھا کر مگر ادب سے پوچھا۔

اور مونس بے بسی سے ہونٹ کاٹتا ہوا ایک طرف ہٹ گیا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ بی بی اس چار دن کی چھو کری کو اس قدر کھلا کیوں چھوڑ رہی ہے کہ حویلی کے تقریباً معاملات اس کے ہاتھوں میں سمیٹے چلے جا رہے ہیں۔

”سنو۔“ اسے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر مونس نے جیسے جھلا کر کہا۔

”جی۔۔۔“ وہ ہوا کے کسی لطیف جھونکے کی طرح لہرا کر باہر اور پھر اس کے قریب چلی آئی۔

”میرے کمرے کی کسی چیز کی جگہ مت بدلنا۔ بس صفائی کرو اور۔۔۔“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔

”دفع ہو جاؤ۔“ بیلا نے اسکی آنکھوں میں جھانک کر اس کی بات پوری کر دی۔ ”یہی کہنا تھا ناں آپ کو؟“

”ایسا میں نے کب کہا؟“ مونس اپنی چوری پکڑے جانے پر ایک باہر پھر گڑبڑا گیا۔ ساتھ ہی اس کے چہرے پر شرمندگی کی لہری آ کر گزر گئی۔ اسے بیلا کی لطافت حس پر حیرت بھی ہوئی۔ جس آسانی اور تیزی سے اس نے مونس کی بات کی کھال اتاری تھی وہ واقعی اس کی ذہانت کا قائل ہو گیا۔

”ہر بات کہنے کی تھوڑی ہوتی ہے مونس بابو۔“ بیلا مسکرائی تو مونس کو لگا کہ وہ اس کا مذاق اڑا رہی ہے۔ ”بعض باتیں سمجھانے کی بھی تو ہوتی ہیں اور میں یہ زبان بڑی اچھی طرح سمجھ لیتی ہوں۔“

”اچھا اچھا۔“ مونس نے جیب سے رومال نکالا اور پیشانی تھپتھپاتا ہوا کارڈور میں چل پڑا۔ ”جاتے ہوئے دروازہ ہلاک کر کے جانا۔“

”لاک کیا جی؟“ اس نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے پوچھا۔

”میرا مطلب ہے کمرہ آٹومٹک لاک ہو جاتا ہے تم صرف۔۔۔“ مونس اسے بتانے کے لئے پلٹا اور اس کی زبان بھٹم گئی۔ بیلا اسے شرارت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ یعنی اسے مونس کی بات کی ساری سمجھ تھی جان بوجھ کر اسے تنگ کر رہی تھی۔۔۔ چند لمحے وہ اسے گھورتا رہا پھر پلٹ کر کارڈور میں آگے بڑھتا چلا گیا۔

بیلا کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ اس نے لہر کر چکیلی کمر کو بل دیا۔ گھوم کر چک پھیری لی اور نٹ کھٹ بچوں کی طرح اچھلتی کودتی مونس کے کمرے میں گھس گئی۔

اور اس دن کے بعد بیلا کا معمول ہو گیا کہ وہ ٹھیک دس بجے مونس کے کمرے پر آوارہ ہوتی۔ وہ چند دن تو لئے دیے رہا۔ پھر ایسا ہوا کہ وہ بیلا کا منتظر رہنے لگا۔ بیلا نے مونس کے تین کمروں کی دیکھ بیکھ کی تو تین ہی دن میں گھر بنا دیا۔ اس کے کپڑے دھو کر پریس کئے ہوئے ملنے لگے۔ ہر چیز اپنے ٹھکانے پر اور صاف ستھری پائی جانے لگی۔ اب جو نوں کی پالش سے لے کر بستر کی چادر بدل دینے کے بارے میں اسے زبان نہ ہلانا پڑتی۔ یہ سب کام پہلے بھی ہوتے تھے مگر راجیہ کے جانے کے بعد ان میں کوئی ترتیب نہ رہ گئی تھی۔ ملازم وقت کے پابند رہے نہ ذمے داری پوری کرنے کے معاملے میں باقاعدگی ان کا وطیرہ رہی۔ خود مونس بھی آہستہ آہستہ بے ترتیبی اور لاابالی پن کا شکار ہوتا جا رہا تھا مگر بیلا نے چند ہی دنوں میں اسے واپس اپنی جگہ پر لاکھڑا کیا۔ اب اسے شیو کئے بغیر باہر جانے پر بھی الجھن ہونے لگی کیونکہ بیلا آتی اور اگر دیکھتی کہ وہ شیو کئے بغیر یا کپڑے بدلے بغیر آفس کے لئے نکل رہا ہے تو وہ اس کے کھتے پر جاتی۔

ایسی میٹھی میٹھی چوٹیں کرتی کہ اسے پسینہ آ جاتا۔ ایک آدھ دن تو بیلا کی باتوں پر اس کا ہاتھ شکن آلود ہو مگر وہ نجابانے کس مٹی کی بنی ہوئی تھی کہ اس کا ہر کڑوا جملہ چوم چاٹ کر مسکراہٹ میں لپیٹ کر نگل جاتی۔ پھر مونس نے تیسرے ہی دن اس کے سامنے اس وقت ہتھیار ڈال دیے جب وہ بی بی سے ملنے اندر گیا اور بی بی نے اسے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ بیلا کو اپنے کسی کام سے نہ روکے۔ باؤ کے ساتھ ساتھ اب وہ بھی بیلا کی ذمہ داری ہے۔ بھک سے مونس کا دماغ اڑ گیا۔ اس نے بے اعتباری سے بیلا کی جانب دیکھا جو بے نیازی سے ادھر ادھر مگر نکلیوں سے اسے بھی دیکھ رہی تھی۔ خاموشی سے بی بی کا حکم سن کر وہ لوٹ آیا اور بیلا کا راستہ صاف ہو گیا۔ اب وہ اس کے گھر اور آفس میں اپنی مرضی سے

دندان قی پھرتی اور مونس چپ چاپ اس کی پھرتیاں دیکھتا رہتا۔ ساتھ ہی یہ بھی تھا کہ وہ اس کے آفس کے کسی کام میں کبھی حارج ہوتی تھی نہ ذیل۔ اسے صرف مونس کے رہائشی کمروں کا سودا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ بیلا اس کا ہر کام جی جان سے کرتی ہے۔ آتی ہے تو دیر سے واپس جانے کے بہانے ڈھونڈتی رہتی ہے۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ رات کو مونس کا سرد بانے بھی چلی آتی۔

ایک طرف مونس اور دوسری طرف رزاقی دو ہی ہفتوں میں بیلا کے ایسے عادی ہوئے کہ انہیں یاد ہی نہ رہا کہ نندنی بھی کبھی ان کی ایسی ہی خدمتگار ہوا کرتی تھی۔ بی بی نے یہ محسوس کرتے ہی اپنے پاؤں پیارے اور بقول بیلا کے اب واقعی وہ صرف حکم دینے کی حد تک محدود ہو گئی۔ اب یہ الگ بات ہے کہ اس کا حکم بیلا یوں پورا کرتی جیسے بھگوان کا کہا اور بی بی کا کہا اس کے لئے ایک برابر ہو۔ تیسرا ہفتہ ختم ہوا تو بیلا کا وجود پوری حویلی پر ایک اختیار بن کر چھا چکا تھا۔

یہ سب کچھ اپنی جگہ مگر سوائے بیلا کے کوئی نہ جانتا تھا کہ ہر رات کافی کے کپ میں سوامی دھیرج داس کی دی ہوئی دوا کی ایک مخصوص مقدار بڑے تو اتر سے حل ہو جاتی ہے اور رزاقی اس کا ایسا عادی ہوتا جا رہا تھا کہ اسے بیلا کے ہاتھ کی بنی کافی کا کپ ملنے میں چند منٹ کی تاخیر بھی بری لگتی۔ پھر کافی پیتے پیتے وہ ایسا پرسکون ہو جاتا کہ کب ختم ہوتے ہوتے اس کا سارا جسم آرام کی چادر میں لپٹ جاتا اور وہ راجہ اور جنت کی تصویر کو آنکھوں میں اتارتے اتارتے نیند کی وادیوں میں گم ہو جاتا۔ چند دن پہلے تک جو رزاقی نیند کی چار چار گولیاں لیتے کے باوجود ساری ساری رات جاگتے قائم رہتے اور راجہ اور جنت کی تصویر دیکھتے دیکھتے آہیں بھرتے گزار دیتا تھا اب ایک ہی گولی نکل کر جورات سوا کو بجے بستر پر لیٹتا تو صبح سات بجے کی خبر لاتا۔ بی بی نے جب اسے اس طرح آرام کے ہاتھوں میں ہاتھ دیے محو استراحت دیکھا تو بیلا کے لئے اس کے ہونٹوں پر بے اختیار دعائیں چل گئیں۔

بیلا اپنی دانست میں مونس کے قریب ہوتی جا رہی تھی اور اس کے لئے وہ رزاقی کو سوامی کی دی ہوئی دوا امرت جان کر پلائے جا رہی تھی۔ اپنی غرض کی بندی بیلا کو یہ علم تھا نہ وہ جانتا چاہتی تھی کہ اس دوا کا رزاقی پر کیا اثر ہو گا اور سوامی اس دوا کے ذریعے اپنا کون سا مقصد کیسے حاصل کرنا چاہتا ہے؟ اسے تو صرف یہ نظر آ رہا تھا کہ سوامی نے اسے حویلی میں پہنچا دیا تھا اور مونس بابو کو پانے میں اس کی مدد کا وعدہ بھی کیا تھا۔ مطلب کی اندھی بیلا کو یہ دکھائی نہ دے رہا تھا کہ رزاقی پر نیند کی دیوی نے تو اپنی زلفیں کھول دی تھیں مگر ساتھ ہی ایک بے نام سی سستی اور کاہلی بھی اس کے وجود کو وقت بے وقت کی جمائیوں اور انگڑائیوں سے بہلاتی رہتی ہے۔ اس کی آنکھیں اب مستقل طور پر ہلکی ہلکی سرخی میں ڈوبی رہتیں۔ چہرے پر چکنائی آلود چمک ذرا غور سے دیکھنے پر محسوس کی جاسکتی تھی۔ جسم ایک لذت آمیز پیش میں سلگتا رہتا جو اسے ہواؤں میں اڑنے جیسی کیفیت میں مبتلا رکھتا۔

مونس محسوس کر رہا تھا کہ رزاقی کی صحت آہستہ آہستہ گرتی جا رہی ہے۔ اس نے بی بی سے بات کی اور اسی شام فیملی ڈاکٹر احسن کو طلب کر لیا گیا جو جنرل ہاسپٹل میں ہی تعینات تھا۔ ڈاکٹر احسن نے رزاقی کے انکار کے باوجود بڑی عرق ریزی سے اس کا چیک اپ کیا۔ خون کے ٹیسٹ لئے اور دو گھنٹے بعد رپورٹیں لئے ڈرائنگ روم میں آ گیا جہاں گھبرائی ہوئی بیلا، مگر مند بی بی بے چین مونس اور بیزار رزاقی پہلے سے موجود تھے۔

”کیا رپورٹ ڈاکٹر صاحب؟“ مونس تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔
”بڑی حیرت انگیز بات سامنے آئی ہے مسٹر مونس۔“ ڈاکٹر احسن نے ان کے سامنے بیٹھے ہوئے رپورٹس کا لٹافہ میز پر ڈالا۔

”خیریت تو ہے ناں بیٹا؟“ بی بی کا دل ہول گیا۔
”ابھی تک تو خیریت ہی ہے بی بی۔“ ڈاکٹر احسن نے ان کی جانب دیکھا۔ ”یہ بتائیے مسٹر رزاقی۔ آپ کوئی ٹرانکولائزر بھی لے رہے ہیں؟“

”رات کو نیند نہیں آتی ڈاکٹر اس لئے میں نیند کی گولیاں۔۔۔“
”کتنی؟“ ڈاکٹر احسن نے اس کی بات اچک لی۔ ”میرا مطلب ہے ایک وقت میں کتنی گولیاں لے رہے ہیں آپ؟“
”بہن۔۔۔“ رزاقی جھجک کر بولا۔ ”تین سے چار گولیاں۔“
”کون سی ٹیبلٹس لے رہے ہیں آپ؟“

جواب میں رزاقی نے اسے گولیوں کا نام بتایا۔
”مائی گڈنس۔“ ڈاکٹر احسن نے حیرت اور خوف سے رزاقی کی جانب دیکھا۔ ”مسٹر رزاقی۔ آپ جانتے ہیں اس کا کیا مطلب ہے؟ تین سے چار گولیوں کا مطلب ہے کہ آپ عام حالت سے بارہ گنا زیادہ ڈوز لے رہے ہیں۔۔۔ اور یہ ڈوز آپ کو اندر ہی اندر جس تیزی سے چاٹ رہی ہے آپ کو اس کا اندازہ نہیں ہے۔“

”مجھے اندازہ ہے ڈاکٹر۔“ مجھے سمجھے لیجئے میں رزاقی نے کہا۔
”تو اس کا مطلب ہے کہ آپ جان بوجھ کر اپنی زندگی کے ساتھ کھیل رہے ہیں؟“ ڈاکٹر احسن کا لہجہ ناخوشگوار ہو گیا۔

”ایسا ہی سمجھ لیجئے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس کھیل میں کون جیتتا ہے؟ زندگی یا۔۔۔“
”یعنی آپ خود کو جانتے بوجھتے ہوئے موت کے منہ میں دھکیل رہے ہیں؟“
”کیا فرق پڑتا ہے ڈاکٹر۔“ رزاقی نے لا پرواہی سے کہا۔ ”اچھا ہے کہ یہ کھیل جلد ختم ہو جائے“

سے ایک کاغذ نکال کر اس پر نظر دوڑانے لگا۔ بیلا کی حالت یہ تھی کہ کانٹو بدن میں لہو نہیں۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کا بھید کھل چکا اور اب ذلت کے ساتھ ساتھ سزا کی گھڑی بھی سر پہ کھڑی ہے۔ اس کا دل سینے میں کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔

”لڑکی۔۔۔“ کاغذ میز پر ڈال کر ڈاکٹر احسن نے بیلا کو مخاطب کیا۔ ”کتنے دن سے تم مسٹر رزاقی کو کافی پلا رہی ہو؟“

”جی۔۔۔“ بیلا کا سر چکرایا۔ آواز حلق میں پھنسی اور آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ ”میں۔۔۔ میں۔۔۔“ وہ ہکلائی۔

”اطمینان سے جواب دو۔ یہ بہت اہم بات ہے۔“ ڈاکٹر احسن نے اسی لہجے میں کہا۔

”جی۔۔۔ وہ۔۔۔ میں۔۔۔“ بیلا کی حالت مزید خراب ہو گئی۔

”بیلا۔۔۔“ بی بی نے اس کی جانب غور سے دیکھا۔ ”تم گھبرا کیوں رہی ہو؟ ڈاکٹر صاحب جو بات پوچھ رہے ہیں اس کا سیدھا سیدھا جواب دو۔“

”جی۔۔۔“ بیلا بی بی کے دلاسہ دینے پر کچھ سنہیلی۔ مونس کی جانب دیکھا جو اسے بڑی عجیب سی نظروں سے تنک رہا تھا۔ ان نظروں میں کیا تھا بیلا سمجھ نہ سکی لیکن اسے لگا کہ اگر اس وقت وہ تھرک گئی تو پوری دنیا میں اسے منہ چھپانے کو کوئی جگہ نہیں ملے گی۔ ایک گہرا سانس لے کر اس نے پہلے صوفے میں دھنسنے رزاقی کی طرف اور پھر ڈاکٹر احسن کی طرف دیکھا جو اس کے جواب کا منتظر تھا پھر اپنے خشک لبوں پر زبان پھیر کر اس نے نظر جھکا لی۔ ”جی۔۔۔ یہی کوئی پندرہ بیس دن سے۔“

”اور اس دوران تم نے یہ آج حیات مسٹر رزاقی کو پلانے میں ایک دن کا بھی ناغہ نہیں کیا؟“

”جی۔۔۔“ اس کا سارا جسم لرزا۔ ”جی نہیں۔“

”کیا تمہیں علم ہے تم اب تک کیا کرتی رہی ہو؟“ ڈاکٹر احسن نے بڑے معنی خیز لہجے میں کہا تو سب لوگ چونک پڑے جبکہ بیلا کی نظر اٹھائے نہ اٹھی۔

”تم کافی کے نام پر۔۔۔“ ڈاکٹر احسن پل بھر کے لئے رکا۔ بیلا کا رنگ فق ہو گیا۔ اسے لگا جیسے ڈاکٹر احسن اس کی موت کا حکم سنانے جا رہا ہو۔ سب لوگوں کے سانس رک سے گئے۔ وہ چاہنے لگے کہ ڈاکٹر احسن رکے بغیر ایک دم سے اپنے الفاظ ان کے کانوں میں انڈیل دے۔ اب وہ چاہے زہر میں بجھے ہوں یا امرت میں بھیجے۔

”مسٹر رزاقی کو جان بچانے والی لائف سیونگ ڈرگ دیتی رہی ہو تم۔“ اسی وقت ڈاکٹر احسن نے اپنی بات پوری کر دی۔

بیلا نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔ اسے اپنی سماعت پر دھوکا ہوا۔ بے اعتباری سے اس نے ڈاکٹر

تاکہ میں اپنے پیاروں کے پاس جا سکوں۔“

رزاقی کی زبان سے یہ بات سن کر نبھانے کیوں بیلا سر سے پاؤں تک کانپ کر رہ گئی۔ پھر وہ غیر اختیاری طور پر اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ مونس اس دوران خاموشی سے رزاقی کو گھورتا رہا اور بس۔۔۔

”باؤ بیٹا۔ یہ کیا کر رہے ہو تم؟“ بی بی رو ہانسی ہو گئی۔ اس نے پاس بیٹھے رزاقی کا ہاتھ تھام کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ ”ارے۔۔۔ تمہیں تو بخار ہے۔“ وہ گھبرا گئی۔

”یہ بخار نہیں ہے بی بی۔“ ڈاکٹر احسن نے تنبیہ کے لہجے میں بتایا۔ ”یہ اس نشہ آور دوا کے سائڈ افیکٹس میں سے ایک علامت ہے جس زہر کو نیند کی گولیوں کے نام پر مسٹر رزاقی اپنے حلق سے اتار رہے ہیں۔ آپ ان کی آنکھیں دیکھئے ان میں ہلکی ہلکی سرخی اور چہرے پر چمکیلی چمکنائی کا احساس بتاتا ہے کہ یہ ان گولیوں کے عادی ہو چکے ہیں۔ اب انہیں سونے کے لئے نہیں جسم کی ڈیمانڈ پوری کرنے کے لئے یہ گولیاں کھانا پڑتی ہیں۔“

”کیا کہہ رہے ہو بیٹا؟“ بی بی کا سانس رک گیا۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ باؤ نشہ کا عادی۔۔۔“

”جی ہاں۔۔۔ میں یہی کہنا چاہتا ہوں۔“ ڈاکٹر احسن کا لہجہ افسوس زدہ ہو گیا۔

”مگر ڈاکٹر۔۔۔“ اسی وقت رزاقی نے بی بی سے ہاتھ چھڑا کر ایک لمبی جھائی لی اور پھر اسی سے کہا۔ ”میں تو اب کئی دنوں سے رات کو صرف ایک گولی لے رہا ہوں۔ اس سے زیادہ مجھے اس کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔“

”کیا مطلب؟“ سب لوگ چونکے اور بیلا کا دہرے سانس اور نیچے کا نیچہ وہ گیا۔

”میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ رزاقی نے محسوس کیا کہ اس کا جسم ٹوٹنے لگا ہے۔ اس نے بازو پھیلا کر انگڑائی لینے کے انداز میں خود کو حرکت دی۔ ”بیلا کے ہاتھ کی بی بی کافی کا کپ پینے کے بعد میں نیند نہ آنے کے خوف سے صرف ایک گولی لیتا ہوں اور چند لمحوں کے بعد مجھے بڑی پرسکون نیند آ جاتی ہے۔“

”کافی۔۔۔؟“ ڈاکٹر احسن نے کچھ سوچتے ہوئے کہا پھر بی بی کی طرف دیکھا۔ ”یہ کافی کون بناتا ہے؟“

”بیلا۔۔۔“ بی بی نے سامنے کھڑی بیلا کی جانب اشارہ کیا۔ ”باؤ کے سب کام ان دنوں یہی دیکھتی ہے۔“

ڈاکٹر احسن کی نظر بیلا پر جم گئی جو ڈری ڈری کھڑی اسے بڑی خوفزدہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے انداز کا اضطراب بتاتا تھا کہ وہ بہت پریشان ہے۔ مونس بھی اسی کی جانب متوجہ تھا اور بی بی بھی اس کی حالت کا جائزہ لے رہی تھی۔

”ہوں۔۔۔“ ڈاکٹر احسن کچھ دیر تک اسے بڑی خاموش نگاہوں سے گھورتا رہا۔ پھر پورٹس میں

نہ کرنے پائیں۔ میں ایک بہت ہلکی ٹیبلٹ لکھ رہا ہوں۔ اگر نیند نہ آنے کی شکایت ہو تو صرف یہ ایک گولی رات سونے سے پہلے لے لیا کریں اور ساتھ ہی یہ دوائیں باقاعدگی سے لیتے رہیں۔ کم از کم تین ماہ تک ان دواؤں کی روٹین ٹوٹی نہیں چاہئے۔ ڈاکٹر احسن نے اپنے پیڑ پر دوائیں لکھ کر کاغذ مونوں کی طرف بڑھا دیا۔

”تھینک یو ڈاکٹر“۔ ”مونس کھڑا ہو گیا۔“ ”آئیے۔ میں آپ کو باہر تک چھوڑ دوں۔“

ڈاکٹر احسن اس کے ساتھ رخصت ہو گیا تو بی بی نے رزاتی کو سینے سے لگا لیا۔ ”بیٹا۔ کیوں اپنی بوڑھی بی بی کا امتحان لے رہا ہے۔ خود کو سنبھال میرے باؤ۔ وہ جو چلے گئے ان کے لئے یوں اپنے آپ کو برباد مت کر۔“

”یونہی کروں گا بی بی۔“ وہ جیسے چل گیا۔ ”کیوں مجھے اکیلا چھوڑ کر چلی گئیں دونوں۔ جنت تو بچی تھی مگر راجیہ تو سب جانتی تھی ناں۔ جانتی تھی کہ میں اس کے بغیر ادھر رہا بھی ہوں اور اکیلا بھی۔ پھر بھی۔۔۔ پھر بھی وہ چلی گئی۔“ اس کا لہجہ شکایتی اور پھر ضدی سا ہو گیا۔ ”اب میرا بھی جوجی چاہے گا میں کروں گا۔“

”جوجی چاہے کرو بھائی مگر ایک بات یاد رکھو۔“ کمرے میں داخل ہوتے مونوں کی آواز نے ان تینوں کو چونکا دیا۔ ”تم جتنا زندگی سے دور بھاگنے کی کوشش کرو گے ہم تمہیں اتنا ہی زندگی کی طرف کھینچ لانے کی سعی کریں گے۔ تم اپنا کام کرتے رہو ہم تمہیں نہیں روکیں گے۔ ہمیں اپنا کام کر کے دو تم ہمیں نہ روکنا۔“ ”مونس اس کے پاس آ بیٹھا۔“ ”میں تمہارے بیڈ روم سے یہ نیند آور گلیاں اٹھا لیا ہوں۔ ملازم ابھی دوائیں لے کر آتا ہی ہوگا۔ اب تمہیں وہ دوائیں استعمال کرنا ہوں گی۔ تم میرے اور بی بی کے بس کے نہیں ہو اس لئے آج اور ابھی تمہاری دوا اور غذا کا چارج بیلا کو دیا جا رہا ہے۔ میں جانتا ہوں وہ ایسی کچی مٹی کی بنی ہوئی ہے کہ تمہیں من مانی نہیں کرنے دے گی۔ کیوں بیلا! کیا میں نے غلط کہا؟“

مونوں نے انتہائی دائیں ہاتھ بی بی کے پہلو میں بیٹھی بیلا کی جانب گردن بڑھا کر دیکھا۔

”میں اپنی سی کر کے رہوں گی مونس بابو۔“ بیلا نے کہا جواب کافی حد تک سنبھل چکی تھی۔ اس کے اندر جو اکھاڑ پھڑا ہو رہی تھی کوئی اس سے واقف نہ تھا اور چہرے پر اس شکست و ریخت کے اثرات وہ آنے نہ دے رہی تھی مگر مسکراہٹ کے پھیکے پن کو چھپاتے ہوئے اس نے مونوں کی جانب ہاتھ جوڑے اور کہا۔ ”اور یہ جو آپ نے مجھے ڈھیٹ مٹی کے بجائے کچی مٹی کا بنا ہوا کہا اس کے لئے دھنیو اد۔“

بے اختیار بی بی ہنس پڑی۔ مونوں کھینسا سا ہو گیا۔ رزاتی دلچسپی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اب اٹھ جائے۔ کافی کی طلب اسے بے چین کرنے لگی تھی۔ اسی وقت ملازم دوائیں لئے اندر داخل ہوا۔ مونوں نے اس سے دوائیں لے کر چیک کیں۔ بیلا کو ان کی ترتیب سمجھائی اور کہا۔

”یہ دوائیں اپنی کسٹڈی میں رکھو۔ وقت پر اس اڑیل گھوڑے کو دوا دینا اب تمہاری ذمہ داری

احسن کی جانب دیکھا جواب مسکرا رہا تھا۔ پھر وہ کسی ریت کی دیوار کی طرح پاس پڑی تپائی پر گرتی چلی گئی۔ اس کے دماغ میں بے یقینی اب بھی دھم دھم ناچ رہی تھی۔

”تھینک گاڈ۔“ بے اختیار مونوں کے لبوں سے نکلا اور اس نے آنکھیں موند لیں۔

”میں سمجھا نہیں ڈاکٹر احسن۔“ رزاتی نے اٹھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میں سمجھاتا ہوں۔“ ڈاکٹر احسن نے حیرت زدہ بی بی کو کچھ کہنے سے روک دیا۔ ”نیند آور گولیوں کے نام پر مسٹر رزاتی جو ہر اپنے جسم میں اتار رہے تھے یہ کافی اس کا تو ثابت ہوئی۔ اسی لئے انہیں جسمانی طور پر وہ نقصان نہ پہنچا جس کا اندیشہ تھا۔ یہ بتائیے مسٹر رزاتی۔ یہ کافی کیا کسی خاص برانڈ کی ہے؟“

”جی ہاں۔“ رزاتی کے بجائے مونوں نے جواب دیا۔ ”رزاتی کے لئے یہ کافی سوئٹز لینڈ سے آتی ہے۔ وہ کالج کے زمانے ہی سے اس کا عادی ہے۔ اسے بنانے میں جس مہارت کی ضرورت ہے وہ بیلا سے پہلے نندنی نامی ملازمہ کے ہاتھ میں تھی یا پھر اب بیلا اس کی ماہر ہے۔“

”تو بس۔۔۔ آپ سب کو بیلا کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ کافی کا عادی بنا کر وہ مسٹر رزاتی کو ٹیبلٹس کے زہر کے ساتھ ساتھ تریاق دیتی رہی۔“

”بیلا۔۔۔“ بی بی نے اسے نمونیت سے دیکھا۔ ”بچی! تو اب بھی پریشان ہے کیوں؟“

”ڈاکٹر احسن نے جیسا کہ سنس بھرا ماحول پیدا کر دیا تھا اس سے تو لگتا تھا جیسے وہ یہ کہیں گے کہ بیلا کافی میں رزاتی کو زہر دیتی رہی ہے۔“ مونوں ایک دم مسکرا کر بولا۔ ”اب اس جوشن میں بیلا کا اس طرح پریشان ہو جانا قدرتی بات ہے بی بی۔“

”مگر اب تو بات صاف ہو گئی۔“ بی بی بیلا کی جانب ہاتھ دراز کیا۔ وہ آہستہ سے اٹھی اور ان کے قریب چلی آئی۔ پھر ان کے پہلو میں بیٹھی تو بی بی نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔ ”میں تیرا احسان نہیں چکا سکتی بیلا۔ تو نے انجانے میں ہی سبھی مگر میرے باؤ کو زندگی کی سرحد پار کر جانے سے روک لیا۔“

”بی بی۔۔۔“ بیلا ان کے پہلو میں سمٹ گئی۔ آنکھیں بند کر لیں اور گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

”ڈاکٹر بیٹا۔۔۔“ بی بی نے ڈاکٹر احسن کی جانب شکایتی نظروں سے دیکھا۔ ”تم نے تو ہماری بیلا کو بہت ڈرا دیا۔“

”سوری بی بی۔۔۔“ ڈاکٹر احسن ہنسا۔ ”سوری بیلا۔۔۔ میرا یہ مقصد نہیں تھا۔ بہر حال مسٹر رزاتی۔ اب آپ دھیان سے سن لیجئے۔ ٹیبلٹس بند کر دیجئے۔ کافی پیتے رہئے۔ اپنی خوراک پر خاص دھیان دیجئے۔ آپ کے جسم میں خون کی بہت کمی ہو چکی ہے۔ مسٹر مونوں۔۔۔“ اس نے سر گھا کر کہا تو مونوں اس کی جانب دیکھنے لگا۔ ”آپ اس بات کا خاص طور پر خیال رکھئے کہ یہ اب کوئی ٹراکولائزر استعمال

ہے۔ خوراک میں ڈاکٹر احسن جو بتا گئے ہیں اس کا خیال رکھنا۔
”میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔“ رزاتی نے آہستہ سے جگہ چھوڑ دی۔ ”بیلا۔ کافی لے آؤ۔“ وہ چل دیا۔

”جی۔۔۔ ابھی لائی۔“ بیلا کا من بجانے کیوں کانپ اٹھا۔ رزاتی باہر نکل گیا۔
”میں بھی چلتا ہوں بی بی۔“ مونس نے بھی اجازت لی اور بیلا کو بڑے عجیب سے انداز میں دیکھ کر رخصت ہو گیا۔

☆=====☆=====☆

بیلا نے بی بی اور حویلی کی ملازماؤں کے ساتھ ساتھ ایک آدھ بار مونس اور رزاتی کے کان میں بھی یہ بات ڈال دی تھی کہ اس بار حویلی پر اس کی ایک دور پار کی موسیٰ اس سے ملنے دہلی سے یہاں آرہی ہے۔ بی بی نے اسے بخوشی اجازت دے دی کہ وہ اپنی موسیٰ کو اپنے ساتھ کوارٹر میں ٹھہرا سکتی ہے۔ آج اگر رزاتی کے چیک اپ کے لئے ڈاکٹر احسن نہ آتا تو وہ سرشام ہی ہستی چلی جاتی کیونکہ اس نے بی بی کو بتا دیا تھا کہ اس کی موسیٰ آج شام ہستی میں پہنچنے والی ہے اور وہ اسے ساتھ لے کر صبح حویلی لوٹ آئے گی۔ رات کے ساڑھے نو بجے تھے جب بیلا رزاتی کو کافی دے کر فارغ ہوئی۔ پھر بی بی کو ہستی میں جانے کا تارکروہ حویلی سے نکلے اس کا دل اب بھی مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ کچھ دیر پہلے کے واقعے کے حوالے سے سوچ میں ڈوبی وہ حویلی سے نکل کر مونس کے آفس کے سامنے پہنچی تو وہ اسے لان کی گھاس پر ٹھکنا نظر پڑا۔ اب یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اسے نظر انداز کر کے نکل جاتی۔ اسی وقت مونس نے بھی اسے دیکھ لیا اور خود ہی لان سے نکل کر روٹ پر آ گیا۔

”بیلا۔۔۔ تم اس وقت۔۔۔ کہیں جا رہی ہو کیا؟“ مونس اس کے پاس آ رکا۔

”جی۔۔۔ وہ آہستہ سے بولی۔“ ہستی جا رہی ہوں۔“

”اتنی رات کو۔ خیریت تو ہے؟“ مونس کے لہجے میں اپنائیت پا کر بیلا کا من سرشار ہو گیا۔

”جی مونس بابو۔ میری موسیٰ دہلی سے آنے والی تھی۔ اسی کو دیکھنے جا رہی ہوں۔“ اس نے مونس کی آنکھوں میں دیکھا جو چاندنی رات میں بے حد پرکشش لگ رہی تھیں۔ یہی آنکھیں تو تھیں جنہوں نے بیلا کو بھری دنیا میں لوٹ کر تنہا کر دیا تھا۔

”اوہ۔۔۔ یہ بات ہے تو پھر ضرور جاؤ۔ کسی اپنے سے ملنا ہونا بیلا تو کسی کو درمیان نہ آنے دینا چاہئے۔ ہاں کوئی دوسری بات ہوتی تو میں ضرور کہتا کہ بیلا صبح چلی جانا۔“ وہ ہنسا۔

”آپ اب بھی کہہ سکتے ہیں مونس بابو کہ بیلا مت جاؤ۔“ بیلا کی آواز میں مستی سی بھر گئی۔

”یعنی اگر میں کہہ دوں کہ بیلا مت جاؤ تو تم نہیں جاؤ گی؟“ مونس کا لہجہ عجیب سا تھا۔

”آپ کہہ کر تو دیکھئے مونس بابو۔“ وہ فریفتگی کے عالم میں بولی۔ ”آپ کا ہر شہد میرے لئے حکم کے سامن ہے۔“

”ایسا کیا؟“ مونس نے مسکرا کر کہا۔

”کبھی آ زما کر تو دیکھئے مونس بابو۔“ بیلا کے لہجے میں حسرت سی اتر آئی۔

”ابھی تو میں خود آ زمائش میں ہوں بیلا۔“ مونس سنجیدہ ہو گیا۔ ”بہر حال رزاتی کے لئے میں تمہارا بہت احسانمند ہوں۔ اس کے ساتھ انجانے ہی میں سہمی تم نے جو بھلائی کی ہے اس کے لئے میں کبھی بھی کوئی قیمت چکا سکتا ہوں۔ یہ تمہارا مجھ پر قرض ہے۔“

”یاد رکھئے گا اپنے الفاظ مونس بابو۔ میں حساب کی بڑی بد لحاظ ہوں۔“ بیلا شوخی سے اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولی۔ ”میں کچھ بھی مانگ سکتی ہوں۔“

”جان سے بڑھ کر کیا مانگو گی بیلا۔“ مونس ہنسا۔ ”رزاتی کے لئے وہ بھی حاضر ہے۔ چاہو تو ابھی لے سکتی ہو۔“

”ایسا نہ کہئے مونس بابو۔“ اس نے بے اختیار مونس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھنا چاہا مگر پھر جھجک کر پیچھے ہٹا لیا۔ مونس نے محسوس کیا کہ بیلا کی آواز کپکپاتی تھی۔ ”دوبارہ اپنی جان دینے کی بات کبھی مت کہئے گا۔“ اس نے بے خطر اب سے کہا اور مونس اس کی حرکت پر منہ ہو کر رہ گیا۔

”ایک بات پوچھوں مونس بابو؟“ اسی وقت بیلا نے نظر جھکا کر زبان کو حرکت دی۔

”ہاں۔۔۔“ وہ ٹھوٹے ذہن کے ساتھ ہوش میں آ گیا۔ ”ہاں۔۔۔ پوچھو۔“

”جب ڈاکٹر صاحب نے مجھے ملکت کیا تو آپ نے کیوں کہا تھا، تھینک گاؤ؟“

”ارے وہ۔۔۔“ مونس نے لہجے میں لاپرواہی پیدا کرنا چاہی مگر وہ اپنی کیفیت چھپانہ سکا۔ ”وہ تو میں۔۔۔ بس۔۔۔“

”جھوٹ مت بولئے مونس بابو۔“ وہ اس کے مقابل آ گئی۔ ”میں جانتی ہوں کہ آخر وقت تک آپ میرے لئے پریشان تھے۔ کیوں؟“

”تو کیا نہیں ہونا چاہئے تھا؟“ الٹا مونس نے اس سے سوال کر دیا۔ ”تم جو میرا اتنا خیال رکھتی ہو۔ بی بی اور رزاتی کے لئے اتنا کچھ کرتی ہو۔ ایک طرح سے حویلی کا سارا بوجھ اب تم پر ہے۔۔۔ تو کیا مجھے تمہارے لئے پریشان نہیں ہونا چاہئے تھا؟“

”تو کیا آپ کی پریشانی صرف اس لئے تھی کہ میں آپ کی کمی نہیں ہوں؟“ بیلا کے ہونٹوں پر بڑی زخمی سی مسکراہٹ ابھری۔

”یہ میں نے کب کہا؟“ مونس جلدی سے بولا۔

”اس کے علاوہ آپ نے اور کچھ کہا بھی تو نہیں مونس بابو۔“ بیلا کا لہجہ بھیگ سا گیا۔
 ”تم۔۔۔ تم۔۔۔“ مونس نے اس کی طرف سے رخ پھیر لیا اور روش کے فرش کو گھورنے لگا۔
 ”تم بہت اچھی ہو بیلا۔۔۔ مجھے غلط نہ سمجھو۔ میں لفظوں کا کھلاڑی نہیں ہوں لیکن ایک بات طے ہے کہ تم نے اپنے لئے کئی کالفاظ استعمال کیا تو مجھے اچھا نہیں لگا۔۔۔“

”مونس بابو۔“ بیلا کا بدن ہوا سے ہلکا ہو کر جیسے اس کا ساتھ چھوڑ گیا۔ اسے لگا کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑی نہ رہ سکے گی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے دھواں سا پھیل گیا۔

”رات بہت ہو گئی ہے۔ بہتر ہے کہ بستی کی طرف صبح چلی جانا اور اگر جانا ضروری ہے تو میں نورے سے کہہ دیتا ہوں وہ تمہیں چھوڑ آئے گا۔“ مونس خاموش ہو کر اس کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ جب کچھ دیر گزر گئی اور خاموشی کا قفل نہ ٹوٹا تو وہ دھیرے سے پلٹا۔

بیلا وہاں سے کچھ دور واپس حویلی کے دروازے میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کے مونس بابو نے کہا تھا ”بیلا! اس وقت بستی نہ جاؤ۔“ وہ کیسے چلی جاتی؟

مونس نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے اسے حویلی میں جاتا دیکھتا رہا۔ پھر جب وہ اس کی نظر سے اوجھل ہو گئی تو وہ اپنے کمرے کی جانب چل پڑا۔

”پگلی۔“ آہستہ سے ایک لفظ مونس کے ہونٹوں پر تیر گیا۔۔۔ مگر کیا یہ صرف ایک لفظ تھا؟ شاید نہیں۔ وہ تو مٹھاس میں ڈوبا حلاوت سے مزین ایک احساس تھا، ایک جذبہ تھا جس نے مونس کے دل کو دھڑکن کی طرح چھو لیا تھا۔

☆=====☆=====☆

سوامی دھیرج داس نے بیلا کی زبانی سارا واقعہ بڑے سکون سے سنا۔ جب بیلا خاموش ہو گئی تو اس نے اپنی پلکیں واکیں۔ سامنے بیٹھی بیلا کو سرخ سرخ آنکھوں کے احاطے میں لیا۔ پھر اس کے حلق سے مخصوص پھٹی پھٹی آواز برآمد ہوئی۔

”تم نے جو کچھ بتایا وہ میرے من کو یہ شافی دینے کے لئے بہت ہے بیلا کہ اب تک جو ہوا وہ میری اچھیا کے انوسار ہوا۔۔۔ مگر تم کیوں پریشان ہو؟“

”سوامی جی۔ اب بھی خیال آتا ہے تو کانپ جاتی ہوں کہ اگر بات کھل جاتی تو کیا ہوتا؟“ بیلا نے اس سے نظر ملانے سے گریز کرتے ہوئے کہا ”پھر ایک اور بات کی مجھے سمجھ نہیں آتی؟“
 ”وہ کیا؟“ سوامی کا لہجہ دلچسپی لئے ہوئے تھا۔

”یہ تو آپ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ دوا جو میں رزاتی بابو کو دے رہی ہوں، اس کے اثر سے وہ ہمارے یعنی آپ کے بس میں ہو جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ وہ دوا کسی نہ کسی طرح تو خطرناک ہے مگر ڈاکٹر نے یہ بتا کر مجھے الجھا دیا ہے سوامی جی کہ جو کافی میں رزاتی بابو کو دے رہی ہوں وہ ان کی نیند کی دوا کی کاٹ ثابت ہو رہی ہے۔ یعنی آپ کی دی ہوئی جو دوا میں کافی میں ملا رہی ہوں وہ رزاتی بابو کو نقصان سے بچا رہی ہے۔۔۔“

”ہا ہا ہا۔۔۔“ ایک دم سوامی کے لبوں سے ہنسی کا پر نالہ بہہ نکلا۔ کتنی ہی دیر وہ بیلا کو سکتا اور ہنستا رہا جبکہ وہ سر جھکائے اسے نککیوں سے دیکھتی رہی۔ پھر سوامی نے اپنی ہنسی پر قابو پایا اور کہا۔ ”تو چھناں تو ہے بیلا مگر اپنی حد میں۔ اس سے باہر تو کسی گلابی کی طرح معصوم ہے۔ ارے پگلی۔ بہتیر کی بات تو یہ ہے کہ جو دوا رزاتی بابو کے جسم میں جگہ بنا رہی ہے، ایک تو وہ اپنا پورا کام کر رہی ہے اور دوسرے اس کا سارا وزن نیند کی گولیوں کے سر جا پڑا۔ اب تو پوری آزادی سے کافی میں وہ دوا ملا کر رزاتی بابو کو چلاتی رہ۔ حویلی کا کوئی منش اور باہر کا کوئی ڈاکٹر تجھ پر شک نہیں کر سکتا۔۔۔ اور یہ بھی جان لے کہ جو باتیں ٹو نے

دیے۔

”سوچ لے بیلا۔“ سوامی کالج پکھل گیا۔ ”مجھے ابھی یہاں بہت دن رکنا ہے اور میں تنہا نہیں رہ

۔۔۔

”یہاں آپ کے لئے اور بہت سی استریاں موجود ہیں سوامی جی اور سب سے بڑھ کر تو نندی ہے۔“ بیلا کے لہجے میں کٹھن تھی جس نے سوامی کو چپ کرادیا۔ وہ سر جھکائے دھار آ زما تی بیلا کو گھور کر رہ گیا۔

اسی وقت مندر کے دروازے سے نندکار اندر داخل ہوا۔ سوامی اسے دیکھ کر سیدھا ہو بیٹھا۔ اس نے اپنے کڑوے ہوتے منہ کا ذائقہ درست کرنے کے لئے پاس پڑی تھالی سے چٹنی بھر شکر اٹھا کر زبان پر رکھی اور پاس آ کر گھٹنے چھوتے نندکار کی کمر پر تھپکی دی۔

”سنگھی رہو بالک۔“

”مہاراج۔“ نندکار نے سیدھا ہوتے ہوئے بیلا کی جانب دیکھا۔ ”آج تو بڑا ہی ٹھیک دن ہے۔ بیلا کے درشن ہو گئے۔“

”ہاں بالک۔“ سوامی مسکرایا۔ ”یہ تو ہے۔ اور سنا۔ ہمارا کام کہاں تک پہنچا؟“

”دو جوان تیار کر لئے ہیں مہاراج۔“ نندکار نے آواز دہائی۔

”بیلا سے کوئی اوٹ نہیں بالک۔ یہ تو نیوکی اینٹوں میں سے ہے۔ ٹوکل کر کہہ چو کہنا ہے۔ کون ہیں وہ دو جوان؟“

”ایک تو اپنی جاتی کا ہے مہاراج۔ ویرو نام ہے اس کا۔ بڑا جوشیلا ہے اور ہر کام کرنے کو تیار ہے۔ اس کے ذمے اپنے مہاجن کروڑی مل کا سات ہزار کا سود اور قرض تھا وہ میں نے ادا کر دیا ہے۔ اب وہ اپنی مٹھی میں ہے۔“

”اور دوسرا؟“ سوامی نے اسے شاباش دینے کی ضرورت نہ سمجھی۔

”دوسرا لنگا ہے مہاراج۔ یہ پہلے شور تھا۔ اب مسلا ہے۔ نام ہے اس کا ان دنوں خیر دین۔“ نندکار کالج پکھل گیا۔ ”میں نے اسے قابو کر لیا ہے۔ پورا زور لگا دوں گا کہ وہ دوبارہ ہمارے دھرم میں لوٹ آئے۔“

”یہ تو جن کا کام ہے بالک۔“ سوامی نے نندکار کی جانب دلچسپی سے دیکھ کر اس کا شانہ تھپکا۔ ”یہ کام کی بات کی تونے۔ لے اسی بات پر یہ کچھ روپے رکھ لے۔ تجھے ضرورت رہے گی۔“ سوامی نے کمر کے پیچھے سے ہاتھ سامنے لائے کچھ ہرے نوٹ نندکار کی گود میں ڈال دیے۔

”ان کی کیا ضرورت تھی سوامی جی۔“ نندکار نے نوٹ سمیٹتے ہوئے کہا۔

مجھے بتائی ہیں انہیں سن کر میں پورے بھروسے سے کہہ سکتا ہوں کہ آنے والے سات دن اور آٹھواں ہولی کا دن ہمارے اوٹ منصوبے کے لئے نیور کھنے کا سہ لے کر آ رہا ہے۔“

”میں کچھ سمجھی نہیں سوامی جی؟“ بیلا چونکی۔

”اب تیرے سمجھنے کا نہیں صرف میرے کہے پر عمل کرنے کا سہ ہے بیلا۔“ سوامی نے اضطراب سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ”میں دیکھ رہا ہوں کہ بہت جلد رزاتی بابو کا کاٹنا ہمارے رستے سے صاف ہونے والا ہے۔“

”سوامی جی۔“ بیلا گھبرا گئی۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ نے تو کہا تھا کہ رزاتی بابو کو کوئی جانی نقصان نہیں ہوگا۔“

”وہ تو میں اب بھی کہہ رہا ہوں بیلا۔ کیا میری کسی بات سے تمہیں لگا کہ رزاتی بابو کا جیون خطرے میں ہے؟“ سوامی نے اسے گہری نظر سے دیکھا۔

”ابھی آپ نے کہا کہ رزاتی بابو کا کاٹنا۔۔۔“

”ارے جب وہ ہماری مخالفت کے قابل نہیں رہے گا تو رستے سے ہٹ ہی تو گیا۔“

”مگر یہ کیسے ہوگا؟“ بیلا اب بھی الجھن میں تھی۔

”ہوگا بیلا اوش ہوگا اور جیٹا میں نے کہا ویسا ہی ہوگا۔“ سوامی کالج عجیب سا ہو گیا۔ ”میری موسی دہلی سے آ چکی ہے۔ اسے اپنے سنگھ حوٹلی کے کوارٹر میں لے جا۔۔۔ اور سنا۔ وہ بڑی گپ چپ سی عورت ہے۔ زیادہ بات نہیں کرنی۔ جو کرے اسے کرنے دینا۔ وہ تیرے کسی کام میں ناگ نہیں اڑائے گی تو اسے تنگ نہ کرنا۔ سمجھ گئیں؟“ سوامی کالج تحکمانہ ہو گیا تو بیلا نے جلدی سے نظریں چرائیں۔ سوامی بے اختیار مسکرا دیا۔

”کہاں ہے میری وہ اچانک جنم لے لینے والی موسی؟“ تب بیلا نے ہلکے سے طنز کے ساتھ پوچھا۔

”پنڈت کے گھر میں آرام کر رہی ہے۔ جب تونے جانا ہوگا بتا دینا میں اسے بلوا دوں گا۔“ سوامی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”سوامی جی۔۔۔“ بیلا نے نرمی سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ ”ہمارے درمیان جتنا طے ہے ہمیں اس کے اندر ہی رہنا چاہئے۔“

”سیمائیں نہ باندھ سندری۔“ سوامی نے اسے سردنگا ہوں سے دیکھا۔ ”ہم ایک دوجے کے لئے ہی بنے ہیں۔ آج تو میری ضرورت ہے کل تجھے میری آویٹھکا ہو سکتی ہے۔“

”جب وہ سے آئے گا تو دیکھا جائے گا سوامی جی۔ ابھی تو مجھے شام کیجئے۔“ بیلا نے ہاتھ جوڑ

کوٹھی کہ سوامی نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، بیلا بول پڑی۔
 ”سوامی جی۔ موسیٰ کا کوئی نام بھی تو ہوگا۔ صرف موسیٰ کہوں گی تو کام کیسے چلے گا؟ اس کا نام بھی تو بتائیے۔“
 ”کماری کو تینا نام ہے اس کا۔“ سوامی نے بیلا کی جانب نظر اٹھائی۔ ”مگر ہم اسے صرف کماری کہیں گے۔“

”نام تو بہت سُندر ہے سوامی جی۔۔۔ خود کیسی ہے؟“ بیلا شوخ ہو گئی۔
 ”تو اسے دیکھیے گی تو دنگ رہ جائے گی بیلا۔ اس کا نام اس کے کل اور آج کا درپن ہے۔“
 ”تو پھر اسے بلائیے۔ میں اب حویلی لوٹ جاؤں تو اچھا ہے۔ کافی دیر ہو گئی۔“
 ”ہاں۔ ٹھیک کہہ رہی ہے تو۔“ سوامی نے پنڈت کی طرف دیکھا۔ ”پنڈت کماری کو لے آؤ۔“
 ”جوا گیا مہاراج۔“ پنڈت دھوتی سنبھالتا ہوا اٹھا اور لڑھکتا ہوا باہر نکل گیا۔

پھر چارپانچ منٹ بعد جب پنڈت کے بعد مندر میں ایک پینتیس چالیس سالہ عورت، نیلی زمین پر زرد پھولوں کی سوتی ساڑھی اور شانوں پر نیلی شال میں ملبوس داخل ہوئی تو بیلا اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔
 اس کے سیاہ بالوں سے الگ چاندی کی دھار جیسی ایک سفید لٹ اس کے لیٹ اور سرخ و سفید چہرے پر چاند کے ہالے کی طرح دکھ رہی تھی۔ اس کا قد گت ایسا تناسب تھا کہ بیلا کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ اس نے ایسا سنڈل اور ترشا ہوا بدن کیا پہلے بھی دیکھا ہے؟ اگر اس کی آنکھوں کے گرد ہلکے ہلکے سیاہ حلقے نہ ہوتے تو شاید وہ اتنی حسین اور مدبر نہ لگتی، جتنی اب لگ رہی تھی۔ آنکھوں کے کونے معمولی سی جھریوں کا شکار تھے۔ جسم سے اس کی عمر کا جواں اندازہ ہوتا تھا، چہرے اور باقی جسم کے نشیب و فراز اس سے بہت کم عمر کی چٹلی کھاتے تھے۔ اس کی عمر اور جسم کا یہ تضاد بیلا کے لئے حیرت ہی حیرت لئے سامنے کھڑا تھا۔۔۔ مگر دکھ کی ایک پرچھائیں سی بیلا کے چہرے پر برسرے بغیر گزر جانے والی بدلی کی طرح چھا گئی جب اس نے حسن کی اس صورت کو چھڑی کے سہارے لنگڑا کر چلتے ہوئے دیکھا۔

پنڈت نے بائیں ہاتھ میں اٹھایا ہوا چھوٹا سا سفری اٹیچی مندر کے فرش پر رکھا تو کماری نے ایک نظر بھگوان کی مورتی پر ڈالی اور ساڑھی شانے پر درست کرنے لگی۔

”کماری نے اب تک شادی نہیں کی بیلا۔ اس کے حسن اور ہر شباب جسم کا راز یہی ہے کہ وہ اب تک اُن چھوٹی ہے۔“ سوامی نے بیلا کو حیرت کے سمندر سے ہوش کے کنارے پر بھیج دیا۔

بیلا اپنی جگہ سے اٹھی اور کماری کے سامنے آکھڑی ہوئی جو اسے پسندیدگی بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”نمسکار۔“ بیلا نے ہاتھ جوڑے۔

”تجھے ہونہ ہو۔ اوروں کو تو ہوگی۔ یہ کاغذ کے ٹکڑے دھرم ایمان سے زیادہ وزنی ہوتے ہیں بالک۔ دھبلی دے کر حویلی لکھوانے والے مہاجنوں سے پوچھ کہ وہ ان سے کیا کیا کام لیتے ہیں؟ تو بھی ان کا بوجھ ویر اور خیر وین کی آنکھوں پر ڈال۔ انہیں ہر سوانہی نوٹوں کی ہریالی نظر آنی چاہئے۔ جب ایسا ہو گیا تو باقی سارے وچار سارے عقیدے ساری وفاداریاں گدھے کی خیال ہی خیال میں کھائی ہوئی گھاس کی طرح ہوا ہو جائیں گی۔“

”جی مہاراج۔“ نندکار نے نوٹ کرتے کی جیب میں ڈال لئے۔ اس کا اندازہ تھا کہ وہ کم از کم بیس ہزار روپیہ تھا جو سوامی نے اس کی گود میں حرامی بچے کی طرح ڈال دیا تھا۔
 بیلا یہ سارا تماشا خاموشی سے دیکھتی رہی۔ بولنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ اسے حویلی سے آئے ہوئے دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ اب وہ چاہتی تھی کہ سوامی اس کی موسیٰ اس کے حوالے کرے تاکہ وہ لوٹ جائے۔ نندکار تھوڑی دیر بعد رخصت ہو گیا تو سوامی نے جیسے ماحول کا تناؤ دور کرنے کے لئے بیلا کی جانب مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

”اور ستا بیلا۔ تیرے منس بابو کا کیا حال ہے؟ کچھ اس طرف سے بھی دھیان دکھنا ملی کہ نہیں؟“
 ”آپ ہی کچھ چنکار دکھائیں گے تو بات بنے گی سوامی جی۔“ بیلا نے منس سے رات کی ملاقات کی بات حلق سے اُپر نہ اُٹنے دی۔ وہ نجانے کیوں چاہتی تھی کہ سوامی اس کے منس بابو کا ذکر نہ ہی کرے۔

”دکھائیں گے سُندری۔ ضرور چنکار دکھائیں گے ذرا ادھر سے کمر سیدھی ہوئے۔ آج تو میں نے پنڈت کو منس بابو کے پاس بھیجنا ہے کہ وہ ایک آدھ دن میں میری رزاقی بابو سے بھینٹ کا سہ طے کرادے۔ میرا اب رزاقی بابو سے ملنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔“
 ”کوئی خاص بات سوامی جی؟“ بیلا نے سراٹھایا۔

”ہاں۔“ سوامی نے چھت کو گھورتے ہوئے جواب دیا۔ ”بہت خاص بات ہے بیلا۔ اور اس خاص بات کا سہ اتنی جلدی اور ایسا قریب لانے میں سب سے زیادہ ہاتھ تیرا ہے۔ سہ آنے پر تیرے ایک ایک اُپکار کا بدلہ چکایا جائے گا۔ یہ میرا وچن ہے تجھ سے۔“

بیلا نے کچھ کہنا چاہا مگر اسی وقت پنڈت مندر میں داخل ہوا تو اس نے ہونٹ سی لئے۔ بیلا کو دیکھ کر پنڈت نہال ہو گیا۔ اس کے گداز شانوں پر ہاتھ پھیر کر ”دکھی ہوناں بیلا“ کے الفاظ سے اپنے آپ کو پرسن کرتا ہوا وہ سوامی کے چروں میں بیٹھ گیا۔

”بیلا کی موسیٰ کیا کر رہی ہے؟“ سوامی نے پنڈت کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔
 ”آپ کی آگیا کی راہ دیکھ رہی ہے مہاراج۔۔۔ ہی ہی ہی۔“ پنڈت کی گاڑی اشارت ہونے

”جیتی رہو۔“ کماری نے بڑے پُرقار انداز اور ایسی شیریں آواز میں جواب دیا کہ بیلا اس کے لہجے کے جادو میں گم ہو گئی۔

”کماری۔ یہ بیلا ہے۔“ سوامی نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ان دونوں کا تعارف کرایا۔ ”حویلی میں تم اسی کے ساتھ رہو گی۔“

”ہوں۔۔۔“ کماری اسے سر سے پاؤں تک بغور دیکھ کر بولی۔ ”چلے گی۔“ اس نے ایسے کہا جیسے سڑک پر بھاگنے والی کسی گھوڑی کے بارے میں رائے دے رہی ہو۔ بیلا اس کے لہجے پر مسکرا دی۔ نجانے کیوں اس کا جی نہ چاہا کہ وہ کماری کی بات کا برا منائے۔ ورنہ اگر یہی بات کوئی اور کہتا تو وہ اس کے وہ لٹے لٹے کہیں۔ جواب میں کماری بھی مسکرا دی۔ پھر ہاتھ بڑھا کر بیلا کا گال چھو لیا۔

”بہت سُند رہو تم بیلا۔“

”آپ جیسی نہیں ہوں۔“ بیلا نے تڑسے کہا۔

”اچھا۔“ وہ ہنسی تو ترنم سا چھڑ گیا۔ ”پھر بھی تم بہت سُند رہو۔“

جواب میں بیلا نے اسے خالص لکھنوی انداز میں سلام کیا جس پر وہ ہلکھلا کر ہنسی۔ ماحول کا سارا تناؤ ختم ہو گیا۔ بیلا کا جی نہ چاہا کہ وہ اس کے بائیں ٹانگ پر بوجھ ڈال کر چھڑی کے سہارے چلنے کا سبب پوچھے۔

”آپ تو کہہ رہے تھے کہ یہ بہت کم بولتی ہیں۔ لے دے رہتی ہیں مگر مجھے تو ایسا کچھ نہیں لگتا۔“ بیلا نے سوامی کی طرف دیکھ کر خوشی سے کہا۔

”بھئی ہمارے ساتھ تو کچھ ایسا ہی معاملہ ہوتا ہے اس کا۔ اب تمہارے ساتھ کھلی جا رہی ہے تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ سوامی نے بیچارگی سے شانے اچکا ئے۔

”اس کا کارن تم خوب جانتے ہو سوامی دھیرج داس۔“ کماری نے ایک دم سنجیدہ ہو کر ایسی رکھائی اور تلخی سے کہا کہ بیلا کے ساتھ ساتھ پنڈت بھی اچھنبھے میں پڑ گیا۔ سوامی دھیرج داس کو کوئی ایسے ٹوڑاک سے بھی مخاطب کر سکتا ہے یہ تو انہوں نے سننے میں بھی نہ سوچا تھا۔ ”بہر حال۔ ہمیں اب چلنا چاہئے۔ کیوں بیلا؟“ کماری نے اس کی جانب نظر اٹھائی۔

”جیسے سوامی جی کی اچھیا۔“ بیلا نے موقع کی نزاکت کو محسوس کر لیا۔

”بیلا۔“ سوامی اس کے لہجے پر یوں مطمئن ہو گیا جیسے اسے بیلا کے ”پناوٹ“ ہونے کا دشو اس آ گیا ہو۔ ”تمہیں کماری کی ہر آگیا کا پالن کرنا ہے۔ اس میں کہیں بھی کیوں اور کیسے کا سوال نہیں اٹھنا چاہئے۔“

”جی۔۔۔ میں خیال رکھوں گی۔“ بیلا نے بات سمیٹ دی۔

”کماری۔۔۔ میں سمجھتا ہوں تمہیں کچھ بتانے یا یاد دلانے کی ضرورت تو نہیں۔“ سوامی نے اپنی جگہ پر پاؤں پھرتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں۔ میں اپنا کام خوب سمجھتی ہوں۔“ کماری نے اپنے شانوں پر شال درست کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”میرا اور تمہارا رابطہ کسی بھی سے ہو سکتا ہے اس لئے ساری کھڑکیاں دروازے کھول کر رکھنا۔“

”اس کے لئے تم نچھت رہو۔ میں کام کے سے سو یا نہیں کرتا یہ تم جانتی ہو۔“ سوامی کا لہجہ بگڑ گیا۔

”تم صرف ایک کام کے سے اور اس کام کے انتظار میں جا گئے کے ماہر ہو سوامی دھیرج داس۔“ کماری کے ہونٹوں پر زہر خند نے جنم لیا۔ ”باقی تمہاری کسی بات کا کوئی دشو اس نہیں۔“

”کماری۔۔۔“ سوامی غراتے ہوئے سیدھا ہو گیا۔ ”تم میرے منہ آ رہی ہو۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں اپنے منہ آنے والوں کا شر خراب کر دیا کرتا ہوں۔“

”اوش جانتی ہوں مہاشے۔“ کماری نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ ”مگر میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم میرے بارے میں لو لنگڑے ہو۔ میں تمہارے بس کا روگ نہیں ہوں۔ چلتی ہوں۔“ اس نے دایاں ہاتھ چھڑی کی موٹھ کے ساتھ ملا کر جوڑا اور سوامی کی جانب یوں حقارت سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔ ”جہنم میں جاؤ۔“ پھر اس نے بیلا کی جانب رخ کیا۔ ”چلو سُند ری۔“ پھر اس کے جواب کا انتظار کے بغیر پلٹ پڑی۔ بیلا نے جلدی سے اس کا پیچی اٹھا لیا اور ٹھٹھک چھڑی کو فرش پر ٹھونکتی ڈرا سی جگہ پر چلتی کماری کے ساتھ باہر کو چل دی۔ پنڈت حیران و پریشان سوامی کا منہ لکیر ہاتھ جس پر غصہ اور قہر نے رات بھر سیاہی پوت دی تھی۔

”مہاراج۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ سب کیا تھا؟“ پنڈت کو چند لمحوں بعد جیسے ہوش آ گیا۔

”کیا تھا؟“ سوامی نے پھاڑ کھانے والے انداز کہا تو پنڈت کی ہلکی بندھ گئی۔

”کچھ نہیں مہاراج۔۔۔ میں تو۔۔۔ میں تو۔۔۔“ وہ ہلکا کر ایک دم سرسوں جیسا زرد ہو گیا۔

”اپنی کھال میں رہا کر پنڈت۔“ سوامی نے اس کی جانب انگلی اٹھائی۔ ”ورنہ تو جانتا ہے کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ کماری کا اور میرا برسوں پرانا پیر چل رہا ہے۔ اس میں کسی کو پاؤں دھرنے کی ضرورت نہیں۔ سمجھا۔“ سوامی کا لہجہ کسی درندے جیسا خوفناک ہوتا چلا گیا۔

”جی مہاراج۔۔۔ جی مہاراج۔۔۔“ پنڈت کا قہقہہ تھل تھل کرتا بدن یوں کانپ رہا تھا جیسے اسے لرزے کا بخار چڑھ گیا ہو۔ جڑے ہاتھوں کے ساتھ وہ جھکا اور سوامی کے سامنے ماتھا فرش پر ٹیک دیا۔

سوامی اپنے مزید سیاہ ہوتے چہرے کے ساتھ جڑے بھینچے پنڈت کے کپکپاتے جسم کو یوں گھور رہا تھا جیسے اس میں سے غلاظت کا فوارہ چھوٹ پڑنے کا منتظر ہو۔

بی بی کمار سے مل کر بہت خوش ہوئی۔ وہ اتنے بیٹھے لہجے اور دلنشیں پیرائے میں گفتگو کرتی تھی کہ سامنے والے کامن موہ لیتی۔ اس کی بانیں ٹانگ بچپن میں ٹائیٹا نڈ کے سبب ایسی مفلوج ہوئی کہ بظاہر تندرست نظر آنے کے باوجود کمار کے چاند جیسے بدن میں گرہن لگ گیا۔ وہ چھڑی کے بغیر چل نہ سکتی تھی۔ بی بی کو اس کے جسم میں اس عیب نے افسردہ سا کر دیا مگر کمار کی تھی کہ اسے اپنے اس نقص کی پرواہ ہی نہ تھی۔ اس نے ہنس کر کہا۔

”بی بی۔ اسی لئے میں نے بیاہ نہیں کیا کہ کوئی مجھ پر ترس نہ کھا سکے۔ میں آزاد پنچھی جیسی حیثیت ہوں کسی کی سوالی نہیں ہوں۔“ اس کی بات پر بی بی سوائے مسکرانے کے کیا کرتی مگر اس کے چہرے سے لگتا تھا کہ اندر ہی اندر اب بھی اسے کمار کی لنگڑاہٹ پر افسوس ہے۔

سب باتیں اپنی جگہ تاہم ایک بات اس کی اور ایسی تھی جس نے بی بی کو کچھ حیران سا کیا اور وہ یہ کہ کمار کی نابالغ ہر مرد سے پردہ کرتی تھی۔ حویلی کے کسی ملازم کے سامنے اس نے چہرہ نہ کھولا۔ ساڑھی کا پلو اس طرح چہرے پر گرائے رکھا کہ اسے دیکھنا ممکن نہ رہا۔ ہاں عورتوں کے سامنے اس کا چہرہ کھلا رہا۔ بی بی کو اس کی یہ اداسی اچھی لگی۔ دوپہر کا کھانا بی بی نے اسے اپنے ساتھ کھلایا۔ پھر چائے پی گئی اور دوپہر دھل رہی تھی جب اس نے بی بی سے اجازت چاہی۔

”اب مجھے آگیا دیجئے۔ یہ آپ کے بھی آرام کا وقت ہوگا۔“ وہ اٹھ گئی۔ بیلا نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی۔

”کب تک رہیں گی یہاں؟“ بی بی نے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

”میرا بیلا کے سوا اور بیلا کا میرے سوا اس جگہ میں کوئی نہیں ہے بی بی۔“ اس نے بیلا کو ساتھ لگا لیا۔

”تین مہینے کاویزہ لگا ہے۔ تب تک تو ہوں یہاں۔ اس کے بعد کی بھگوان جانے۔“

”آتی رہے گا۔ مجھے آپ کی طبیعت بہت اچھی لگی۔“ بی بی نے محبت سے کہا تو مسکراتے ہوئے اس نے بی بی کے پاؤں چھو لئے۔ ”ارے ارے۔ یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟“ بی بی بوکھلا کر پیچھے ہٹی۔

”اگر آپ آگیا دیں تو میں آپ کو دیدی کہہ لیا کروں۔ ایک ہی بھیٹ میں آپ نے میرا من موہ لیا ہے۔ اگر میری کوئی بڑی بہن ہوتی تو آپ ہی جیسی ہوتی۔“ کمار نے بڑی حسرت سے کہا۔

”ضرور کہہ لیا کروں۔“ بی بی ہنسی۔ ”اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟“

”دھیوا۔“ کمار نے ہاتھ جوڑ کر بڑی ممنونیت سے بی بی کی جانب دیکھا۔ ”آپ نے میرا مان رکھ لیا دیدی۔“

پھر وہ بیلا کے ساتھ رخصت ہو گئی۔

حویلی سے نکل کر جب وہ واپس کوارٹر میں آئیں تو سارا رستہ کمار نے اپنا چہرہ آتے جاتے

لوگوں سے چھپائے رکھا۔ کیا مجال کہ کوئی اس کی صورت دیکھ پایا ہو۔ بیلا کی بے چینی کو کوارٹر میں داخل ہوتے ہی زبان مل گئی۔

”کمار کی جی۔“ اس نے دروازہ بند کیا اور اس کے ساتھ چھوٹا سالان پار کرتے ہوئے کمرے کی جانب بڑھی۔ ”ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“

”کون سی بات سُندری؟“ کمار نے کمرے میں قدم رکھا۔ چھڑی کو دیوار کے ساتھ لگایا اور بستر پر بیٹھے ہوئے کمرے کی سادہ سادہ سجاوٹ کو تعریفی نظروں سے تولنے لگی۔

”یہ آپ نے حویلی میں آتے ہی پردے کا ڈھونگ کیا شروع کر دیا۔ ادھر مندر میں تو آپ۔۔۔“

”یہ بہت ضروری ہے بیلا۔“ کمار نے شمال ایک طرف ڈال کر بستر پر گرتے ہوئے کہا تو اس کے لہجے میں سنجیدگی در آئی۔ بیلا اس کے پاس ہی نئے موڑھے پر بیٹھ گئی۔ کمار نے بازو پھیلا کر ایک توبہ شکن انگڑائی لی اور ہاتھ گدی پر باندھ کر نیم دراز ہو گئی۔ پھر ذرا سانس اٹھا کر بیلا کی آنکھوں میں جھانک کر بولی۔ ”مندر میں سب اپنے دھرم داس تھے۔ یہاں میں جس کام کے لئے آئی ہوں اس میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ میرا چہرہ یہاں کے مردوں کی نظر میں کم سے کم آئے یہی میرے لئے بہتر ہے۔ یہ ہوگی ایک بات۔۔۔“ وہ ذرا سار کی پھر کہا۔

”دوسری بات جس کا تمہیں بہت خیال رکھنا ہے وہ یہ ہے کہ میں یہاں تمہارے پاس رہ کر کیا اور کیسے کرتی ہوں، تم اس بارے میں اپنی آنکھیں بند رکھو گی اور زبان کو سوا لوں کا کشت نہیں دو گی۔ جو بات میں جانا چاہوں گی وہ تم مجھے بتاؤ گی اور اس کے علاوہ اپنے ننھے سے دماغ کو کسی چتا میں نہیں ڈالو گی۔ سمجھیں۔“

”جی۔۔۔“ بیلا کچھ بھڑکی گئی۔ کمار نے اسے بالکل ہی جھاڑ کر رکھ دیا تھا۔

”میری کسی بات کا برا نہ مناؤ بیلا۔“ کمار سیدھی ہو بیٹھی۔ پھر بیلا کا ہاتھ تھام کر پیار سے سہلاتے ہوئے کہا۔ ”اگر میرا کوئی شدید تمہیں برا لگا ہو تو مجھے شکر کرنا مگر میں اپنے کام سے مجبور ہوں۔ سیما سے ہٹ کر میں اپنے اور تمہارے لئے کٹھنایاں کھڑی کر لوں گی اور یہ مجھے کسی صورت منظور نہیں۔ اس لئے میں نے تمہیں چند شبدوں میں سمجھا دیا ہے کہ ہم دونوں یہاں کس طرح رہیں گی۔“

”نہیں نہیں کمار کی جی۔ آپ چنتا نہ کریں۔ میں آپ کے کسی کام میں دخل نہیں دوں گی۔ جیسا آپ چاہیں گی ویسا ہی ہوتا رہے گا، بس آپ سے ایک ہلتی ہے۔“ بیلا نے اسے امید بھری نظروں سے دیکھا۔

”بنتی کیوں؟ تم جو چاہو کھل کر کہہ سکتی ہو۔ بولو کیا بات ہے؟“ کمار نے اس کا ہاتھ محبت سے

حساب صاف ہو جائے گا۔ میں اس سے نہیں ڈرتی، اس کا ابھی دوسروں کے لئے ہے۔ میرے لئے نہیں۔“ کماری کا لہجہ زہرا لود ہو گیا۔

تب بیلا نے اسے گزشتہ رات کی اپنی اور مونس کی ملاقات کے بارے میں بتایا۔ کماری اس کی بات غور سے سنتی رہی۔ اس کے خاموش ہونے پر وہ بولی۔

”لگتا ہے ابھی تمہاری منزل بہت دور ہے بیلا پر تو یہ بھی نظر آ رہا ہے کہ مونس بابو تمہارے لئے اپنے ہر دے میں نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ ابھی یہی کافی ہے۔ اگر تمہاری لگن کچی ہے تو ایک دن وہ بھی آئے گا جب تم اپنے من کی مراد پا لو گی۔“

”دیدی۔۔۔“ آبدیدہ ہو کر بیلا نے سراسر اس کی گود میں رکھ دیا۔ اسے کماری کی باتوں نے امید کی جھللاہٹ کا لمس عطا کر دیا تھا۔

”سو امی تیار ہا تھا کہ اس نے تمہیں اپنے چسکار سے یہاں پہنچایا ہے۔“

”ہاں۔ یہ تو سچ ہے۔“ بیلا نے اب بھی سر نہ اٹھایا۔

”تو اس کی قیمت بھی وصول کی ہو گی اس نے؟“ کماری کا لہجہ کڑوا ہو گیا۔

جواب میں بیلا خاموش رہی۔ بس اس کا جسم ایک بار آہستہ سے کپکپایا اور کماری کو اس کے سوال کا جواب مل گیا۔

”ایک بات یاد رکھنا بیلا۔“ کماری نے اس کے بالوں میں انگلیوں سے شانہ کرتے ہوئے نرم آواز میں کہا۔ ”آج کے بعد اپنے شریر کو مونس بابو کے نام پر امانت سمجھ لو۔ اس جگہ کے ہر منش کے لئے اس پر انکار کی سختی جزدو۔ اب تک جو ہوا سو ہوا مگر اب تم نے جس پگڈنڈی پر قدم رکھ دیا ہے اس پر چلنے کی شرطوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ تمہارا شریر بھی پوتر ہو۔ جس کا نام زبان سے چھٹی ہو جس کا نام دل پر لکھ لیا ہے اس کا نام شریر تک پہنچنے والے دروازے پر بھی لکھ دو تا کہ کوئی دوسرا اس پر دستک ہی نہ دے۔“

”مگر سو امی جی سے بچنا۔۔۔“ بیلا نے سر اٹھایا۔

”جان دے دینا مگر اب جسم نہ دینا بیلا۔“ کماری نے اس کے بال مٹھی میں جکڑ کر اس کا چہرہ ایک جھٹکے سے اوپر اٹھایا۔ ”میں ایک ہندو ناری ہوں مگر میں یہ بھی جانتی ہوں کہ پریم کا کوئی دھرم نہیں ہوتا۔ تمہارا پریم مسلمان ہے تو یہ تمہارا بھاگ۔۔۔ پر تو کیا اس تک اپنا داغ داغ شریر لے کر جاؤ گی؟ وہ پل جو پریت کی معراج بن کر سو بھاگیہ والوں کی رات میں جگمگاتا ہے اس ایک میل کی آس میں تم نے دین دھرم سے منہ پھیر لیا ہے۔ اپنے جسم کو ایک بار تو بچو لیا ہے مگر اب دوبارہ نہیں۔ کبھی نہیں۔ مجھے وچن دو کہ اب کبھی کسی سو امی کسی پنڈت کسی نند کمار کا ہاتھ اپنے جسم تک نہیں پہنچے دو گی۔ تبھی میں تمہارے بھید کو

دبایا۔ اس کے لہجے میں پیار ہی پیار تھا۔ بیلا کو اس سے حوصلہ ہوا۔

”میرے مونس بابو کو کچھ نہیں ہونا چاہئے۔“

”سو امی مجھے اس بارے میں سب بتا چکا ہے بیلا۔“ کماری نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اور ہمارے منصوبے میں کہیں بھی مونس بابو کے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے مگر ایک بات تو بتاؤ۔“

”جی۔ پوچھئے۔“ بیلا کھل سی گئی۔

”اتنے دن سے تم حویلی میں ہو۔ کیا مونس بابو کو تمہارے یہاں ہونے کا احساس ہوا؟ میرا مطلب ہے۔۔۔“

”کیا میں آپ پر وشواس کر سکتی ہوں کماری جی؟“ بیلا نے اس کی بات کاٹ دی۔

”رکو بیلا۔“ کماری نے اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ ”جو بات جب محسوس ہو اسے اسی وقت کر لینا چاہئے۔ تم بار بار مجھے کماری کہہ کر بلارہی ہو جبکہ میں یہاں تمہاری موسی ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ تم حویلی میں بھی مجھے کماری کہہ کر مخاطب کر بیٹھو اس لئے فوری طور پر اس لفظ کو زبان سے الگ کر دو۔“

”مضیبت یہ ہے کہ آپ کسی لحاظ سے میری موسی نہیں لگتیں۔ زیادہ سے زیادہ میں آپ کو دیدی کہہ سکتی ہوں۔۔۔ موسی دیدی کیسا رہے گا؟“ ایک دم وہ انگلی اٹھا کر بولی تو کماری کی ہنسی نکل گئی۔

”بالکل بگلی ہو تم۔ یہ تو مجھے دوسروں کی نظروں میں خاص طور پر لانے والی بات ہو گی۔ تم جی پر جبر کرو اور مجھے موسی ہی کہا کرو۔“

”اچھا۔“ بیلا نے جیسے مجبوراً کہا۔ ”کوشش کروں گی۔“

”کوشش نہیں۔ تم مجھے موسی ہی کہو گی۔“ کماری نے زور دیا۔

”ٹھیک ہے۔“ بیلا نے سر جھٹک کر کہا۔ ”ایسا ہی سہی۔“

”ہاں۔ تو تم کر رہی تھیں مجھ پر وشواس کی بات۔۔۔ تو بیلا! اگر بھارت ماتا اور مندر کی بات ہے تو میں کوئی وچن نہیں دے سکتی۔ اور اگر عورت ہونے کے ناطے کوئی ایسی بات ہے جس میں میں تمہارے کسی کام آ سکوں تو بغیر کسی ابھے کے کہہ ڈالو۔ میرا معدہ بہت مضبوط ہے۔“ کماری کا لہجہ سجد گھمبیر تھا۔

”میں نے سو امی جی کے سامنے یہ بات نہیں کہی اس لئے کہ مجھے ان سے خوف آتا ہے۔“ بیلا نے کماری کی جانب دیکھا۔

”وہ ہے ہی ایسا درندہ کہ اس سے خوف آنا ہی چاہئے۔۔۔“

”مگر آپ تو ان سے نہیں ڈرتیں۔ آپ نے تو ان سے آج جس طرح بات کی، ہم لوگ تو اس بارے میں دچار بھی نہیں کر سکتے۔“

”میرا اس سے بہت پرانا شکست چل رہا ہے بیلا۔ اس دن کی راہ دیکھ رہی ہوں جب اس سے میرا

ہر دے میں چھپا سکوں گی۔“ اس نے بیلا کے بالوں کو بل دے کر جھجھوڑ ڈالا۔

”میں وچن دیتی ہوں دیدی۔ وچن دیتی ہوں۔ جان دے دوں گی۔۔۔ جان دے دوں گی۔۔۔ جان دے دوں گی۔۔۔ اس کی ہنسی بندھ گئی۔ آنسو بہہ نکلے۔ کماری نے اسے گود میں ڈال لیا اور بے اختیار اس کے بالوں پر ہونٹ رکھ دیے۔ اس کی اپنی آنکھیں بھی نم تھیں۔ نجانے کیوں؟

☆=====☆

”ہر سال ہولی کے تیوہار پر رزاقی بابو اور ان سے پہلے ان کے بڑے اس حسن کی سو بھابھو ہانے کے لئے کچھ سے کو ہماری بستی میں پاؤں دھرتے آئے ہیں مولس بابو مگر اس سال۔۔۔“ پنڈت نے چہرے پر غم کے آثار پیدا کرنا چاہے اور حسب سابق کارٹون بن کر رہ گیا۔ مولس نے کھانسنے کر رومال ہونٹوں پر رکھ لیا تاکہ اس کی مسکراہٹ پنڈت نہ دیکھ سکے جو اس گتے کی طرح سر جھکائے فرش کو گھور رہا تھا۔

”میں سمجھتا ہوں پنڈت جی۔“ کچھ دیر بعد مولس نے رومال ہٹایا تو پنڈت نے بھی اس کی آواز پر سر اٹھایا۔ ”لیکن دنیا کے کام کسی وجہ سے کب رکتے ہیں؟ آپ لوگوں کا یہ مذہبی تہوار ہے۔ آپ اسے اسی طرح منائے جیسے ہمیشہ مناتے آئے ہیں۔ ہاں رزاقی بابو کا میں بتا چکا ہوں کہ وہ نہیں آسکیں گے۔“

”اور ہم ان کے بغیر ہولی کی سروعات نہیں کر سکتے مولس بابو۔ سوامی جی نے بستی والوں سے صاحبہ صاحبہ کہہ دیا ہے کہ اگر رزاقی بابو نہیں آئیں گے تو ہولی نہیں کھلی جائے گی۔“ پنڈت نے اپنی طرف سے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔

”خدا نہ کیجئے پنڈت جی۔“ مولس اسے نرمی سے سمجھانے کے انداز میں بولا۔ ”اتنے بڑے سانچے کے بعد رزاقی ایسی تقریب میں شامل ہونے پر کیسے۔۔۔“

”میں سب جانتا سمجھتا ہوں مولس بابو۔۔۔ مگر ہم آپ کی پر جاہیں۔ اگر آپ ہمیں اس طرح نجر انداز کریں گے تو۔۔۔“ پنڈت کی زبان نے سوامی کے رٹائے ہوئے الفاظ اگلے تو مولس کو سنبھلنا پڑا۔

”دیکھئے۔۔۔“ اس نے کہنا چاہا۔

”مولس بابو۔ آپ سوامی جی کی رزاقی بابو سے ایک چھوٹی سی بھینٹ کا انجام کر دیں۔ شاید سوامی جی انہیں منالیں۔“ اس نے مولس کی بات کاٹ دی۔

”میں اصل میں چاہتا نہیں کہ کوئی رزاقی کو ڈسٹرب کرے۔“ مولس کا لہجہ خشک ہو گیا۔

”ایسا کچھ نہیں ہے مولس بابو۔“ پنڈت نے ڈھیٹ پن کی حد کر دی۔ ”دیکھئے ناں اگر سوامی جی سے بھینٹ کے بعد بھی رزاقی بابو ہولی کے حسن میں نہ آئے تو اس کی ساری جتنے داری سوامی جی پر ہو گی۔ پھر وہ بستی والوں کو گھد ہی سمجھا بھالیں گے۔ کچھ ہماری مزبور ہی سمجھے مولس بابو۔“ اس کا لہجہ لاجت آمیز ہو گیا۔

”اچھا۔“ مولس نے مزید بحث سے جان چھڑائی۔ ”ٹھیک ہے۔ میں رزاقی سے بات کرتا ہوں کہ وہ کب سوامی جی سے مل سکتا ہے۔ آپ یہ بتائیے کہ ہولی کب ہے؟“

”پرسوں۔“

”اور ہولی کھیلنے کی رسم کب شروع ہوگی؟“

”سویرے دس بجے۔“ پنڈت نے بتایا۔

”ٹھیک ہے۔ آپ شام کو کسی کے ہاتھ پتہ کروالیں گے۔ ملاقات اگر ہوئی تو کل ہی ہوگی۔“

”یہ بھون نمبر دیا تھا سوامی جی نے۔“ پنڈت نے ایک چھوٹی سی چٹ مولس کے سامنے میز پر رکھ دی۔ ”کرپا کر کے آپ اس پر ان سے بات کر لیں یا وہ گھد سام کو آپ سے پوچھ لیں گے۔ آپ کا نمبر تو ہمارے پاس ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں خود ہی آپ کو بتا دوں گا۔“ مولس نے چٹ پر لکھے موبائل فون نمبر پر نگاہ دوڑائی اور چٹ جب میں رکھی۔

”بہت بہت دھنواؤں مولس بابو۔“ پنڈت خوش ہو گیا۔ پھر وہ رام رام کرتا ہاتھ جوڑے اٹے پاؤں اس کے آفس سے نکل گیا۔

مولس کچھ دیر بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر اٹھا اور آفس سے نکل کر حویلی کی طرف چل پڑا۔ اسے رزاقی اپنے کمرے ہی میں ملا۔ اس کے کمرے تک پہنچنے تک غیر اختیاری طور پر اس کی نگاہیں بیلا کو ڈھونڈتی رہیں مگر وہ اسے نہیں نظر نہ آئی۔ پھر اسے خیال آیا کہ اسے آج اپنی موسیٰ کو لینے بستی جانا تھا شاید وہیں گئی ہو۔ بی بی اپنے کمرے میں تھی۔ مولس نے اسے بے آرام کرنا مناسب نہ سمجھا اور ملازمہ سے رزاقی کا پوچھ کر سیدھا اس کے کمرے پر چلا آیا۔

اس نے آہستہ سے دستک دی۔

”کون؟“ اندر سے رزاقی کی سپاٹ آواز ابھری۔

”میں ہوں مولس۔۔۔“ کہتے ہوئے اس نے دروازہ کھول دیا۔

”ارے تم مولس۔۔۔“ رزاقی بستر سے اٹھ گیا۔ ”یہ تم دستک دے کر کیوں آرہے ہو بھائی؟

یہاں کس سے پردہ ہے تمہارا؟“

اس کی بڑھی ہوئی شیو اور بھیجی بھیجی سی آنکھیں دیکھ کر مولس کے دل پر چوٹ سی پڑی۔ خوش لباسی جس پر ختم تھی۔ کھلا ہوا گلاب جس کے چہرے سے شرما جاتا تھا۔ اس کا یہ حال مولس کو دل گرفتہ کرنے کے لئے کافی تھا۔

”کیا کر رہے تھے؟“ مولس نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے دوبارہ بستر پر بٹھا دیا اور خود

”میری راجیہ مجھے واپس لا دو مونس۔ میری جنت مجھے دلا دو۔ میں جی اٹھوں گا۔ بننے لگوں گا۔ مسکرانے لگوں گا۔“ آنسوؤں میں ترتر چہرہ مونس کے سامنے لا کر پگلوں کے انداز میں رزاتی نے کہا تو مونس کے دل پر آرا سا چل گیا۔ اس نے تڑپ کر اسے پھر سینے میں چھپا لیا۔ دونوں بچوں کی طرح ہلکے اٹھے۔

سینے کا غبار کچھ کم ہوا تو مونس اسے لے کر کمرے سے نکل آیا۔ رزاتی نے بھی ضد نہ کی۔ دونوں پائیں باغ میں چلے آئے۔ سردیوں کی شام قریب تھی۔ دھوپ ڈھل چکی تھی۔ پرندے درختوں کی شاخوں پر چھپا رہے تھے۔ ایک شور سا مچا ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر ٹھلکتے رہے۔ پھر مونس اسے لئے ہوئے ایک شامیانے کے نیچے پچھی کر سیوں پر آ بیٹھا اور ذہن میں الفاظ ترتیب دینے لگا جن کے سہارے وہ رزاتی کو پنڈت اور سوامی کی فرمائش کے بارے میں آگاہ کر سکے۔

ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ برتنوں کی کھٹکناہٹ سے دونوں چوٹ پڑے۔ دیکھا تو بیلا چائے کی ٹرائی لئے ان کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اس نے مسکرا کر ان دونوں کو نمسکار کیا۔ برتن میز پر سجائے اور مونس کو بڑی پیاسی نظروں سے دیکھتی ہوئی لوٹ گئی۔

”یہ بیلا بڑی کھجور لڑکی ہے مونس۔“ رزاتی نے اسے باغ سے باہر جاتا دیکھ کر کہا تو مونس اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ”اس نے غدنی کی کمی تو آئے ہی پوری کر دی تھی اب اس نے مجھے اپنی عادت ڈال دی ہے۔ اس وقت چائے کو بہت جی چاہ رہا تھا اور مجھے یا تمہیں کہنا نہیں پڑا۔ نجانے اس نے کب ہمیں یہاں آتا دیکھ لیا اور خاموشی سے کچن میں چلی گئی۔“

”ٹھیک کہتے ہو تم۔“ مونس نے چائے کا کپ رزاتی کی طرف سر کیا۔ پھر اپنا کپ سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں بھی اس کے بارے میں کچھ ایسا ہی سوچتا ہوں۔“

چائے کے ساتھ خشک میوہ جات اور دوسرے لوازمات بھی تھے۔ دونوں خاموشی سے چائے پینے لگے۔ سب لے کر مونس نے کپ میز پر رکھا۔

”ابھی کچھ دیر پہلے پنڈت گردھاری لال آیا تھا۔“

”خیریت؟“ رزاتی نے اس کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

جواب میں مونس نے اسے ساری گفتگو سے آگاہ کیا جو اس کے اور پنڈت کے درمیان ہوئی تھی۔

”نہیں مونس۔ میں کسی ایسی تقریب میں نہیں جاسکتا جو خوشی کے نام پر منائی جا رہی ہو۔“ رزاتی نے صاف انکار کر دیا۔

”وہ خود کو تمہاری رعایا کہہ کر تمہیں یہ احساس دلانا چاہتے ہیں کہ تمہیں ان کے دکھ سکھ میں شرکت کرنی چاہئے۔ اسی لئے سوامی دھیرج داس تم سے ملنا چاہتا ہے۔“

اس کے سامنے کرسی پر ٹک گیا۔

”کچھ نہیں یار۔ کیا کرنا ہے؟“ وہ تھکے تھکے لہجے میں بولا اور سر جھکا لیا۔

اسی وقت مونس کی نظر تپائی پر پڑے سگریٹ کے پیکٹ اور لائٹر پر پڑی۔

”یہ۔۔۔“ اس نے چونک کر ہاتھ سے ادھر اشارہ کیا۔ ”سگریٹ بھی شروع کر دیے؟“

”وقت نہیں کتنا مونس۔“ بڑے ڈکھ سے رزاتی نے کہا تو مونس نے نپلا ہونٹ دانتوں میں دبایا۔

”اس طرح کٹ جاتا ہے؟“ کچھ دیر بعد اس نے دھیرے سے پوچھا تو رزاتی نے اس کی

جانب نگاہ اٹھائی۔

”نہیں۔۔۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”بس۔۔۔ کوشش کرتا ہوں یا یوں کہہ لو خود کو فریب دیتا

ہوں کہ کسی طرح احساس ہوتا رہے کہ وقت گزر رہا ہے۔ دس اکتوبر پر تھم نہیں گیا۔“

”دس اکتوبر۔۔۔“ مونس کے دماغ کو جھکا سا لگا۔ یہ تاریخ تھی جب راجیہ اور جنت کا

ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔

”ہاں۔ دس اکتوبر۔“ رزاتی کے لبوں پر ایک آہ چل گئی۔ ”میری جنت اجڑ جانے، میری جنت

چھن جانے کا دن۔۔۔“ پھر ایک دم وہ مونس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ ”مونس۔ یہ وقت تمہیں کیوں گیا

ہے یار؟ جلدی سے مجھے میری قبر تک کیوں نہیں پہنچا دیتا؟ میری راجیہ اور جنت کے پاس کیوں نہیں لے

جاتا مجھے؟“

”رزاتی۔“ مونس تڑپ کر آگے کو جھکا اور اسے گلے لگا لیا۔ ”کیوں ایسی باتیں کرتے ہو جو جگر

چیر دیتی ہیں۔ دل پر نشتر چلانا آگیا ہے تو اپنوں ہی پر آ زمانے لگے ہو۔ اپنے چلے جانے کی بات کر کے

مجھے اور بی بی کو کیوں صلیب دینا چاہتے ہو؟“

”نہیں مونس۔ ایسی بات نہیں ہے۔“ رزاتی کا سارا جسم تپ بھی رہا تھا اور ہولے ہولے لرز بھی

رہا تھا۔ ”تم دونوں کے سوا اب میرا رہا کون ہے؟ لیکن یار دن رات کے یہ آٹھ پہرے یہ چوبیس گھنٹے

میرے لئے دلدل جیسے غلیظ ہوتے جا رہے ہیں۔ میں ان میں دھنستا جاتا ہوں۔ آہستہ آہستہ۔ سانس

رکتا ہے۔ دل ڈوبتا ہے۔ بہت ہاتھ پاؤں مارتا ہوں مگر سب بیکار۔ نہ باہر نکل پاتا ہوں نہ پوری طرح یہ

دلدل مجھے نگل لیتی ہے۔ ایک ہی بار کیوں مجھے ہڑپ نہیں کر لیتا یہ وقت۔۔۔“

”بس کرو۔۔۔ بس کرو۔“ مونس نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”اگر میرے بس میں ہوتا

ناں رزاتی تو میں اپنی جان دے کر بھی تمہارا دکھ بانٹ لیتا مگر۔۔۔“ اس کی آواز رندھ گئی۔ ”میں کیا

کروں رزاتی۔۔۔ کیا کروں؟ کیا کروں کہ تمہارے ہونٹوں پر پھر سے ہنسی سج جائے۔ تم پھر سے جی

اٹھو۔ کیا کروں؟“

میرا حلیہ اس نے کیسا نائٹ کر دیا ہے۔“ مونس نے اپنی جانب اشارہ کیا۔
 ”بی بی نے آج ہی نادر شاہی حکم کے تحت مجھے بیلا کے حوالے کر دیا ہے بھائی۔ کل صبح سے میں اس کی ڈسپوزل پر ہوں۔“ رزاتی نے بیچارگی سے بتایا۔

”زندہ باد۔“ بیساختہ مونس کے لبوں سے نکلا۔ ”تو میں چلتا ہوں۔“
 مونس اس کا شانہ تھپک کر لوٹ گیا۔ رزاتی اسے تب تک دیکھتا رہا جب تک وہ نظر آتا رہا۔ پھر اس نے کرسی کی پشت سے سر ٹیک دیا اور آنکھیں بند کر کے تنہائی کے اس سمندر میں اتر گیا جس کی ہر ہلچل میں راجیہ اور جنت کی یادیں کروٹیں لے رہی تھیں۔

☆=====☆=====☆

”میں آپ کا بہت آجہاری ہوں رزاتی بابو کہ آپ نے مجھے جھینٹ کا سہ دیا۔“ راجیہ کی تصویر سے نظر ہٹاتے ہوئے سوامی دھیرج داس نے رزاتی کی طرف دیکھا۔ وہ ٹھیک وقت پر رزاتی سے ملاقات کے لئے آن پہنچا تھا۔ آج اس کے ساتھ صرف پنڈت گردھاری لال تھا۔ چپلا چائنا کوئی نہ تھا۔ ملاقات حسب سابق رزاتی کے آفس میں ہوئی۔ مونس نے انہیں چائے سرو کروائی اور خود رزاتی کے دائیں ہاتھ ایک فومی کرسی پر جم گیا۔ اس طرح کہ سوامی اس کے بالکل سامنے آ گیا۔ پنڈت ذرا پرے بیٹھا محل پان سے انصاف کرنے میں مصروف تھا۔ یوں جیسے وہ اسی کام کے لئے یہاں آیا ہو۔
 ”اچھی کوئی بات نہیں سوامی جی۔ آپ کے چائے پر آپ سے ملاقات نہ کرنا مناسب نہ تھا۔“ رزاتی نے نرمی سے جواب دیا۔ آج بیلا نے اس کی شیو سے لے کر لباس تک میں اپنی مرضی چلائی تھی جس کے نتیجے میں وہ دھلا دھلایا، تھرا ہوا اپنی سیٹ پر بیٹھا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ سوامی نے یہ تو محسوس کیا کہ وہ پہلے کی نسبت کافی کمزور ہو چکا ہے۔ کبھی کبھی اس کے ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش کا احساس بھی ہوتا اور آنکھوں میں وہ چمک بھی مفقود تھی جو پہلی ملاقات میں انہیں صاف نظر آئی تھی مگر تھا وہ اپنے حواس میں۔

”میں آپ کا زیادہ سے نہیں لوں گا رزاتی بابو۔ آپ کو مونس بابو نے بتا دیا ہو گا کہ میں آپ سے کیوں ملنا چاہتا تھا۔“ سوامی فوراً ہی اصل مدعا پر آ گیا۔

”جی ہاں۔“ رزاتی نے پیپر ویٹ گھماتے ہوئے نظر میز کی سطح پر جمادی۔ ”لیکن آپ میری مجبوری بھی جانتے ہیں۔“ وہ بےحد سنجیدہ تھا۔

”رزاتی بابو۔“ سوامی نے ایک نظر پھر رزاتی کے عقب میں دیوار پر لگی راجیہ اور جنت کی تصویر پر ڈالی۔ ”میں آپ کے دھرم عقائد اور وشواس کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ یہ ہر منٹ کا اپنا معاملہ ہے پرتو ایک بار پھر آپ سے پوچھنا چاہوں گا کہ آتما کے بارے میں آپ کے کیا چار ہیں؟“

”اگر انہیں میرے دکھ کا احساس ہوتا تو وہ اس بار ہولی نہ مناتے مونس۔“ رزاتی نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن جب وہ اپنی خوشی منانے کے لئے آزاد ہیں تو میں اپنے غم کی دنیا سے باہر نہ آنے میں خود مختار ہوں۔ سوامی سے کہہ دو کہ۔۔۔“

”تم کل صبح اس سے مل رہے ہو۔“ بی بی کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔
 ”بی بی۔۔۔ آپ۔“ مونس کھڑا ہو گیا۔ رزاتی بھی اپنی نشست پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔
 ”بیٹھو بیٹا۔“ بی بی نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”باؤ۔“ بی بی نے رزاتی کی طرف نگاہ کی۔
 ”بیٹا! ہر انسان کو اپنا دکھ سب سے بڑا لگتا ہے۔ ہمارا دکھ ہمارے لئے بہت بڑا ہے مگر کیا ہمیں کہہ کہہ کر دوسروں کو اس کا احساس دلانا چاہئے۔۔۔ نہیں بیٹا۔ یہ تو اپنے دکھ کی توہین کرنے والی بات ہے۔ وہ خود کو ہماری رعایا سمجھتے ہیں تو ہمیں ان کو یہ احساس دلانا ہو گا کہ ہم اپنے دکھ سے زیادہ ان کی خوشی کو اہمیت دیتے ہیں۔ کل صبح سوامی سے ملو اور اسے یہ محسوس کرنے دو کہ تم نے اس کے آنے کا بھرم رکھا ہے۔ پرسوں ان کی ہولی میں چند لمحوں ہی کے لئے، مگر جاؤ ضرور۔ ہمارا دین دوسروں کا دل جیتنے کے لئے ایسی ہی باتوں پر زور دیتا ہے بیٹا جن میں اپنے آپ پر جبر کرنا پڑے۔ کوئی کھانے کی دعوت دے تو حکم ہے کہ اس کے لئے اپنا فطری روزہ توڑ دو مگر اس کی دل آزاری نہ ہونے دو۔ سمجھ لو ان پچاس گھروں کی بستی والوں نے چاہا ہے کہ تم ان کی دعوت قبول کر لو۔ اپنے غم کا روزہ توڑ دو۔ ان کی خوشی کی دعوت میں شریک ہو جاؤ۔ کل پھر تمہارا ہے باؤ۔ غم کا آٹھ پہرہ روزہ رکھ لیتا۔ دگنا ٹو اب مل جائے گا۔“ بی بی کی آواز بھرا گئی۔
 ”پھر اپنا دکھ اپنا غم کونسا ایک دن کا ہے بیٹا۔ یہ تو جنم جنم کا ساتھی ہے۔ اس سے جدائی کا تو سوال ہی نہیں ہے۔“ بی بی اٹھی اور چادر کے پلو سے آنکھیں خشک کرتی ہوئی لوٹ گئی۔

نکتی ہی دیر خاموشی کا ساز بے آواز بجاتا رہا۔ مونس اور رزاتی سر جھکائے اپنی اپنی سوچوں میں ڈوبے رہے۔ پھر چونکے تو اس وقت جب بیلا برتن اٹھانے کے لئے آدھمکی۔ وہ چپ چاپ برتن سمیٹ کر خرابی دھکیلتی ہوئی واپس چلی گئی تو مونس نے رزاتی کی جانب دیکھا۔ تب وہ ایک طویل سانس لے کر بولا۔
 ”سوامی کو اطلاع کر دو کہ کل صبح دس بجے آ جائے۔“

جواب میں مونس نے اثبات میں سر ہلایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔
 ”آؤ اندر چلیں۔“

”تم جاؤ۔ میں ابھی کچھ دیر بیٹھوں گا۔ بہت دنوں بعد آیا ہوں یہاں۔ اچھا لگ رہا ہے۔“ رزاتی نے ادھر ادھر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

”سوامی کے سامنے یوں دیو داس بن کر مت آنا۔“ مونس نے اس کے رخسار کو چھوا۔ ”اگر اب میں نے تمہیں اس حال میں دیکھا تاں تو بی بی سے کہے بغیر تمہاری شیونگ کٹ بھی بیلا کو تھا دوں گا۔ دیکھ لو“

رزاتی نے پہلو بدل کر لیوں کو حرکت دینا چاہی مگر مونس نے اس کا ہاتھ دبا کر اسے کچھ کہنے سے روک دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ سوامی اپنا سارا زہر ایک ہی بار اگل دے تاکہ اس کے ساتھ زیادہ مغز ماری نہ کرنی پڑے اور بات ایک دم صاف ہونے میں زیادہ وقت نہ لگے۔

”منش کی فطرت ہے مہاراج کہ اسے جہاں سے آسانی اور لا بھ ملتا ہے وہ اس طرف جانے کے لئے حیلے بہانے تراش لیتا ہے پرنتو جو بات سامنے کی ہو اس کے لئے حیلے کی ضرورت ہوتی ہے نہ بہانے کی۔“ سوامی نے ایک پل کے بعد پھر زبان کھولی۔ ”میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آواگون ایک ایسا عقیدہ ہے جس کے بارے میں ہندو دھرم کے ذامن میں بڑی ٹھوس گواہیاں موجود ہیں۔“

”میں آواگون کے بارے میں کچھ حد تک جانتا ہوں سوامی مہاراج مگر چاہوں گا کہ آپ اپنی زبان سے اس پر کچھ کہیں۔“ مونس نے بات کا رخ متعین کر دیا۔

”ضرور مونس مہاراج۔“ سوامی نے اس کی جانب اپنی چکیلی نظروں سے دیکھا اور اس کے پتلے پتلے لیوں پر بڑی ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر اس نے رزاتی کی طرف نظر گھمائی اور کہا۔ ”آواگون کے انوسار ہر انسان مرتبہ کے بعد سات بار مختلف شکلوں میں جنم لے کر اس جگہ میں واپس آتا ہے۔ اگر اس کے کرم اچھے ہیں تو وہ دوبارہ اپنی پہلی ہی شکل یعنی اچھے منش یا اچھی استری یا پھول یا کسی بھی اچھی شے کی صورت میں جنم لیتا ہے اور اگر اس کے کرم بُرے ہیں تو وہ کسی بُرے منش یا بدی استری کتے، سانپ یا کسی نحس جانور کی شکل میں جنم لیتا ہے۔ اسے اپنے پہلے جنم کے بارے میں کبھی تو سب کچھ یاد ہوتا ہے اور کبھی بچھلے جنم کی یادوں کا دھندلا دھندلا سا عکس اس کے دماغ پر کبراہن کر چھایا رہتا ہے۔ یہ سات بار کا جنم اس سے اور بھی اٹوٹ ہو جاتا ہے جب مرنے والے کی آتما بے چینی کا شکار ہو۔ یہ بے چینی یہ بیا کلتا اس وقت انتہا پر ہوتی ہے مہاراج جب وہ اپنے کسی پیارے سے بے وقت زبردستی یا حادثاتی طور پر جدا ہو گیا ہو یا کر دیا گیا ہو انیائے کی چھری سے اس کی ہڈی دے دی گئی ہو یا ابھی اس کے من کی مرادیں پوری نہ ہوئی ہوں اور اسے اس جگہ سے جانا پڑ جائے۔ اپنے پیاروں سے جسمانی طور پر نہ چاہتے ہوئے بھی جدا ہو جانے والے لوگوں کی آتما میں واپس ان کے پاس آنے کو بیا کلت رہتی ہیں اور جو نبی انہیں آ گیا ملتی ہے یا بھگوان ان کی بیا کلتا دیکھ کر انہیں واپس اس جگہ میں بھیجتا ہے تو وہ سیدھی اپنے پیاروں کے پاس پہنچ جاتی ہیں۔ سے زیادہ بیت چکا ہو تو انہیں ڈھونڈتی ہیں۔ اگر دونوں ایک ہی سے پر مرتیو کا شکار ہوئے ہوں تو ایک دوسرے کو تلاش کرنے میں وہ پرتھوی کا چپے چپے چھان مارتی ہیں اور بالآخر کہیں نہ کہیں آپس میں ان کی بھینٹ ہو جاتی ہے اور اگر انہیں کسی سے انتقام لینا ہو کسی کو غم دینا ہو تو وہ اپنے شتر کا پیچھا پاتال تک کرتی ہیں۔ اسے جب تک وہ نشٹ نہیں کر لیتیں انہیں قرار نہیں آتا۔ بدلے کی یہ بھاونا اپنے شتر کی مرتیو سے کم نہیں بھتی۔“

”اس کے بارے۔۔۔“ مونس نے کہنا چاہا کہ رزاتی نے اسے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

”میں مختصر ا پہلے بھی کہہ چکا ہوں سوامی جی کہ آتما میرے اللہ کا امر ہے۔ اس کا حکم ہے۔“ رزاتی نے نگاہ اٹھائی۔ مونس نے اس کے لہجے سے اندازہ لگا لیا کہ آج وہ اس بحث کو انجام تک پہنچانے کے موڈ میں ہے، لہذا وہ سنبھل کر بیٹھ گیا کہ جہاں اس کی ضرورت ہو وہاں دخل دے سکے۔

”اور اسی لئے میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں مہاراج کہ کیا آپ کا آواگون پر دوشواں ہے؟“ سوامی نے یوں پہلو بدلا جیسے اپنے ہتھیار ترتیب دے رہا ہو۔

”جی نہیں۔ ہمارے دین میں ایسے عقائد کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔“ رزاتی نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔

”بات گنجائش کی نہیں ہے مہاراج۔“ سوامی نے ہاتھ کھولے۔ ”گنجائش تو آپ کے دھرم میں بہت سی باتوں کی نہیں ہے مگر شچا ہوں گا یہ کہنے کے لئے کہ آپ کے بھائی بند نیائے انیائے سے نچھت ہو کر ان کرموں کو اپنا ادھیکار سمجھتے ہوئے ہیں جو آپ کے دھرم میں قطعاً جائز نہیں۔“

”مثلاً۔۔۔ آپ کا اشارہ کن باتوں کی طرف ہے؟“ مونس نہ رہ سکا۔

”میں سب باتوں کی بجائے صرف چند گنا دیتا ہوں مونس مہاراج۔ آپ باقی باتوں کے بارے میں خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔“ سوامی نے اسے نظروں میں تو لا اور کہا۔ ”مثلاً سودی آپ کے دھرم میں کوئی گنجائش نہیں ہے پرنتو میں نے آپ کی کچھ باتوں میں یہاں تک پڑھا ہے کہ سود خوروں نے سود وصول نہ ہونے پر اپنے مقروض کو جان سے ملکت کر ڈالا اس کی جائداد ہڑپ لی یا اس کی گھر والی اور جوان بھری کو اٹھا لے گئے۔“

”میں آپ کی بات سمجھ گیا سوامی جی لیکن آپ ایک آدمی کے قول یا فعل کو سارے مسلمانوں پر یا ہمارے مذہب پر کیسے ٹھونس سکتے ہیں؟“ رزاتی نے جیسے اسے مزید کچھ کہنے سے روکنا چاہا۔

”نہ نہ مہاراج۔ بالکل نہیں۔“ سوامی جلدی سے بولا۔ ”میں تو گنجائش کی بات کر رہا ہوں۔ جس طرح لاکھوں کروڑوں مسلمانوں میں ایک منش ایسا ہے جو اپنے دھرم پر قائم رہتے ہوئے سودنا جائز قتل شراب جوئے اور بلا دکاری میں کیول اس لئے حرج نہیں سمجھتا کہ اس سے اس کی کسی نہ کسی انداز میں تسکین ہوتی ہے ضرورت پوری ہوتی ہے یا اسے کچھ لا بھ حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح جنتر منتر اور کالا علم بھی ایسی چیزیں ہیں جنہیں آج کے مسلمان ہم سے زیادہ اپنائے ہوئے ہیں۔ ہمارے تو دھرم میں یہ باتیں شامل ہیں پرنتو آپ کا دھرم تو ان سے باقاعدہ روکتا ہے پھر بھی آج کا روشن خیال اور ترقی یافتہ یا پھر کشٹ سے گزرتا ہوا مسلمان ہمارے دھرم کی کشلٹ کو اپنانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔“ سوامی کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

اس کے جسم میں ایسی صاف کپکپاہٹ محسوس کی کہ وہ چونک اٹھا۔
”تم ٹھیک تو ہو؟“ وہ اس کی طرف جھکا۔

”ہاں۔“ رزاتی نے بے قابو سانسوں کے ساتھ جواب دیا۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“
”تم غصے میں مت آؤ۔ ان کا اپنا عقیدہ ہے۔ اپنی دنیا ہے۔ ہمیں گھر آئے مہمانوں کے ساتھ
نرمی کا سلوک کرنا چاہیے۔“ مونس نے اسے سمجھایا۔

”میں شام چاہتا ہوں مہاراج۔“ سوامی نے ایک دم معذرت خواہانہ لہجے میں کہا مگر اس کی آواز میں
سرکشی صاف جھلک رہی تھی تاہم وہ مونس کو تشکر سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے دوبارہ رزاتی کی جانب نگاہ
اٹھائی۔ ”میرے کسی شبد سے آپ کے من کو ٹھیس پہنچی ہو تو میں آپ کا مجرم ہوں پر تو میرا یہ ارتھ ہرگز نہیں
تھا۔ اگر آپ شانتی سے سینل تو میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔“

”ابھی اور کچھ کہنا ہے آپ کو؟“ رزاتی نے اسے بڑی درد بھری نظروں سے دیکھا۔ ”میرے
زخموں پر ابھی اور کتنا نمک چھڑکیں گے آپ سوامی جی؟“

”بھگوان کے لئے میری کسی بات کا ایسا مطلب نہ لیجئے رزاتی بابو۔“ سوامی نے خلوص کا اظہار کرنا
چاہا۔ ”آپ میری بات سن تو لیں۔ پھر میرے صحیح یا غلط ہونے کا ترے لیجئے گا۔“

مونس نے اسے مزید بات کرنے سے روکنے کے لئے زبان کھولنا چاہی مگر رزاتی نے اس کا شانے
پر ہاتھ دبا کر اسے روک دیا۔ ”کہئے۔ جو کہنا ہے کہئے۔ میں سن رہا ہوں۔“

مونس واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گیا مگر اب وہ کچھ مضطرب سا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ سوامی جتنی جلدی ہو
سکے اپنی بات کر کے دفعان ہو جائے۔

سوامی نے دیوار گیر راجیہ کی تصویر پر نگاہیں جمادیں۔ پھر پلکیں موندیں اور چند لمحوں بعد بڑے
کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ”مہاراج۔ جیسے آپ اپنے پیاروں اور اس جگہ سے چلے جانے والوں کی
آتماؤں کو پسینوں میں دیکھتے ہیں اس سے ایک پگ آگے ہم آتماؤں کو کھلی آنکھوں سے دن رات کے
کسی بھی پہر میں اپنے آس پاس ارد گردیوں دیکھ لیتے ہیں بات کر لیتے ہیں جیسے اس سے آپ اور میں
آمنے سامنے بیٹھے ہیں۔ آپ میری شکلیوں سے بے شک انکار کریں مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ بہت جلد
شاید آنے والے آٹھ پہر کے اندر اندر ہی آپ کی پتی کی آتما آپ تک لوٹ آنے والی ہے۔ آپ
اسے اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے اور میری آج اس سے کہی ہوئی بات آپ کو یاد دلانے لگی کہ میں
نے غلط نہیں کہا تھا۔“

سوامی نے دھیرے سے پلکیں واکیں۔ اس کی انگارہ ہوتی آنکھوں سے ایسی چمک خارج ہو
رہی تھی جس نے رزاتی کے سارے جسم کو ایک سنسناہٹ سے دوچار کر دیا۔ اس نے چاہا کہ سوامی کی

”ہوں۔۔۔“ مونس نے سوامی کے خاموش ہونے پر ایک گہرا سانس لیا۔ ”آپ نے بڑی
وضاحت سے آواگون کے بارے میں بتایا سوامی جی لیکن اس ساری بات سے ہمارا کیا لینا دینا؟“ اس
کے لہجے میں لاپرواہی تھی۔

”کچھ لینا دینا ہو بھی سکتا ہے مہاراج۔“ سوامی نے بڑی مشکل سے اپنے لہجے پر قابو پایا کیونکہ
مونس نے یہ بات ایسے ہی کہی تھی جیسے سوامی کو جہنم میں جانے کا مخلصانہ مشورہ دیا ہو۔

”وہ کیسے؟“ رزاتی نے سوامی کی پیشانی پر اچھرتی تیوری دیکھ لی تو دخل دیا۔

”دیکھئے مہاراج۔“ اس نے نرم ہوتے ہوئے کہا۔ ”میں نہیں جانتا کہ میرا ہر دے آپ کے دکھ
پر کیوں کڑھتا ہے پر نتو یہ سچ ہے کہ میں چاہتا ہوں اگر آپ کے کسی کام آ سکتا ہوں تو اوش آؤں۔ جس
طرح آپ کی پتی اور پتری آپ سے جدا ہوئیں اسے سن اور دیکھ کر کسی بھی منش کا سینہ غم سے پھٹ
جائے گا۔ میں نے آواگون کے بارے میں اس لئے بات کی ہے کہ شاید آپ کا اس پر ذرا سا وشواس
آپ کی پتی کی آتما اور ایک سے پر جا کر اس کے شریر سے آپ کی بھینٹ کرا دے۔“

”یہ کیسے ممکن ہے؟“ ایک دم مونس اور رزاتی کے لبوں سے نکلا۔ حیرت نے رزاتی اور بے یقینی
نے مونس کے چہرے پر کتنے ہی رنگ بکھیرے۔

”سمجھو تو ہے مہاراج۔“ سوامی بڑے ہر اسرار انداز میں مسکرایا۔ اسی وقت پنڈت نے چائے کا
تیسرا کپ خالی کر کے آگے آتے ہوئے پر رکھا اور اپنا بڑا سا سر سوامی کی طرف جھکا کر یوں آنکھیں بند کر
لیں جیسے کوئی پیٹ بھرا ایل کھیوں کو اجازت دے دے کہ وہ اس کے سر منہ پر پٹک مناتے ہوئے موج
مستی کر سکتی ہیں۔

”آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ۔۔۔“

”میں یہی کہنا چاہتا ہوں مہاراج کہ آپ کی پتی کی حد تک میرا دھرم اور علم یہ بتاتا ہے کہ اس کی
آتما اور ایک دن اس کے شریر سے آپ کی بھینٹ ہو سکتی ہے۔“ سوامی نے رزاتی کی بات پوری کر دی۔
”ناممکن۔۔۔“ وہ بڑبڑایا۔

”ایسا کسی صورت ممکن نہیں۔“ مونس نے اس کی تائید کی۔

”ایسا نہ کہئے مہاراج۔“ یکا یک سوامی کا لہجہ گھمبیر ہو گیا۔ ”میری شکتی کا امتحان نہ لیجئے۔ میں
آواگون کو ایک طرف رکھ دوں تب بھی میں آپ کی پتی کی آتما کو آپ کی خاطر دوبارہ اس جگہ میں بلا
سکتا ہوں۔“

”بس۔۔۔“ رزاتی ایک دم آپے سے باہر ہو گیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہوا اور آنکھیں حلقوں سے
اٹل پڑیں۔ ”اور ایک لفظ نہیں۔۔۔“ اس نے ہونٹ بھیجنے لئے۔ مونس نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو

نگاہوں سے رابطہ توڑ لے کر اس کا بھاری ہوتا ہوا دماغ ایسا کرنے سے قاصر ہوتا چلا گیا۔

”میری بات یاد رکھئے گا رزاقی بابو۔“ سوامی نے اس کی جانب انگلی اٹھائی اور زور دیتے ہوئے کہا۔ ”میں نے جو کہا سچ کہا۔ آئندہ ایک رات اور ایک دن کا سہم آپ کے لئے بہت اہم ہے۔ آپ کی چینی کی آتما آپ تک آنے کے لئے بیاکل ہے۔ بہت بیاکل۔ اس کی بیاکلتا پر بھگوان کو دیا آگئی ہے اور اسے اس جگہ میں آپ کے پاس آنے کی آگیا دی جا چکی ہے۔ ہماری اگلی بھینٹ بہت جلد ہوگی اور آپ اس سے میرے ان الفاظ کے سچ ہونے کی گواہی دیں گے۔“

سوامی نے انگلی ایک دم سے نیچے گرائی۔ اپنی آنکھوں کا زاویہ بدلاتا تو رزاقی جیسے ایک جھٹکے سے ہوش میں آ گیا۔ اس کا سر درد کے دھماکوں کی زد میں تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا اور کنپٹیاں دبائے لگا۔

”میں جس مقصد سے آیا تھا وہ توقع ہی میں رہ گیا رزاقی بابو۔“ سوامی نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔ ”میں ساری ہندوستانی کی طرف سے یہ کہنے کے لئے آیا ہوں کہ آپ جس کثت سے گزر رہے ہیں جس ڈکھ کو جھیل رہے ہیں اس میں ہم سب آپ کے ساجھی ہیں۔ اسی لئے ہم لوگوں نے زرنے لیا ہے کہ اس بار ہولی نہیں منائی جائے گی۔“

”کیا مطلب؟“ رزاقی اور سوامی بری طرح چونکے۔ پنڈت کا کبھی یہی حال ہوا جیسے سوامی نے اس کی توقع کے برعکس بات کہہ دی ہو۔

”جی ہاں۔“ سوامی نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ ایسے غم سے دوچار ہیں رزاقی بابو جس کا سچا احساس صرف آپ ہی کو ہو سکتا ہے۔ اسی غم کی آغچ نے مجھے آپ سے آواگون اور دھرم علم کے بارے میں چار شہد کہنے پر مجبور کیا۔۔۔ پرنتو کیا یہ اچھا لگے گا کہ آپ کو رنج میں گھرا چھوڑ کر ہم لوگ ڈھول ڈھمکے سے اپنا من بھلاتے پھریں۔ آپ کے غم میں شریک ہونے کا عملی ثبوت دینے کا یہی ایک راستہ ہے کہ اس بار ہم ہولی کا تہوار نہ منائیں۔“

”ہرگز نہیں۔“ رزاقی نے درد سے پھٹے سر کو دونوں ہاتھوں میں جکڑے جکڑے نیم و آنکھوں سے سوامی کی جانب دیکھا۔ ”میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ آپ میری وجہ سے اپنا مذہبی تہوار ترک کر دیں۔“

”اگر آپ واقعی یہ چاہتے ہیں رزاقی بابو کہ ہم ہولی منائیں تو حسب سابق اس بار بھی آپ کو ہولی کے جشن میں پدھارنا ہوگا۔“

”میں ضرور آؤں گا۔“ رزاقی نے جیسے اس سے جان چھڑانا چاہی۔ اس کے سر کا درد اب اس کے جسم میں سرایت کرنے لگا تھا۔

”آپ نے میرا مان رکھ لیا رزاقی بابو۔ اس کے لئے بہت بہت دھنیو اد۔“ ایک دم سوامی کے

چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی تو پنڈت اس کی ساری چال سمجھ کر اسے حیرت اور تحسین سے دیکھنے لگا۔

”ہولی کی رسم کل کس وقت شروع ہوگی؟“ مونس نے سوامی کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا تے ہوئے پوچھا۔

”دس بجے دن مہاراج۔“ پنڈت نے ساری گفتگو میں پہلی بار قلمہ دیا۔

”رزاقی بابو پہنچ جائیں گے۔ اور کچھ؟“ مونس نے اپنی نشست سے کھڑا ہو گیا۔ سوامی سمجھ گیا کہ یہ ملاقات ختم ہونے کا اشارہ ہے۔ رزاقی سر ہاتھوں میں تھا سب بالکل خاموش بیٹھا تھا۔

”آپ کو بھی آنا ہے مونس مہاراج۔“ سوامی اور پنڈت بھی کھڑے ہو گئے۔ ”ہم لوگ آپ کی راہ نہاریں گے۔“ اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔

جواب میں مونس نے سر اثبات میں ہلانے پر ہی اکتفا کی۔ پنڈت اور سوامی نے باہر کی راہ لی تو مونس نے رزاقی کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

”تم ٹھیک تو ہو؟“

”ہاں۔۔۔“ رزاقی نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔ ”بس۔ سر بھاری سا ہو گیا ہے۔ عجیب وزنی وزنی سادرد محسوس ہو رہا ہے کنپٹیوں میں۔“

”چلو۔ اٹھو۔ اندر چل کر آرام کرو۔“ مونس نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور ساتھ لگائے ہوئے دوکانے کی جانب چل پڑا۔ رزاقی یوں قدم اٹھا رہا تھا جیسے پاؤں منوں بھاری ہو گئے ہوں۔

☆=====☆=====☆

کماری بی بی کے پاس بیٹھی راجیہ جنت اور رزاقی کی باتیں سن رہی تھی۔ بی بی نے اول تا آخر اسے ساری کہانی سنائی کہ کس طرح رزاقی اور راجیہ کی شادی ہوئی؟ کیسے ان دونوں کا پیار ایک دم انتہا کی جانب رواں ہوا اور جنت کی آمد کے بعد کیسے رزاقی کے لئے ساری دنیا سمٹ کر بیوی اور بیٹی تک محدود ہو گئی!

اس دوران کتنی ہی بار بی بی کی آنکھیں نم ہوئیں۔ بیلا پیچھے کھڑی بی بی کے کندھے دبا رہی تھی۔ بار بار اس کا دل بھی بھر آیا اور وہ کبھی ہونٹ پیچھ کر اور کبھی آہ بھر کر اپنے آنسو ضبط کرتی رہی۔ کماری درمیان میں چھوٹے چھوٹے سوال پوچھتی رہی جیسے اسے اس کہانی سے دلی لگاؤ ہو۔ بی بی خاموش ہوئی تو کماری کے چہرے پر افسردگی اور ملال کی تہیں اور گہری ہو گئیں۔ سر جھکائے وہ کسی سوچ میں ڈوبی بیٹھی رہی۔ بی بی نے اپنی آنکھیں پونچھیں اور بیلا کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

”بیلا۔ چائے ہی بنا لا چھوری۔ دیکھ تیری موسیٰ کیسی اداس ہو رہی ہے۔“

”اداس ہونے کی تو بات ہی ہے بی بی۔“ کماری نے ایک سرد آہ بھری۔ ”ایسی محبت اور ایسا

دکھ۔۔۔ بھگوان بھی کبھی کبھی بڑا نرم دیکھتا ہے۔ ایسے پیار کرنے والوں کو اس طرح جدا کرتے ہوئے نجانے اس کا من کیوں نہیں کاٹتا؟“ کماری کے لہجے میں شکایت کا عنصر نمایاں تھا۔ اسی وقت بیلا خاموشی سے چائے بنانے کے لئے کمرے سے نکل گئی۔

”اس کی وہی جانے کماری۔“ بی بی کا سر جھک گیا۔ ”جس دن سے راجیہ اور جنت گئی ہیں، میرا باؤ تو مسکراتا بھول گیا ہے۔ نجانے وہ کون سا عید کا دن ہو گا جب میں اس کے ہونٹوں پر پھر سے ہنسی کھیلتی دیکھوں گی۔“

”وہ دن بہت جلد آئے گا بی بی۔“ کماری نے بی بی کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔ ”میرا ٹوٹ و شواہ ہے کہ رزاتی بابو ایک دن پھر اپنی ہنسی کھیلتی دنیا میں لوٹ آئیں گے اور ایسا بہت جلد ہو گا۔ بہت جلد۔“

”خدا تمہاری زبان مبارک کرے کماری۔“ بی بی نے اسے حسرت سے دیکھا۔ ”بظاہر تو وہ اپنے راستے سے بھٹک گیا ہے۔“

”آپ ایسا شاید اس وجہ سے کہہ رہی ہیں کہ رزاتی بابو نے مسجد کو۔۔۔“

”ہاں۔۔۔“ بی بی نے اس کی بات آہستہ سے اچک لی۔ ”یہ اچھا نہیں ہو گا کہ اس کا ایمان خدا کی رحمت سے اٹھ گیا ہے۔“

”مگر میرا دل کچھ اور کہتا ہے بی بی۔“ کماری نے محبت سے بی بی کا ہاتھ تھپتھپایا۔

”کیا؟“ بی بی نے آنکھیں اس کی طرف اٹھائیں۔

”رزاتی بابو کی یہ حرکت ان کے اپنے خدا پر و شواہ اور اس کے ساتھ تعلق کی مضبوطی کو ظاہر کرتی ہے بی بی۔“

”وہ کیسے؟“ بی بی نے اسے حیرت سے دیکھا۔

”بی بی۔۔۔“ کماری نے اسے واری واری جاتی نظروں سے دیکھا۔ ”تو کیسی انہونی باتیں کرتی ہے ری۔ ایسی باتیں جو من کو مہلتیں دے دے کہ پر مر رہی ہیں۔ غم کی دھوپ میں سایہ بن جاتی ہیں۔ تو نے یہ سب کہاں سے سنا اور سیکھا ری؟“ بی بی کا اندر جیسے شاداب ہو گیا تھا۔

”کہیں سے نہیں بی بی۔“ کماری ہنسی۔ ”جیون اور دھرم نے یہ سب بتایا ہے مجھے۔ سکھایا ہے مجھے۔ میں نے دنیا کے بڑے بڑے سب دھرموں کا مطالعہ کیا ہے بی بی۔ اسلام کو تو میں بہت بھیتر تک جانتی ہوں۔ آپ کہیں تو میں آپ کو پوری نماز سنا سکتی ہوں۔ دعائے قنوت بھی۔“

”دعائے قنوت بھی؟“ بی بی نے اسے حیرت سے دیکھا۔ ”وہ دعائے قنوت جو ہمارے کئی مولویوں کو بھی یاد نہیں ہوتی۔“

”ہاں بی بی۔“ کماری پھر ہنسی۔ ”وہی دعائے قنوت۔ سناؤں؟“

”نہیں۔“ بی بی نے اسے محبت سے دیکھا۔ ”مجھے یقین ہے تو سچ کہہ رہی ہے۔“

اسی وقت بیلا چائے کی ٹرائی دھکیلتی اندر آئی۔ کماری نے ہولے سے بات کا رخ بدلا۔ ”بی بی! یہ بتائیے راجیہ کیا کہہ کر رزاتی بابو کو بلایا کرتی تھیں؟“

”صاحب۔۔۔“ بی بی نے ایک دم مگر دھک سے جواب دیا۔ ”صاحب کہہ کر بلایا کرتی تھی وہ باؤ کو۔ کبھی کبھی باؤ بھی کہتی تھی مگر عام طور پر صاحب ہی کہا کرتی تھی۔“

تب تک بیلا ان کے قریب آ گئی۔ اس نے چائے بنا کر بی بی اور کماری کو دی۔ بسکٹ اور کیک کی پلیٹ سامنے رکھی اور خود پھر بی بی کے پیچھے آن کھڑی ہوئی۔

”بی بی۔“ ایک ملازمہ نے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔ ”مونس باپو ملنے آرہے ہیں۔“

”تو بلاؤ انہیں۔ یہاں کس سے پردہ ہے؟“ بی بی نے کہا تو کماری نے چائے کا کپ تپائی پر رکھا اور ساڑھی کا پلو یوں گرالیا کہ اس کا چہرہ دیکھنا ممکن نہ رہا۔ بی بی کو علم تھا کہ وہ مردوں سے پردہ کرتی ہے اس لئے مسکرا کر خاموش ہو رہی۔ اتنے میں مونس نے کمرے میں قدم رکھا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ وہ کماری کے سامنے آ رہا تھا۔ بیلا کا چہرہ ان گنت رنگوں کی آمیزگاہ بن گیا۔ وہ چاہتی تھی کہ کماری اس کے مونس باپو کو دیکھے۔ اسے یقین تھا کہ کماری نے اپنے گھونگھٹ نما پردے کی اوٹ سے ضرور مونس کو دیکھ لیا ہوگا اور اس کا گمان سچ تھا۔ کماری نے مونس کو ذرا سی گردن گھما کر سر سے پاؤں تک دیکھا اور اس کے چہرے پر تحسین کی خوشبو بکھر گئی۔

”سلام بی بی۔“ مونس کمرے میں داخل ہوا اور کسی کو چہرہ ساڑھی کے آئینل میں چھپائے بیٹھا دیکھ کر وہیں رک گیا۔

”آؤ مونس بیٹا آؤ۔ رک کیوں گئے؟“ بی بی نے جلدی سے کہا۔ پھر اسے لپٹی مٹی کماری کی طرف دیکھتے پا کر بولی۔ ”اچھا اچھا۔ تو تو ان سے جھگڑا ہے۔ یہ بیلا کی مٹی ہے۔ کماری نے ذرا مردوں سے پردہ کرتی ہیں۔“

”جی۔“ مونس نے بیلا کی جانب بڑی سرسری نظر سے دیکھ کر کماری سے کہا۔ ”آداب۔“ پھر اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر بی بی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”بی بی۔ رزاقی کی طبیعت ذرا خراب ہے۔ میں اسے اس کے کمرے میں چھوڑ کر آ رہا ہوں۔ نیند اور سردی دوا دے دی ہے۔ وہ سو گیا ہے۔ بیلا! ذرا اس کا خیال رکھنا اور جونہی وہ جاگے فوراً مجھے اطلاع کر دینا۔“

”جی۔“ بیلا نے اسے بیباکی سے گھورتے ہوئے جواب دیا۔

”کیا ہوا باؤ کو؟“ بی بی کے ہاتھ میں کپ کپکپا کر رہ گیا۔

”کچھ نہیں بی بی۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ سر میں درد تھا جو بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے بتایا ناں کہ اسے دوا دے کر سلا دیا ہے۔“

”ہائے ہائے۔“ بی بی اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئی۔ ”ڈاکٹر کو بلا لینا تھا بیٹا۔“

”ضرورت نہیں ہے بی بی۔ آپ زیادہ پریشان نہ ہوں۔ وہ جاگے گا تو ٹھیک ہو چکا ہوگا۔ سردی کون سی بڑی بیماری ہے۔“ مونس نے اسے تسلی دی۔

”خدا میرے باؤ کو تھی ہوا نہ لگنے دے۔ اپنی امان میں رکھے۔ نبی پاک کی پناہ میں رکھے۔“ بی

بی کے ہونٹوں پر دعائیں سجنے لگیں۔

بیلا نے ایک نظر کماری کو دیکھا۔ پھر مونس پر ایک ترجیحی نگاہ ڈال کر باہر نکل گئی۔ اس کا رخ رزاقی کے کمرے کی جانب تھا۔ اسی وقت کماری اٹھ گئی۔

”میں چلتی ہوں بی بی۔ پھر آؤں گی۔ رزاقی باپو کے بارے میں فکر نہ کیا کریں۔ وہ بہت جلد اچھے ہو جائیں گے۔ میں بھی ان کے لئے پرارتھنا کروں گی۔ نمستے۔“ کہہ کر اس نے چھڑی سنبھالی۔ پھر چہرے اور جسم کو مکمل طور پر ساڑھی میں لپیٹے سیٹھے سامنے کے دروازے سے ٹھک ٹھک کرتی چھڑی کے سہارے باہر نکل گئی۔

مونس کو اس کے لنگڑا کر چلنے پر حیرت ہوئی اور افسوس بھی۔ تاہم اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ وہ اس کے جانے کے بعد آگے بڑھا اور بی بی کے قریب آ بیٹھا جس کے ہونٹ اب بھی رزاقی کے لئے مجھوے دعا تھے۔ ذرا دیر بعد بی بی نے زیر لب اپنے رب کے حضور عرضی پیش کی۔ پھر چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مونس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”چائے بناؤں تمہارے لئے؟“

”ہوں۔“ مونس نے اثبات میں سر ہلایا۔ بی بی اس کے لئے چائے بنانے لگی۔ ”یہ بیلا کی مٹی“ عمر کی تو اتنی نہیں گئی بی بی۔“

”تم نے اسے گھونگھٹ میں بھی دیکھا؟“ بی بی مسکرائی۔

”اس کے صرف ہاتھ نظر پڑے ہیں بی بی۔“ مونس جھینپ گیا۔

”بس بیٹا۔ بعض رشتے عمر میں برابر بھی تو ہوتے ہیں۔ کماری بیلا سے پندرہ بیس برس بڑی ہے۔“

”نہیں بی بی۔“ مونس کے لہجے میں حیرت تھی۔ ”مجھے نہیں لگتا کہ وہ چالیس برس کی ہوگی۔“

”تو پھر؟“ بی بی نے چائے کا کپ اس کے آگے سرکایا۔ ”کیا وہ بیس برس کی ہے؟“

”بیس کی نہیں تو۔۔۔“ مونس سوچ میں پڑ گیا۔

”اچھا وہ جتنی عمر کی بھی ہے ہمیں اس سے کیا لینا دینا۔ تم یہ بتاؤ کہ باؤ کی طبیعت اچانک خراب کیسے ہوئی؟“

”وہ جو دوا کھارہا تھا نیند کی۔ سب اسی کے سائڈ ایفیکٹس ہیں بی بی۔“ مونس، سوامی سے رزاقی کی آج کی ملاقات گول کر گیا۔ بی بی کی ٹینشن بڑھ جاتی اور یہ وہ چاہتا نہیں تھا۔

”اور وہ پنڈت آیا تھا آج؟“ ایک دم بی بی نے پوچھا۔

”ہاں۔“ مونس نے چائے کا گھونٹ لے کر کپ واپس تپائی پر رکھا۔ ”رزاقی نے کل ہولی کے

ہو۔ پتھروں کی بارش میں بھی وہ مسکراتے رہے کہ شرع پوری کرنے کے لئے ان کے دوست شبلی نے گلاب کا ایک پھول آہستہ سے انہیں کھینچ مارا۔ حسین کے ہونٹوں سے چیخ نکل گئی جیسے کسی نے انہیں خنجر سے چیر ڈالا ہو۔ شبلی نے پوچھا۔ ”حسین! لوگوں نے تمہیں پتھر مار کر لہو لہان کر دیا، تم مسکراتے رہے۔ میں نے پھول مارا تو تم چیخ اٹھے۔ کیوں؟“ حسین نے دلفگار لہجے میں جواب دیا۔ ”شبلی۔ لوگ تو ناواقف ہیں۔ نا آشنا ہیں۔ نامحرم ہیں۔ کچھ نہیں جانتے۔ تم تو محرم راز ہو۔ میرے دوست ہو۔ سب جانتے ہو۔ تمہارا پھول پتھر سے زیادہ زخم دینے والا ہے۔“ مونس کا لہجہ پُر غم ہو گیا۔ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا اور آواز کی تھر تھراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ بی بی سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔

”بس بی بی۔“ کچھ دیر بعد مونس نے لرزتی آواز میں کہا۔ ”ہمارے رزاقی کا بھی یہی حال ہوا ہے۔ وہ اپنے خدا کا مارا ہوا پھول برداشت نہیں کر سکا۔ اپنے سب سے بڑے دوست اپنے محسن اپنے محرم کا پھول اسے جو زخم دے گیا ہے اس کی اذیت سے وہ چیخ اٹھا ہے۔ ہم لوگ اس کی چیخ کو اس کی گستاخی سمجھ رہے ہیں جبکہ اس کا خدا اسے کیا سمجھ رہا ہے اسے کیا سمجھانا چاہتا ہے؟ کوئی نہیں جانتا۔ جان ہی نہیں سکتا۔ یہی صوح کر میں نے اس کے سارے عمل کے آخر میں اسے آنے والے وقت کے حوالے کر دیا تھا بی بی۔ میں اس کے اور خدا کے درمیان آنے والا کون ہوتا ہوں؟ ہاں اسے اکیلا بھی اس لئے نہیں چھوڑ سکتا کہ وہ اندھیرے میں بھی میرے سامنے کے ساتھ کا عادی ہے۔ ایک دن آئے گا بی بی جب وہ سنہل جائے گا۔ جب اندھیرا چھٹ جائے گا۔ جب زخم بھر جائے گا۔ جب وہ لوٹ آئے گا۔ جب۔۔۔ جب۔۔۔“ مونس کی آواز ڈوب گئی۔ بھیگ کر اتنی بھاری ہو گئی کہ بی بی کو صرف اس کی سسکیاں سنائی دیں۔ دونوں سر جھکائے دل کا غبار آنکھوں کے رستے باہر نکالتے رہے۔

کتنی ہی دیر گزر گئی۔ پھر انہوں نے خود کو سنبھالا اور تھری ہوئی آنکھوں، ٹھہرے ہوئے دل کے ساتھ گزرتے وقت کی چاپ سننے لگے۔

”ایسی باتیں کوئی ان پڑھ اور بے علم نہیں کر سکتا۔ لگتا ہے بیلا کی موسیٰ خاصی پڑھی لکھی ہے۔“ مونس نے سنہلنے کے کچھ دیر بعد بات چھیڑی۔

”بتا رہی تھی کہ اس نے دلی یونیورسٹی سے گریجویشن کیا ہے۔“

”اس کے باوجود پردے کا یہ عالم ہے کہ۔۔۔“

”بیٹا۔ وہ مذہب پر بڑی کچی طرح کار بند ہے۔ تجھے مزے کی بات بتاؤں، کہہ رہی تھی کہ اسے ہماری ساری نمازی یاد ہے۔ دعائے قنوت بھی۔“

”اچھا۔“ مونس حیرت سے بولا۔ ”دعائے قنوت تو ہمارے ملک کے کرتادھرتاؤں کو بھی نہیں آتی

جشن میں جانے کی حامی بھری ہے۔“

”اچھا کیا بیٹا۔“ بی بی نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”ہمیں ان لوگوں کا خیال رکھنا چاہئے۔ آج تک ہم نے انہیں کسی جائز بات پر انکار نہیں کیا، پھر اب کیوں؟“

جواب میں مونس سر ہلا کر رہ گیا۔ بی بی نے اپنے لئے دوسرا کپ بنایا۔ پہلا تو شربت ہو چکا تھا۔ پھر چائے تم ہونے تک خاموش رہی۔

”کل باؤ کے ساتھ ہی جانا بیٹا۔“ بی بی نے خالی کپ تپائی پر رکھا۔

”اور کیا اسے اکیلا جانے دوں گا بی بی۔ آپ بھی کمال کرتی ہیں؟“ مونس ہنسا۔

”وہ تو میں جانتی ہوں کہ تو اُسے کبھی اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ بس ایسے ہی منہ سے نکل گیا۔“ بی بی ہولے سے بولی پھر جیسے اسے کچھ یاد آ گیا۔ ”ارے ہاں۔ آج کماری نے بڑی عجیب بات کہی مونس۔“

”وہ کیا؟“ مونس نے دلچسپی سے پوچھا۔

جواب میں بی بی نے اسے اپنے لفظوں میں وہ ساری گفتگو سنائی جو تھوڑی دیر پہلے اس کی کماری سے ہوئی تھی۔

”کہتی تو وہ ٹھیک ہے بی بی۔“ مونس، کماری کی باتوں سے خاصا متاثر نظر آ رہا تھا۔ ”انسان جس سے جتنا قریب ہوتا ہے اس کی بات اتنی ہی زیادہ سمجھ اور دکھ دیتی ہے۔“

”یہ تو ہے بیٹا۔“ بی بی نے کہا۔

”حسین علاج تھے ناں بی بی!“

”وہی انا الحق والے؟“ بی بی نے اشتیاق سے پوچھا۔

”ہاں وہی۔“ مونس کو علم تھا کہ بی بی صوفیوں اور اللہ والوں کی کتابیں بڑے شوق سے پڑھتی ہے۔ ”انہیں جب سولی دی گئی ناں بی بی تو سارا شہر انہیں ملامت کرنے پتھر مارنے اور ان کی موت کا منظر دیکھنے کے لئے جمع تھا۔“ مونس نے دُکھے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا تو بی بی ہمہ تن گوش ہو گئی۔ یوں جیسے اس کے ذرا سا حرکت کرنے پر مونس ڈسٹرب ہو جائے گا۔

”اس ہزاروں کے مجمعے میں حسین کے دوست شبلی بھی موجود تھے۔ حسین کو سولی دی گئی تو سب سے پہلے ان کے ہاتھ کاٹے گئے۔ انہوں نے اپنا لہو چہرے پر مل لیا اور کہا۔“ اپنے خالق کے حضور جا رہا ہوں اپنے خون سے وضو کر لوں۔ شاید اسے پسند آ جاؤں۔“ پھر ان کے پاؤں قطع کئے گئے تو فرمایا۔“ ان پیروں سے چل کر میں کب اس خالق تک پہنچ سکتا تھا جو جسم کے تصور سے آزاد ہے۔ اچھا ہوا، چلنے کا یہ ذریعہ چھن گیا۔“ اس کے بعد فقیہ شہر نے انہیں سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ لوگوں نے حسین کو پتھر مارنا شروع کئے۔ حسین سر سے پاؤں تک زخم زخم ہو گئے۔ بدن کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں سے خون نہ بہہ رہا

”اب درد تو نہیں ہے۔ بس سر روزنی وزنی سا ہے۔“

”اگر تم مان جاؤ تو ڈاکٹر کو بلا ہی لیں۔“

”تم بھی بی بی کی طرح۔۔۔“ رزاتی نے کہنا چاہا پھر ہونٹ دبایا۔

”ہاں ہاں کہو ناں تم بھی بی بی کی طرح پاگل ہو۔“ بی بی نے محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

”بیٹا۔ مائیں پاگل ہی ہوتی ہیں اسی لئے تو اولاد کا دکھ سہہ نہیں پاتیں۔ اگر ہوشمند ہوں تو دل کو سمجھا بچھا کروقت گزار لیا کریں۔“

”یہ بات نہیں بی بی۔“ رزاتی جھل سا ہو گیا۔ ”میرا مطلب تھا کہ۔۔۔“

”تیرا جو بھی مطلب ہے میں سمجھتی ہوں۔ دیکھ تیرے ہاتھ کیسے لرز رہے ہیں کمزوری سے۔ نہ تو ٹھیک طرح کھاتا پیتا ہے نہ سوتا ہے۔ طبیعت کیسے ٹھیک ہوگی؟ بیلا۔۔۔“ بی بی نے پلٹ کر بستر کی پانچٹی کھڑی بیلا کی طرف دیکھا۔ ”باؤ نے صبح ناشتہ کیا تھا؟“

”جی ہاں۔“ بیلا نے جلدی سے جواب دیا۔ ”میں نے اپنے سامنے کرایا تھا۔“

”بیلا اپنا کام ذمے داری سے کرتی ہے بی بی۔ اس کی طرف سے آپ بے فکر ہو جائیں۔ اصل مسئلہ ہے آپ کے پوتے کا جو جمنیشن ہاؤس سے باہر نہیں آ رہا۔“ مونس نے کہا اور بیلا کی جانب دیکھا جو اس کی بات پر ایک دم کھل اٹھی تھی۔

”مونس! رزاتی نے آہ سے کہا۔ ”میں خود کو دھیرے دھیرے سمجھا رہا ہوں۔ بہت حد تک ٹھیک اور دل سے کا زہر دل میں اتار چکا ہوں مگر پھر بھی یار۔ کچھ وقت تو لگے گا ناں کسی ایک جگہ ٹھہر جانے کے لئے۔“

”اچھا بس۔ کیسی بد فال منہ سے نکال رہا ہے تو۔“ بی بی نے اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ ”مونس بیٹا۔ اگر ڈاکٹر کو نہیں بلواتا تو اسے کوئی بخار کی دوا دو۔“

”ہاں۔ یہ ہو سکتا ہے۔“ مونس نے بیلا کی طرف دیکھا۔ ”تھرمامیٹر کہاں ہے؟“

بیلا جلدی سے آگے بڑھی۔ بستر کے سرہانے پڑی تپائی کے دراز سے تھرمامیٹر نکال کر مونس کو تھمایا اور اپنی جگہ واپس چلی گئی۔ مونس نے رزاتی کا ٹیپر چیک کیا اور حیرت زدہ رہ گیا۔ ٹیپر بیچر بالکل نارمل تھا۔ اس نے اپنا شک دور کرنے کے لئے دوبارہ تھرمامیٹر رزاتی کی زبان تلے دے دیا مگر بخار ہوتا تو ظاہر ہوتا۔ پیشانی گرم مگر بخار ندارد۔ وہ الجھن میں پڑ گیا۔

”کیوں پریشان ہو رہے ہو؟“ رزاتی نے اس کی جانب دیکھا۔ ”میں کہہ تو رہا ہوں کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔“

”عجیب سی بات ہے۔“ مونس نے کہا اور بی بی کو بتایا کہ رزاتی کو بخار نہیں ہے۔ وہ بھی اچنبھے

بی بی۔ انتخابات کے دنوں میں الیکشن کمیشن کے دفاتر میں نام نہاد انٹرویو کے دوران جب ان سیاست دانوں سے دین اسلام کے بارے میں سوالات کئے جاتے ہیں تو کبھی کبھار دعائے قنوت کا ذکر بھی آتا ہے اور یہ تو آپ نے بھی اخباروں میں پڑھا ہوگا کہ سو میں سے ایک سو ایک کو دعائے قنوت نہیں آتی۔“

”اسی پر تو مجھے بھی حیرت ہے مونس۔“ بی بی ہنسی۔ ”ہمارے دین کا ایسا اہم رکن ہے جو ہمیں تو یاد نہیں اور کماری کو ساری نماز کے ساتھ وہ بھی یاد ہے۔“

”یہ خالی خولی شرم کی نہیں سوچنے کی بات بھی ہے بی بی۔ آخر ہم مذہب سے اتنی دوری کا راستہ کیوں اختیار کر رہے ہیں؟“

اسی وقت بیلا دروازے میں نمودار ہوئی۔

”مونس بابو۔ رزاتی بابو جاگ گئے۔“

”اتنی جلدی۔“ مونس اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

”جی۔“ بیلا نے کہا۔ ”آپ کو بلا رہے ہیں۔“

”چلو۔“ مونس چل پڑا۔

”میں بھی چلتی ہوں۔“ بی بی نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی اور اس کے پیچھے پیچھے کمرے سے نکل آئی۔

تینوں آگے پیچھے چلتے ہوئے رزاتی کے کمرے میں داخل ہوئے۔ بیلا نے رزاتی کے کمرے پر کمرے کی کھڑکیاں کھول کر پردے ہٹا دیے تھے۔ باہر درخت کھلے فضا کھیت تھیں اور چمک تھیں بہار دکھارہا تھا۔ رزاتی اپنے بستر میں کھل گھٹنوں پر ڈالے ٹانگیں پسارے بیٹھا ایک ہاتھ سے ہولے ہولے اپنی پیشانی مسل رہا تھا۔

”کیا بات ہے۔ اتنی جلدی اٹھ گئے؟“ مونس اس کے قریب پہنچا اور پاس پڑی کرسی پر ٹک گیا۔

”ہاں۔ بس ایک دم نیند اچاٹ ہو گئی۔“ رزاتی نے آنکھیں کھولیں۔

”بیٹا۔ اگر طبیعت زیادہ خراب ہے تو ڈاکٹر کو بلا لوں؟“ بی بی نے بستر کی پٹی پر بیٹھ کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا جو تپ رہی تھی۔ ”ارے۔ تمہیں تو بخار لگتا ہے۔“

”دیکھو۔“ مونس نے رزاتی کی کلائی تھام لی۔ ”ہاتھ تو گرم نہیں ہیں۔“ وہ بڑبڑایا۔

”دیکھو تو مونس۔ آنکھیں کیسی سرخ ہو رہی ہیں۔“ بی بی نے رزاتی کے چہرے پر پریشانی کے عالم میں ہاتھ پھیرا۔ ”میں تو کہتی ہوں ڈاکٹر کو بلا ہی لو۔“

”نہیں بی بی۔ آپ یونہی فکر مند ہو رہی ہیں۔ معمولی سی حرارت ہے۔ ٹھیک ہو جائے گی۔“

رزاتی نے بی بی کی جانب دیکھ کر جیسے اسے تسلی دی۔

”سردرد کا کیا حال ہے اب؟“ مونس نے پوچھا۔

”میں سمجھا نہیں تمہاری بات۔“ مونس نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”میرا مطلب یہ ہے کہ کیا تم اس پر یقین رکھتے ہو کہ سوامی یا کوئی بھی ہندو تانترا کسی انسان کی

روح کو واپس اس دنیا میں لاسکتا ہے؟“

”بالکل بکواس ہے یہ۔“ مونس نے سختی سے کہا۔ ”ہمارے دین میں ایسی خرافات کے بارے میں سوچنا بھی جائز نہیں۔ وہ تو یہ بھی کہہ رہا تھا کہ روح کے بعد وہ مرنے والے جسم کو بھی سانس لاسکتا ہے۔ زندہ سلامت بولتا چلتا جسم۔ تو کیا ہمیں اس پر بھی یقین کر لینا چاہئے۔“

”نہیں۔“ رزاتی نے دھیرے سے کہا۔ ”میں یہ نہیں کہہ رہا۔ تاہم یہ بات تو اپنی جگہ طے ہے کہ ہندو ازم میں ایسی شعبہ باز یوں کی بہت گنجائش ہے۔“

”اب تم نے خود ہی بات کو اس کے منطقی انجام تک پہنچا دیا ہے تو مزید بحث کا رستہ خود بخود بند ہو گیا۔ ہندو ازم محض شعبہ بازی ہی ہے اور شعبہ دوز پر سنجیدہ ہو جانا حماقت کے سوا اور کیا ہے؟“

”ہوں۔۔۔“ رزاتی نے پلکیں موند لیں اور مونس اس کے چہرے پر نگاہیں جمائے کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس کا دل کسی انجانے خدشے سے ہول رہا تھا۔ نجائے کیوں؟

☆=====☆=====☆

ہندو پستی میں ایک کمرے کے مندر کو کسی پٹھان کی سائیکل کی طرح سجائے کی بھرپور کوشش کی گئی تھی۔ بستی کا گھر صاف تھرا اور دھلا دھلا یا لگ رہا تھا۔ مندر تک آنے والے وسیع و فراخ میدان میں چاروں جانب چونا ڈالا گیا تھا۔ ہر طرف جھنڈیوں، جھاروں اور رنگوں کے سفوف سے بہار کا سماں پیدا کیا گیا تھا۔

رزاتی اور مونس گاڑی سے اترے۔ نور گاڑی آگے بڑھالے گیا۔ اس نے گاڑی ایک درخت کے نیچے پارک کی اور سگریٹ سلگا کر سیٹ کی پشت سے نکال گیا۔ اب اس کی عقابی نگاہیں ادھر اُکھا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔

دونوں کے گاڑی سے اترتے ہی مندر سے کنواری اور شادی شدہ عورتوں کا ایک چھوٹا سا جھوم نکلا اور مندر کے آگے کھلے میدانی حصے میں دونوں جانب قطار بنا کر کھڑا ہو گیا۔ ان کے ہاتھوں میں چاندی کی تھالیاں تھیں جن سے وہ گلاب کی پتیوں اور رزاتی اور مونس پر پھونکا رہی تھیں۔ مندر کی سیڑھیوں سے اتر کر سوامی پنڈت اور اس کے چاروں چیلوں نے ان کا استقبال کیا۔

”جے ہو مہاراج کی۔“ سوامی نے ہاتھ جوڑے تو پنڈت اور اس کے چیلے بھی سراپا یتیم بن گئے۔ ”میں دل سے آپ کا آج بھاری ہوں رزاتی بابو کہ آپ مونس بابو کے ساتھ یہاں پدھارے۔“ اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری۔

میں پڑ گئی۔ بالآخر بات بیلہ پر آ کر رکی جس نے پوچھا۔

”بی بی۔ میں کچھ کہوں؟“

”کہو۔“ بی بی نے اسے اجازت دی تو مونس اور رزاتی بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”میرا خیال ہے رزاتی بابو کا شریر بہت کمزور ہو گیا ہے جس کی وجہ سے ان کی یہ حالت ہو رہی ہے۔“

”یہ کھانا پیتا بھی تو کچھ نہیں ناں۔“ بی بی نے شکوے کے انداز میں کہا۔

”اگر میں ان کے لئے نیچنی بنا کر لاؤں تو؟“ بیلہ نے اجازت طلب نگاہوں سے مونس کی طرف دیکھا۔

”بہت اچھی بات ہے۔“ مونس اور بی بی نے فوراً کہا۔

”نیچنی۔“ رزاتی نے منہ بنایا۔

”نیچنی کی بات ہے کونین کی نہیں کہ یوں منہ بسور رہے ہو۔“ مونس نے اسے ڈانٹا۔ ”کوئی خرخرہ نہیں چلے گا۔۔۔ بیلہ۔ جاؤ نیچنی بنا کر لاؤ اور روزانہ دو وقت نیچنی کا پیالہ اس کے کھانے پینے کے مینو میں شامل کر دو۔ اب تم اسے نیچنی کیسے پلاتی ہو یہ تم پر ہے۔“

”اس کی آپ فکر نہ کریں مونس بابو۔ وہ میرا کام ہے۔“ بیلہ مسکراتی پھر کھلکھلا کر ہنسی اور کمرے سے نکل گئی۔ رزاتی نے منہ نہ بنایا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ جائگہ تھا کہ ان میں سے کسی کے سامنے اس کی ہاں گلے والی نہیں خاص طور پر بیلہ کے آگے۔ بیلہ کے جانے کے بعد بی بی نے مونس اور رزاتی کو کھٹکھٹو کا موقع دیا اور نماز کا کہہ کر رخصت ہو گئی۔

”لیٹ جاؤ۔“ مونس نے اس کا تکیہ درست کرتے ہوئے کہا۔ رزاتی نے بالکل خندہ کی اور اچھے بچوں کی طرح لیٹ گیا۔ مونس نے اس کے جسم پر کبیل ٹھیک کیا اور رزاتی کے پلکیں موند لینے پر کرسی سنبھالی۔ ”یہ سر درد تمہیں اچانک کیسے لاحق ہو گیا؟“

”پتہ نہیں۔ بس اس سوامی کے بچے سے آنکھیں ملنے کی دیر ہوئی کہ میرا سر۔۔۔“

”یعنی اس سے پہلے تم بالکل ٹھیک تھے؟“ مونس چونکا۔

”تمہارے سامنے ہی تھا سب کچھ۔“ رزاتی نے ماتھا مسلتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں اچھا بھلا بیٹھا تھا۔“

”ہوں۔۔۔“ مونس کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں۔ وہ سوچ میں ڈوب گیا۔

”اچھا مونس۔“ اچانک رزاتی نے آنکھیں کھولیں اور اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔ ”یہ

جو سوامی روح کے بارے میں بکواس کر رہا تھا اس کے لئے تمہارا کیا خیال ہے؟“

اچانک اسے لگا کہ رزاتی نے بے چینی سے پہلو بدلا ہے۔ وہ اس کی جانب متوجہ ہوا۔ رزاتی مردوں اور عورتوں کے ہولی کے رنگوں میں رقصاں ہجوم میں ایک خاص جگہ نگاہیں جمائے کرسی سے ذرا سا آگے ہو کر کسی کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ مونس کچھ کہتا، رزاتی نے بیتابی سے پوچھا۔

”مونس۔ تم نے کچھ دیکھا؟“

”کہاں؟“ مونس نے اس کی نظروں کا تعاقب کرنے کی کوشش کی۔

”وہ۔۔۔“ رزاتی نے ہجوم کی جانب انگلی سے اشارہ کیا۔ ”وہاں۔۔۔“ وہ اپنی نشست سے تھوڑا سا اٹھ گیا۔

مونس نے رزاتی کی بتائی ہوئی جگہ پر نظر غور سے دیکھا۔ ”کیا ہے وہاں؟“

”وہ۔۔۔ سفید ساڑھی والی عورت۔۔۔“ رزاتی کے لہجے میں بے قراری اتر آئی۔

اسی وقت پنڈت نے کچھ کہنا چاہا کہ سوامی نے ہاتھ اٹھا کر اسے یوں خونخوار نظروں سے دیکھا کہ اس کی سٹی گم ہو گئی۔ چیلے تو پہلے ہی ہر چیز سے لاپرواہ ان عورتوں کو گھورنے میں مصروف تھے جن کی ساڑھیاں اور کرتے رنگوں کی پھوار نے جسم سے چپکا کر انہیں تقریباً عریاں کر دیا تھا اس لئے انہیں متنبہ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ سوامی نے ہوسٹ کھینچے اور نگاہیں اسی طرف جمادیں جس سمت رزاتی، مونس کی توجہ دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”وہ۔۔۔“ مونس کی نظر نے بلا آخر کسی مورنی کی طرح دھیرے دھیرے چمک پھیریاں لیتی ہوئی کے رنگوں سے لبریز سفید ساڑھی میں ملبوس اس عورت کے ہوشربا جسم کو تاک لیا، جس کی لمبی زلفوں نے اس کے آدھے سے زیادہ چہرے کو چھپا رکھا تھا مگر۔۔۔ حیرت سے مونس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے ایک پل کو رزاتی کی جانب دیکھا جس کے چہرے پر حیرانی سے زیادہ بے یقینی اور یقین کے رنگ پھیل اور سمٹ رہے تھے پھر تیزی سے دوبارہ اس جانب نگاہ ڈالی جہاں وہ عورت اب بھی مستی کے عالم میں مجور قص تھی۔ آہستہ آہستہ وہ مردوں اور عورتوں کے ہجوم میں گھری مندر کی سیڑھیوں کی جانب بڑھ رہی تھی۔ جوں جوں وہ قریب آ رہی تھی رزاتی اور مونس کا حال دگرگوں ہوتا جا رہا تھا۔ ان کے دل سینے میں دھڑ دھڑکی صدا میں دے رہے تھے جیسے پسلیاں توڑ کر باہر آنے کو جھل رہے ہوں۔ کنپٹیوں میں سنسنائیں گونج رہی تھیں۔ دوران خون رنگوں میں تیز ہوتا جا رہا تھا اور ہوش و حواس ان کا ساتھ چھوڑنے کی تیاری کر رہے تھے۔

وہ عورت۔۔۔ بیس پچیس عورتوں اور لڑکیوں میں گھری اب سیڑھیوں سے تقریباً بارہ چودہ فٹ دور ہلکورے لے رہی تھی۔ ایک بار جب اس نے زلفوں کو جھٹکے سے چہرے سے ہٹایا تو ان دونوں کے

جواب میں رزاتی اور مونس نے محض سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ مندر کی سیڑھیاں چڑھ کر جو چھوٹا سا برآمدہ نما حصہ تھا وہاں دو نقش کرسیاں رکھی گئی تھیں سوامی نے ان کی جانب اشارہ کیا۔

”براہئے مہاراج۔“

رزاتی اور مونس ان پر بیٹھ گئے تو سوامی نے پنڈت کے ہاتھوں پر دھرے خوان سے کپڑا ہٹایا۔ اس میں ایک نارمل گیندے کے پھول اور سیندور پڑا تھا۔ سوامی نے سیندور کا ٹیکا پہلے اپنے ماتھے پر لگایا پھر پنڈت کی پیشانی پر۔ گیندے کے پھولوں کو چھو کر ہاتھوں کو چوما۔ اس کے بعد نارمل اٹھا کر مندر کے دروازے کے عین سامنے سیڑھیوں سے نیچے زمین پر پھوڑ دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہاں موجود مردوں اور عورتوں نے ”جے کرشنا۔ جے ماتا۔ جے سیتامیا“ کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ ڈھول تاشے پیٹے جانے لگے اور مردوزن ایک دوسرے پر رنگ بھینکنے لگے۔ ہولی کا جشن باقاعدہ شروع ہو چکا تھا۔ ڈانڈیا رقص کے ساتھ مندر کے سامنے کھلے میدان میں لڑکیاں، نوجوان بوڑھے اور جوان سب ناچ رہے تھے۔ نعرے لگا رہے تھے۔ ایک دوسرے پر رنگوں کی پچکاریاں مار رہے تھے۔ ان کے جسم اور چہرے نیلے پیلے لال رنگوں سے گل و گلزار ہو گئے۔ رزاتی اور مونس اپنے سامنے بیس پچیس فٹ کی دوری سے یہ سارا تماشا دیکھتے ہوئے خاموش بیٹھے تھے۔

مونس کو اس ہولی ہیلے ہجوم میں نندی بھی نظر آئی اور بیلا بھی۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ تھیں اور دوسری عورتوں کی طرح ان کی ساڑھیاں اور جسم بھی رنگوں میں گم ہو چکے تھے۔ نندہ کا ان دونوں کے ارد گرد پروانہ وار چکر کھا رہا تھا۔ وہ بار بار ان پر رنگوں کی پچکاری مارتا اور ”ہولی آئی رے“ کا نعرہ لگاتا ہوا ان کے ساتھ ناچنے لگتا۔ تاہم کچھ دیر بعد کچھ عورتوں اور مردوں نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا اور وہ ان کے ساتھ دوسری جانب نکل گیا۔

بیلا نے مونس کی جانب دیکھ کر وہاں انداز میں پھیری لی اور یوں رقص کرتی ہوئی آگے چلی آئی جیسے بھگوان کے سامنے نرت پیش کر رہی ہو۔ چند لمحوں بعد جب نندی اس کے قریب پہنچی تو سوامی کی طرح اسے بھی یقین ہو گیا کہ بیلا وہاں صرف اور صرف مونس کے لئے بے خود ہوئی جا رہی ہے۔ نندی اسے بڑے غیر محسوس انداز میں تھوڑی دیر بعد واپس ہجوم میں کھینچ گئی مگر مونس کا ماتھا اتنی ہی دیر میں پسینے سے تر ہو چکا تھا۔ بیلا نے جس پیبا کی سے اس کے سامنے رقص کیا تھا اور جسم کے زاویوں آنکھوں کے اشاروں سے جس طرح اس پر اپنے والہانہ پن کا اظہار کیا تھا وہ نادان نہیں تھا کہ اسے سمجھ نہ پاتا۔ بیلا کی اس جسمانی شاعری نے اسے چونکا دیا تھا اور اسی احساس نے اسے اپنے آپ میں چور بنا دیا۔ اس نے نگاہیں جھکا لیں اور رومال سے ماتھا پونچھنے لگا۔ سوامی اور پنڈت اپنے چاروں چیلوں کے ساتھ پیچھے کھڑے خاموشی سے ہولی کا کھیل دیکھ رہے تھے۔

”نہیں رزاقی۔ اگر وہ راجیہ تھی تو اب کہاں ہے؟“ ایک دم مونس نے کسی سحر سے آزاد ہو جانے والے لہجے میں کہا۔

”مگر تم نے اسے خود دیکھا ہے مونس۔ میں نے جب اس کی جانب تمہاری توجہ دلائی تو تمہاری حالت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔“ رزاقی کے لہجے میں ضد اتر آئی، جیسے وہ ہر قیمت پر اپنی بات منوانا چاہتا ہو۔

”مجھے بھی ایسا ہی لگا تھا رزاقی کہ وہ راجیہ بھابی ہی ہے مگر میرا سوال اپنی جگہ ہے کہ پھر وہ اچانک کہاں چلی گئی؟“

”آتمائیں جیسے آتی ہیں ویسے ہی لوٹ بھی جاتی ہیں مونس بابو۔“ سوامی کا لہجہ بڑا گھمبیر تھا۔
”آتمائیں عام منٹس سے بہت زیادہ شگفتگی مان ہوتی ہیں۔“
”یعنی وہ۔۔۔“

”جی ہاں رزاقی بابو۔ وہ آپ کی چینی کی آتما ہی تھی۔ اگر آپ بھولے نہ ہوں تو کل میں نے آپ سے کہا تھا کہ آنے والا ایک دن اور ایک رات آپ کی چینی کے حوالے سے بہت اہم ہے۔“ سوامی بے سنجیدہ ہورہا تھا۔

”میں کیسے مان لوں؟“ رزاقی نے پھر سر جھٹکا۔
”آتمائیں دیکھنے کو بھی جھٹلا رہے ہیں رزاقی بابو۔ حیرت ہے۔“ سوامی بولا۔
”اگر وہ راجیہ۔۔۔ یا اس کی روح تھی تو وہ یہاں کیا کر رہی تھی؟“ رزاقی نے اٹھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”آپ لوگوں میں اس کا کیا کام؟“

”اس کا جواب دے کر میں آپ کو ایک بار پھر کرودھ میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا رزاقی بابو۔ بہر حال اتنا اوش کہنا چاہتا ہوں کہ وہ آپ کی چینی ہی کی آتما تھی جو کیول آپ کے لئے بیاکل ہو کر سو رگ سے یہاں چلی آئی اور شاید اب اس سے تک واپس نہیں جائے گی جب تک آپ کا اور اس کا ایک بار پھر ملن نہیں ہو جاتا۔“

”ایک روح اور انسان کا ملاپ۔۔۔ یہ کیسے ممکن ہے؟“ مونس نے رزاقی کے منہ کی بات چھین لی۔
”میں آپ سے سمٹ ہوں مونس بابو۔ تاہم اپنے علم اور شگفتگی کی بنیاد پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ یا تو یہ دو آتماؤں کا ملن ہو گا یا دوشریروں کا۔“

”مطلب؟“ رزاقی بھی مونس کی طرح بری طرح چونکا۔
”آپ دونوں خوب سمجھ رہے ہیں جو میں کہہ رہا ہوں۔ مجھے کھل کر کہنے پر مجبور نہ کیجئے۔ میری کہی ہوئی ایک بات اگر آپ کو شک دے گی تو دوسری بات کا خیال بھی آپ کو دکھ دینے والا ہے۔“

دل اچھل کر حلق میں آ گئے۔ سانس رک گیا اور ہونٹ حیرت کے عالم میں وا ہو گئے۔ بے اختیار رزاقی۔ اور اس کے بعد مونس اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اسی وقت اس عورت نے رزاقی کی جانب نگاہ اٹھائی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہو لے سے مسکرائی۔۔۔ لیکن کیا واقعی وہ مسکراہٹ تھی؟ رزاقی کو لگا جیسے وہ دید کی پیاس میں ڈوبی مسکراہٹ اس کے لئے ایک پیغام ہو۔ سند یہ ہو۔ ان آنکھوں میں پیاس اور محرومی یوں جل بچھ رہی تھی کہ رزاقی کے لئے خود پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ اپنی جگہ سے آگے بڑھتا، مونس نے اس کا بازو تھام لیا۔ رزاقی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اسے عجیب سی نظروں سے گھور رہا تھا۔

”مونس۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔“ رزاقی نے کہنا چاہا اور پلٹ کر دیکھا۔ اس کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ لڑکیوں اور عورتوں کا جھوم اب بھی ہولی کھیل رہا تھا مگر۔۔۔ وہ عورت وہاں کہاں تھی؟ ایک دم اس کا وجود یوں ناپید ہو گیا جیسے کبھی وہاں تھا ہی نہیں۔ ہولی کے رنگوں کی اڑتی مکھڑی پھیلتی سنتی پھوار نے اس کا ہونا نہ ہونا برابر کر دیا۔ حیرت اور اچھبے سے رزاقی کے چہرے کے نقوش بگڑ گئے۔ یہی حال مونس کا بھی ہوا۔ ”وہ۔۔۔ وہ کہاں گئی؟“ بیساختہ رزاقی کے لبوں سے نکلا۔

”کیا ہوا رزاقی بابو؟ کس کی بات کر رہے ہیں آپ؟“ ایک دم سوامی کی پھٹے بانس جیسی آواز نے ان دونوں کو چونکا دیا۔

”وہ۔۔۔ وہ۔۔۔“ رزاقی بکلا کر رہ گیا۔
”کے دیکھ لیا آپ نے رزاقی بابو؟“ اس کے ہونٹوں پر بڑی بڑا سرا سر مسکراہٹ ابھری۔ ”جو یوں بیاکل ہو رہے ہیں۔“

”وہ۔۔۔ راجیہ تھی۔“ رزاقی نے دوبارہ جھوم کی جانب بے قرار نگاہوں سے دیکھا مگر وہ وجود تو بے وجود ہو چکا تھا جسے اس کی اور مونس کی نظروں نے بیک وقت راجیہ کے روپ میں دیکھا تھا۔
”راجیہ؟“ سوامی نے حیرت سے کہا مگر صاف ظاہر ہوا کہ اس کی حیرت طنزیہ ہے۔ ”آپ کی چینی راجیہ؟“

”ہاں۔ وہی تھی وہ۔ میں نے اسے صاف دیکھا ہے۔ صاف پہچانا ہے۔ کیوں مونس؟ وہ راجیہ ہی تھی ناں؟“ اس نے مونس کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

”مگر وہ تو سو رگشاں ہو چکی ہیں رزاقی بابو۔“ سوامی نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”اور آواگون یا میری کالی شگفتیوں پر آپ کو شواہس ہے نہیں۔ پھر آپ کی چینی کی آتما یہاں ہمارے ہولی کے تیوہار میں کیسے آن پہنچی؟“

”وہ سب میں نہیں جانتا۔۔۔ مگر۔۔۔ وہ تھی راجیہ ہی۔“ رزاقی نے سر جھٹکا۔

اسے نکھیلوں سے دیکھ رہی تھی۔

گاڑی کے پاس رک کر اس نے ان دونوں کو منستے کہا اور تب تک وہاں ہاتھ باندھے کسی بات کی طرح ساکت و جامد کھڑی رہی جب تک ان کی گاڑی حویلی کے راستے پر مڑ نہ گئی۔

☆=====☆=====☆

رات کا آخری پہرہ ریگ رہا تھا۔

ساری حویلی پر سکوت طاری تھا مگر رزاقی اب بھی اپنے کمرے میں کسی ایسے مسافر کی طرح ٹہل رہا تھا جسے سرباب نے ڈس لیا ہو۔ ہاتھ پشت پر باندھے تھکا تھکا سا، پڑمرہ سا، سر نہوڑائے وہ شرقا غربا مسلسل سفر میں تھا۔ اس کی آنکھوں میں راجیہ۔۔۔ رنگوں میں بھگی، مندر کے سامنے میدان میں دوسری عورتوں کے بچوں بیچ اور کبھی ان کے آگے ناچتی راجیہ کا سراپا تھم سا گیا تھا۔ اس کا دل کہتا تھا کہ وہ راجیہ کے وہاں ہونے، اس کی روح کے پلٹ آنے پر یقین کر لے مگر فوراً ہی مونس کی باتیں اس کے اس یقین کے چیتھڑے اڑا دینے کو اس کے کانوں میں گونجنے لگتیں۔ اس کے قدم شل ہو چکے تھے۔ دماغ کینسر کے پھوڑے کی طرح ڈکھ رہا تھا۔ سارا جسم درد سے بے حال تھا مگر سوچیں تھیں کہ اسے کسی کنارے لگنے ہی نہ دے رہی تھیں۔ وہم اور یقین کی یہ جنگ اسے زہر میں بکھی تلوار کی طرح کاٹ رہی تھی۔ وہ مان لیتا چاہتا تھا کہ وہ راجیہ ہی تھی۔ اس کی روح تھی۔۔۔ مگر ہر بار اس کا انداز اس کا ایمان اسے ہکا سا ٹھوکا دے کر بے یقینی کی مندر سے نیچے دھکیل دیتا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ وہ ہاتھ مسلتے ہوئے کرسی پر گر پڑا۔ ”اگر وہ راجیہ ہی تھی تو ہولی کے جشن میں کیا کر رہی تھی؟“

اس خیال کا آنا تھا کہ ایک اور سوچ کا ناگ اس کے دل و دماغ پر حملہ آور ہو گیا۔ اسے سوامی کی کہی ہوئی باتوں میں سے ایک بات کا ڈنک بڑپا گیا۔

”کہیں سوامی نے تو اس کی راجیہ کی روح کو بس میں نہیں کر لیا؟“

یہ ایسا خوفناک اور جان لیوا خیال تھا کہ وہ ساری کلفت ساری تھکان بھول کر ایک دم اچھل کر کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

”اگر واقعی ایسا تھا تو۔۔۔؟“

اور اس ”تو“ سے آگے ایک بہت بڑا سوالیہ نشان پھن کاڑھے اسے ڈنکے کے لئے جھوم رہا تھا۔ اس کا سارا جسم بید مجنون کی طرح لرزا۔ رنگ ایک دم سرسوں ہو گیا۔ اس نے جھپٹنا چاہا مگر چکرا کر بستر کی پٹی پر ڈھلے گیا۔

”رزاقی بابو۔۔۔“ ایک دم اندر داخل ہوتی بیلا نے ہکلا کر کہا اور تیزی سے اس کے قریب چلی

سوامی نے ہاتھ جوڑ دیے۔

”میں کسی خیال سے نہیں گھبرا تا سوامی جی۔ آپ یہی کہنا چاہتے ہیں ناں کہ اگر بقول آپ کے میرا اور راجیہ کا روحانی ملاپ ہو گا تو اس کے لئے میری روح کو بھی جسم کی قید سے آزاد ہونا پڑے گا؟“ رزاقی نے وضاحت چاہی۔

”جی۔۔۔“ سوامی مختصراً کہہ کر چپ ہو گیا اور اس کی نظریں سامنے میدان میں ناچتے گاتے لوگوں پر جم گئیں جو اب بستی کے گلی کو چوں میں بکھرتے جا رہے تھے۔

”جانے دو یار۔ کس چکر میں پڑ گئے تم۔“ مونس نے رزاقی کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”وہ راجیہ بھابی کی ہمشکل کوئی عورت تھی اور بس۔“

”تو اب میں تمہارا ہی سوال دہراتا ہوں مونس۔۔۔ اگر وہ جیتی جاگتی عورت تھی تو ایک ہی پل میں غائب کہاں ہو گئی؟“ رزاقی نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”یعنی تم اس بات پر یقین کر چکے ہو کہ وہ راجیہ بھابی کی روح تھی؟“ مونس حیرت زدہ سا اس کی جانب دیکھ کر بولا۔

”میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا مونس۔“ رزاقی نے ایک بار پھر میدان میں متلاشی نظروں سے دیکھا پھر اپنی پیشانی پر مٹے لگا۔ ”بہت الجھ گیا ہوں۔“

”میں شاید چاہتا ہوں رزاقی بابو کہ یہاں آ کر آپ کو ایک گھنٹک صبح کو حال کا سامنا کرنا پڑا تاہم میں آپ اور مونس بابو کی ہر آنکھن سمجھانے کے لئے تیار ہوں بشرطیکہ آپ میری باتوں پر دوشواں کریں۔“

”بہت شکریہ سوامی جی۔“ مونس نے استہزائیہ انداز سے کہا۔ ”میرا خیال ہے ہمیں اب چلنا چاہئے۔ کیوں رزاقی؟“

”ہاں۔۔۔ چلو۔“ وہ تھکے تھکے انداز میں سوامی کی جانب دیکھ کر مونس کے ساتھ بیڑیوں کی جانب چل پڑا۔

”منستے مونس بابو۔۔۔ منستے رزاقی بابو۔“ سوامی نے پیچھے سے کہا۔

جواب میں ان دونوں نے زبان سے کچھ نہ کہا اور بیڑیاں اتر گئے۔ بستی کے کافی سارے لوگ ہنستے گاتے گھروں اور گلیوں میں جا چکے تھے۔ باقی جو مردوزن وہاں موجود تھے انہوں نے رزاقی اور مونس کو راستہ دے دیا۔ مندی نے ان دونوں کو ہاتھ جوڑ کر پر نام کیا اور سمت کر ایک طرف ہٹ گئی جبکہ بیلا میدان سے باہر گاڑی تک ان کے ساتھ ساتھ آئی۔ اس کی ساڑھی بھیک کر بدن کے ساتھ چپک چکی تھی اور جسم کے نشیب و فراز حشر پیا کر رہے تھے۔ مونس اس سے نظریں چرا رہا تھا جبکہ وہ زیر لب مسکرا مسکرا کر

آئی۔ ”کیا ہوا؟ کیا ہوا رزاقی بابو؟“ وہ بیٹا باندہ اس پر جھک گئی۔

”کچھ۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔“ رزاقی نے رک رک کر کہا۔ ”بیلا۔۔۔ مونس کو بلاؤ۔“

”جی۔۔۔“ وہ سیدھی ہوئی اور جیسے بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

بمشکل ڈیڑھ منٹ بعد مونس اور بیلا آگے پیچھے کمرے میں داخل ہوئے۔ مونس کے چہرے کا رنگ اڑا اور سانس پھولا ہوا تھا۔ وہ لپک کر بستر پر بے سدھ پڑے رزاقی کے قریب پہنچا اور اسے باہوں میں لے لیا۔

”رزاقی۔۔۔ رزاقی۔۔۔ میری جان کیا ہوا؟“ وہ بے قراری سے کہتا چلا گیا۔ ”م نکھیں کھولو یار۔۔۔ رزاقی۔۔۔“ پھر اس کے دل کی دھڑکن محسوس کرنے کے لئے ہاتھ اس کے سینے پر رکھا۔ دل دھڑک رہا تھا مگر کیسے؟ جیسے کنوئیں میں چوئی رینگ رہی ہو۔

”رزاقی۔۔۔“ مونس بے طرح گھبرا گیا۔ پھر اس نے بیلا کی طرف دیکھا جو اسی کی طرح بیحد پریشان اس کے بائیں طرف کھڑی تھی۔ ”بیلا۔۔۔ ڈاکٹر احسن کو فون کرو۔ جلدی۔“

”جی مونس بابو۔“ بیلا نے تھوک نکل کر حلق تر کرنے کی کوشش کی اور باہر جانے کے لئے پلٹی۔

”نہیں مونس۔“ اسی وقت رزاقی نے آنکھیں آہستہ سے وا کیں۔ ”ڈاکٹر کو بلا نے کی کوئی ضرورت نہیں یار۔ بیلا رک جاؤ۔ میں ٹھیک ہوں۔“

بیلا دروازے سے پلٹ آئی۔ ”اوہ میرے خدا۔“ مونس نے آنکھیں بند کر کے کہا تو اس کی آنکھوں کے گوشے کپکپا گئے۔

رزاقی۔ میری جان۔ کیا ہوا تھا تمہیں؟“ اس نے اسے بچوں کی طرح سینے سے لگا لیا۔

”کچھ نہیں یار۔ بس تمہارے جانے کے بعد سے اب تک مسلسل راجیہ کے بارے میں سوچتے سوچتے ایک ایسا خیال ذہن میں ابھرا کہ میں برداشت ہی نہیں کر سکا۔“

”ایسا کیا خیال تھا رزاقی۔ میں تمہیں منع کر کے گیا تھا کہ اب تم بالکل نہیں سوچو گے مگر لگتا ہے کہ تم نے ساری رات سینہ جلاتے گزار دی ہے۔“

”کیسے نہ سوچتا مونس۔“ رزاقی نے اس کے سینے سے الگ ہوتے ہوئے کہا۔ مونس نے اسے کرسی پر بٹھایا اور خود اس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”بات راجیہ کی ہو اور میں اسے ایک طرف پھینک دوں۔ کیا یہ ممکن ہے مونس؟“

اس سے پہلے کہ مونس اس کے جواب میں کچھ کہتا بیلا گرم گرم دودھ کے دو گلاس ٹرے میں رکھے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ نجانے کس وقت خاموشی سے باہر نکل گئی تھی کہ انہیں پتہ ہی نہ چلا۔

دھیرے سے اس نے تپائی پردوں کو گلاس رکھے اور ٹرے ہاتھ میں لئے ایک دیوار کے ساتھ لگ

کر کھڑی ہو گئی۔ مونس نے اسے شکر سے دیکھا تو وہ ہولے سے مسکرا دی۔ مونس نے ایک گلاس اٹھایا اور رزاقی کی طرف بڑھایا۔ ”اسے گھونٹ گھونٹ کر کے پیو۔ طبیعت سنبھل جائے گی۔“

رزاقی نے بحث کئے بغیر گلاس لے لیا۔ چھوٹے چھوٹے دو تین گھونٹ لئے اور گلاس تپائی پر رکھ دیا۔ مونس نے دوسرے گلاس کو چھوا بھی نہ تھا۔

”اب بتاؤ۔ کس خیال کے بارے میں بات کر رہے تھے تم؟“ مونس نے اس کا ہاتھ تھام کر ہولے ہولے سے ہلاتے ہوئے کہا۔

”مونس۔“ رزاقی نے کہا اور بیلا کی جانب دیکھا۔ وہ اس کی نظر سے سمجھ گئی کہ وہ کیا چاہتا ہے؟ آہستہ سے دیوار سے پشت ہٹائی اور باہر کو چل دی۔ ”میں باہر موجود ہوں۔ ضرورت پڑے تو آواز دے لیجئے گا۔“

جواب میں رزاقی نے محض سر ہلا دیا جبکہ مونس بھی خاموش ہی رہا۔ بیلا نے باہر نکل کر دروازہ بھیڑ دیا اور کارڈور میں کئی قدم آگے جا کر دیوار سے ٹک گئی۔ اس کی آنکھوں میں کسی گہری سوچ کی پرچھائیاں اتر آئی تھیں۔

”ہاں اب کہو۔“ مونس نے رزاقی کی جانب دیکھا۔

”مونس۔“ رزاقی نے ہاتھوں کو آپس میں ملتے ہوئے اس کی نظر سے نظر ملاتی۔ ”ایک دم مجھے جو خیال آیا اور جس نے مجھے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا وہ یہ تھا کہ کہیں سوامی نے راجیہ کی روح کو اپنے بس میں تو نہیں کر لیا؟“

”کیا؟“ مونس کا منہ حیرت سے کھلا گیا۔ چند لمحے وہ رزاقی کو پچھنی پچھنی آنکھوں سے گھورتا رہا پھر اس کے حواس میں ٹھہراؤ آ گیا۔ ”ایسا کیوں سوچا تم نے؟“

”اس نے ایک بار کہا تھا مونس کہ وہ ایسا کر سکتا ہے۔“ رزاقی نے سر جھٹکا۔ ”اور اگر اس نے ایسا کیا ہے تو۔۔۔“

”تو میں اسے جان سے مار دوں گا۔“ مونس ایک دم آپے سے باہر ہو گیا۔ ”اول تو مجھے اس بات پر یقین ہی نہیں ہے اور اگر اس میں ایٹم کے ذرے کے برابر بھی حقیقت ہے تاں رزاقی تو اسے میرے ہاتھ سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ کوئی بھی نہیں۔“ مونس کے لہجے میں نجانے کیا بات تھی کہ رزاقی اسے دیکھتا رہ گیا۔ ”وہ سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو؟“ مونس غصے میں کانپتا ہوا اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ ”اپنی بکواس سے اس نے تمہیں اس حد تک پریشان کر دیا ہے کہ تم اپنے دین اپنے اہل عقائد میں بھی شک کا شکار ہونے لگے ہو۔“ اس کا لہجہ ناخوشگوار ہو گیا۔ ”اپنے آپ کو سنبھالو رزاقی۔ یہ اچھا نہیں کر رہے تم اپنے اور ہمارے ساتھ۔ مانا کہ تم ایک ناقابل برداشت دکھ سے گزر رہے ہو لیکن کیا یہ دکھ کیا یہ غم اتنا بڑا ہے کہ تم

اپنے دین سے برگشتہ ہو جاؤ۔ ایک بت پرست کی اوٹ پناہگ باتوں سے متاثر ہو جاؤ۔ ہمارے دین میں ایسے عقائد اور ایسی خرافات کی جگہ کہاں ہے؟“

”میں تمہاری ہر بات سے اتفاق کرتا ہوں مونس۔“ رزاقی بھی اٹھ گیا۔ ”میں بھی تو صرف اسی خیال سے خوفزدہ ہو گیا ہوں کہ کہیں سوامی نے ایسی کوئی حرکت کر ہی تو نہیں ڈالی۔“

”اس کے بارے میں تم سوچنا چھوڑ دو۔“ مونس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”میں تمہارا سایہ

ہوں ناں۔ میں اندھیرے میں رہ کر جو دیکھ سکتا ہوں وہ تم اجالے میں نہیں دیکھ پاؤ گے۔ میں اس ساری بات کی تہہ تک پہنچ کر ہوں گا جس نے تمہیں اس طرح توڑ پھوڑ دیا ہے۔ تم بس ایک کام کرو کہ اس ڈھونگی کی کسی بھی بات کے بارے میں سوچنا چھوڑ دو۔ دل و دماغ کو پرسکون ہو جانے دو۔ یہ بستر اس لئے نہیں ہے کہ تم اسے اپنا انتظار کراتے رہو۔ اس پر لیٹ جاؤ اور آرام کرو۔“ مونس نے اسے کسی بچے کی طرح بازو سے تھام کر بستر پر لٹا دیا۔ اس پر کبل اوڑھایا اور نائٹ بلب جلا دیا۔ ”صبح ملاقات ہو گی۔ اب میں یہ نہ سنوں کہ تم دوبارہ کمرے میں بے چین خرامی کا مظاہرہ کر رہے ہو۔ بیلا تمہارے بارے میں مجھے پل پل کی رپورٹ دے گی۔ سمجھے۔ شب بخیر۔“ وہ اس کا ہاتھ چوم کر سیدھا ہوا۔

”مونس۔۔۔“ رزاقی نے لیٹے لیٹے مٹی سی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔ ”ایک بات کہوں؟“

”کہو۔“ مونس نے دھیرے سے جواب میں کہا۔

”بیلا اور زندگی بھی وہیں تھیں۔ اگر ہم ان سے پوچھیں۔۔۔“

”پگنہ نہ ہو رزاقی۔“ مونس نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”یہ بات ایسی نہیں ہے کہ یوں عامیانہ انداز میں اس کے بارے میں ملازموں سے بات کی جائے۔ لوگ بات کا بنگلہ بنا دیں گے۔ تمہارے بارے میں۔۔۔“ ایک دم کہتے کہتے مونس رک گیا اور نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا۔

”یہ کہیں گے کہ رزاقی بابو پاگل ہو گئے۔ یہی ناں؟“ وہ بڑے زہنی انداز میں ہنسا۔ جواب میں مونس سر جھکائے سینے پر ہاتھ باندھے خاموش رہا۔ ”تو اس میں غلط کیا ہے مونس۔ پاگل پن اور کسے کہتے ہیں؟ میں پاگل ہوں دیوانہ ہوں یہ سب سننے کے بعد ہی اگر مجھے حقیقت کا پتہ چل جائے تو برا کیا ہے۔“

”میں نے کہا ناں۔ تم اپنے دماغ کو مت تھکاؤ۔“ مونس کے لہجے میں تھکن بھر اور دوا ترانہ۔ ”میں بہت جلد اصلیت کا پتہ لگا لوں گا مگر تم ایسی کوئی حرکت نہیں کرو گے جو تمہارا مرتبہ لوگوں کی نظر میں گھٹا دے۔ ورنہ میں اور کچھ نہ بھی کر سکتا تو ہر وہ زبان گدی سے کھینچ لوں گا جو تمہارے بارے میں ایک بھی نازیبا لفظ اگلے گی۔“ مونس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ رزاقی اسے دیکھتا رہ گیا۔ چند لمحوں کے بعد مونس آپے میں آیا۔ ایک گہرا سانس لیا اور کہا۔ ”سو جاؤ۔ اس یقین کے ساتھ کہ میں تمہارے لئے جاگ رہا ہوں۔“

اس نے رزاقی کی پلکیں داہنے ہاتھ سے اس کی آنکھوں پر جھکائیں اور کمرے سے نکل گیا۔

بیلا کو کارڈور میں کافی دور کھڑا دیکھ کر وہ ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ وہ اس کی طرف چلی اور پاس آ کر کرک گئی۔ خالی ٹرے اب بھی اس کے ہاتھوں میں تھی جسے اس نے سینے کے سامنے کر رکھا تھا۔

”بیلا۔ رزاقی کا خیال رکھنا۔ اسے اب سو جانا چاہئے۔“

”میں جاگ رہی ہوں مونس بابو۔“ بیلا نے عجب اعتماد سے کہا۔ ”رزاقی بابو اب بستر سے اسی وقت اٹھیں گے جب صبح آپ آئیں گے۔“

”اور بی بی کو اس بارے میں بتانے کی ضرورت نہیں۔“

”آپ نچت رہئے۔“

مونس نے اسے بڑی گہری نظروں سے دیکھا۔ پھر کچھ کہے بغیر سر اثبات میں ہلاتا ہوا کسی سوچ میں ڈوبا کارڈور میں چل پڑا۔ بیلا نے اس کے موڑ مڑ جانے پر رزاقی کے کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھولا۔ اندر جھانک۔ رزاقی دوسری طرف کروٹ لئے بستر پر لیٹا تھا۔ اس نے دروازہ بھیڑ دیا اور دروازے کے سامنے رکھے موڑھے پر بیٹھ گئی۔

رزاقی اندر بستر پر آنکھیں موندے خاموش پڑا گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ نیند اس کی آنکھوں میں کہاں تھی جو وہ سو پاتا۔ دماغ میں تو راجہ کا سر اپنا رقصاں تھا۔ کانوں میں سوامی کی باتیں سرسرا رہی تھیں اور دل و دماغ میں ایک جنگ یہ فیصلہ کرنے کے لئے چھڑی ہوئی تھی کہ اسے سوامی کی باتوں پر یقین کر کے وقت کے ہاتھ سے اپنے لئے تسکین کا جام لے لینا چاہئے یا خود فریبی جیسی صورتحال سے نکلنے کے لئے آنکھیں کھول کر اس نیند سے بیدار ہو جانا چاہئے جس میں اس کا وجود کسی بے وزن شے کی طرح تحلیل ہوتا جا رہا تھا۔

☆=====☆

تین دن گزر گئے۔

مونس نے کیا سوچا؟ کیا کیا؟ رزاقی کو اس کا کچھ علم نہ تھا تاہم اس کی اپنی حالت یہ تھی کہ ان تین دنوں میں اس کی صحت بے طرح گر گئی۔ جسمانی تھابت کے آثار اس کے چہرے سے ظاہر ہونے لگے اور تھکاوٹ جیسے اس کے سارے بدن میں ڈیرا ڈال کر بیٹھ گئی۔ بیلا اپنی سی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے کھانے پینے اور دوا لینے کے معمولات کو حتی الامکان قائم رکھنے میں اس نے کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا۔ بی بی کو بھی رزاقی کی ایک دم بگڑتی صحت نے پریشان کر دیا۔ اس نے مونس سے بات کی تو وہ بی بی کو تسلی بخشی دے کر رخصت ہو گیا۔ اس نے ڈاکٹر احسن کو بلوانے کی بات دے لفظوں میں اڑا دی۔ بی بی کو یہ باور کرایا کہ رزاقی کی صحت چند دنوں میں بحال ہو جائے گی۔ اس کے لئے اس نے تجویز پیش کی کہ رزاقی

رہا۔ بیلا نے چائے کا کپ تیار کیا اور اس کی جانب نظر اٹھائی۔ پھر مونس کو اپنی ہی جانب نگراں پا کر وہ گڑبڑ اسی گئی۔ اسے لگا کہ مونس کی نظریں آج کچھ اور طرح کی ہو رہی ہیں۔ کیسی؟ یہ سوچنے کے ساتھ ہی اس کا سانس بے قابو ہو گیا۔ اس نے دوبارہ مونس کی جانب دیکھا جواب بھی اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”بیلا۔“ مونس کی آواز پر وہ اپنی دگرگوں کیفیت سے باہر نکل آئی۔ ”رزاقی بابو کیسے ہیں؟“

”ٹھیک ہیں مونس بابو۔“ بیلا نے زبان ہونٹوں پر پھیر کر جواب دیا۔ ”کمرے سے نہیں نکلتے۔“

میں نے بہت چاہا کہ وہ چائیں باغ تک ہی چلے چلیں مگر۔۔۔“

”ہوں۔۔۔“ مونس نے ایک گہرا سانس لیا۔ ”بیلا۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں یہ سوچ کر کہ تم

رزاقی بابو کے معاملے میں مجھ سے ہر ممکن تعاون کرو گی۔“

”آپ۔۔۔ آپ کہتے مونس بابو۔“ بیلا نے نظر جھکائی، پھر اٹھائی اور مونس کی آنکھوں میں دیکھنے

لگی۔ ”آپ کے لئے بیلا کی جان بھی حاضر ہے۔“ اس نے کہا تو مونس کا سارا بدن جھنجھٹا اٹھا۔ کچھ ایسی ہی

سچائی تھی بیلا کی نگاہوں میں کہ وہ چند لمحوں کو مبہوت سا ہو کر رہ گیا۔ پھر چونکا اور سنجھل گیا۔ بیلا کی بات نے

اسے لفظوں کے محتاط استعمال پر مجبور کر دیا تھا۔

”بیلا۔ کیا مجھے تم سے یہ وعدہ لینے کی ضرورت ہے کہ آج اس لمحے کے بعد ہم دونوں کے درمیان

حوادث اور اس کے مکتبوں کے بارے میں جو بھی بات ہو گی وہ کسی تیسرے کے کانوں تک نہیں پہنچے

گی؟“ مونس نے اسے نظروں کی گرفت میں لے لیا۔

”بالکل نہیں مونس بابو۔“ بیلا نے عجب سرشاری سے کہا۔ ”بیلا نے کہا ناں کہ آپ کے لئے جان

بھی حاضر ہے تو یہ دل سے کہا۔ اور جس کے لئے جان دے دی جائے اس کی کوئی بھی بات کسی بیگانے

سے نہیں کی جاتی۔ یہ میرے دل کے دھرم میں شامل ہے۔“

”اور تمہارے اپنوں میں کون کون شامل ہے بیلا؟“ مونس نے اس کی بات تھام لی۔

”اپنوں میں۔۔۔“ بیلا نے اس کی جانب ایسی نگاہوں سے دیکھا جن میں صاف جھلک رہا تھا

کہ ”مونس بابو۔ آپ۔۔۔ آپ۔۔۔ بس آپ میرے اپنے ہیں۔“ تاہم اس نے ایک پل

ٹھہر کر دھیرے سے کہا۔ ”صرف کماری موسیٰ۔۔۔“

”مگر میں چاہتا ہوں کہ تمہاری موسیٰ تک بھی ہماری کوئی بات کبھی نہ پہنچے۔“

”جملہ۔۔۔“ بیلا اک ذرا سا چونکی۔ پھر سر جھٹکا۔ ”آپ چاہتے ہیں تو ایسا ہی ہو گا مونس بابو۔“

”پوری بستی میں ایک بھی فرد ایسا نہیں ہونا چاہئے بیلا جو ہمارا راز دار ہونے کا دعویدار ہو۔“

مونس کا لہجہ گھمبیر ہو گیا۔

”صرف بستی ہی کیوں مونس بابو۔ پوری دھرتی پر کوئی نہیں ہو گا۔“ بیلا نے سر اٹھا کر جواب دیا تو

کو کچھ مفتوں کے لئے پہاڑ پر بھیج دیا جائے۔ آب و ہوا کی تبدیلی یقیناً اس کی صحت پر اچھا اثر ڈال سکتی تھی مگر رزاقی نے کہیں بھی جانے سے صاف انکار کر دیا۔ مونس نے اس کے ساتھ بحث کی نہ ضد۔ وہ جانتا تھا کہ موجودہ حالت میں رزاقی اس کی کسی بھی خلاف مزاج بات پر عمل کرنے پر آسانی سے تیار نہیں ہوگا اور بہ امر مجبوری وہ مانے گا نہیں۔

مونس نے ساری صورتحال پر جتنا غور کیا اس کا دماغ اتنا ہی الجھتا چلا گیا۔ بات کا اصل سرا اس کے ہاتھ نہ آ رہا تھا۔ سوامی کی باتوں سے لگتا تھا کہ وہ بہر صورت انہیں یہ سنوانا چاہتا ہے کہ وہ راجیہ کی روح کو طلب کر سکتا ہے اور اسی کی وجہ سے ہولی کے دن وہ مونس اور رزاقی کو دکھائی بھی دی۔ اب اس کے بعد وہ چاہتا تھا کہ رزاقی اس کی باتوں پر یقین کر کے اس سے عرض گزار ہو کہ وہ راجیہ کی روح کے ساتھ اس کا جسمانی یا روحانی ملن کر اویں اور یہ دعویٰ تو سوامی کر چکا تھا کہ وہ ایسا کر سکتا ہے۔

یہاں آ کر مونس کی سوچوں کا سلسلہ رک گیا۔

کتنی ہی دیر وہ ہولی کے دن کی واردات پر غور کرتا رہا۔ کچھ دیر کے لئے تو اسے بھی یقین سا

ہو نکلگا کہ اس نے راجیہ ہی کو دیکھا تھا۔ اسی کی روح ہی وہاں رقصاں تھی مگر۔۔۔ پھر اس نے سر جھٹک

کر اس خیال کو پرے پھینک دینا چاہا۔ اگر وہ راجیہ ہی کی روح تھی تو مشرکوں کے درمیان کیا کر رہی تھی؟

اور اگر وہ اس کی روح نہیں تھی تو ایک ہی پل میں ناپید کیوں اور کیسے ہوگی؟ اگر وہ ہندو بستی کی کوئی عورت

تھی تو اس کے بارے میں وہ بتا لگوا سکتا تھا مگر اس کے لئے اسے بیلا اور نندنی میں سے کسی ایک پر اعتماد

کرنا پڑتا۔ بیلا کا خیال آیا تو اس کی سوچوں کا دھارا بدل گیا۔ اسے بیلا کا قصہ یاد آیا۔ اس کی بیباک

آنکھوں کا پیغام یاد آیا۔ اس کی فریفتگی یاد آئی۔ وہ بچہ تھا نہ نادان کہ بیلا کی وارفتہ حرکتوں اور چڑھی ہوئی

آنکھوں کی زبان سمجھ نہ سکتا تاہم اسے اپنے اور اس کے درمیان جو فاصلہ دکھائی دیتے تھے ان کا پائنا

بظاہر تو ممکن نہیں تھا۔ اس کے باوجود ہوا یہ کہ بیلا کے بارے میں سوچتے ہی یکبارگی اس کا دل دھڑکا اور

نندنی کو طاق نسیاں پر رکھ کر دماغ نے فیصلہ بیلا کے حق میں دے دیا۔ ایک لمحے کے لئے اسے لگا کہ وہ

بیلا کی طرف جھک رہا ہے اور اسے اس طرح بیلا کی دیوانگی کو کیش نہیں کرنا چاہئے مگر دوسرے ہی لمحے وہ

رزاقی کا خیال آتے ہی سب کچھ بھول گیا۔ اس نے جذباتیت کو ایک طرف رکھا اور بیلا کو استعمال کرنے

کا فیصلہ کر لیا۔

سر پہر کی چائے لے کر جب بیلا اس کے کمرے میں آئی تو وہ کھڑکی میں کھڑا اور تک پھیلے

کھیتوں کی ہریالی کو دیکھ رہا تھا۔

”نستے مونس بابو۔“ بیلا نے چائے کی ٹرے تپائی پر رکھی تو وہ اس کی طرف پلٹا۔ بیلا گھٹنے قالین

پر ٹیکے اس کے لئے چائے بنا رہی تھی۔ وہ اس کے قیامت خیز سراپے کو چند لمحوں تک نظروں میں تولتا

مونس کو اس پر پیارا گیا۔ کیسی دیوانی ہو رہی تھی وہ اس کے لئے۔ اس کا دل بھرا آیا۔
”ہوں۔۔۔“ وہ کسی سوچ میں ڈوب گیا۔

کتنی ہی دیر گزر گئی۔ بیلا سارے عرصے میں اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہی تھی یا نظروں سے اسے چوم رہی تھی یہ وہی جانتی تھی۔ مونس نے جب دوبارہ اس کی جانب نگاہ اٹھائی تو اسے اپنی جانب اس طرح دیکھتے پا کر گھبرا سا گیا۔ ایسی پیش آئی آج ایسی لودی جی آنکھیں تو اس نے کبھی نہ دیکھی تھیں۔ بیلا مسکرائی تو جواب میں وہ بھی بلاوجہ مسکرا دیا۔ تاہم مسکراہٹوں کے اس تبادلے نے اسے سنبھل جانے میں بہت مدد دی۔

”بیلا۔۔۔ اب میں تمہیں یہ نہیں باندھوں گا۔ سیدھی سیدھی باتیں ہوں گی اور تم مجھے وہ بتاؤ گی جو میں جانتا چاہتا ہوں۔“
”جی مونس بابو۔“ بیلا ہمدن گوش ہو گئی۔

”ہو لی والے دن کیا تم نے وہاں۔۔۔ مندر کے سامنے ناچتے گاتے لوگوں میں کسی خاص شخصیت کو دیکھا تھا؟“

”خاص شخصیت؟“ بیلا نے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے بات اس کی سمجھ میں نہ آئی ہو۔

”ہاں۔ ایک عورت۔۔۔ جو سفید ساڑھی میں بیوس دیوانگی کے عالم میں ناچ رہی تھی۔“
”سفید ساڑھی والی عورت۔۔۔“ بیلا جیسے کچھ یاد کرنے لگی۔ ”ایسی تو چار یا پنج عورتیں تھیں وہاں مونس بابو۔ آپ کس خاص عورت کی بات کر رہے ہیں میں سمجھی نہیں۔“

”اچھا۔ تم اس بات کو دوسری طرح سوچو۔“ مونس نے اسے اچھے ہوئے پا کر جلدی سے کہا۔
”کیا وہاں ایسی کوئی عورت تھی جس کی شکل و صورت راجیہ بھانی سے ملتی ہو۔“

”جی نہیں۔“ ایک دم بیلا نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ایسی کوئی عورت وہاں نہیں تھی اور پوری ہندو بستی میں ایسی کوئی عورت نہیں ہے مونس بابو جو راجیہ بی بی سے مشابہت رکھتی ہو۔“

”کیا یہ بات تم پورے یقین سے کہہ سکتی ہو بیلا؟“ مونس نے اسے غور سے دیکھا۔

”جی ہاں مونس بابو۔“ بیلا کے لہجے میں اعتماد تھا۔ ”میں اپنی بستی کے ایک ایک گھر کے ایک ایک مرد اور عورت کو جانتی بھی ہوں، پہچانتی بھی ہوں۔ وہاں ایسی کوئی عورت نہیں ہے جس کی صورت راجیہ بی بی سے میل کھاتی ہو۔“

”جو لوگ ہولی کے اس موقع پر بھارت سے آئے ہیں کیا ان میں ایسی کوئی عورت ہو سکتی ہے؟“
مونس نے پوچھا تو بیلا چوکی۔

”بھارت ماما سے آنے والوں میں جو عورتیں شامل ہیں ان میں کوئی بھی جوان نہیں ہے مونس

بابو۔ سب ادھیڑ عمر اور بوڑھی ہیں۔۔۔ مگر آپ یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں اگر آپ مجھے یہ بتائیں تو شاید میں کچھ بہتر بتا سکوں۔“

”بیلا۔۔۔“ مونس نے اب اسے ساری کے بجائے بات کا معمولی سا حصہ بتانے میں حرج نہ سمجھا اور کہا۔ ”دراصل اس دن وہاں مجھے اور رزاتی کو ایک عورت پر راجیہ کا شبہ ہوا تھا۔“

”مگر وہ تو سورگباش ہو چکی ہیں مونس بابو۔“ بیلا کے لہجے میں حیرت ہی حیرت تھی۔
”ہاں۔“ مونس بڑے پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔ ”مگر کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ راجیہ کی روح تھی جو دوسرے جہان سے لوٹ آئی تھی۔“

”ہمارے دھرم میں ایسی باتوں کی بہت گنجائش ہے مونس بابو۔ ہم آواگون پر یقین رکھتے ہیں اور ان دیکھی شکلیوں سے کام بھی لیتے ہیں۔۔۔ پرنتو آپ لوگ تو ایسی باتوں پر وشواس نہیں رکھتے۔ اگر راجیہ بی بی کی آتما لوٹ ہی آئی تھی تو وہ وہاں کیا کر رہی تھی۔ اسے تو رزاتی بابو کے پاس یہاں، حویلی میں آنا چاہئے تھا۔ ہولی تو ہمارا ہندوؤں کا تیوہار ہے۔ وہاں راجیہ بی بی کا کیا کام؟“

”یہی بات تو میں کہتا ہوں بیلا مگر۔۔۔“ مونس کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ بیلا نے محسوس کیا کہ مونس ہونٹوں پر آئی بات کو پی گیا ہے تاہم اس نے کربید انہیں۔ خاموشی سے اس کی جانب دیکھتی رہی۔ جب کچھ

دیر گزر گئی اور مونس سوچ میں ڈوبا رہا تو بیلا نے دھیرے سے پوچھا۔

”آپ سے یہ بات کس نے کہی مونس بابو کہ وہ راجیہ بی بی کی آتما تھی؟“

”تمہارے عوامی دھرم داس نے۔“ مونس نے طنز سے کہا تو بیلا کامہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

”سوامی جی نے۔۔۔“ مونس نے اس کی جانب دیکھا تو وہ سرسرائی۔

”ہاں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ راجیہ کی روح تھی اور ان کی کوششوں سے لوٹ آئی ہے۔“ مونس کے لہجے میں تمسخر کھل گیا۔

”مونس بابو۔۔۔ اگر سوامی جی نے ایسا کہا ہے تو۔۔۔“ وہ کہتے کہتے رک گئی۔

”کہو کہو۔ اگر سوامی نے ایسا کہا ہے تو کیا بیلا؟“ مونس ایک قدم آگے بڑھ آیا۔

جواب میں بیلا ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔ اب وہ مونس کو کیا بتاتی کہ اسے سوامی پر کس قدر اعتماد ہے۔ اس نے اپنے دیے ہوئے سے کے مطابق دونوں کے اندر اندر اس کا پنڈا اندھکار سے چھڑا دیا اور اسے حویلی بھی پہنچا دیا تھا۔ بستی کی ہر وہ عورت جو سوامی کے پاس اپنا کوئی مسئلہ لے کر گئی تھی اسی کے گن

گار ہی تھی۔ بیلا کا خیال تھا کہ سوامی اپنی کالی شکلیوں کے بل پر جو چاہتا کر سکتا تھا۔ وہ خود اس کی شکتی کا مظاہرہ دیکھ چکی تھی۔ اپنے دونوں کام ہوتے دیکھ کر اب وہ کیسے کہہ دیتی کہ سوامی جو کہتا ہے، کر نہیں سکتا۔

”تم کچھ کہہ رہی تھیں بیلا۔“ مونس نے اسے چونکایا تو وہ سوچوں کے گرداب سے نکلی۔

”میں ابھی تازہ چائے بنا لاتی ہوں۔“ بیلا نے برتن ٹرے میں رکھے اور لپک جھپک کمرے سے نکل گئی۔

مونس کھلے دروازے کے خلا میں خاموشی سے گھورتا رہ گیا۔ اس نے بیلا پر اعتماد کر کے کچھ غلط تو نہیں کیا؟ اس کے دماغ سے اٹھتے اس سوال کا جواب دل سے آ رہا تھا اور یہ جواب بڑی شد و مد کے ساتھ نفی میں تھا۔

☆=====☆=====☆

بی بی نے کماری کو ساری حویلی کی سیر کرائی اور ابھی ابھی دونوں تھک کر واپس بی بی کے کمرے میں پہنچی تھیں۔ بیلا مونس کو چائے دے کر لوٹی تو وہ دونوں کی بات پر کھلکھلا کر ہنس رہی تھیں۔ بیلا کو دیکھ کر بی بی نے فوراً کہا۔

”ارے واہ بیلا۔ جیتی رہ پئی۔ اس وقت تیری یاد بڑی شدت سے آ رہی تھی۔“

”چائے بناؤں بی بی؟“ بیلا مسکرائی تو بی بی کے ساتھ کماری بھی ہنس پڑی۔

”تو تو نجوی بھی ہو گئی بیلا۔“ بی بی نے اسے شاباش دیتی نظروں سے دیکھا تو بیلا کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ ”بس اب اپنی بات پر جلدی سے عمل کر کے دکھا دے۔ تیری موسیٰ نے آج حویلی کا چپہ چپہ دیکھ ڈالا اور میری ایک ایک چوٹی ہلا دی۔“ بی بی نے اپنی پنڈلیاں دبا جتے ہوئے کہا۔

”میں چائے بناؤں۔“ بیلا نے ناگئیں داب دیتی ہوں۔“ بیلا نے بی بی کو ترجمے سے دیکھا تو کماری نے جلدی سے کہا۔

”تم صرف چائے بناؤ بیلا۔ ناگئیں میں داب دیتی ہوں۔“ اور ذرا آگے سرک کر اس نے بی بی کی پنڈلیاں تھام لیں۔ پھر بی بی نہ نہ ہی کرتی رہ گئی مگر کماری نے ایک نہ سنی اور اس کے دابنے سے ملنے والے سکون نے چند ہی لمحوں بعد بی بی کی آنکھوں پر پلکوں کی جھالگرادی۔ بیلا چائے لے کر آئی تو بی بی قالمین پر کشن سر کے نیچے رکھے سو رہی تھی جبکہ کماری اس کی ناگئیں دابنا بند کر چکی تھی۔

”شش۔۔۔“ بیلا کو بات کرنے سے روکنے کے لئے کماری نے انگلی ہونٹوں پر رکھی اور اپنی جگہ چھوڑ دی۔ دونوں نے کچھ پرے بیٹھ کر آرام سے چائے پی۔ پھر کماری نے ساڑھی کا پلوٹھیک سے سر پر جمایا اور اٹھ گئی۔

”میں کوارٹز میں جا رہی ہوں۔ آرام کروں گی۔ بی بی کو سونے دینا۔ حویلی کیا ہے پورا قلعہ ہے۔“

سیر کرتے کرتے میری تو اپنی پیس بول گئی۔

جواب میں بیلا مسکراتے ہوئے سر ہلا کر رہ گئی۔ کماری نے منہ سر لینا اور چھڑی پر بائیں ٹانگ کا وزن ڈالتی کمرے سے نکل گئی۔ بیلا اس کی پشت پر نظریں جمائے سوچتی ہی رہ گئی کہ کماری کا جسم اپنی عمر

”جی مونس بابو۔“ اس نے سر جھکا لیا۔ ”میں یہ کہہ رہی تھی کہ سوامی جی کے پاس بڑی مہمان شکتیاں ہیں۔ وہ جو کہتے ہیں ویسا ہی ہوتا ہے۔۔۔ تاہم راجیہ بی بی کی آتما کے معاملے میں میرا ذہن الجھ گیا ہے۔ میں سوچ رہی ہوں کہ اگر سوامی جی نے ان کی آتما کو حاضر کر لیا ہے تو وہ اس سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔“

”وہ چاہتے ہیں کہ ہم لوگ ان کی شکتیوں پر یقین کر لیں اور ان کے کہنے پر عمل کرتے ہوئے رزاقی اور راجیہ کا ملن کرانے پر تیار ہو جائیں۔“

بیلا کا دماغ ایک بار پھر گھوم گیا۔ ذرا دیر میں اسے یاد آ گیا کہ سوامی نے رزاقی بابو کے بارے میں کہا تھا کہ بہت جلد وہ سوامی کے کام کا منش بن جائے گا اور اسی کے ذریعے بستی میں مندر بننے کا کام سہل ہو جائے گا۔ تو کیا سوامی جی نے راجیہ بی بی کی آتما کو پر لوک سے اس لئے واپس بلوالیا تھا کہ رزاقی بابو پر اپنا وزن ڈال کر مندر کا کام آسان کر لیں؟ اس کے سارے بدن میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔

”کیا سوچ رہی ہو بیلا؟“ مونس نے اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کک۔۔۔ کچھ نہیں مونس بابو۔“ وہ گڑبڑا گئی اور نگاہیں جھکا لیں۔ ”سوامی جی کی شکتیوں کے بارے میں وچار کر رہی تھی۔ وہ مہمان ہیں۔ یہ تو میں بھی مانتی ہوں۔“

”بہر حال بیلا۔ ہم مسلمانونی کا ان باتوں پر ایمان نہیں ہے اور نہ ہمارا دل دماغ انہیں تسلیم کرتا ہے۔ ہاں تم سے اتنا ہی چاہتا ہوں کہ تمہیں ذرا سی بھی کسی ایسی بات کا علم ہو جس کا تعلق راجیہ سے ہو تو تم فوراً مجھے بتاؤ گی۔ اس سلسلے میں مجھے تمہارا تعاون۔۔۔“

”آپ کی آگیا کا پالن کرنے کا میں وچن دے چکی ہوں مونس بابو۔“ بیلا نے اس کی بات اچک لی۔ ”یہ تعاون کیا ہوتا ہے؟ میں نہیں جانتی۔ میں تو صرف یہ جانتی ہوں کہ آپ نے جو حکم دے دیا اس پر پہرہ دینا میرا دھرم ہے اور بس۔“

”میں تمہارا شکر یہ ادا کر کے تمہارا وزن کم نہیں کرنا چاہتا بیلا۔ تم میرے لئے ان حالات میں بہت اہم ہو گئی ہو۔“ مونس نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔ ”مجھے بہر حال میں رزاقی کو کسی بھی نئے حادثے سے بچانا ہے۔ چاہے اس کے لئے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔“

”آپ ہمیشہ مجھے اپنے چرنوں میں پائیں گے مونس بابو۔“ بیلا نے خلوص سے کہا تو جواب میں مونس بڑے دلاویز انداز میں مسکرایا۔ بیلا اس کی مسکراہٹ پر غائب ہو گئی۔ پھر جلدی سے اس نے نگاہ پھیر لی۔ ”کہیں میری نظر نہ لگ جائے۔“ اس کے دل سے ایک صدا ابھری اور اس نے تپائی پر پڑے چائے کے کپ کی جانب دیکھا۔ مونس نے اس کی نظر کا تعاقب کیا۔

”ارے۔ باتوں باتوں میں چائے کا خیال ہی نہ رہا۔ یہ تو برف ہو گئی ہوگی۔“

سے اس قدر کم کیوں لگتا ہے؟ پھر اس نے برتن ایک طرف سرکائے اور دیوار سے ٹیک لگانیم دراز ہوتے ہوئے کمرؤس سے آج کی ملاقات کے سرور میں ڈوب گئی۔

اسے یقین نہ آ رہا تھا کہ اس کے مونٹس بابو نے اسے اپنے اتنا قریب کر لیا ہے۔ اس پر اعتماد کا جو بوجھ مونٹس نے ڈالا تھا اسے سہارا اس کے لئے مشکل ہو رہا تھا۔ کبھی اسے سوامی کا خیال آتا تو وہ اندر ہی اندر کانپ جاتی۔ سوامی سے کچھ بھی چھپانا اور اسے اندھیرے میں رکھنا دیوانے کے خواب جیسی ہی بات تھی۔ اسے اگر بیلا اور مونٹس کی گفتگو کا علم ہو جاتا اور وہ یہ جان جاتا کہ بیلا نے اپنے تن من کے بعد آب دھرم ایمان بھی مونٹس کے نام کر دیا ہے اور اسے لاعلمی میں رکھ کر وہ مونٹس کے بتائے ہوئے راستے پر آنکھیں بند کر کے چل پڑنے کا فیصلہ کر چکی ہے تو وہ اس کا کیا حشر کرتا بیلا اس سے انجان نہیں تھی۔ مگر اسی بل مونٹس کا چہرہ روشنی کے جھپکے کی طرح اس کے دل و دماغ میں پھلپھڑی چھوڑ دیتا۔ تب سوامی کا وجود اسے بیدار حقیقت نظر آنے لگتا۔ سارا خوف سارا ڈر اس کی رگ رگ سے ہوا ہو جاتا۔ ایک طاقت سی لہویں دوڑ جاتی اور وہ مونٹس سے کئے ہوئے وعدے کے جھوٹے میں ہلارے لینے لگتی۔ کبھی اسے پنڈت کی شکل میں ایک ریچھ نظر آتا جو اس کا جسم نوچنے کے لئے رال پکاتا اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔۔۔ ایسے میں اسے کماری کی کبھی ہوئی بات اپنی گرفت میں لے لیتی۔ اس نے کہا تھا کہ اب کسی کا ہاتھ بیلا کی طرف نہیں بڑھنا چاہئے۔ بیلا کا جسم جان اب صرف اور صرف مونٹس بابو کی مانت ہے۔ کماری کی بات کا یاد آنا تھا کہ اس کے سارے جسم میں ایک نشہ بھرا گیا۔ روح ایسی ہلکی ہو گئی کہ وہ بیٹھے بیٹھے فضا میں پرواز کرنے لگی۔ اس فضا میں جہاں اس کے ساتھ مونٹس بابو کا خیال تھا۔ اس کی شبیہ تھی۔ ”بیلا۔۔۔ بیلا۔۔۔“

”پکارتی اس کی آواز کا خمار تھا۔ اس نے پلکیں موند لیں اور اپنے آپ سے بگاڑے ہو گئی۔ اپنے محبوب اپنے مونٹس بابو کے تصور میں یوں ڈوبتی چلی گئی جیسے کوئی شکستہ ناؤ اپنی مرضی سے خود کو گرداب کے حوالے کر دے۔“

ادھر کماری نے کوارٹر میں داخل ہو کر داغی دروازے کی اندر سے چٹنی چڑھائی اور سونے کے کمرے میں چلی آئی۔ یہاں بھی دروازہ بند کیا۔ اپنے بستر کے قریب پہنچی۔ چھڑی بستر کے سہارے ٹکا دی۔ بستر پر بیٹھ کر بائیں کونے سے گدا اٹھا کر موبائل نکالا۔ آن کیا۔

”نہیں۔۔۔“ چند سیکنڈ میں دوسری طرف سے رابطہ قائم ہونے کا سگنل مل گیا۔

”کماری از ہمیر۔“ کماری نے دوسری جانب سے آواز سن کر دبی زبان سے کہا اور پھر آواز اتنی نیچی کر لی کہ پاس بیٹھا شخص بھی بمشکل سن پاتا۔ پھر جب دو تین منٹ بعد اس نے موبائل آف کر کے اسے واپس گدے تلے چھپایا تو اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ کتنی ہی دیر تک بڑی بیدردی سے وہ اپنے خوبصورت ہونٹ کاٹتی رہی جیسے کسی دشمن کے نیچے ادھیڑ رہی ہو۔۔۔ پھر جب حواس نارمل ہوئے تو

اس نے اپنا پرس کھولا۔ اس میں سے ایک چھوٹی سی شیشی نکالی اور اس کا ڈھکن اتارتے ہوئے کچن میں چلی آئی۔

چھوٹی سی فریج کونے میں پڑی تھی۔ اس نے فریج سے دودھ کی کیتلی نکالی۔ شیشی میں سے دو قطرے سیال اس میں ملایا اور دودھ کو خوب ہلا کر کیتلی واپس فریج میں رکھ دی۔ شیشی کا ڈھکن بند کیا اور واپس آ کر پرس میں رکھی۔ پھر بستر پر لیٹ کر پلکیں موند لیں۔

آنے والے لمحات کے بارے میں سکون سے سوچنے کی ضرورت تھی اور یہ وقت اسے وافر میسر تھا۔ بیلا رات دس بجے سے پہلے لوٹنے والی نہیں تھی۔ تب تک وہ خوب آرام بھی کر سکتی تھی اور پلان بھی۔

☆=====☆=====☆

رزاتی، مونٹس اور بیلا کے ساتھ عجب آکھ بچولی کھیل رہا تھا۔

مونٹس سے کسی بات پر وہ بحث نہ کرتا اور بیلا کی ہر بات چپ چاپ مان لیتا۔ وہ اپنے طور پر اس کی طرف سے مطمئن تھے۔ رات دس بجے سے پہلے بیلا اس کی جان نہ چھوڑتی۔ اسے کھانے اور دوا کے بعد دودھ اور پھر سونے کے وقت پر کافی کا کپ سرو کر کے وہ صبح خوش خوش اٹھنے کی دعا دے کر رخصت ہو جاتی تو اس کی آزادی کا وقت شروع ہوتا۔

ان دنوں میں اس نے پوری کوشش کی کہ اس کی طبیعت کی خرابی مونٹس کی بی بی اور بیلا کو اس کی جانب متوجہ نہ ہونے دے۔ وہ خود کو سنبھالے رہتا۔ خاموشی کے پردے میں اپنی شکست و ریخت کو چھپائے رکھتا اور سمجھتا کہ سب اس کی جانب سے اطمینان کا سانس لے رہے ہیں جبکہ ایسا نہیں تھا۔ مونٹس کو اگر رزاتی کا سایہ ہونے کا دعویٰ تھا تو یوٹی نہیں تھا۔ وہ پل پل اس کے ساتھ سانس لیتا تھا۔ بیلا اسے ”سب اچھا“ کی رپورٹ دے رہی تھی اور اسے اس کی بات پر شک بھی نہ تھا تاہم وہ جانتا تھا کہ رزاتی جو اس قدر اطمینان خاموشی اور سکون کا مظاہرہ کر رہا ہے تو اس کی تہہ میں ایسی بے سکونی دم سادھے پڑی ہے جو کسی بھی وقت اضطراب کے طوفان میں بدل سکتی ہے۔ اسی لئے وہ مسلسل کسی ایسی تدبیر کی تلاش میں تھا جو رزاتی کی موجودہ الجھن کا مداوا کر سکے۔ ابھی تک اسے کوئی سراہا تھا نہ آیا تھا مگر وہ مایوس نہیں تھا۔ متواتر اپنی سی کئے جا رہا تھا۔ اسے اپنے رب واحد پر پورا بھروسہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے دل سے ہر وقت رزاتی کے لئے جو دعائیں نکلتی ہیں وہ رازِ گہاں نہیں جائیں گی۔ اس کے معبود کی طرف سے کبھی بھی ایسا لمحہ عطا ہو سکتا تھا جو ساری گفتگو کا غبار دھو کر ساتھ لے جاتا اور اس عجیب و غریب صورتحال کا تدارک ہو جاتا جس نے اسے رزاتی سے زیادہ نہیں تو اس جیسا ہی بیکل ضرور کر رکھا تھا۔

آج بھی بیلا کافی کا کپ اس کے سر ہانے تپائی پر رکھ کر مسکراتی ہوئی بولی۔

”میری بھگوان سے پرا تھنا ہے رزاتی بابو کہ صبح آپ جاگیں تو آپ کے جیون میں پھر سے بہار

کیوں تھا؟ اس کی آنکھیں واہو گئیں۔ اسے ہلکی ہلکی سردی محسوس ہو رہی تھی اور اسی احساس نے اسے نیند یا غنودگی سے جدا کر دیا تھا۔

کمرے میں پھیلی مدھم سی سبز روشنی میں اس نے گردن گھما کر پاؤں کی جانب دیکھا۔ کبل کی تہہ برابر تھی۔ یعنی آج اس نے کبل کھولا ہی نہ تھا۔ رات کا پچھلا پہر شروع ہوا تو سردی کی لہر نے اسے کپکپا کر بیدار کر دیا تھا۔ کابلی سے کبل کھینچ کر اس نے جسم پر ڈالا اور دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ پیاس اب بھی شدید تھی مگر اس کا جی نہ چاہ رہا تھا کہ ہاتھ بڑھا کر تپائی پر پڑے پانی کے گلاس سے اپنی تشنگی دور کر لے۔

پھر دوبارہ غنودگی کی باہوں میں سمٹ ہی رہا تھا کہ اس کی قوتِ شامہ سے ایک جانی پہچانی خوشبو نکرائی۔ چند لمحے وہ نیم خوابی کے عالم میں اس مہک کے جھولے میں ہلکورے لیتا رہا جو اس کے شعور میں دھیرے دھیرے اپنے کچھ کھول رہی تھی۔ اس نے دو تین گہرے گہرے سانس لئے اور جیسے اس خوشبو کو رگ رگ میں اتار لینا چاہا پھر چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

یہ خوشبو یہ مہک۔۔۔ اس کا ذہن پوری طرح بیدار ہو گیا۔ دل زور سے دھڑکا اور دماغ میں ابھرتے خیال کی تان باندھی۔ کمرے کا ماحول یکدم بیدار ہو گیا تھا۔ اس نے اٹھنا چاہا مگر ایک دم پتھر کے پست کی طرح سہکتا و صامت ہو گیا۔

کھلے بالوں، سوگوار چہرے کے ساتھ سفید ساڑھی میں لپٹے وہ کمرے کے کھلے دروازے کے قریب، بستر کی پائنتی کی جانب کھڑی اسے والہانہ انداز میں دیکھ رہی تھی۔ یوں جیسے اسے اس کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہ ہو۔ وہ کب سے وہاں تھی رزاقی نہ جانتا تھا۔ کم از کم پندرہ فٹ کی دوری تھی رزاقی کے اور اس کے درمیان مگر وہ اس کے ملیج چہرے کے ہر تاثر کو بخوبی جانچ سکتا تھا۔

راجیہ اداس تھی۔ دل گرفتہ تھی۔ پریشان تھی۔ اس کی جانب مگر اس نے آنکھیں لبالب نہیں لگتا تھا کسی بھی لمحے آنسو اس کے رخساروں کو شبنم آلودہ کر دیں گے۔

راجیہ کے جسم سے اس کی پسندیدہ خوشبو کی بھینی بھینی مہک رزاقی کی جانب کسی تھکے ہوئے مسافر کی طرح رواں تھی۔ یہ مہک یہ خوشبو رزاقی کے تن من میں رچی بسی تھی۔ اسے وہ کیسے بھول سکتا تھا۔ کیسے فراموش کر سکتا تھا۔ پروفیسی، راجیہ کی پسندیدہ خوشبو تھی جو اس وقت بھی اس کے جسم کو ہالے میں لئے ہوئے تھی۔

رزاقی کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ بے یقینی اور یقین کی وہی کیفیت ایک بار پھر اس کے حواس پر چھا گئی جس نے ہولی کے دن اسے جکڑ لیا تھا۔ اسے لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے لیکن یہ کیسا خواب تھا جو اس کی روح کو جھوٹو رہا تھا۔ اس کی رگ رگ میں سنسناء پیدا کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں

آچکی ہو۔“

جواب میں رزاقی نے اسے تشکر سے دیکھا اور ہاتھ کافی کی طرف بڑھا دیا۔ بیلا کمرے کا دروازہ بھیڑ کر رخصت ہو گئی اور وہ کافی کے سپ لینے لگا۔ بیلا کے ہاتھ کی بنی ہوئی یہ کافی اسے ایسا سکون مہیا کرتی تھی کہ وہ کچھ دیر کے لئے ہی سہی عجیب سی غنودگی اور بے خودی کی وادی میں اتر جاتا تھا۔ یہ وقفہ دو سے تین گھنٹوں پر محیط ہوتا تھا۔ اس کے بعد اس کی آنکھ کھل جاتی اور باقی ساری رات یادوں کے خاردار بستر پر کروٹیں بدلتے گزر جاتی۔

آج بھی حسب معمول کافی کا کپ خالی کر کے اس نے تپائی پر رکھا۔ ٹائٹ بلب جلانے کے لئے ہاتھ بندھ سوچ کی طرف بڑھایا۔ ٹیوب بجھ گئی اور کمرے میں سبز روشنی کا پُرسکون اور خواب آلود نور پھیل گیا۔ اس نے بستر پر دراز ہونا چاہا کہ رک گیا۔ کھڑکیاں کھلی تھیں مگر پردے نہ گرائے گئے تھے۔ شاید بیلا بھول گئی تھی۔

وہ بستر سے اتر کر کھڑکی کے پاس جا کر پردے کھولے اور انہیں پھیلا نا چاہا کہ اس کی نظریں دور کھیتوں سے پار بڑھ کر وہ عجیب شان بے نیازی سے سر اٹھائے، بقعہ نور بنی مسجد پر جم گئیں۔ اسے لگا جیسے وہ زبان خاموشی اسے اپنی طرف بلا رہی ہو۔ اسے صدا میں دے رہی ہو۔ اس کی جانب باہیں پھیلائے ہوئے ہو۔ بہت زیادہ کتنی ہی دیر جان خدا کو تھارہا۔ پردوں کو تھا اسے اس کے ہاتھ لڑاں جسم کو سہارا دیے ہوئے تھے۔ اور وہ بے خودی کے عالم میں مسجد کو دیکھ جاتا تھا۔

ہوا کا ایک سرد جھونکا اس کے بدن سے نکرایا تو وہ دھیرے سے چونکا۔ تب اس نے پردے پھیلا کر پلٹنا چاہا تو نظریں کانٹوں پر پڑی راجیہ اور جنت کی تصویر پر جم گئیں مگر یہ کیا۔۔۔ اسے تصویر صاف دکھائی نہ دے رہی تھی۔ دھندلی دھندلی، کہہ میں لپٹی تصویر کو اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا چاہا۔ ناکامی ہوئی تو اس نے آنکھیں مسل ڈالیں۔۔۔ اور تب اس پر کھلا کہ اس کی آنکھوں میں تو نمکین پانی کا سیلاب اتر ا ہوا تھا۔ یہ غم غبار اسے کچھ بھی صاف دیکھنے نہ دے رہا تھا۔ ہچکیاں لیتا ہوا وہ لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھا اور بستر پر گر پڑا۔ بچوں کی طرح روتا ہوا وہ کب تک سکتا رہا اسے کچھ علم نہ تھا۔ ہاں کمرے میں ہلکورے لیتی بیدار ہلکی سبز روشنی نے یہ ضرور دیکھا کہ جب رزاقی کی سسکیاں رکیں تو وہ بستر پر بے سدھ چپ پڑا تھا اور اس کی آنکھوں کے گوشے اب بھی نم تھے۔

معمول کا تقریباً ڈھائی تین گھنٹوں کا وقفہ گزرا تو غیر اختیاری طور پر رزاقی کے جسم کو جنبش ہوئی۔ اس نے کراہ کر روٹ بدلی اور کسی نیم جاں کی طرح پھر بے حس و حرکت ہو گیا۔ چند لمحے اسی عالم میں گزر گئے۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ پیاس کے مارے کانٹے آگے آئے تھے حلق میں۔

آہستہ آہستہ حواس نے اس کا ہاتھ تھاما تو اسے کسی بھولی ہوئی بات کی طرح یاد آیا کہ وہ جاگا

کی آواز بھگ گئی۔ ٹوٹ گئی۔

”نہیں بی بی نہیں۔۔۔ وہ ابھی آئی تھی میرے کمرے میں۔۔۔ مجھ سے ملنے۔۔۔ اس نے مجھے صاحب کہہ کر پکارا بی بی۔۔۔“ رزاتی نے مسلسل ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر بی بی کی گرفت سے نکل گیا اور بے بس سا ہو کر لان سے گیٹ کی طرف دوڑ پڑا۔

”باؤ۔۔۔ باؤ بیٹا۔۔۔“ بی بی بھی اس کے پیچھے لپکی۔ گیٹ باہر سے بند تھا۔ رزاتی نے اسے زور زور سے دھڑ دھڑایا تو چوکیدار نے باہر سے گیٹ کھول دیا۔

”جی صاحب۔۔۔“ گن ہاتھ میں تھا مے چوکیدار نے چھوٹا دروازہ کھول کر اس کی جانب دیکھا۔

”کیا ابھی کوئی یہاں سے باہر گیا ہے افضل؟“ رزاتی نے جلدی سے پوچھا۔

”نہیں تو صاحب۔“ افضل نے اس کی حالت پر گہرا کر جواب دیا۔

”تمہیں پورا یقین ہے؟“ رزاتی نے اسے ابلی پڑتی آنکھوں سے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

”جی صاحب۔ میں مسلسل یہاں موجود ہوں۔ یہاں سے کوئی باہر نہیں گیا۔“

اسی وقت بی بی آن پہنچی۔ اس نے رزاتی کو بازو سے تھاما اور افضل سے کہا۔ ”تم گیٹ بند کرو اور دھیان سے ڈیوٹی دو۔ کوئی باہر جائے آئے تو اسے روک کر اندر اطلاع کرنا۔“

”جی بی بی۔“ افضل نے ادب سے جواب دیا اور بی بی کے اشارے پر گیٹ بند کر لیا۔

”اوہ۔۔۔“ رزاتی نے سر کے بال نوچ لئے۔ ”بی بی۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ راجیہ ابھی کچھ دیر پہلے میرے پاس موجود تھی۔ اس کی پسندیدہ خوشبو کی مہک اب تک میرے کمرے میں محسوس ہو رہی ہو گی۔ تم آؤ میرے ساتھ۔“ وہ بی بی کا ہاتھ تھامے اسے ساتھ لئے واپس پلٹا۔ بی بی نے کچھ کہنا چاہا مگر پھر کچھ سوچ کر ہونٹ بھینچ لئے اور کسی معمول کی طرح اس کے ساتھ گھسٹی چلی گئی۔

کمرے میں پہنچ کر رزاتی بستر کے پاس رک گیا اور آنکھیں بند کر کے گہرے گہرے سانس لینے لگا جیسے کمرے کی فضا سے پروفیسی کی مخصوص مہک اپنے نفس میں جذب کر لینا چاہتا ہو۔ بی بی نے بڑی کوشش کی کہ اسے راجیہ کی پسندیدہ خوشبو کا ادراک ہو سکے مگر نام کام رہی۔ اس نے اپنے حواس کو دھوکا دینے کے لئے خود کو یقین دلانا چاہا کہ رزاتی سچ کہہ رہا ہے مگر اسے اس خود فریبی کی کوشش میں بھی کامیابی نہ ہوئی۔

”دیکھو بی بی۔۔۔ محسوس کرو۔ پروفیسی کی مہک اب تک کمرے میں موجود ہے۔ ہے ناں؟“ وہ

پگلوں کے انداز میں بی بی کا ہاتھ تھام کر بولا تو حلق میں اترتے نمکین پانی کو گھونٹ گھونٹ پیتی بی بی کا سر بے اختیار اثبات میں ہل گیا۔

”دیکھو بی بی۔۔۔ محسوس کرو۔ پروفیسی کی مہک اب تک کمرے میں موجود ہے۔ ہے ناں؟“ وہ

پگلوں کے انداز میں بی بی کا ہاتھ تھام کر بولا تو حلق میں اترتے نمکین پانی کو گھونٹ گھونٹ پیتی بی بی کا سر بے اختیار اثبات میں ہل گیا۔

”دیکھو بی بی۔۔۔ محسوس کرو۔ پروفیسی کی مہک اب تک کمرے میں موجود ہے۔ ہے ناں؟“ وہ

پگلوں کے انداز میں بی بی کا ہاتھ تھام کر بولا تو حلق میں اترتے نمکین پانی کو گھونٹ گھونٹ پیتی بی بی کا سر بے اختیار اثبات میں ہل گیا۔

”دیکھو بی بی۔۔۔ محسوس کرو۔ پروفیسی کی مہک اب تک کمرے میں موجود ہے۔ ہے ناں؟“ وہ

پگلوں کے انداز میں بی بی کا ہاتھ تھام کر بولا تو حلق میں اترتے نمکین پانی کو گھونٹ گھونٹ پیتی بی بی کا سر بے اختیار اثبات میں ہل گیا۔

”دیکھو بی بی۔۔۔ محسوس کرو۔ پروفیسی کی مہک اب تک کمرے میں موجود ہے۔ ہے ناں؟“ وہ

پگلوں کے انداز میں بی بی کا ہاتھ تھام کر بولا تو حلق میں اترتے نمکین پانی کو گھونٹ گھونٹ پیتی بی بی کا سر بے اختیار اثبات میں ہل گیا۔

”دیکھو بی بی۔۔۔ محسوس کرو۔ پروفیسی کی مہک اب تک کمرے میں موجود ہے۔ ہے ناں؟“ وہ

پگلوں کے انداز میں بی بی کا ہاتھ تھام کر بولا تو حلق میں اترتے نمکین پانی کو گھونٹ گھونٹ پیتی بی بی کا سر بے اختیار اثبات میں ہل گیا۔

میں ایک ایسی حقیقت کی طرح جذب ہوتا جا رہا تھا جسے تسلیم نہ کرنے کے لئے اب اس کے پاس کوئی دلیل نہ تھی۔

”صاحب۔۔۔“ ایک درد بھری سرگوشی راجیہ کے لبوں سے آزاد ہوئی اور اس نے سسک کر باہیں اس کی طرف پھیلا دیں۔

”راجیہ۔۔۔“ رزاتی کے جسم کو جھٹکا سا لگا۔ اس نے اپنی جگہ سے حرکت کرنا چاہی۔ بستر سے اٹھنا چاہا مگر اسی وقت راجیہ نے بلک کر باہیں سمیٹ لیں۔ اس کی آنکھوں نے موٹے موٹے آنسو اگل دیے۔ آزاد ہونے کو بیتاب آہوں کو کانپتے لبوں میں سمیٹے وہ اٹنے پاؤں پیچھے ہٹی۔ کھلے دروازے سے باہر نکلی اور کارڈور کے اندھیرے میں گم ہو گئی۔

”راجیہ۔۔۔“ رزاتی کے ہونٹوں سے بے اختیار نکلا۔ وہ لرزتا کانپتا تیزی سے بستر سے اترتا اور دروازے کی جانب بھاگتا مگر اس کا پاؤں کبل میں الجھ گیا۔ دوسرے ہی قدم پر وہ منہ کے بل قالین پر گر پڑا۔ ہاتھوں کو فرش پر نہ ٹیک لیتا تو اس کا چہرے کا بھر تہ بن گیا ہوتا۔ کبل سے پاؤں نکال کر اس نے اٹھنے میں دیر نہ لگائی اور گرتا پڑتا دروازے سے باہر آ گیا۔ کارڈور کی لائٹیں آن کیں اور دائیں بائیں بے کل نظریں دوڑائیں۔۔۔ مگر وہاں کیا تھا؟

”راجیہ۔۔۔“ راجیہ۔۔۔ وہ یونانی کے عالم میں پکارتا ہوا بائیں طرف دوڑتا چلا گیا۔ بی بی کے کمرے کے سامنے سے گزرا تو اس کا دروازہ کھلا۔ بی بی نے باہر بھاگنا۔ وہ تہہ پر تہہ رہی تھی کہ دروازے کی

”راجیہ راجیہ“ کی پکار سن کر جلدی سے سلام پھیر کر باہر نکل آئی۔ اب اسے اس طرح ہوش و حواس سے بیگانہ کارڈور میں بھاگتے دیکھا تو اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ پھر اسے کچھ نہ سوجھا تو وہ بھی اس کے پیچھے لپکی۔ بوڑھی جان بھاگ تو نہ سکتی تھی مگر اس وقت جیسے اس کے پیروں میں پتھک لگ گئے تھے۔ وہ چادر سنبھالتی بانٹنی کانٹنی کارڈور سے باہر برآمدے میں اور وہاں سے مردانے میں چلی آئی۔

رزاتی کو اس نے لان میں ادھر ادھر پاگلوں کی طرح بھاگتے اور راجیہ راجیہ کی صدا سنیں دیتے دور ہی سے دیکھ لیا۔ وہ بھی اسے آوازیں دیتی کسی بیتاب روح کی طرح اس کے قریب پہنچی تو اس کا سانس پھول چکا تھا اور تنفس دھونکی کی طرح چل رہا تھا۔

”باؤ۔۔۔ بیٹا۔۔۔ کیا ہوا؟ باؤ بیٹا۔۔۔“ بی بی نے جاتے ہی اسے بازوؤں سے تھام لیا۔

”بی بی۔۔۔ راجیہ۔۔۔ راجیہ۔۔۔“ رزاتی کسی باولے کی طرح متوحش نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا جیسے کسی کو تلاش کر رہا ہو۔ اس کا سانس چڑھا ہوا تھا۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھیں مشعل جیسی لودے رہی تھیں اور سارا جسم بید مجنوں کی طرح لرز رہا تھا۔

”کہاں ہے راجیہ بیٹا؟“ بی بی کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا۔ ”وہ تو۔۔۔“ کہتے کہتے بی بی

”کہاں ہے راجیہ بیٹا؟“ بی بی کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا۔ ”وہ تو۔۔۔“ کہتے کہتے بی بی

”کہاں ہے راجیہ بیٹا؟“ بی بی کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا۔ ”وہ تو۔۔۔“ کہتے کہتے بی بی

”کہاں ہے راجیہ بیٹا؟“ بی بی کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا۔ ”وہ تو۔۔۔“ کہتے کہتے بی بی

”کہاں ہے راجیہ بیٹا؟“ بی بی کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا۔ ”وہ تو۔۔۔“ کہتے کہتے بی بی

”نہیں بیٹا۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔۔۔“

”تو کھاؤ میری قسم کہ تمہیں میری بات کا یقین ہے۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”کیوں؟ تیری قسم کیوں کھاؤں؟“ بی بی نے تڑپ کر کہا۔ ”تیری آئی خود پر کیوں نہ لے لوں۔“

”مجھے پتہ ہے بی بی۔ مجھے پتہ ہے۔“ اس نے بی بی کے ہاتھ تھام کر ہونٹوں سے لگا لئے۔ ”میں

جانتا ہوں کہ تم اور مولس میرے لئے جان بھی دے سکتے ہو۔ میری خوشی کے لئے اپنی جانوں کی جھوٹی قسم

کھا سکتے ہو۔۔۔ مگر میں جھوٹ نہیں کہہ رہی بی بی۔ راجیہ آئی تھی۔“

”باؤ۔۔۔“ بی بی نے خود پر قابو پاتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔ ”بیٹا۔ تو راجیہ سے جتنی محبت

کرتا ہے ناں۔ اس کی شدت سے اس کی پیش سے کون واقف نہیں۔۔۔ اور میں سچ کہوں تو اب میری

سمجھ میں ایک بات آرہی ہے۔ راجیہ واقعی یہاں آئی ہوگی۔“ بی بی نے ہر خیال لہجے میں کہا۔

”کیسے بی بی۔ اب یہ کیسے کہہ سکتی ہو تم؟“ رزاتی نے اس کی جانب امید بھری تائید چاہنے والی

نظروں سے دیکھا۔

”بیٹا۔ وہ بھی تجھ سے اتنی ہی محبت کرتی تھی جتنی تو اس سے کرتا ہے۔ وہ آئی ہوگی ضرور آئی ہوگی

مگر تیرے خواب میں۔“

”خواب میں؟“ رزاتی بڑبڑایا۔ ”نہیں بی بی۔۔۔ وہ خواب نہیں تھا۔۔۔“

”دلوں میں بسنے والوں کی یادیں جب جب خیالوں پر شخاں مارتی ہیں ناں بیٹا تو خوابوں پر بھی

حقیقت کا کمان ہوتا ہے۔ میری بات پر زیادہ غور نہ کر۔ اپنے خواب کو زیادہ کریدنے کی کوشش نہ کر۔ بس

یہ سمجھ لے کہ راجیہ بھی وہاں اتنی ہی بے کل ہو رہی ہے جتنا تو یہاں۔ اسے تیری محبت نے تیرے خواب

میں یوں آنے پر مجبور کر دیا ہے کہ تیرا خیال اسے حقیقت مان لینے پر تل گیا ہے۔“

”مگر بی بی۔۔۔“ رزاتی کا یقین بھی ڈانواں ڈول ہو گیا۔

”کچھ مت کہہ۔ کچھ مت سوچ۔ بس آنکھیں بند کر اور سو جا۔ شاید وہ دوبارہ پھر تیرے خوابوں

میں آنا چاہ رہی ہو مگر بیٹا اب کے وہ آئے تو ایسی دیوانگی مت دکھانا کہ وہ تیری بار آنے سے رہ جائے۔

۔۔۔ وہ کیسے چاہے گی کہ تیری باتیں اور حالت لوگوں کے سامنے تجھے ہوش و حواس سے بیگانہ ثابت کر

دیں۔ میری بات سمجھ رہا ہے ناں۔“

”ہاں بی بی۔“ دھیرے سے رزاتی نے کہا۔ اسے بی بی کی باتوں پر یقین سا ہونے لگا تھا۔ ساتھ

ہی یہ خوف اس کے ذہن پر چھا گیا کہ واقعی اس کی حالت کہیں اسے لوگوں کے ساتھ ساتھ اپنی نظروں

میں بھی پگھلا نہ بنادے۔

بی بی نے اس کا ہاتھ چوما۔ سر پر ہاتھ پھیرا اور کھڑکیاں بند کر کے کمرے سے نکل گئی۔ کمرے کا

رزاتی کی دیوانگی پر اس کا جی چاہ رہا تھا وہ چھین مار مار کر روئے۔ اسے باہوں میں لے کر اس کا

ہاتھ چومے اس کی آنکھوں کو بوسے دے اور کہے۔ ”پگھلے۔ راجیہ جہاں چلی گئی ہے وہاں سے لوٹ کر کبھی

کوئی واپس نہیں آتا۔ تو کیوں خود کو اس کی محبت میں ہلکان کر رہا ہے؟ خود کو سنبھال بیٹا ورنہ تیری دیوانگی

تجھے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دے گی۔۔۔“ مگر وہ چپ چاپ رزاتی کی آنکھوں میں دیکھنے کے سوا

کچھ بھی نہ کر سکی۔

”میں سمجھ گیا بی بی۔“ اس کی آنکھوں میں تیرتی بے یقینی کو جیسے رزاتی کے پگلے پن نے پڑھ لیا۔

”تمہیں میری بات کا یقین نہیں آیا۔“ اس کے لہجے میں شکستگی اتر آئی۔ ”اور یقین آئے گا بھی کیسے؟

راجیہ تو مجھ سے ملنے آئی تھی۔ مجھے صاحب کہہ کر پکارا تھا اس نے۔ میرے لئے روٹی تھی وہ۔ تم نے تو

اسے دیکھا ہی نہیں پھر تم کیسے اس کی مہک کو محسوس کر سکو گی بی بی۔ کیسے اس کی آمد تمہیں یقین کا احساس

دلا سکے گی۔۔۔“ بڑبڑاتے ہوئے اس نے بی بی کے ہاتھ چھوڑ دیے اور بستر پر گر سا پڑا۔

”باؤ بیٹا۔۔۔“ بی بی نے ایک قدم آگے بڑھ کر اس کا سر بازوؤں کے بالے میں لے کر سینے

سے لگا لیا۔ ”مجھے تیری ہر بات کا اعتبار ہے مگر بیٹا۔۔۔“ اس کی آواز سسکی میں ڈھل گئی۔

”مرنے والے لوٹ کر نہیں آیا کرتے۔۔۔ یہی ناں۔“ رزاتی نے بڑے زخمی لہجے میں کہا۔

”مگر بی بی۔۔۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ وہ آئی تھی۔ راجیہ آئی تھی۔ راجیہ آئی تھی۔“ وہ ہلک پڑا۔ بچوں کی

طرح۔

جواب میں بی بی نے بے کل ہو کر اس کے سر پر کتنے ہی بوسے دے ڈالے۔ اس کے منہ بھرے

آنسو رزاتی کے بالوں میں قطرہ قطرہ جذب ہوتے چلے گئے۔ اس کی ہچکیاں اس کے سینہ ڈکار ہونے کی

گواہی دے رہی تھیں۔

کتنی ہی دیر بعد جب ان کی دھڑکنوں میں ٹھہراؤ آیا تو بی بی نے اسے بستر پر لٹا کر کمر باندھا

اور اس کے پاس سے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ”میں مولس کو بلواتی ہوں۔“

”نہیں بی بی۔ اسے نہ بلوانا۔“ رزاتی نے بیٹابی سے کہا تو بی بی واپس بیٹھ گئی۔ ”وہ بھی پریشان ہو

گا۔ پہلے ہی اسے میری بہت فکر ہے۔ اور بے کل ہو جائے گا۔ ویسے بھی اسے تمہاری طرح میری بات پر

یقین نہیں آئے گا۔“ وہ بیچارگی سے بولا تو بی بی نے تڑپ کر اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے لیا۔

”بی بی صدقے۔ ایسا کیوں کہتا ہے تو۔ لے۔ میں اپنی قسم کھاتی ہوں کہ جو تو نے کہا مجھے اس پر

اعتبار ہے۔“

”جھوٹ بی بی۔“ وہ بی بی کی آنکھوں میں دیکھ کر بڑے پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔ ”میں

جانتا ہوں تم یہ صرف میری محبت میں میری تسلی کے لئے کہہ رہی ہو۔“

دروازہ بند ہوا تو راقی نے بھی آنکھیں موند لیں۔ اس امید پر کہ اگر وہ خواب تھا تو شاید راجیہ دوبارہ اس کے خوابوں میں چلی آئے۔ شاید۔۔۔!

☆=====☆=====☆

بی بی اپنے کمرے میں پہنچی تو اندر بیٹا بی سے ٹہکتے مونس کو دیکھ کر ٹھک گئی۔
 ”مونس۔ تم یہاں۔ اس وقت؟“ وہ دروازہ بند کر کے اس کی جانب بڑھی۔

”ہاں بی بی۔ مجھے افضل نے بتایا کہ رزاقی کی حالت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ کیا ہوا اسے؟ میں جب پہنچا تو اندر سے تمہاری اور اس کی باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے اندر جانا مناسب نہ سمجھا اور یہاں آ گیا۔ اب تم بتاؤ۔ کوئی خواب دیکھا کیا اس نے؟“ وہ ایک ہی سانس میں اپنی پریشانی کا باب پڑھتا چلا گیا۔

جواب میں بی بی نے اسے ساری بات تفصیل کے ساتھ سنادی۔ مونس اس دوران مسلسل ٹہکتا اور خاموش رہا۔ جب بی بی اپنی بات ختم کر چکی تو اس نے اپنے قدم روک لئے۔ بی بی کے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے ایسی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا جن میں تفکر ہی تفکر تھا۔

”بی بی - رزاقی کی یہ حالت کسی اچھی علامت کا اظہار نہیں ہے۔“ اس نے سسے ہوئے لہجے میں کہا۔
 ”میں سمجھتی ہوں سوسن لیکن اس نے راجیہ کی جدائی کو دل کا روگ بنا لیا ہے۔ اب وہ ایک خواب
 کو حقیقت سمجھ کر کہہ رہا ہے۔“
 ”نہیں بی بی - یہ محض خواب نہیں ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ باؤ بچ کھڑا ہے۔“ بی بی نے اچھے اور خوف کی ملی جلی کیفیت کے تحت کہا۔
 ”نہیں۔“ مونس نے چاہا کہ ہولی والے دن کا سارا قصہ اس کے گوش گزار کر دے مگر بی بی کی حالت دیکھ کر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ بی بی شاید اس کی بات سن کر برداشت نہ کر پاتی اور کسی ایسے ڈر اور سہمنا کی کاٹھار ہو جاتی جو بعد میں کوئی نئی الجھن کھڑی کر دیتا، اس لئے اس نے بات کا رخ بدل دیا۔
 ”ایسی بات نہیں ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ رزاقی نے راجیہ کے خیال کو اس طرح خود پر سوار کر لیا ہے کہ اسے اب اپنا تصور بھی حقیقت لگنے لگا ہے۔ خواب اور خیال نے مل کر اسے یقین دلا دیا ہے کہ اس نے جو دیکھا وہ سچ ہے۔ راجیہ واقعی اس سے ملنے آئی تھی۔“

”یہی بات میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتی آئی ہوں بیٹا مگر وہ کسی طرح یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ اس نے کوئی سپنا دیکھا ہے۔ میں نے تمہیں بتایا ناں کہ وہ تو راجیہ کی پسندیدہ خوشبو کو کمرے میں محسوس کرنا چاہ رہا تھا مگر۔۔۔۔“

میں سمجھتا ہوں بی بی کہ فوری طور پر ہمیں ڈاکٹر احسن کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے رزاقی کو کسی

ہل شیٹن پر بھیج دینا چاہئے۔ یہاں کے ماحول سے کٹ کر اس کی حالت سنبھل جانے کے چانسز ہیں۔ یہاں رہ کر تو اس کی طبیعت بد سے بدتر ہوتی جائے گی۔“

”مگر وہ کسی کی بات مانے بھی۔ میں نے کوشش نہیں کی یا تم نے۔ اب میں اور کس طریقے سے اسے یہاں سے جانے پر راضی کروں یہ میری سمجھ نہیں آتا۔“

”ارے ہاں بی بی۔ آج بیلا کہاں ہے؟ میں نے اسے رات کو بھی یہیں رہنے کو کہا تھا تاکہ ایسی کسی بھی صورتحال میں وہ آپ کے ساتھ مل کر رزاقی کو سنبھال سکے یا مجھے خبر کر سکے۔“

”بیٹا۔ وہ آج کئی راتوں سے مسلسل جاگ کر باؤ کی دیکھ کر رہی تھی۔ میں نے ہی اسے آج کو ارڈر جا کر آرام کرنے پر مجبور کر دیا اور ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا کہ باؤ کی یہ حالت وہ نہ دیکھ سکی ورنہ بات حویلی سے باہر نکل جاتی تو باؤ کو کڑھوشمند کن کہتا۔“

مولس کو بی بی کی بات میں وزن محسوس ہوا۔ بہتر یہی تھا کہ بیلا رزاقی کی دیوانگی کی گواہ نہ ہوتی۔ مولس سے اس کی جو بات چیت ہوئی تھی اس کے بعد امکان تو نہیں تھا کہ وہ کسی سے رزاقی کے بارے میں کوئی بات کرتی مگر بی بی کو اس گفتگو کا راز دار بنانا اسے مناسب نہ لگا، اس لئے وہ اگلی بات گول کر گیا۔

”بہر حال بی بی رزاقی سے ایک بار اور بات کرنا لازم ہو گیا ہے۔ اے کسی بھی طرح یہاں سے دوڑ بھجوانا بہت ضروری ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ وہ مان جائے۔“

”اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو۔“ بی بی نے دعا کی لہجے میں کہا۔

”اچھا بی بی۔ میں چلتا ہوں۔ رات بہت بیت گئی۔“

”اچھا بیٹا۔“ بی بی نے اسے شکر سے دیکھا۔ ”اللہ کرے تمہاری کوششیں بار آور ہوں۔“

”انشاء اللہ ایک دن ایسا ضرور ہوگا جی بی۔ بس آپ دعا کرتی رہا کریں۔“ مونس نے سر پر پیار لیا اور کمرے سے نکل گیا۔ جی بی نے دروازہ بند کرنے سے پہلے چاہا کہ ایک نظر رزاتی کو جا کر دیکھ آئے مگر پھر کچھ سوچ کر رک گئی۔ کچھ دیر بعد وہ پھر اپنے خالق کے حضور رُکوع و سجود میں مصروف ہو گئی مگر اس کا ذہن تب بھی رزاتی میں اٹکا ہوا تھا۔

☆=====☆=====☆

نندکار، سوامی دھیرج داس کے پاؤں داب رہا تھا۔ پنڈت گردھاری لال کسی مرل بھینے کی طرح سر جھکائے، آنکھیں بند کئے پاس ہی اپنی چوکی پر براجمان بڑے بڑے منکوں کی مالا گھمار رہا تھا مگر اس کے کان سوامی اور نندکار کی طرف ہی تھے۔

”ہوں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف تین آدمی تیار کر سکا ہے ثواب تک۔“ سوامی

کرتے کی جیب سے موبائل نکالا جو بالکل ویسا ہی تھا جیسا کماری کے پاس۔ صرف رنگ کا فرق تھا۔ کماری کے موبائل کی باڈی براؤن کلر کی تھی اور سوامی کا موبائل سیلٹی رنگ کا تھا۔ ایک نمبر ملا کر اس نے موبائل کان سے لگالیا اور رابطہ قائم ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

☆=====☆=====☆

سوچ سوچ کر مونس کا دماغ پلپلا ہوا گیا مگر الجھن جوں کی توں سامنے کھڑی تھی۔ وہ رزاتی کے معاملے میں کیا کرتا؟ کیا نہ کرتا؟ اسے کچھ سمجھ نہ آ رہی تھی۔ سوامی کا کردار پل پر اسرار ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے راجیہ کی روح کی شکل میں جو پینتر امارا تھا اس کا تو مونس کو ابھی تک نہ سوجھا تھا۔ ایک بات تو طے تھی کہ مونس کو راجیہ کی روح کے لوٹ آنے کی بکواس پر ہرگز ہرگز یقین نہ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ سب شعبہ بازی ہے۔ سفلی علوم، جہتر منتر اور تانترا ترک و دیاؤں کے ذریعے سوامی جیسے جملہ عوام الناس کو بے وقوف بنانے کا دھند اصدیوں سے جاری رکھے ہوئے تھے اور رزاتی کا دماغ آج کل جس کمزوری کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اس پر سوامی کے کسی بھی چھل کپٹ کا اثر ہو جانا سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ سمجھ میں تو اس کی یہ نہ آ رہا تھا کہ وہ رزاتی کو اس دن بدن مضبوط ہوتے جال سے کیسے نکالے اور آنے والے وقت میں اس کے ریشمی تانے پانے سے اسے کیسے بچائے؟

بیلا کو ایک حد تک ہی اعتماد میں لیا جاسکتا تھا اور وہ مناسب حد تک اسے اپنے لئے کام کرنے پر تیار کر چکا تھا۔ اس سے آگے اسے اپنا راز دلانا بنانے کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے ہاتھ کاٹ کر اس کے حوالے کر دیتا۔ رزاتی کی ذہنی صحت درست نہ رہنے کی بات حویلی سے نفی تو کوٹھوں چڑھ جاتی اور پھر اسے کسی بھی بانس کی مدد سے واپس نیچے اتارنا ممکن نہ ہوتا۔ زندگی کا خیال آیا تو وہ اسے اپنے لئے بالکل ہی بیکار لگی۔ ایک ڈھکوسلے کے نام پر قائم مذہب کے افراد پر بھروسہ کرنا اسے خطرے سے خالی نظر نہ آیا۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ کتنا بھی اچھا سلوک کر لیتا، کتنا بھی انہیں اپنے قریب کر لیتا، تاریخ کے صفحات پر بکھرے ہوئے ہندو یہودی خدایوں، خود غرضیوں اور طوطا چشمیوں کے قصوں کو کیسے بھول جاتا!

وہ سوچ سوچ کر سر سے پاؤں تک سراپا دردین گیا۔ تب اسے چائے کی طلب نے بے حال کر دیا۔ ”اگر اس وقت گرم گرم چائے کی ایک پیالی مل جاتی تو؟“ اس کے خیال کا گھوڑا میہیں تک دوڑ پایا تھا کہ آفس کے دروازے پر ہلکی سی مانوس دستک نے اس کے قالین روندتے قدم روک لئے۔

”لیں۔۔۔“ اس نے رخ دروازے کی جانب کیا۔

دروازہ کھلا اور اس کی آنکھیں عجب حیرت سے پھیل گئیں۔ اس کی فضول سی بات خدا نے کتنا قریب ہو کر سنی تھی۔ بیلا چائے کی ٹرے سنبھالے کمرے میں داخل ہوئی اور اس کی جانب مسکراتی ہوئی

نے مندر کماری کی جانب کڑی نظروں سے دیکھا۔
”جی سوامی جی۔“ مندر کماری نے شرمندگی سے سر نہ ہوا لیا۔ ”میں کوشش کے باوجود اس سے زیادہ۔۔۔“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔“ سوامی نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ ”پر تو یہ تینوں آدمی تو کپے ہیں ناں؟“

”بالکل کپے سوامی جی۔“ مندر کماری نے ہر یقین لہجے میں کہا۔ ”ان کی میں گارنٹی دیتا ہوں۔“

”آج کل میں ان تینوں کی مجھ سے بھینٹ کرا دے۔“

”ٹھیک ہے جی۔ کل ہی میں ان تینوں کو یہاں لے آؤں گا۔“

”تو بس اب نکل جا۔ مجھے کچھ کام کرنا ہے۔“ سوامی نے بدلتی سی بات سے کہا تو مندر کماری سنبھلی محسوس کرتے ہوئے اٹھ گیا۔ سوامی کے چرن چھوئے۔ پنڈت کو پر نام کیا اور اپنے پاؤں مندر سے باہر نکل گیا۔

”یہ دعوے تو بہت کرتا تھا پنڈت مگر کام چوہیا کے بچے جتنا کر کے ہاتھ کھڑے کر دیے اس نے۔“ سوامی نے کروڑھ سے کہا تو پنڈت نے مالا گلے میں ڈال کر ہاتھ سوامی کے پیروں پر ڈال دیے۔

”مہاراج۔ ایسے کام کرنا کوئی بال کھلوڑ ہے؟ پھر بھی ایک بات کا میں آپ کو دوشواس دلاتا ہوں کہ مندر کماری نے جو کہا ہے ویسا ہی ہو گا۔ یہ آپ سے یا مجھ سے جھوٹ نہیں بولی سکتا۔“ پنڈت نے سوامی کے پاؤں داہتے ہوئے خوشامد سے کہا۔

”مگر اس طرح تو کام بہت سے لے لے گا پنڈت اور زیادہ سے ہمارے پاس ہے نہیں۔ مجھے کچھ وچار کرنا پڑے گا۔ کچھ کرنا پڑے گا۔“ سوامی نے اس کے ہاتھ اپنے پیروں سے ہٹائے اور جگہ چھوڑ دی۔

”میں اندر جا رہا ہوں۔ کسی کو ادھر مت آنے دینا۔“ وہ بھگوان کی صورتی کے ساتھ بنی کوٹھڑی کے دروازے کی طرف چل پڑا۔

پنڈت اپنا بڑا سا سر ہلاتے ہوئے اپنی جگہ کھڑا رہا۔ پھر جب سوامی نے کوٹھڑی میں داخل ہو کر دروازہ اندر سے بند کر لیا تو اس نے ایک بڑا سا سانس لیا۔ اطمینان بھر سانس لیا۔ وہ سوامی کی موجودگی میں کھل کر سانس لیتا نہ بات کرتا تھا۔ اس کی تو سنی گم ہوئی رہتی تھی سوامی کے آگے۔ دھوتی سنبھالتے ہوئے وہ پھر اپنی جگہ بیٹھ گیا اور سر سینے پر ڈال کر کسی استری کی آمد کا یوں انتظار کرنے لگا جیسے مردار کی امید میں گدہ خزاں رسیدہ درخت پر بیٹھا ہو۔

سوامی نے کوٹھڑی کے دروازے کی اندر سے کنڈی لگائی اور سامنے طاق میں دھری کالی ماتا کی صورتی کے سامنے چٹائی پر آ بیٹھا۔

”کیا بات ہے شوکت، تم کچھ پریشان ہو۔“ مونس نے کپ ایک طرف سرکا کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”سرحدی چوکی سے انوارالحق کا فون آیا ہے سر۔“ شوکت میز کے بائیں ہاتھ بڑی کرسی پر بیٹھ کر رازدارانہ لہجے میں بولا تو مونس بھی چونک کر اس کی جانب جھک گیا۔

”خیریت؟“

”دو شخص اسلحہ منگھل کرتے ہوئے گرفتار کئے ہیں ان لوگوں نے۔“ شوکت نے کہا تو مونس اچھل پڑا۔

”ہماری سرحدی پٹی پر؟“ حیرت مونس کے چہرے پر بے چینی بن کر چھا گئی۔

”جی ہاں۔“ شوکت نے جواب دیا۔ ”ان سے پچیس ہینڈ گرنینڈ پانچ کلاشنکوفیں، بائیس ریوالور

اور بارہ سوراؤنڈ برآمد ہوئے ہیں۔“

”کیا؟“ مونس کا سانس رک گیا۔

”ہمارے سرحدی علاقے سے پہلی بار ایسی سنگنگ کی کوشش کی گئی ہے سر۔۔۔ اور حیرت کی

دوسری بات یہ ہے کہ انہوں نے انوارالحق کو خریدنے کی بھرپور کوشش بھی کی۔“

”یعنی۔۔۔“ مونس کا منہ واقعی کھلے کا کھلا رہ گیا۔

”ان کے پاس پاکستانی کرنی کی بھاری مقدار بھی تھی سر۔ لاکھوں میں۔“

”اوہ۔۔۔“ مونس اضطراب کے مارے اپنی سیٹ کے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ

پوری تیاری کے ساتھ آئے تھے۔“

”جی ہاں۔“

”اب وہ دونوں کہاں ہیں؟“

”جی ایچ کیو پہنچا دیے گئے ہیں سر۔ یہ معاملہ ہمارے ہینڈل کرنے والا نہیں تھا۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ مونس کے لہجے میں تشویش عروج پر تھی۔ وہ ہاتھ پیچھے باندھے کمرے میں شرفا

غرباٹھنے لگا۔ شوکت چند لمحوں کی جانب دیکھتا رہا پھر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

”میرے لئے کیا حکم ہے سر؟“

”تم۔۔۔“ مونس کے قدم ٹھم گئے۔ چند لمحوں کے بعد سوچتا رہا پھر کہا۔ ”تم نورے اور غلام حسین کے

ساتھ سرحدی چوکی سے گاؤں تک آنے والے راستے کا ایک اچھا راؤنڈ لگاؤ۔ فوری طور پر اپنے آدمیوں

کو سارے راستے پر نگرانی کے لئے پھیلا دو۔ ہمارا کوئی آدمی نظر نہیں آنا چاہئے اور چھپ چھپا کر دشمن کا

کوئی آدمی گاؤں تک پہنچنا نہیں چاہئے۔ بی ایس ون کو پوری طرح فارم میں لے آؤ۔ ہمیں کسی بھی وقت

کوئی بھی ایکشن لینا پڑ سکتا ہے۔“

نظروں سے دیکھ کر سر جھکا یا۔

”نمستے مونس بابو۔“ اس نے ٹرے میز پر رکھی اور برتن نکالنے لگی۔

”ہوں۔۔۔“ وہ محض سر ہلا کر رہ گیا۔ پھر ایک طویل سانس لے کر چھت کی جانب دیکھا اور اپنی

سیٹ پر آ بیٹھا۔

”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے مونس بابو؟“ وہ کپ اس کے آگے رکھتے ہوئے اس کے چہرے کو

غور سے دیکھنے لگی۔

”ہاں۔۔۔ بالکل ٹھیک ہے۔ کیوں؟“ مونس نے چائے کا کپ اٹھایا۔

”لگتی تو نہیں۔“ وہ تشویش سے بولی۔

”یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو ڈاکٹر صاحب؟“ مونس دھیرے سے ہنسا اور کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔

”آپ کا چہرہ بہت تھکا تھکا سا ہے مونس بابو۔“ وہ ٹرے لئے ہوئے ایک قدم پیچھے ہٹ گئی تاہم

اس کی نگاہیں اب بھی مونس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

”ارے وہ کچھ نہیں۔۔۔“ مونس نے کپ واپس میز پر رکھا اور لا پرواہی سے کہا۔ ”سر میں

معمولی سادہ رہے۔ چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ تم بڑے موقع سے لے آئیں۔ ابھی چائے کا آخری

گھونٹ اندر اور سر درووازہ پر۔“

”میں سر دروازوں؟“ بیلا نے جلدی سے پوچھا۔

”آں ہاں۔۔۔“ مونس نے ٹی میز سر ہلایا۔ ”میری عادتیں نہ بگاڑو۔ میں۔۔۔“ اس سے

پہلے کہ مونس کی بات پوری ہوتی، دروازے پر کسی نے باہر سے دستک دی۔ اس نے بات ادھوری چھوڑ

دی اور دروازے کی جانب دیکھا۔ ”یس۔۔۔ کم ان۔“

دوسرے ہی پل دروازہ کھلا اور شوکت نے اندر قدم رکھا۔ اس کے چہرے پر بکھرے اضطراب

نے مونس کو چونکا دیا۔ شوکت نے ایک نظر مونس اور پھر بیلا کی طرف دیکھا۔ مونس اس کی نظروں کا

مطلب سمجھ گیا مگر اس سے پہلے بیلا معاملے کو بھانپ گئی۔ اس نے مونس کے کپ کی جانب دیکھا جس

میں ابھی چائے موجود تھی۔ چائے کے برتن اور ایک خالی کپ بھی میز پر پڑا تھا۔ وہ ہمیشہ دو کپ لایا کرتی تھی۔

”آپ کے لئے چائے بناؤں شوکت بابو؟“ بیلا نے پوچھا۔

”نہیں۔“ شوکت نے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”مجھے سر سے کچھ ضروری بات کرنا ہے۔“ وہ

صاف صاف کہہ گیا۔

”تو میں چلوں مونس بابو۔ کھانا لے کر آؤں گی تو برتن لے جاؤں گی۔“ بیلا نے برا منائے بغیر

پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ پھر ”سلام مونس بابو“ کہہ کر ٹی میز اور باہر نکل گئی۔ دروازہ اس نے اپنے پیچھے بند کر دیا۔

”جی سر۔۔۔ کچھ بھی بتانے سے پہلے انہوں نے شرٹ کے کالر پر کوٹ کیا گیا سائٹائڈ چاٹ لیا۔“

”اوہ۔۔۔“ مونس کے لہجے میں مایوسی اتر آئی۔

”جی ایچ کیو سے فوری طور پر خالق نگر کی سرحد پر نفری میں اضافہ اور نگرانی میں سختی کے آرڈر کر دیے گئے ہیں۔ رزاتی صاحب کو خبر ہوگئی سر؟“

”میں اسی کو بتانے جا رہا تھا انوار۔ رزاتی بہت بیمار ہے تاہم یہ بات ایسی نہیں ہے کہ اسے بتائی نہ جائے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر۔ مجھے اجازت ہے؟“

”ان سچ رہنا انوار۔ مجھے پل پل کی خبر ملنی چاہئے۔ میرا موبائل چوبیس گھنٹے آن رہے گا۔“ مونس نے بیتابی سے کہا۔

”ضرور سر۔ میں ہر نئی صورتحال سے آپ کو باخبر رکھوں گا۔ آپ بھی اپنے علاقے میں ضروری اقدامات کر لیجئے۔“

”میں پہلے ہی نورے کو اس بارے میں کہہ چکا ہوں انوار۔ یہاں دشمن کا پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔“ مونس نے عجب یقین کے ساتھ کہا۔

”اللہ حافظ سر۔“ انوار نے المٹ لہجے میں رخصت چاہی۔

”اللہ حافظ انوار۔“ مونس نے رابطہ ختم ہونے پر موبائل کان سے ہٹا لیا۔ پھر ایک گہرا سانس لے کر چاروں طرف دیکھا۔

شام اتر رہی تھی۔ اس نے وہیں رک کر ساری صورتحال کا ایک بار بھر پور جائزہ لیا۔ کچھ سوچا۔ فیصلہ کیا اور قدم واپس اپنے آفس کی جانب موڑ لئے۔

جس ذہنی شکست و ریخت کے دور سے رزاتی گزر رہا تھا اس میں اسے یہ گنجائش کہیں نظر نہ آئی کہ وہ ایسے نازک معاملے میں اسے شریک کر لیتا۔ اسے تو اپنا ہوش نہیں تھا۔ یہ تو قومی سلامتی کا معاملہ اس کے دماغ پر کیسا بوجھ ڈال دیتا۔ وہ اس بوجھ کو برداشت کر پاتا یا نہ؟ کون کہہ سکتا تھا۔

سر جھکائے وہ اپنے آفس کی جانب لوٹ گیا۔

☆=====☆=====☆

”ہوں۔۔۔“ سوامی اپنے سامنے بیٹھے ذبح ہونے کے لئے سہی ہوئی بکریوں کی طرح ہاتھ باندھے سر جھکائے اندر رہی اندر لرزتے تینوں افراد کو نیم وا آنکھوں سے گھورتے ہوئے غرایا تو وہ باہر سے بھی کانپ اٹھے۔ ”تو یہ ہیں ویروڈیو اور خیر دین؟“ آخری نام لیتے ہوئے اس کا لہجہ بحد ہر یلا ہو گیا۔

”لیس سر۔۔۔“ ایک دم شوکت کا سارا جسم تن گیا۔ کسی کڑک فوجی کی طرح ٹھک سے اڑیاں جوڑ کر اس نے ہاتھ پہلوؤں میں گرا لئے۔ اس کا چہرہ یوں تہمتا اٹھا جیسے اس نے اپنے دشمن کا چہرہ دیکھ لیا ہو۔

”میں رزاتی سے بات کرنے جا رہا ہوں۔ تم فوری طور پر اپنا کام مکمل کر کے مجھے رپورٹ کرو۔ اور ہاں۔۔۔“ وہ میز کے پیچھے سے نکلتے نکلتے رک گیا۔ ”کیا یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ اس لمحے کے بعد ہماری کسی بھی قسم کی نقل و حرکت کو گاؤں والوں کی نظریں دیکھ نہ پائیں گی!“

”نوسر۔“ شوکت کے گلے سے سرگوشی یوں نکلی جیسے وہ اندر سے لرز رہا ہو۔

”گڈ۔“ مونس نے حرکت کی اور اس کے پاس آ کر قدم روک لئے۔ ”وش یو گڈ لک مائی برادر۔ اٹس دی ٹائم ٹو ایکٹ ان ڈارکنیس و دو اپن آئر اینڈ نو بر۔ جھ۔“

”لیس سر۔“ نور اور تن گیا۔

مونس نے اس کا دایاں شانہ زور سے دبا کر چھوڑ دیا اور کمرے سے نکل گیا۔ شوکت اس کے پیچھے کسی اکڑی ہوئی لاش کی طرح چلا تو اس کے جسم کا سارا خون چہرہ پر جمع ہو چکا تھا۔

☆=====☆=====☆

آفس سے حویلی کی جانب جاتے ہوئے مونس کا دماغ کسی کمپیوٹر کی طرح کام کر رہا تھا۔ اسے معاملہ بہت گھمبیر لگ رہا تھا۔ خالق نگر کی سرحد سے اسلحہ منگل کرنے کی کوشش کے پیچھے دشمن کے عزائم کیا ہو سکتے ہیں؟ اس کے بارے میں وہ اتنا تو کچھ ہی سکتا تھا کہ ان عزائم میں خیر گالی کا کوئی عنصر نہیں تھا۔

دہشت گردی کی نیت سے ہی ایسے اقدامات کئے جاتے ہیں اور ایسی خباثت کے لئے خالق نگر کا چناؤ کسی خاص مہم کا حصہ ہی ہو سکتا تھا۔ ایک دم سے اس کے دماغ سے رزاتی کی حالت اور پریشانی ہوا ہوئی۔ اس وقت اسے صرف اس نئی پیدا شدہ صورتحال نے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

ابھی وہ حویلی کے لان کے پاس ہی پہنچا تھا کہ اس کے موبائل پر بیل ہوئی۔ وہ رک گیا۔ موبائل جیب سے نکلا۔ سکرین پر نظر دوڑائی۔ انوار الحق کا فون تھا۔ فوراً ہی کال ریسیو کرتے ہوئے اس نے موبائل کان سے لگا لیا۔

”لیس انوار۔۔۔ اٹس مونس۔“ وہ بیقراری سے بولا۔

”سر۔۔۔ میں انوار۔۔۔ آپ کو شوکت نے خبر تو کر دی ہوگی؟“ انوار الحق نے دوسری طرف سے کہا۔

”ہاں انوار۔۔۔ میں سن چکا ہوں۔ جی ایچ کیو سے کوئی خبر؟“

”صرف یہ سر کہ ان دونوں نے خود کشی کر لی۔“

”کیا؟“ مونس کے ذہن کو جھکا سا لگا۔

”جی مہاراج۔“ نندکار نے جلدی سے جواب دیا اور سوامی کی طرف دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے خیر دین پر نگاہ ڈالی۔ ”اور یہ بات یہ ہے کہ خیر دین واپس اپنے دھرم میں آنے کو تیار ہے۔“

”تو پہلے کیا نرک میں جانے کے لئے ان پیچھوں میں شامل ہوا تھا؟“ سوامی کے لہجے کا کردہ اور بڑھ گیا۔

”غلطی ہو گئی مہاراج۔“ کانپتے ہوئے خیر دین نے سوامی کے پیروں پر سر رکھ دیا۔ ”مجھے شاکر دیجئے۔ میں نے بہت بڑا پاپ کیا کہ اپنا دھرم چھوڑ کر ان نسلوں میں گھس گیا۔ مجھے شُدھ کر کے اپنے چرنوں میں واپس سویکار کر لیجئے تاکہ میں نرک کا ایندھن بننے سے بچ سکوں۔“ خیر دین سوامی کے پیروں پر آنکھیں رگڑتے ہوئے رو دیا۔

”وہ تو ٹھیک ہے مگر یہ بتاؤ دوبارہ اپنے دھرم میں کس کارن لوٹ آنا چاہتا ہے؟ تیری کون سی اچھیا وہاں پوری نہیں ہوئی جو تو کتوں کی طرح میرے پیروں کے لئے یہاں آ پہنچا۔“ سوامی جیسے اس کے اندر کا بھید بھاؤ جاننے کا تہیہ کر چکا تھا۔

”مہاراج۔۔۔“ خیر دین نے اس کے پیر مضبوطی سے تھام لئے اور انہیں چومنے لگا۔

”اندر کی بات باہر نکال گنگا۔۔۔ مجھ سے چھل کرنے کا خیال بھی تجھے ملنا پ کے زہر کی طرح چاٹ لے گا۔“ سوامی نے اپنے پیر کھینچ لیا۔

”مہاراج۔۔۔“ مہاراج۔۔۔“ خیر دین نے اس کے پیر دونوں ہاتھوں میں تھام کر کہا تھا ان پر ٹیک دیا۔ ”میں ایسا چار بھی کیسے سن میں لا سکتا ہوں۔ میں ساری بات بتاتا ہوں۔“

”ہوں۔۔۔ جلدی بول۔ میرے پاس فالتو سے نہیں ہے۔“ سوامی نے کسی کتے کی طرح قدموں میں لوٹتے خیر دین کو پوری آنکھیں کھول کر گھورا۔ ویرودیا اور نندکار خاموشی سے سارا تماشا دیکھ رہے تھے۔

”مہاراج۔ میں نے مسلمان ہونے کے بعد بڑی کوشش کی کہ کسی طرح وہ لوگ مجھے اپنا مان لیں۔ سویکار کر لیں۔۔۔ پرنتو۔۔۔“ وہ ایک پل کور کا۔ پھر اس کے لہجے میں نفرت ابھری۔ اس نے چہرہ اوپر اٹھایا تو سب نے دیکھا وہاں کروڑھ ہی کروڑھ تھا جو اپنی سیاہی اس کے سانو لے چرے پر بکھیر رہا تھا۔ ”پرنتو مہاراج۔۔۔“ اس نے سوامی کے پاؤں چھوڑ کر بھیگی ہوئی آنکھیں آستین سے صاف کیں۔

”انہوں نے مجھے ہندو ہی سمجھا۔ شور ہی خیال کیا۔ ہر کسی نے مجھے اپنی بہن بیٹی کا رشتہ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کا یہی مطلب تھا ناں مہاراج کہ انہوں نے مجھے دل سے اپنا نہیں مانا۔ یہ بات جب مجھے نندکار نے سمجھائی تو میرے نیچے میں آیا کہ میں نے اپنا دھرم چھوڑ کر کتنا گھور پاپ کیا ہے۔ مُسلوں نے مجھے مال تو دیا۔ کام تو دیا۔ میرے ساتھ بیٹھ کر کھایا پیا تو ضرور مہاراج پرنتو میرا گھر بسانے کے معاملے

میں بالکل کورا جواب تھا ان کی زبان پر۔۔۔ اس سے تو میں ہندو ہی بھلا تھا۔ ذات برادری سے کٹ کر دین دھرم سے منہ موڑ کر میں نے سوائے چار مہینوں کے ڈنڈ کے کچھ نہیں پایا مہاراج۔ میری غلطی شام کیجئے اور مجھے دوبارہ اپنے چرنوں میں سویکار کیجئے۔“

”گنگا۔“ سوامی نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ پتھر کا بُت بن کر رہ گیا۔ سوامی کی آنکھیں کبوتر کے خون جیسی سرخ ہو رہی تھیں۔ گنگا کا سارا بدن ایک دم سُن ہو گیا۔ ”غلطی کا پراپت کرنا پڑتا ہے۔ پاپ کا ڈنڈ بھوگنا پڑتا ہے تب شاملتی ہے۔ کیا تو اس کے لئے تیار ہے؟“ سوامی کا لہجہ سرد تر ہو گیا۔

نجانے کیوں اس کے الفاظ پر نندکار کے سارے جسم میں پھریری سی دوڑ گئی۔ دیر وادریو کا بھی یہی حال تھا۔ مٹی کے مادہ بنے وہ سوامی کے ایک ایک لفظ کو ہتھوڑوں کی طرح دماغ پر برستا محسوس کر رہے تھے۔

”مہاراج۔۔۔“ خیر دین کی کمزوری آواز ابھری۔ ”میں آپ کی ہر آگیا کا پالن کروں گا بس مجھے اپنے چرنوں میں سویکار کر لیجئے۔“

”تو ٹھیک ہے۔“ سوامی نے ہاتھ کھڑا کرتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ”تجھے شُدھ ہونے کے لئے ڈنڈ بھوگنا پڑے گا اور کم از کم ڈنڈ تیرے لئے یہ ہے کہ تو نے جس زبان سے ان پیچھوں کا دھرم سویکار کرتے ہوئے ان کے خدا کا کلمہ پڑھا تھا اس زبان کو اپنے ہاتھوں سے کاٹ کر کالی ماں کے چرنوں میں ڈال دے۔ کیا تو اس کے لئے تیار ہے؟“

سوامی کے الفاظ کیا تھے پگھلا ہوا سیسہ تھا جو خیر دین نندکار ویرودیا کے کانوں میں اترتا چلا گیا۔ وہ بھونچکے رہ گئے۔ سانس جیسے سینے میں اٹک گیا اور جسم برف کی طرح بچ ہو گئے۔ گھبرا کر انہوں نے خیر دین کی طرف دیکھا۔

”مہاراج۔۔۔“ خیر دین کے ہونٹوں سے سرگوشی سی نکلی اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار بہہ نکلی۔ اس کی نگاہیں اب بھی سوامی کی نگاہوں میں گڑی ہوئی تھیں۔ وہ جیسے اپنے بس ہی میں نہ تھا۔

”ہاں یا نہ۔۔۔ ایک لفظ پر تیری کتنی کی نیو دھری ہے گنگا۔ بول۔ کتنی چاہتا ہے یا نرک کی آگنی؟“

سوامی نے بچہ سرد آواز میں پوچھا۔

”کتی مہاراج۔۔۔ کتی۔“ خیر دین نے طاغوت سے سودے پر اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔

”تو یہ لے۔۔۔“ سوامی نے پاس پڑا تیز دھار خنجر اٹھا کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ”اندر کوٹھڑی میں چلا جا۔ پنڈت وہاں موجود ہے۔ ماں کالی کی مورتی کے سامنے ماتھا ٹیک اور اپنی زبان اسے بھینٹ کر دے۔ تجھے شام بھی مل جائے گی اور تو شُدھ بھی ہو جائے گا۔ جا۔۔۔“ سوامی نے اسے کسی کتے کی طرح دھنکرا دیا۔

خیر دین خنجر ہاتھ میں لئے ہوئے کسی سحر زدہ معمول کی طرح اپنی جگہ سے اٹھا اور ڈولتے قدموں سے کوٹھڑی کے کھلے دروازے کی طرف چل پڑا۔ لگتا تھا وہ اپنے حواس میں نہیں ہے۔

کسی نیند میں چلتے شخص کی طرح وہ کوٹھڑی میں داخل ہوا تو سامنے طاق میں مکی کالی کی چھوٹی سی مورتی کے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھے پنڈت گردھاری لال نے بڑی عجیب سی نظروں سے پہلے اسے اور پھر اس کے بائیں ہاتھ میں خنجر کو دیکھا تو اس کا دل سینے میں دھڑ دھڑک اٹھا۔ اس دھمک کے آثار اس کے چہرے پر لرزے کی شکل میں محسوس کئے جاسکتے تھے۔

خیر دین لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھا اور گوبر کی طرح مورتی کے سامنے ڈھیر ہو گیا۔ اس کا سارا جسم پسینے میں ڈوبا جا رہا تھا۔ آنکھیں کھل نہ رہی تھیں اور سانس لہجہ بوجھل ہو رہا تھا۔

پنڈت خاموشی سے اس کی جانب دیکھتا رہا۔ خیر دین ماتھا کالی کی مورتی کے سامنے فرش پر ٹیکے کچھ دیر تک بے حس و حرکت پڑا رہا پھر آہستہ سے اس نے سر اٹھایا۔ دوزانو بیٹھ کر منہ کھولا اور کانپتی ہوئی زبان کپکپاتے ہونٹوں سے باہر نکال لی۔

پنڈت کا دل سینے میں اچھلا۔

خیر دین نے منوں وزنی ہاتھ میں لڑتا ہوا خنجر زبان پر رکھ دیا۔

پنڈت کی آنکھیں بے اختیار بند ہو گئیں۔ اس نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لئے۔

پھر۔۔۔

چند لمحوں کے جانگل سنائے کے بعد کوٹھڑی میں درو سے لبریز ایک فلک شگاف چیخ گئی۔

پنڈت نے تھل تھل کانپتے جسم کے ساتھ اپنا بڑا ساسر زمین پر ڈال دیا۔ خوف اور ایک ناقابل برداشت اذیت کے تصور سے اس کی ہونٹوں پر ”رام رام۔ رام رام“ کی گردان جاری ہو گئی۔

سرخ سرخ خون کا فوارہ چھوٹا اور کالی کی مورتی جیتے جیتے گرم لہو میں نہا گئی۔ خیر دین کھڑ زبان اس کے سامنے فرش پر پڑی میں ترپ رہی تھی اور وہ خود منہ سے التے خون کو روکنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے گلے پر چھری پھرے بکرے کی طرح ترپ ترپ کر چیخ رہا تھا۔ ذکر اہا تھا۔

باہر سواری کے چرنوں میں بیٹھے دیو دیو اور نندکار کے دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لئے۔ ان کے چہرے سرسوں جیسے زرد پڑ گئے تھے۔

اور سواری۔۔۔ اس کے پتلے پتلے سیاہ اور مکروہ ہونٹوں پر بڑی ہراسنا اور بے رحم مسکراہٹ ریگ رہی تھی۔

خیر دین پھر سے گنگا بن گیا تھا۔ خُدد ہو گیا تھا۔ نرک میں جانے سے بچ گیا تھا۔ ڈنڈ بھوک کر مکتی پا گیا تھا!

☆=====☆=====☆

قاری خادم حسین اپنے گھر کے اس کمرے میں سر جھکائے بیٹھے تھے جسے انہوں نے اور گاؤں والوں نے عارضی طور پر مسجد قرار دے لیا تھا۔ جس نے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا ہوتی تھی وہ وقت پر یہیں چلا آتا تھا۔ اس وقت بھی فجر کی نماز کے بعد کافی سارے لوگ تو رخصت ہو گئے مگر چند افراد رک گئے۔ گاؤں کے یہ وہ بڑے بڑے تھے جنہوں نے قاری صاحب کو خیر دین کے دوبارہ گنگا بن جانے کی افسوسناک خبر سنائی تو وہ گنگ ہو کر رہ گئے۔

کتنی ہی دیر گزر گئی۔ پھر جب انہوں نے اپنا ستا ہوا چہرہ اوپر اٹھایا تو نمی ان کی آنکھوں سے چھلکی پڑ رہی تھی۔

”خیر دین کی اپنے جھوٹے دھرم میں لوٹ جانے کی اس خوفناک واپسی کے لئے ہم میں سے ہر شخص مجرم اور قصور وار ہے۔“

”وہ کیسے قاری صاحب؟“ بوڑھے کرم الہی کی زبان سے فوراً ہی نکلا۔ ”وہ تو مرتد ہو گیا ہے۔ اس میں ہمارا کیا قصور؟ اسے قتل کر دینا چاہئے۔“

”غلط۔“ قاری صاحب کی آواز ایک دم بلند ہو گئی۔ انہوں نے بڑی تیز نظروں سے کرم الہی کی جانب دیکھا۔ ”ہمارا دین کہتا ہے کہ جرم کی سزا دینے سے پہلے جرم کا محرک تلاش کرو۔ اگر مجرم نے مجبور ہو کر اچھا حق نہ ملنے پر جرم کا ارتکاب کیا ہے تو اسے نہیں نظام چلانے والا کو سزا ملنی چاہئے جنہوں نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ جرم کرے۔ اس نے مرتد ہونے کا جرم خوشی سے نہیں مجبور ہو کر کیا ہے۔۔۔ اور گنگا کے اس جرم کے لئے ہم سب گاؤں والے قصور وار ہیں۔ مجرم ہیں۔“

”قاری صاحب آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں۔“ کرم الہی نے بحث کی۔ ”اسے ہم میں سے کسی نے تنگ نہیں کیا۔ ہم سب نے اس کی دلجوئی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ قیوم جٹ نے اسے کام پر لگایا۔ شہباز ملک نے اسے رہنے کو کوٹھادیا۔ گاؤں کے مسلمانوں نے اسے ساتھ کھلایا پلایا اور اسے کیا چاہئے تھا؟“

”وہ عزت جو اسے دائرہ اسلام میں آنے کے بعد ملنی چاہئے تھی وہ ہم نے اسے نہیں دی کرم الہی۔ آپ لوگ ہی بتا رہے ہیں کہ وہ حق جو مسلمان ہونے کے بعد اس کا ہم پر تھا ہم نے اسے تسلیم ہی نہیں کیا۔“ قاری صاحب نے اس کی طرف انگلی اٹھائی۔

”ہم سمجھے نہیں قاری صاحب۔“ کرم الہی نے اپنے ساتھ آئے ہوئے تینوں افراد کی نمائندگی کی۔

”کپڑا لٹا“ کھانا پینا اور کام کاج ہی انسان کی ضرورت نہیں ہوتی۔“ قاری صاحب کی آواز میں دکھ جھلکا۔ ”آپ میں سے ہر ایک جانتا ہے کہ گنگا دوبارہ مشرک کیوں ہو گیا؟ گاؤں میں سے کسی نے اسے اپنی بیٹی بہن کا رشتہ نہیں دیا۔ یہ اس کا وہ حق تھا جس کے لئے ہم سب نے اس سے آنکھیں

کے قدموں پر سر رکھ کر بھی اسے خیر دین سے نکاح کے لئے منالوں گا۔ جاؤ۔ تم لوگ گنگا کو مسلمان کر کے لے آؤ، میں کل شام سے پہلے اسے اپنا بہنوئی بنا لوں گا۔ اور اگر ایسا نہ کر سکا تو اس کے لئے گاؤں گاؤں رشتے کی بھیک مانگتے نکل جاؤں گا۔ کہیں تو کوئی مجھ جیسا خطا کار ہوگا جو اللہ کے نام پر خیر دین سے ناطہ جوڑنے کے لئے ہاں کرنے کو تیار بیٹھا ہوگا؟ اپنے اللہ سے مجھے اس کرم کی پوری امید اور یقین ہے۔“

قاری صاحب خاموش ہو گئے۔ چاروں عزت دار منہ ہٹا کر ان کی طرف دیکھتے رہ گئے۔ ان کے پاس قاری صاحب کی کسی بات کا کوئی جواب تھا نہ کٹ جتنی کے لئے کوئی دلیل۔

”میں تم لوگوں کو شرمندہ کرنا چاہتا ہوں نہ ہی تم پر لعن طعن کا میرا کوئی ارادہ ہے مگر ایک بات تم تک پہنچانا میرا فرض ہے اور شاید آج کے ان لمحات سے زیادہ موزوں وقت یہ بات کرنے کے لئے مجھے میسر ہی نہ آیا تھا۔۔۔ کہنا یہ چاہتا ہوں صاحبو! کہ ہم اپنے دین کے ساتھ خلص ہیں ہی نہیں۔ اپنا پلہ اپنا مال و دولت اپنی نام نہاد عزت و آبرو بچا کر رکھتے ہیں کہ کہیں اللہ اور رسول ﷺ کے نام پر قربان کرنے کا لمحہ اسے دیکھ نہ لے۔ ایک گنگا کی بات نہیں ہے جو بھی نیا شخص ہمارے دین میں داخل ہوتا ہے ہم اس کے ساتھ ایسا ہی ناروا سلوک کرتے ہیں کہ ہمارے اسلاف کی روحیں تڑپ جاتی ہوں گی۔ میں تم لوگوں کی بات کیوں کروں؟ اپنے طبقے کی بات کیوں نہ کروں۔ میں اس وقت ایف اے کا طالب علم تھا اور اوقاف کا مینیجر تھا، گواہ ہوں کہ صوبائی دارالحکومت کی شاہی مسجد میں ایک مجمعے کی نماز کے بعد میرے سامنے ایک عیسائی خاندان نے اس وقت کے امام مسجد اور خطیب کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ یہ دو حیلان بیوی اور ان کے دو چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کا کنبہ تھا جنہیں اللہ نے اپنے دین برحق کی روشنی اور ہدایت سے نوازا۔ مولانا نے انہیں کلمہ پڑھایا۔ اسلام کی بنیادی تعلیمات سے متحضر آگاہ کیا۔ وہاں موجود مسلمانوں نے اللہ اکبر کے فلک شکاف نعرے لگائے۔ ان نو مسلموں کے لئے دعائے خیر کی گئی۔ اس کے بعد بائیسویں گریڈ کے اس درباری ملا نے مائیک پر اعلان کیا کہ۔۔۔ ”مسلمانو! یہ لوگ اپنی برادری اور عیسائیت سے کٹ کر ہمارے دین کی طرف آئے ہیں۔ ہمیں ان لوگوں کو اپنے سینے سے لگا لینا چاہئے۔ ان کے مذہبی حلقے اور خاندان والوں نے ان کا معاشی بایکٹ کر دیا ہے۔ اس وقت یہ سخت مشکل میں ہیں۔ ہمیں ان کے کام آنا چاہئے۔ اب یہ ہمارے بہن بھائی ہیں۔ ان کے بچے ہمارے بھتیجے بھتیجیاں ہیں۔ اسلام نے انہیں ہماری ذمہ داری بنادیا ہے۔ اس لئے میری آپ سب لوگوں سے اپیل ہے کہ ان نو مسلموں کی ہر ممکن امداد کی جائے۔ میں انہیں مسجد کے صدر دروازے پر بھیج رہا ہوں۔ یہ وہاں بیٹھ جائیں گے۔ آپ سب لوگ وہاں سے باہر نکلتے ہوئے حسب توفیق ان کی مالی امداد ضرور کیجئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دونوں جہانوں میں عطا فرمائے گا۔ و ما علینا الا البلاغ۔“

قاری صاحب کا سر ایک بار پھر جھک گیا۔ ان کی آواز میں درازی پڑ گئی جسے وہ سسکیوں سے پُر

چرائیں۔ ایک مشرک مسلمان ہوا تو ہمیں چاہئے تھا کہ اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتے جیسا ایک مسلمان کا حق ہے۔۔۔ مگر سب نے اسے ہندو ہی سمجھا۔ اس کے ساتھ رشتے داری قائم کرنے سے ہر ایک نے اجتراز کیا۔۔۔ وہ تو اپنے جھوٹے عقیدے سے جان چھڑا کر بیچ سمجھ کر اس کے دھرم والے اس کے ساتھ جو سلوک کرتے تھے اس انسانیت سے گئے ہوئے رویے سے گھبرا کر ہماری طرف آیا تھا کہ ہم اسے جی جان سے اپنے برابر کا سمجھیں گے۔۔۔ لیکن ہم نے اس کے ساتھ وہی کیا جو ہمیں نہیں کرنا چاہئے تھا۔ ہم نے اسے معاشی سہولت تو دی۔ سر چھپانے کا ٹھکانہ تو دیا مگر زندگی کا سانس دینے سے مکمل گریز کیا۔“

”قاری صاحب۔“ قیوم جٹ نے پہلی بار زبان کھولی۔ ”اگر آپ میری بات کا برا نہ منائیں تو ایک چھوٹا سا سوال میں بھی کروں؟“

اس کے لہجے میں کوئی ایسی جھین تھی جس نے قاری صاحب کو اس کی جانب غور سے دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ ”ضرور پوچھو قیوم۔ اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے۔“

”تو یہ کہتے قاری صاحب۔ ہم سب تو مجرم ہوئے کہ ہم نے اپنے فرض سے دانستہ یا نادانستہ روگردانی کی لیکن اگر کل کا خیر دین اور آج کا گونگا گنگا اپنے لئے آپ کے سامنے سوا ہوتا تو آپ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے؟ کیا آپ اسے اپنی کسی بیٹی بچی کا ہاتھ دے دیے؟“ اس نے بات ختم کی تو کرم الہی اور دوسرے دونوں افراد نے قیوم کی جانب گھبرا کر دیکھا۔ ان کے خیال میں قاری صاحب کو اس سوال پر آپ سے باہر ہو جانے سے کوئی نہ روک سکتا تھا۔۔۔ مگر جواب میں قاری صاحب کا سر جھک گیا۔

چند لمبے خاموشی میں گزر گئے تو ان چاروں نے ایک دوسرے کو فاتحانہ نظروں سے دیکھا۔ قیوم جٹ اپنی مونچھوں کو تاؤ دے کر جیسے قاری صاحب پر اپنی فتح کا اثر دیکھ رہا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ ان میں سے کسی کے لبوں سے کچھ اور نکلتا، قاری صاحب نے سر اٹھایا اور بڑے ہر سکون انداز میں تپش دیتی آواز ان کے لبوں سے نکلی۔

”میں نے یہ چند لمبے جو خاموشی سے گزارے ہیں، میں اپنے اندر جھانک کر تمہارے سوال کا جواب تلاش کر رہا تھا قیوم۔“

”پھر کیا جواب ملا قاری صاحب؟“ قیوم کا لہجہ ہلکا سا طنز لئے ہوئے تھا۔

”جواب یہ ملا قیوم۔۔۔“ قاری صاحب نے اسی لہجے میں کہا۔ ”کہ اگر آج اور ابھی گنگا دوبارہ میرے اللہ اور آقا و مولا ﷺ پر ایمان لے آئے اور زندگی بھر کبھی اللہ کے سچے دین ”اسلام“ سے روگردانی نہ کرنے کا وعدہ کرے تو میں اپنی بیٹی تو نہیں، کہ میں ابھی اس نعمت سے محروم ہوں ہاں اپنی بہن

والوں میں اُس وقت نہیں بھی برابر کا شریک تھا۔ آج تک میں اپنے اس گناہ کی معافی اللہ سے مانگتا ہوں، مگر دل کو سکون نہیں ملتا۔۔۔ سکون تو معافی ملنے پر ہی ملے گا ناں، جو شاید مجھے ابھی تک نہیں ملی۔ یہی کچھ آج ہم نے گنگا کے ساتھ کیا ہے۔ ہم نے اسے مسلمان تو کر لیا مگر اسے اپنا دینی بھائی ہونے کا پورا حق نہ دیا۔ اس کا کوئی حق ادا نہ کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم لوگوں کی طرف سے مایوس ہو کر اس نے اپنے کسی بھائی بند کی بات پر کان دھرا ہو گا اور وہ اسے کشاں کشاں ہماری مسجد سے واپس اپنے مندر میں لے گیا۔ ہمارے رویے نے ایک موحّد کو دوبارہ ملحد اور مشرک بنا دیا۔ جو کچھ ہم نے اس کے ساتھ کیا، اس کے جواب میں اگر اس کے دھرم والوں نے اسے واپس اپنی طرف کھینچ لیا تو اس میں عجب کیا؟ وہ ہمارے درمیان رہتا تو مرتے دم تک شور ہی رہتا۔ ہمارے اندر اس کے لئے وہ محبت اور احساس جانگے کا سوال ہی کہاں تھا، جو مسلمان ہونے کے باوجود اسے ہمارا داماد یا بہنوئی بنا دیتا۔ کیا وہ ساری زندگی کنوارہ رہتا؟ کیا ایسا ممکن ہے کہ وہ پل پل اپنے نفس کو گانڈھ دے کر گھٹ گھٹ کر ہمارے ساتھ نمازیں پڑھتا رہتا۔ ہمارے دین کی فراخی اور وسعت کے قصے سنتا رہتا اور خاموشی سے راتوں کی تہائیوں کا زہر گھونٹ گھونٹ حلق سے اتارتا رہتا۔ بستے گھروں کو حسرت بھری نگاہوں سے تکتا رہتا۔ اپنے چھوڑے ہوئے دھرم اپنی ذات برادری، بہن بھائیوں اور ماں باپ کو یاد کر کے اکٹیلے پن کی آگ میں جلتا رہتا؟ آخر وہ ایسا کیوں کرتا؟ کیا اس جرم میں گناہ اس نے جھوٹ اور مذہب کے نام پر ایک بہت بڑے دھوکے سے منہ موڑ کر ہمارے سچے دین کے دامن میں پناہ لی تھی؟ اگر یہ اس کا جرم تھا تو اس کی سزا ہم سب نے اسے اس کی گھر داری کی خوشی سے محروم رکھ کر دی۔ اب ہمارے اس جرم کی سزا ہمارا اللہ ہمیں کیسے، کب اور کس طرح دے گا؟ ہمیں اس کا منتظر رہنا چاہئے۔ اس سزا سے میں بچ سکتا ہوں نہ آپ۔ اس بات کو پہلے باندھ لیجئے کہ ہم نے اپنے اللہ کے واضح احکام سے روگردانی کی ہے۔ اس کے سچے دین کی امان میں آئے ہوئے ایک انسان کو دوبارہ شرک اور کفر کی دلدل میں دھکیلنے کا ظلم ہم سب نے کیا ہے۔ اس کے لئے ہم اس کے غضب کا شکار ہو سکتے ہیں۔ جائیے۔ اپنے اپنے گھروں میں جا کر توبہ استغفار کیجئے۔ اپنے اللہ سے اپنے اس گناہ کی معافی مانگئے جو گناہ کبیرہ کی شکل میں ہم سب سے سرزد ہوا ہے۔ اگر وہ ہمیں معاف کر دے تو یہ اس کا کرم ہے ورنہ ہم ہیں تو اس قابل کہ وہ ہمیں اس جرم اس گناہ کی پاداش میں زندہ زمین میں غرق کر دے۔“

قاری صاحب کی ہچکیوں نے وہاں موجود ایک شخص کو سر تاپا لرزا کر رکھ دیا جو بچوں کی طرح چہرہ ہاتھوں میں چھپائے دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ کرم الہی کے ساتھ چٹائی پر بیٹھے قیوم جٹ شہباز ملک اور چوہدری نظام کے سر بھی جھک گئے۔ ان کے دل سینے میں اس نیکی کی طرح لرز رہے تھے جو تیز آندھی کے تھیزوں کی زد میں آ گیا ہو۔

کرنے کی ناکام کوشش کرتے رہے پھر کچھ دیر بعد لرزتی ہوئی آواز میں بولے۔

”آپ لوگ مجھے بتائیے، کیا ہمارے دین کی طرف سے ایسی کسی صورتحال میں ہماری یہی ذمہ داری ہے؟ کیا ہمیں اپنے مذہب سے یہی تعلیم ملتی ہے کہ نو مسلموں کے اسلام کے دامن میں پناہ لینے کے بعد نئی زندگی کے پہلے لمحے میں انہیں گداگر بنا دیا جائے۔ عزت نفس کا مکمل خاتمہ کر کے انہیں ہر مسلمان کے سامنے ہاتھ پھیلا کر بھیک مانگنے کے لئے سہرا ہٹھا دیا جائے۔۔۔ یہ تو میں نہیں جانتا کہ ان کے دل پر اس وقت کیا بیٹی ہوگی جو اپنے دعو معصوم بچوں کے ساتھ اللہ کے سچے دین میں داخل ہونے کے بعد فقیروں کی طرح جھولی پھیلائے، کپڑا بچھائے اللہ کے گھر کے باہر بٹھا دیے گئے؟ تاہم میرا دل یہی چاہتا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سا جاؤں مگر اس سے پہلے مذہب کے اس بڑے ٹھیکیدار کا ٹینو اضرور دبا دوں جس نے اللہ کے سچے دین کے ساتھ ایسا بھیا نک مذاق کیا۔۔۔ وہ ایک عالیشان گھر میں کروڑوں روپے والا درباری ملا مجھ اور آپ جیسے لاکھوں مسلمانوں سے زیادہ آسودہ حال تھا۔ وہ چاہتا تو اس پورے خاندان کی جب تک چاہتا آسانی سے کفالت کر سکتا تھا۔ اس نو مسلم کنبے کے سربراہ کو کسی اچھے اور باعزت روزگار پر لگا سکتا تھا۔ اسے کوئی سی بھی چھوٹی موٹی نوکری دلو سکتا تھا۔ اسے فکر معاش سے آزاد کر سکتا تھا مگر اس جھوٹے عالم نے ایسا کچھ بھی نہ کیا۔ بس اس خاندان کو اپنے جیسے ہی ضمیر مسلمانوں کے حوالے کر کے اپنے محل میں لوٹ گیا اور میں سوائے اپنا سینہ جلانے کے کڑھنے کے خود کو گالیاں دینے کے کچھ بھی نہ کر سکا۔ کیا تو صرف یہ کہ شاہی عہد سے باہر جاتے ہوئے میں نے بھی ان چاروں نو مسلموں کے سامنے بچھے کپڑے پر چند سکے ڈال دیے۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ وہ دونوں میاں بیوی منہ چھپائے، سر جھکائے اپنے بچوں کی آنکھوں پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیر رہے تھے۔ شاید چاہتے تھے کہ ان کے نو مسلم بچے یہ نہ دیکھ سکیں کہ مسلمان ہوتے ہی انہیں کس ذلت، بے بسی اور لاچارگی سے دوچار کر دیا گیا؟ کیا اس بائیسویں گریڈ کے دیوپیکر مولانا کا یہی فرض تھا کہ وہ ان نو مسلموں کو بھیک مانگنے کا پیشہ اختیار کرنے کا اجازت نامہ دے دے؟ مجھے نہ جانے کیوں لگتا ہے کہ اسلام کے دامن میں آتے ہی بھیک مانگنے کا جو فن اس درباری ملا نے انہیں ودیعت کیا تھا اور جس طرح سے اس نے ان نو مسلموں کی عزت نفس پر انہیں گداگر بنا کر وار کیا تھا وہ بیچارے اس کے بعد یا تو واپس اپنی عیسائیت کی طرف لوٹ گئے ہوں گے یا پھر زندگی بھر کے لئے گداگر بن کر رہ گئے ہوں گے۔۔۔ اور اگر ان دونوں میں سے ایک بات بھی سچ ہوئی ہوگی تو اس کا حساب وہ درباری ملا تو اللہ کے حضور دے گا ہی، اس حساب کتاب کے وقت مجھ جیسے خاموش رہنے والے بھی یکساں مورد الزام ٹھہریں گے جنہوں نے ان نو مسلموں کا بازو پکڑ کر انہیں اٹھا کر عزت کے ساتھ اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش ہی نہ کی۔ انہیں اپنے کمترین وسائل میں سے ان کا حصہ نہ دیا۔ انصار و مہاجرین کی مواخات کا سبق فراموش کر دینے

رزاقی کی بے چینی کا عجیب عالم تھا۔ وہ بیلا کے کافی لے آنے کا یوں انتظار کر رہا تھا جیسے اس سے زیادہ اہم کام اسے اور کوئی نہ ہو۔ جونہی بیلا کافی رکھ کر واپس گئی وہ دروازہ بند کر کے کھڑکیوں کی طرف اپکا جن پر بیلا نے آج سر شام ہی پردے گرا دیے تھے۔ موسم بہت ٹھنڈا ہو رہا تھا شاید اسی لئے اس نے کھڑکیوں کے پٹ کھولے ہی نہ تھے۔

رزاقی نے کھڑکیاں کھولیں۔ پردے ہٹائے اور اضطراب کے عالم میں بستر پر آ بیٹھا۔ اس کی نظریں کھڑکی سے باہر نجانے کیا دیکھنا چاہتی تھیں؟ کافی کا کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگاتے لگاتے وہ رک گیا۔ کافی پی کر اسے غنودگی شروع ہو جاتی اور پچھلی دو خالی جانے والی راتوں کی طرح آج بھی وہ ایسا کچھ نہ چاہتا تھا۔ اس کا دل کہتا تھا کہ آج تو راجیہ کی روح ضرور ہی آئے گی اس سے ملنے کے لئے۔ اس سے باتیں کرنے کے لئے۔۔۔ اس نے کافی کا سہارا اسی لئے نہ لیا کہ غنودگی اسے کہیں راجیہ کی آمد سے بے خبر ہی نہ کر دے۔ اس نے کپ واپس تپائی پر رکھ دیا اور اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ دس پندرہ منٹ اسی عالم بے قراری میں گزر گئے۔ پھر وہ دروازے کی طرف بڑھا اور آہستہ سے اسے کھول دیا۔ باہر جھانکا۔ کارڈور میں ٹیوب لائٹس کی روشنی ہو رہی تھی۔ دائیں بائیں جھانک کر اس نے اپنا اطمینان کیا اور پھر بے آواز دروازہ اٹھ کھڑکھڑا کر پر آ گیا۔ اب اسے ہلکی سی سردی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس نے نیم دروازہ پر کھڑکیوں کے پیچھے رکھا۔ سوچا کہ اگر کمرے کی لائٹ آف کی اور نائٹ بلب جلا دیا۔ کمرے کا ماحول ایک دم رومانی اور خواب آلود ہو گیا۔ سبز روشنی میں کچھ ایسا ہی سحر تھا کہ وہاں کی فضا و ہند لکے میں ڈوبتی چلی گئی۔ اس نے کمرے کے کونے کونے سے دیکھا اور نظریں ادھ کھلے دروازے پر جمادیں۔ راجیہ کے انتظار میں جس کی روح کی آمد کے بارے میں اس کا دل و دماغ اب بھی تشکیک کا شکار تھا۔

پندرہ منٹ گزر گئے تو ایک دم اس کے جسم میں اٹھن سی شروع ہو گئی۔ تپائی پر پڑے کافی کے کپ کی طلب اس کے سارے جسم میں چٹکیاں لینے لگی۔ اس نے بہت چاہا کہ اپنی اس طلب کو بالے مگر اس میں تو اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ بے بس ہو کر اس نے کافی کا کپ اٹھایا اور اس ارادے کے ساتھ ہونٹوں سے لگا لیا کہ وہ ہرگز سونے کا نہیں۔ نیند اور غنودگی کو ہر ممکن طریقے سے بھگا دے گا۔ کافی کے پہلے ہی سب نے اس کی زبان کا ذائقہ خراب کر دیا۔ کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ بیلا کو بلا کر کافی گرم کرانے یا نئی بنوا لے مگر پھر اس نے فوراً ہی یہ ارادہ ترک کر دیا۔ بیلا کو بلانے کا مطلب تھا کہ کم از کم بیس منٹ دوبارہ ضائع ہو جاتے اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اب اس کے اور راجیہ کے انتظار کے درمیان کسی کا بھی وجود ایک پل کے لئے بھی حائل ہو۔ اس نے ٹھنڈی کافی دو تین بڑے بڑے گھونٹوں میں

حلق سے نیچے اتاری اور آنکھیں بند کر کے راجیہ کے خیال میں ڈوب گیا۔ آج تیسری رات تھی راجیہ سے دوبارہ ملاقات ہوئے۔ ایک ہی بار اب تک وہ اس کے سامنے آئی تھی اور اس کا حال کسی شکل کی طرح کر کے دوبارہ اس کی خبر ہی نہ لی تھی۔

پچھلے دو دن اور دو راتوں میں اس نے بی بی کا کم از کم سامنا کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس سے سوال و جواب کئے جائیں۔ بیلا نے بھی اس کے رویے میں معمولی سا اضطراب محسوس کیا اور بس۔ بی بی نے جان بوجھ کر اس کے ساتھ راجیہ کے موضوع پر بات نہ کی۔ اسے مونسنے منع کر دیا تھا۔ خود مونسنے بھی اس کا حال چال پوچھنے کے علاوہ اس کے ساتھ کسی بھی قسم کی ایسی بات نہ کی جس کا تانا بانا راجیہ سے جاملتا۔ سرحدی چوکی کی صورتحال کو مونسنے کسی کڑے گھونٹ کی طرح پی گیا۔ اس نے اس کڑواہٹ کا ذرا سا تاثر بھی اپنے چہرے پر نہ آنے دیا۔ غلام حسین نورے اور شوکت کوختی سے ہدایت کر دی کہ رزاقی کو کسی پریشان کن خبر خاص طور پر تازہ سرحدی حالات کے بارے میں قطعاً بھٹک نہ پڑنے دی جائے۔

نجانے یہ سرد کافی کا اثر تھا یا اس کی قوت ارادی کا کمال کہ کافی پینے کے ایک گھنٹے بعد بھی اس کا ذہن بالکل بیدار رہا۔ اسے نیند آئی نہ غنودگی نے اوگھ کے حوالے کیا۔ وہ آنکھیں بند کئے نیم دروازہ پر رہا۔ کبھی جی چاہتا تو آنکھیں کھول کر کمرے کا جائزہ بھی لے لیتا مگر اسے اپنے آپ کو جاگتا رہنے کے لئے کوئی خاص کوشش نہ کرنا پڑی۔

اسے حیرت ہوئی جب وہ مسلسل تین گھنٹوں تک بغیر کسی وقفے کے جاگتا رہا۔ یوں گیر کلاک نے جب رات کا ایک بجنے کا اعلان کیا تو ایک دم اس کی آس ٹوٹ گئی۔ اسے لگا کہ وہ اب تک بیکار ہی راجیہ کا انتظار کرتا رہا۔ شاید بی بی ٹھیک ہی کہتی تھی کہ وہ سب اس کا سپنا تھا، خواب تھا، جس کا یقین اس کی محبت اور دیوانگی نے حقیقت کے طور پر اسے دلایا تھا۔ اس کا دل اور دماغ الجھ سے گئے۔ اس نے سوچا اگر وہ راجیہ کی روح ہی تھی تو یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ دوبارہ اس کے پاس نہ آتی۔ جس شدت اور چاہت کا اظہار اس نے کیا تھا اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ ہر رات اس کے پاس آتی۔ اس سے باتیں کرتی۔ اسے تسلیاں دیتی۔ دلا سے دیتی۔ فرقت میں گزرتے ایک ایک پل کی کہانیاں سنتی اور سناتی۔۔۔ لیکن وہ تو جیسے اسے بھول ہی گئی تھی۔ اور یہ فراموشی اسے سمجھا رہا تھا کہ شاید بی بی کا کہنا ٹھیک تھا۔ مونسنے کا شک درست تھا۔ بات حقیقت نہیں ایک خواب ایک سپنے کے پلو سے بندھی وہ دیوانگی تھی جس کا نام محبت ہے۔

اس کی آنکھیں جل اٹھیں۔ اس نے سسک کر روٹ لے لی۔ اسے اپنے آپ پر رحم سا آ گیا۔ ترجم کا یہ احساس اس کے دل پر پڑنے والا ایسا تازہ تھا جسے وہ سہہ نہ سکا۔ اس کے جذبات میں بے بسی نے لاچارگی کی آگ لگا دی۔ اس آگ کو وہ اپنے بیساختہ بہہ نکلنے والے آنسوؤں سے نہ بجھاتا تو اور کیا

کرتا! بازو پر سر رکھے وہ تپائی پر پڑی راجیہ اور جنت کی تصویر پر نظریں جمائے اشک بہاتا رہا اور دل ہمک ہمک کر اسے رلاتا رہا۔

ایک دم مایوسی کی گرد میں اٹ جانے سے اس کا دماغ تھک سا گیا۔ روتے روتے اس کی آنکھیں بند ہوئیں اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی غنودگی کی کھائی میں اتر گیا۔ اس کی قوت ارادی اس کے جذب کی دین تھی۔ جذبے نے زخم کھایا تو قوت ارادی نے بھی سپرد ڈال دی۔ کسی معصوم بچے کی طرح وہ تر پتر چہرے کے ساتھ بے سدھ ہو گیا۔ کافی ٹھنڈی ضرورت تھی۔ اس کا اثر دیر ہی سے سہی مگر ہو چکا تھا۔

وہ خواب کا عالم تھا یا بیداری کا اسے اس کا احساس نہ ہو سکا مگر اس کا لاشعور دھیرے دھیرے اس کے دماغ پر دستک دے رہا تھا۔ اسے پکار رہا تھا۔ اسے جگ رہا تھا۔ اسے صداؤں کے ہلکورے دے رہا تھا۔

”صاحب۔۔۔ صاحب۔۔۔ صاحب۔۔۔“

اس کی سماعت پر اس ایک لفظ کی تھکیاں جاری تھیں۔ اس کی پلکیں اس لفظ کے احساس کی تصویر دیکھنا چاہتی تھیں۔ اسے لگا جیسے کوئی اسے خواب میں پکار رہا ہے۔ اس نے ہوا میں اڑتے جسم و دماغ کے ساتھ ہولے سے حرکت کی۔ بدن ہلاتو پلکوں نے بھی واہو نے کی کوشش کی۔ پلکوں کے نیم واہوتے ہی آنکھوں میں سفید سفید دھند سی در آئی۔ اس نے سوزش زدہ آنکھوں پر سے پوٹے بمشکل اٹھائے۔ دھند ذرا سی کٹئی۔ کمرے کی چادر کا پلہ ہلکا سفیدی کے دائرے نے وسعت کی سیڑھی سے نیچے قدم رکھا۔ چند لمحے وہ خالی الذہنی کے عالم میں سفید دھند میں دکھائی دیتے گلاب کو تکتا رہا۔ اسی وقت اس کی سماعت میں ایک بار پھر ”صاحب۔۔۔ صاحب۔۔۔“ کی مدھرتان گونجی۔ ایک ہلکے سے جھٹکے نے اسے ہوش کی ڈھلوان پر سے پھلتے پھلتے روک لیا۔ حواس نے چونک کر اس کے شعور میں چٹکی لی۔

”صاحب۔۔۔“ اس بار آواز ایسی صاف اور نہری ہوئی تھی کہ ساری دھند سارا کھراچاک ہو گیا۔ وہ بستر پر اٹھ بیٹھا۔

آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ خواب نے حقیقت کا روپ دھار لیا۔ اس کے سامنے اُدھ کھلے دروازے سے اندر کھڑی اپنی مخصوص خوشبو لاتی، سفید ساڑھی میں ملبوس، زلفیں شانوں پر ڈالے اس کی راجیہ اسے والہانہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اسے مستی بھری صدا میں دے رہی تھی۔

”صاحب۔۔۔“ اس کے غنچے ہونٹ مسکرانے کے انداز میں چٹکتے تو رزاتی پوری طرح جاگ گیا۔ اس نے بستر سے نیچے قدم رکھا تو راجیہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ ”نہیں صاحب نہیں۔ آپ کے قریب آنے کی اجازت نہیں ہے مجھے۔۔۔ وہیں رک جائیے۔“ اس نے ملتجیانہ لہجے میں کہا اور اسے روک دینے کے لئے بازو اس کی جانب دراز کیا۔

”راجیہ۔۔۔“ ایک بیقرار سرگوشی کے ساتھ رزاتی اپنی جگہ ٹھہر گیا۔ ”اگر تم راجیہ ہی ہو تو۔۔۔“

اس کی آواز بھرا گئی۔ جسم میں کپکپاہٹ تیر گئی اور آنکھیں جھلکنے کو تیار ہو گئیں۔

”صاحب۔۔۔“ راجیہ نے ہاتھ دل پر رکھ لیا۔ ”میرے ہونے“ میرے آنے میں شک کیوں ہے آپ کو؟“ اس کی آواز میں تڑپ تھی۔ کک تھی۔ زخمی ہو جانے کا درد تھا۔

”میری راجیہ مجھے یوں تڑپتا چھوڑ کر کیسے جاسکتی تھی؟ تم جانتی ہو، کتنی راتوں کے بعد آئی ہو؟“ رزاتی کے لہجے کا درد ایسا جگر خراش تھا کہ راجیہ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

”میں جانتی ہوں صاحب۔۔۔ مگر میرے صاحب! میں کیا کروں؟ کیا کروں میں؟ آپ جان لیجیے کہ میں اپنی مرضی کی مالک نہیں ہوں۔ میں کسی کی اجازت اور رضا کے اختیار میں ہوں۔ جب جب مجھے اجازت ملتی ہے جب جب کسی کی گرفت مجھ پر نرم پڑتی ہے میں اڑتی ہوئی آپ تک چلی آتی ہوں۔۔۔ بڑی پابندیاں ہیں صاحب جن کی زنجیریں توڑنا پڑتی ہیں آپ کی راجیہ کو۔ بڑے فاصلے ہیں جن کو

پاشا پڑتا ہے اسے۔ میں ابھی اپنے جسم اور روح کی آزادی سے بہرہ ور نہیں ہوئی میرے صاحب۔ مجھے معاف فرمائیے کہ میں نے آپ کی راتوں میں انتظار کی آگ لگائی۔۔۔ لیکن میں خود بھی تو اسی آگ میں جلتی رہی ہوں یہ سارا وقت۔ آپ کیا جانیں کہ آپ کے پاس آ کر بھی آپ سے دوری آپ کے لمس سے محرومی کا دکھ مجھے کس عذاب سے دوچار کئے ہوئے ہے؟ میرا رواں رواں آپ کا اسیر ہے اور آپ ہی سے فاصلے پر رہنا میرا مقدر بن گیا ہے۔۔۔“ اس کی آواز میں نئی جھلکی اور وہ اپنی بیتیابی سے ہونٹ کانٹنے لگی کہ رزاتی کے لئے برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔

”تو تم مجھے بتاؤ ناں راجیہ۔۔۔ یہ فاصلے کیسے ختم ہو سکتے ہیں؟ اگر تم سے ملنے کے لئے مجھے اپنا جسم چھوڑنے کی شرط پوری کرنی ہے تو میں ابھی اسی وقت اس دیمک لگے بدن کی قید سے آزاد ہونے کو تیار ہوں۔۔۔ اور اگر تمہیں کسی کی قید سے چھڑانے کے لئے مجھے کسی کی جان لینی ہے تو۔۔۔“

”ایسا کچھ نہیں ہے صاحب۔۔۔“ راجیہ نے آنسو پونچھتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔ اس کی دھلی دھلائی آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے اتر آئے تھے۔ وہی ڈورے جو رزاتی کو پاگل کر دیا کرتے تھے۔ وحشت پر آمادہ کر دیا کرتے تھے۔ ان ڈوروں کو دیکھ کر اس وقت بھی اس کا دل قابو سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ اس کا جی چاہا وہ پروانہ دار آگے بڑھ کر اپنی راجیہ کو بازوؤں میں جکڑ لے۔ اس کے ہونٹوں پر اس کی آنکھوں پر اس کے سینے پر اس کے گداز بازوؤں پر اس کی زلفوں پر اس کے انگ انگ پر اپنی جلتی سلگتی فرقت کی مہریں ثبت کر دے۔ اسے یوں اپنے آپ میں جذب کر لے کہ وقت کے پیدا کردہ ہر فاصلے کا دم ٹوٹ جائے۔۔۔ مگر ایسا کرنے کے بارے میں وہ محض سوچ کر رہ گیا۔ راجیہ کی بھگی ہوئی آواز نے اس کے سارے خیالات کا تانا بانا بکھیر دیا۔

”صاحب۔۔۔“ مجھ سے آپ کی حالت دیکھی نہیں جا رہی۔ خود کو سنبھالئے۔ آپ میری امانت

میں چھو کر اپنے سارے شک لوگوں کے سارے وہم دور کر دیجئے۔ میں جل کر مر جانے کے لئے تیار ہوں لیکن اپنی محبت پر شک کا سایہ نہیں سمہ سکتی۔ آئیے میرے صاحب۔۔۔ آئیے۔۔۔ مجھے چھو کر میرا لمس محسوس کر کے اپنے یقین کا دامن پھولوں سے بھر لیجئے۔“ ہونٹوں پر بڑی جاندار مسکراہٹ لئے راجیہ نے دوسرا قدم اٹھایا۔

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ رک جاؤ راجیہ۔۔۔ میری جان رک جاؤ۔۔۔“ رزاتی لپک کر اس سے کئی قدم دور جا کھڑا ہوا۔ اس کا سانس ایک دم پھول گیا۔ چہرہ پسینے میں تر اور ہاتھ پاؤں جیسے ٹھنڈے ہو گئے۔ وہ پاگلوں کی طرح ہاتھ اٹھائے اسے اپنے قریب آنے سے روک رہا تھا۔ ”مجھے تمہاری قیمت پر کسی یقین کسی حقیقت کا ادراک نہیں چاہئے راجے۔۔۔ میں زندگی کی اس لاش کو مرتے دم تک اسی آس پر گھسٹتا رہوں گا کہ ایک دن ہمارا ملن ضرور ہوگا۔ جیتے جی نہیں تو مرنے کے بعد۔۔۔ تم مجھ سے ملنے آتی رہنا“ مجھ سے دور کھڑی رہ کر ہی مجھ سے باتیں کرتی رہنا میں اس دوری کو اپنی عادت بنا لوں گا راجے۔۔۔ وہ سسک پڑا۔ ”مگر مجھ سے ہمیشہ کے لئے اپنے اس ادھورے ملن کا احساس مت چھینو۔ میں اب کبھی تمہیں چھونے کی بات نہیں کروں گا۔ کبھی لوگوں کے شک اور وہم کی خاطر تمہاری آمد کو پسنا کہہ کر نہیں جھٹلاؤں گا۔“ اس کی آواز آنسوؤں میں بھگتی چلی گئی۔ ”میں۔۔۔ میں۔۔۔ کسی کو بتاؤں گا ہی نہیں کہ تم مجھ سے ملنے آتی ہو۔ میں بالکل خاموش ہو جاؤں گا۔ بالکل خاموش کسی لاش کی طرح۔“

”صاحب۔۔۔“ اپنی جگہ رکتی راجیہ کا دل جیسے پھٹ گیا۔ اس کی حالت سے لگ رہا تھا کہ اس کا بس نہیں چل رہا، ورنہ وہ رزاتی کی اور اپنی جان ایک کر دیتی۔ ”مجھے جانے کی اجازت دیجئے۔ میں اب آؤں گی تو اپنے اور آپ کے ملن کا رستہ دیکھ کر آؤں گی۔۔۔ اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو کبھی لوٹ کر آؤں گی ہی نہیں۔“

”نہیں راجیہ نہیں۔ ایسا نہ کرنا میری جان۔“ رزاتی نے تڑپ کر اس کی جانب دیکھا۔ ”تمہارا یوں چلے آنا“ مجھے اپنی صورت دکھا جانا ہی کافی ہے۔ میں نے تو اپنے سارے مطالبے ختم کر دیے ہیں سو ہنا۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ تم مجھ سے ہر رات کو۔۔۔ نہیں نہیں۔۔۔ تم پر کوئی پابندی نہیں میری جان۔۔۔ بس تم جب جب آسکناں تب تب مجھ سے ملنے مجھے اپنی یہ موتی صورت دکھانے چلی آیا کرنا۔ میں ہر رات تمہارے لئے دیدہ دل فرس راہ رکھوں گا مگر تم پر کوئی قدغن نہیں کہ تم ہر رات آؤ۔۔۔ بس۔۔۔ جب بھی آسکو آ جایا کرنا۔۔۔ ہمیشہ کے لئے لوٹ جانے کی بات تب سوچنا جب میرا یہ جسم روح سے خالی ہو جائے گا۔“

”صاحب۔۔۔“ راجیہ کا جیسے کلیجہ پھٹ گیا۔ اس نے ساڑھی کے پلو میں چہرہ چھپایا اور اگلے پاؤں کمرے سے نکل کر کاریڈور کی بھی ہوئی روشنیوں کے اندھیرے میں گم ہو گئی۔

ہیں۔۔۔“

”تم نے ایک جھلک دکھا کر میری ہستی کے خرمن میں جو چنگاری پھینکی راجیہ اس کو لاؤ بننے سے بھی تہی روک سکتی تھیں۔۔۔ مگر تم تو تب کی گئی اب لوٹی ہو جب حویلی والے مجھے دیوانہ اور پاگل سمجھنے پر مجبور ہوئے جارہے ہیں۔“

”کون کہتا ہے ایسا؟“ راجیہ نے تڑپ کر کہا۔ وہ ایک دم پھری گئی۔

”جو بھی دیکھتا ہے یہی کہتا ہے اور ٹھیک ہی تو کہتا ہے راجے۔۔۔“ وہ بڑے دکھ سے مسکرایا۔

”میں تمہاری محبت میں دیوانہ ہی تو ہو گیا ہوں۔ اس رات میں تمہارے پیچھے پاگلوں کی طرح بھاگا۔ بی بی اور منوں نے مجھے سنبھالا۔ سمجھانا چاہا کہ میں نے کوئی سپنا دیکھا ہے۔۔۔ تب سے اب تک تمہارے آج آنے سے پہلے تک میں بھی انتظار کا زہر پیٹے پیٹے تھک کر رہی سمجھنے لگا تھا کہ تمہاری اس رات کی آمد ایک خواب ہی تھا۔۔۔ لیکن۔۔۔“ وہ اسے بے یقینی سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آج دوبارہ آ کر تم نے میرے اس یقین کو ڈانواں ڈول کر دیا ہے۔ مجھے سچ بتاؤ راجیہ! میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں یا واقعی تم اس وقت میرے سامنے موجود ہو؟“

”صاحب۔۔۔“ راجیہ کے لہجے میں ایک بار پھر درد جاگا۔ ”یہ آپ کس وہم کا شکار ہو گئے ہیں؟ کیا میری آواز میرا وجود میری نمک میرے آنسو میری تڑپ۔۔۔ یہ سب آپ کو میرے آنے کا یقین دلانے کے لئے کافی نہیں ہیں؟ اگر یہ سب خواب ہے پسنا ہے تو آپ کا دل میرے لئے کیوں دھڑک رہا ہے۔ آپ کی حالت مجھے خون کیوں ترلا رہی ہے؟“

”وہ سب ٹھیک ہے راجیہ مگر۔۔۔“ رزاتی ایک پل کو رکھا پھر اس کی جانب دیکھ کر ہنٹ کاٹے ہوئے بولا۔ ”تمہیں چھو نہ سکنے کا ذیبت بھرا احساس مجھے ڈانواں ڈول کر دیتا ہے۔ دماغ میرے دل کو شک کے حوالے کر دیتا ہے۔“

”میں جس راہ سے لوٹی ہوں جس کی وجہ سے لوٹی ہوں اس کا کہنا یہی ہے صاحب کہ اگر ایک خاص وقت سے پہلے آپ نے مجھے چھوا تو میں سوکھی لکڑی کی طرح جل کر بھسم ہو جاؤں گی لیکن۔۔۔“ وہ بڑے عجیب انداز میں مسکرائی۔ ”میں اپنے صاحب کو شک سے یقین کی منزل میں لے آنے کے لئے اپنی قربانی دینے کے لئے بھی تیار ہوں۔۔۔“ وہ دھیرے سے ایک قدم آگے بڑھی۔ ”اب سے پہلے آپ مجھے چھونے کے لئے بیتاب تھے اور میں آپ کو روک رہی تھی۔ وجہ میں نے آپ کو بتادی مگر اب میں خود آپ کے قریب آ رہی ہوں میرے صاحب۔۔۔ میں خود آپ کو چھو کر ثابت کر دوں گی کہ میں آپ کے سامنے مجسم موجود تھی۔ یہ آپ کا خواب نہیں تھا۔ میں زمان و مکان کی حدود پار کر کے اگر آپ کو دوبارہ پانے کے لئے آپ تک چلی آئی تو آپ پر نثار ہو کر ہمیشہ کے لئے فنا بھی ہو سکتی ہوں۔۔۔ آئیے۔۔۔“

انداز پر چونکا۔ اسی وقت پنڈت نے اپنی بات کا بقیہ حصہ اگل دیا۔ ”یہ ہمارے دھرم کا ماملہ ہے۔ جس طرح ہم آپ کے دھرم کے کسی بھی ماملے میں دھل نہیں دے سکتے یا نہیں دیتے، چاہے وہ کسی کا جاتی ماملہ ہو یا مسیت کی تالہ بندی کا اسی طرح ہماری آپ سے بنتی ہے کہ آپ بھی ہمارے اندر کے ماملوں میں دھل نہ دیں۔ پھر یہ سب کچھ ہمارے دھرم کے بہت بڑے جانور اور ادھیکاری سوامی دھیرج داس جی کی آگیا پر ہوا ہے۔ ہمارے لئے ان کی ہر آگیا کا پالن کرنا بھگوان کا حکم ماننے کے انوسار ہے۔ جس طرح آپ کے دھرم کے کچھ نیم ہیں اسی طرح ہمارا دھرم بھی کچھ نیموں پر ٹکا ہوا ہے مہاراج۔ سوامی جی کا کہنا ہے کہ اس ماملے کو اگر اچھا لایا تو بات دور تک چلی جائے گی۔“

”کتنی دور تک؟“ اچانک مونس بھڑک اٹھا۔ اسے لگا کہ سوامی نے پنڈت کے ہاتھوں اسے دھکی دی ہے۔ پنڈت کے منہ میں اس وقت سوامی کی زبان متحرک تھی وہ جو کہہ رہا تھا اس میں اس کی اپنی عقل کو ذرہ برابر دخل نہیں تھا۔ یہ سب سوامی دھیرج داس کا زہر تھا جسے وہ اس طرح فقرہ فقرہ اگل رہا تھا۔ ”یہ تو میں نہیں جانتا مہاراج۔“ ایک دم جیسے پنڈت کی ہوا سرک گئی۔ اس کے چہرے پر مسے پن نے ڈیرہ جمالیا۔

”یہ بات بھی اپنے سوامی سے پوچھ کر آنا تھی ناں پنڈت جی۔“ مونس کے لہجے میں آگ بھڑکی۔ ”بہر حال ایک بات طے ہے کہ آج کے بعد خالق نگر میں ایسا کوئی واقعہ ہوا تو ہمیں سوچنا پڑے گا کہ آپ لوگوں کا یہاں رہنا مناسب ہے یا نہیں؟“

”جی۔۔۔“ پنڈت کی دھوٹی گیلی ہوتے ہوتے پچی۔ آواز حلق میں پھنس گئی اور پریشان نظریں مونس کے چہرے پر اپنے لئے نرمی تلاش کرنے کی ناکام کوشش میں مصروف ہو گئیں۔

”جی۔۔۔“ مونس نے ہونٹ بھیج کر کہا۔ ”اور ہاں۔۔۔“ مونس نے اسے کڑی نظروں سے دیکھا۔ پھر پوچھا۔ ”آپ کے سوامی جی اور کتنے دن یہاں ہیں؟“

”جی۔۔۔ وہ۔۔۔ شاید۔۔۔ ایک ڈیڑھ مہینہ۔۔۔“

”تو ان سے کہئے کہ وہ یہ عرصہ یہاں شانتی سے گزار لیں۔ دوبارہ کبھی بھی خالق نگر کو اپنی کسی ایسی سرگرمی کا نشانہ نہ بنائیں جو مجھے مجبور کر دے کہ میں ان کے لئے ناپسندیدہ شخصیت کے نام پر واپسی کا بندوبست کر ڈالوں۔“

اس بار پنڈت کے منہ سے ہوں ہاں بھی نہ نکلا۔ وہ بے بسی سے مونس کو دیکھتا رہ گیا۔ مونس نے اپنی کرسی چھوڑ دی۔ اٹھا اور جا کر دروازہ کھول دیا۔

”آپ کے اعزاز میں میں نے دروازہ اپنے ہاتھوں کھول دیا ہے۔ آپ تشریف لے جاسکتے ہیں۔ پلیز۔۔۔“

”راہے۔۔۔ راج۔۔۔“ رزاتی نے اس کے پیچھے لپکنا چاہا لیکن فوراً ہی رک گیا۔ اس کا اٹھا ہوا بازو شکستگی کے عالم میں پہلو میں گر پڑا۔ کپکپاتے ہوئے ہونٹوں پر بڑی پھسکی سی مسکراہٹ ابھری اور نفی میں سر ہلاتا ہوا وہ بستر پر گر پڑا۔ ”نہیں راہے۔۔۔ میں تمہارے پیچھے نہیں آؤں گا۔ میں کوئی پاگل ہوں جو راجیہ راجیہ پکارتا ہوا بھاگتا پھروں؟ تم خود ہی مجھ سے ملنے چلی آیا کرو گی۔۔۔ میں جانتا ہوں تم بھی میرے بغیر ادھوری ہو۔ میرے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ میں یہاں بے کل ہوں تو تم وہاں بیقرار تھیں۔ اب اگر وقت کی دیوار درمیان میں کھڑی ہوگی ہے تو اسے وقت سے پہلے میں کیسے گرا سکتا ہوں؟ میں مر تو سکتا ہوں راہے۔۔۔ مگر کوئی یہ یقین تو دلائے کہ مرنے کا تو تم سے جا ملوں گا۔۔۔ ابھی کوئی آکر یہ کہہ دے اتنا یقین دلا دے کہ مر کر تمہیں پاسکوں گا۔۔۔ تمہاری قسم راہے۔۔۔ ابھی جان نہ دے دوں تو خدا کرے تمہارے صاحب کو کبھی موت نہ آئے۔۔۔ لیکن کوئی کہے تو۔۔۔ کوئی کہے تو۔۔۔“ وہ پگلوں کی طرح بڑبڑا رہا تھا۔

اور کچھ رات کے اس سیاہ کر بناک سناٹے میں کمرے کی کھیتوں کی جانب کھٹنے والی کھڑکیوں کے بائیں ہاتھ دیوار سے لگا ایک سایہ کسی پتھر کے بت کی طرح بے حس و حرکت کھڑا اس کی یہ دیوانوں جیسی باتیں قطرہ قطرہ دل کی زمین پر گرتی محسوس کر رہا تھا۔ اس کے سینے کی دھڑکن سانس لینے کی رفتار اس قدر مدھم تھی کہ شاید اسے خود بھی بڑی مشکل سے اس کا احساس ہو رہا ہوگا۔ لگ رہا تھا اس کا دل کوئی مٹھی میں لے کر مائل رہا ہے۔ ٹپلا ہوئے، دانٹوں میں دبائے، حلق سے آزاد ہونے کے لئے بیتاب آہوں اور سسکیوں کو بمشکل روکے کھڑے اس سائے کا سارا وجود پرفیسی کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔

☆=====☆=====☆

پنڈت گردھاری لال کسی بکری کی طرح سہا مونس کے سامنے بیٹھا میا رہا تھا۔

”خالق نگر میں آج تک ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا پنڈت جی تو پھر اب کیوں؟ گنگا نے اگر اپنا دھرم بدلاتو یہ اس کا ذاتی مسئلہ تھا۔ اس وقت ہم نے اس پر کوئی جشن نہیں منایا تھا مگر اس کی ہندو دھرم میں واپسی پر آپ لوگوں نے اس کا جو شکر کیا ہے اس پر پورا خالق نگر تھرا اٹھا ہے۔ حالانکہ ہمارے دین میں مرتد ہو جانے والے کی سزا قتل ہے مگر اس کا فیصلہ کرنا ہمارا نہیں ہماری اعلیٰ عدالتوں کا کام ہے جو اس ملک میں شرعی کورٹس کے نام پر موجود ہیں۔“ مونس کی آواز لمحہ بہ لمحہ بلند ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس میسے ٹیل کاٹینو ادب دیتا۔ ”اگر میں چاہوں تو ابھی کے ابھی آپ کو پولیس کے حوالے کر سکتا ہوں۔“

”آپ ایسا نہیں کر سکتے مہاراج۔۔۔“ اچانک جیسے پنڈت کا گلا کھل گیا۔ اس نے جڑے ہوئے ہاتھ سامنے کرتے ہوئے مونس کی جانب سردی نگاہوں سے دیکھا۔ مونس اس کے بدلے ہوئے

اس میں شاید کچھ دیر لگ جائے۔ ڈاکٹروں نے ہوابدی کا مشورہ دیا تو لالو نے بیوی بچے کو یہاں آپ کے پاس بھیج دیا۔“

”ارے۔۔۔“ مونس کے لبوں سے بیساختہ نکلا۔ ”تو انہیں اندر بھیج دیا۔“ کہتے ہوئے اس نے موبائل آف کر کے میز پر رکھا اور دروازے کی جانب نظر جمادی۔

چند ہی لمحوں گزرے کہ دروازہ ہلکی سی دستک کے ساتھ کھل گیا۔ گرم چادر میں لپٹے چار سالہ شہزادے کو کندھے سے لگائے پروین اندر داخل ہوئی تو مونس یہ دیکھ کر مطمئن ہوا کہ بچے کے چہرے پر زندگی کی رونق جھلک رہی تھی۔

”سلام صاحب۔۔۔“ پروین نے بڑی ممنونیت سے اس کی جانب دیکھا۔

”سلام پروین بی بی۔ بیٹھو۔“ مونس نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ آرام سے بیٹھ گئی تو

مونس نے دیکھا کہ بچہ سو رہا ہے۔ تب اس نے پوچھا۔

”سب ٹھیک تو ہے ناں؟“

”جی صاحب۔۔۔ سب ٹھیک ہے۔“

”شوکت نے بتایا کہ شہزادہ اب۔۔۔“

”جی صاحب۔۔۔ یہ سب آپ کی اور رزاتی بابو کی وجہ سے ہوا ہے۔“ اس کی آنکھیں نم ہو

”نہیں۔۔۔“ مونس نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ ”شفا اور قضا صرف اللہ کے بس میں ہے

میری بہن۔“

”میں جو کہنا چاہتی ہوں وہ آپ بھی سمجھتے ہیں صاحب۔ میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں جن کے

سہارے میں اپنا دل آپ پر کھول سکوں۔“

”الفاظ کو سنبھال کر رکھنا چاہئے پروین۔“ مونس کہتے کہتے رکھ کر ایک

ٹائٹل بعد بولا۔ ”میں اگر تمہیں بی بی نہ کہوں تو تمہیں برا تو نہیں لگے گا۔ دراصل ہمارے ہاں جو بی بی

پہلے سے موجود ہے ناں اس کے علاوہ کسی اور کو بی بی کہتے ہوئے عجیب سا لگتا ہے اور پھر تم ابھی بی بی کی

عمر کی ہو بھی نہیں۔“

”آپ جیسے بھی پکاریں گے صاحب وہی اچھا ہے۔“ وہ ممنونیت سے بولی۔

”تو پروین۔ الفاظ جو ہوتے ہیں ناں یہ اظہار کا ذریعہ ضرور ہیں مگر انہیں کبھی کبھی خاموشی کی

زبان درکار ہوتی ہے۔ تب یہ خوب بولتے ہیں۔ خوب سمجھاتے ہیں۔ تم بھی ابھی کچھ نہ کہو۔ ابھی انہیں

خاموشی کی چادر میں لپٹا رہنے دو۔ تم جو کہنا چاہتی ہو میں سمجھ رہا ہوں۔ رزاتی کو سمجھانے کی ضرورت

پنڈت کو بھیکے ہوئے جوتے کا خیال بڑی سرعت سے آیا۔ وہ دھوٹی سنبھالتا ہوا اٹھا اور مردہ قدموں سے چلتا ہوا یوں کمرے سے نکل گیا جیسے ابھی ابھی شمشان میں ماما کی اترتی جلا کر آ رہا ہو۔ مونس نے اس کے جڑے ہوئے ہاتھوں کی طرف دیکھا نہ اس کے نمستے اور رام رام کا جواب سر کے اشارے سے بھی دینے کی ضرورت سمجھی۔ ہاں یہ ضرور کیا کہ اس کے جانے کے بعد دروازہ بڑے زور سے بند کر دیا جس کی دھمک نے جاتے ہوئے پنڈت کو لرزاکر رکھ دیا۔

مونس کو آج صبح ہی شوکت اور پھر قاری خادم حسین صاحب سے پتہ چلا تھا کہ گنگانے دوبارہ ہندو دھرم اپنا لیا ہے اور ہندو بستی کے مندر نما کمرے میں اسے اسلام تک جانے اور لوٹ آنے کی سزا کے طور پر اپنے ہاتھوں اپنی زبان کاٹ دینا پڑی ہے۔ اس نے فوراً ہی پنڈت کو بلوایا اور اب اس کی خاطر تواضع کر کے اسے چلتا کیا تھا۔ اس کے کانوں میں اب بھی سائیں سائیں ہو رہی تھیں۔ ایسی بھیمت ایسی دردنگی۔ اسے گنگا کے مرتد ہو جانے کی وجہ کا علم ہوا تو وہ محض افسوس کر کے رہ گیا۔ اس معاملے میں تو وہ بھی بے بس تھا۔ کچھ بھی نہ کر سکتا تھا۔ تاہم جب بھی اس واقعے کا خیال آتا اس کا دماغ بار بار کھولنے لگتا۔ پنڈت کی زبانی سوامی کی حرکت کے بارے میں جان کر وہ سرتاپا شعلہ بنا جا رہا تھا مگر اس وقت وہ کچھ بھی کرنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ تاہم یہ فیصلہ اس نے پوری شدت سے کر لیا کہ سوامی کے بارے میں کئی بھی طرح کی زور عایت سے کام نہ لے گا اور اس کی کسی بھی ناپسندیدہ حرکت کو ایک ہی جیل میں اس کی واپسی کا ٹکٹ بنا دے گا۔

کمرے میں کسی زخمی درندے کی طرح ادھر سے ادھر ٹپکتے ہوئے اس کے پاؤں تب تکے جب اس کے موبائل نے چیخ کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس نے میز پر پڑا موبائل اٹھایا۔ شوکت کا فون تھا۔ اس نے موبائل کان سے لگا لیا۔

”ییس۔۔۔“

”شوکت بول رہا ہوں سر۔“

”ہاں شوکت بولو۔“ مونس نے جواب میں کہا۔ ”مگر پہلے یہ بتاؤ کس پریشن کیسا جا رہا ہے؟“

”جیسا آپ چاہتے ہیں سر ویسا ہی۔۔۔ کوئی کمی نہیں ہے۔ ہر راستہ ہر گلی ہر موڑ ہماری نظر اور دسترس میں ہے۔“

”گڈ۔۔۔ ہاں اب کہو۔ کیا بات تھی؟“

”سر۔ شہر سے لالو کی بیوی آئی ہے۔“

”لالو کی بیوی؟“ حیرت سے مونس نے دہرایا۔ ”خیریت؟“

”ییس سر۔ خیریت ہی ہے۔ اس کا بچہ تندرست ہو گیا ہے۔۔۔ لالو کا کیس ابھی چل رہا ہے۔“

اثبات میں سر ہلادیا۔

تب مونس نے انٹرکام کاٹن دیا۔ دوسری طرف سے رابطہ قائم ہوا تو اس نے کہا۔ ”بی بی۔ آپ ذرا میری بات دھیان سے سنئے۔“

”ہاں ہاں۔ کہو بیٹا۔“ بی بی نے محتاط ہوتے ہوئے جواب دیا تو مونس نے اسے مختصر اپروین کی آمد کے بارے میں بتایا اور ساتھ ہی کسی بھی تیسرے فرد سے اس بارے میں بات نہ کرنے کا اشارہ دیا۔ بی بی نے ساری بات سمجھ لی تو مونس نے پوچھا۔

”بیلا کہاں ہے؟“

”میں ہے بیٹا۔ کیا سمجھیں اسے؟“ بی بی نے ادھر سے پوچھا۔

”ہاں بی بی۔ اگر فارغ ہے تو ذرا بھیجئے۔“ کہتے ہوئے مونس نے رابطہ کاٹ دیا۔

اب یہ کیسے ممکن تھا کہ مونس بابو کا حکم ہوا اور بیلا رک جائے۔ ٹھیک دو منٹ بعد وہ لہراتی، بل کھاتی دروازے پر نمودار ہو گئی۔ پھر پروین کو دیکھ کر اس کے چہرے کے سارے رنگ سمٹ گئے۔ وہ سنبھل کر اندر آئی اور مونس کی جانب دیکھا۔

”یہ بیلا ہے پروین۔۔۔ اور بیلا۔۔۔ یہ ہے پروین۔“ مونس نے تمہید کے بغیر دونوں کا تعارف کرانا چاہا۔ ”بیلا حویلی کی کڑا دھرتا ہے پروین۔۔۔ اور پروین بہت دور سے سفر کر کے یہاں تک پہنچی ہے بیلا۔ کچھ لوہے ہماری مہمان ہے۔“

”سر آنکھوں پر مونس بابو۔“ بیلا نے آنکھیں پل بھر کو موند کر کہا۔ پھر سرور بھرے انداز میں آنکھیں کھولیں اور پروین کی گود میں بچے کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ہنسی کھل اٹھی۔ ”ارے۔۔۔ یہاں تو ایک چندا بھی ہے۔“ اس نے بے تکلفی سے سوئے ہوئے شہزادے کو پروین کی گود سے لے لیا۔ وہ ایسی گہری نیند میں تھا کہ ذرا سا اوں آں کر کے پھر بے سدھ ہو گیا۔ بیلا نے اسے دونوں گالوں پر چوم کر کندھے سے لگالیا۔ ”حکم کیا ہے مونس بابو؟“

”اپنے ساتھ والا کو اڑ پروین کے لئے کھول دو۔ یہ کچھ دن نہیں رہے گی۔“

”اور کچھ؟“ اس نے مست نگاہی سے مونس کو جانب دیکھا۔

”بس بیلا۔“ مونس نے نگاہیں چرائیں۔ ”اس کا سامان۔۔۔“ اس نے پروین کی جانب سوالیہ انداز میں دیکھا۔

”بس ایک بیگ ہے۔ باہر پڑا ہے۔“ اس نے کھڑے ہوتے ہوئے جواب دیا۔

”تم بے فکر ہو کر بیلا کے ساتھ چلی جاؤ پروین۔ تم اب اسی کی ذمہ داری ہو۔“ مونس نے عجب اعتماد کے ساتھ کہا۔

نہیں۔ وہ خاموشی کی زبان سے خوب آشنا ہے۔۔۔ بس اب تم یہ کہہ ڈالو کہ یہاں آنا ہوا تو خیریت سے ہوناں؟“

”جی صاحب۔“ پروین نے بچے کی جانب محبت سے دیکھا۔ ”آپ کی دعاؤں اور کوشش سے شہزادہ دنوں میں ٹھیک ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے مہینہ بھر کی دوائیں ساتھ دے دیں اور فائل بھی۔ انہوں نے کہا کہ اسے کھلی آب و ہوا میں لے جاؤ۔ لالو نے کہا کہ میں اسے خالق نگر آپ کے پاس لے جاؤں۔“

”یہ تو بہت اچھا کہا لالو نے۔“ مونس مسکرایا۔ ”اس حویلی میں کسی بچے کی بہت بری طرح کی ہے پروین۔ شاید اس کے آنے سے یہاں کی رونق لوٹ آئے۔“

”رزاقی بابو کا کیا حال ہے صاحب؟“ پروین نے دھیرے سے پوچھا اور کسی خیال سے اس کی آنکھیں بے اختیار جھک گئیں۔

”ویسا ہی ہے۔ دعا کرو کہ۔۔۔“ مونس کی بات ادھوری رہ گئی۔ شہزادہ کراہ کر کسمایا تھا۔ پروین نے فوراً ہی اسے چوم کر ساتھ لگالیا۔

”لالو کا کیس کس مرحلے میں ہے؟“ مونس نے اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”تاریخیں بڑی جلدی جلدی پڑ رہی ہیں صاحب۔“ پروین کا لہجہ سمجھ سا گیا۔ ”لالو نے مجھے اس لئے بھی یہاں بھیجا ہے کہ عدالت کا فیصلہ سنا جائے کیا ہو؟ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو میں۔۔۔“ پروین کی آواز رندھ گئی اور وہ ہونٹ کاٹنے لگی۔

”آں ہاں۔۔۔“ مونس نے ہاتھ اٹھا کر اسے رونے سے روک دیا۔ ”کچھ نہیں ہو گا لالو کو۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔“

”صاحب۔۔۔“ پروین کی نم آنکھیں مونس کی طرف اٹھیں۔

”ہاں۔۔۔“ مونس نے پورے اعتماد سے اسے تسلی دی۔ ”میں سچ کہہ رہا ہوں۔ بہت جلد وہ بری ہو جائے گا۔“

”انشاء اللہ۔“ بے اختیار پروین کے لبوں سے نکلا۔

”جب اللہ پر اس قدر بھروسہ ہے تو پھر گھبرانا کیسا پروین۔ یقین رکھو سب ٹھیک ٹھیک ہو گا۔ انشاء اللہ۔“ وہ مسکرایا۔ ”اب جس ایک خاص بات کا دھیان رکھنا ہے تمہیں وہ سن لو۔“

”جی۔۔۔“ پروین نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے آنکھیں خشک کیں۔

”یہاں تم کسی کو لالو کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گی۔ تم میرے آفس بوائے نادر کی بہن ہو اور کچھ دنوں کے لئے یہاں اپنے بچے کے ساتھ کھلی آب و ہوا میں رہنے آئی ہو۔ بس اس کے سوا تم یہاں کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گی۔ بی بی کو میں خود سنبھال لوں گا۔“ مونس خاموش ہوا تو جواب میں پروین نے

زن ہوا کہ وقت گزرنے کے احساس سے اس کا ناطہ ٹوٹ سا گیا۔ اسے بی بی کی وہ ساری باتیں یاد آنے لگیں جو اس نے کماری کے بارے میں بتائی تھیں۔ اسے اونگھ سی آگئی۔۔۔ اور اسے حیرت تو اس وقت ہوئی جب تقریباً پچیس منٹ بعد وہ جاگا تو اس کا سر درد ختم ہو چکا تھا۔ دماغ میں بندھی گریہ ڈھیلی ہو جانے کے احساس سے اس کی طبیعت پر چھائی مردنی میں خاصی کمی آچکی تھی۔ اسے لگا جیسے پروین کی آمد اس کے اللہ کی طرف سے اس کے لئے امداد غیبی ہے۔ اب وہ اس امداد کو وہ کہاں اور کیسے استعمال کرتا ہے یہ اس کی صوابدید پر تھا اور یہ تو رزاقی بھی مانتا تھا کہ مونس کی دینی صلاحیتیں اللہ تعالیٰ نے کسی خاص وقت میں اسے ودیعت کی تھیں۔

اسے ایک بار پھر چائے کی طلب ہو رہی تھی اور وہ جانتا تھا کہ ابھی بیلا کسی جن زادی کی طرح چائے کا ٹرے تھامے آن موجود ہوگی۔ وہ بڑی شدت سے اسے یاد کرنے لگا جیسے ٹیلی میٹھی سے کام لیتے ہوئے اپنا پیغام بیلا کو پہنچانا چاہ رہا ہو۔

☆=====☆=====☆

”اچھا۔ تو ایسا کہا اس مونس بابو نے؟“ سوامی نے پنڈت کی بات سن کر بڑے کڑوے لہجے میں کہا تو پنڈت کی ٹہنی گم ہوگئی۔ اسے لگا کہ سوامی اب کوئی قہر ڈھانے ہی کو ہے۔ اب اس کی لپیٹ میں کون کون آتا ہے یہی خیال اس کی گھبراہٹ کا باعث تھا۔

”سوامی جی۔ ہمیں بھی یہ بات گھٹ رکھنا چاہئے تھی۔ یہاں آج تک ایسا کچھ نہیں ہوا جیسا اب ہوا۔“ پنڈت نے ہاتھ جوڑ کر اس کی جانب بھی ہوئی نظر اٹھائی۔

”جب یہ ہمارے دھرم کا معاملہ ہے پنڈت تو اس مونس بابو کو سمجھ جانا چاہئے تھا کہ اس میں ٹانگ اڑانے کی آگیا نہیں ہے اسے۔“

”وہ تو انہوں نے آپ کی بات سو بیکار کر کے بتا دیا سوامی جی کہ وہ ہمارے کسی ماتلے میں دھل نہیں دے رہے۔“

”مگر ساتھ ہی دھکی بھی تو دے دی۔۔۔“ سوامی کسی زنجی سانپ کی طرح تڑپا۔ ”اور یہ تو اس کی اتنی سہانتا کیوں کر رہا ہے؟“ وہ پنڈت پر اُلٹ پڑا۔

”مم۔۔۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔ سہانتا کہاں کر رہا ہوں سوامی جی؟ مم۔۔۔ میں تو۔۔۔ میں تو۔۔۔“ وہ میا کر رہ گیا۔

”بزدلوں کی طرح جیون بتاتے بتاتے تجھے ان مُسلوں سے ڈرتے رہنے کی عادت ہو گئی ہے پنڈت پرنتو تو نہیں جانتا کہ اب ان کا یہاں سے چل چلاؤ ہے۔ بہت جلد یہاں ہمارا مندر بنے گا۔ نا تو س گونجے گا۔ ہم یہاں اکثریت میں ہوں گے اور یہ مُسلے اقلیت میں۔ سمجھاؤ۔“ سوامی نے اسے

”شکر یہ صاحب۔“ پروین نے کہنا چاہا۔

”آں ہاں۔۔۔“ بیلا نے اسے کچھ بھی کہنے سے روک دیا۔ ”مونس بابو برامان جائیں گے ایسی کسی بھی بات کا۔ آ جاؤ۔ چلیں۔“ وہ مونس کو تیکھی نگاہوں سے دیکھ کر دروازے کی جانب پلٹ گئی۔

مونس نے اثبات میں سر ہلا کر جانے کا اشارہ کیا تو پروین بھی سر جھکا کر بیلا کے پیچھے باہر نکل گئی۔

مونس نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنی سیٹ پر گر سا پڑا۔ اسے لگا جیسے اس کے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔

ایک بار پھر اس کا ذہن کچھ دیر پہلے کی رو میں بہہ نکلا۔ اسے پنڈت کی باتیں یاد آئیں اور وہ ان کی تہہ میں اترنے کی سعی کرنے لگا۔ اسے سوامی پہلے دن ہی سے اچھا نہ لگا تھا اور اب اس نے لنگا کی زبان کٹوا دی تو وہ اس سے اور بھی متنفر ہو گیا۔ جوں جوں وہ سوچتا گیا اس کے ذہن پر سوامی کے کردار کا بوجھ بڑھتا گیا۔

ایک بار اس کا جی چاہا کہ وہ رزاقی کے پاس جائے۔ اس کی طبیعت معلوم کرے۔ اسے پروین کی آمد کے بارے میں بتائے مگر پھر اس نے کچھ دیر کے لئے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ وہ ابھی تہارہ کر سوامی کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا۔ کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتا تھا۔ نجائے کیا پھانس تھی جو اس کے ذہن میں چھپ گئی تھی۔ کہیں کوئی چھوٹی سی گرتھی جس نے اس کے ذہن اور سوچ کے درمیان روڑا سہاڑا دیا تھا۔ یہ گرتھ کھل جاتی تو بات صاف ہو جاتی مگر کیسے؟ یہی اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ سوچتے سوچتے اس کے دماغ میں پروین کا خیال در آ یا۔ اگر وہ کسی طرح اسے اس معاملے میں مدد پر آمادہ کر لیتا تو شاید۔۔۔ دوسرے ہی لمحے اس نے سر جھٹک کر اس سوچ سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی۔ اس سے پہلے وہ بیلا کو بھی تو تعاون پر آمادہ کر چکا تھا۔ ابھی تک اس نے کیا کر لیا تھا؟ حویلی میں کسی نئی بات نے جنم لیا تھا نہ بیلا نے اسے کسی قسم کا نیا واقعہ سنایا تھا۔ رزاقی کے بارے میں وہ یہی بتاتی تھی کہ وہ خاصے آرام سے ہے۔ اس کا مطلب تو یہی تھا کہ وہاں سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے تاہم اس کا دل یہ بات مانتا نہ تھا۔ نجائے کیوں؟ سرحدی چوکی پر ہونے والے واقعے نے اس کی توجہ اپنی جانب کھینچی تو وہ اور الجھ گیا۔ گھوم پھر کر ہر بات کا تعلق نجائے کیوں اسے سوامی دھیرج داس کی بد ذات سے جڑا ہوا محسوس ہوتا۔ جب سے وہ آیا تھا تبھی سے خالق مگر میں انہو نیاں ہونے لگی تھیں۔

اس کا سر درد ہونے لگا۔ کپٹیاں دباتے ہوئے اس نے آنکھیں بند کر لیں اور سر کرسی کی پشت سے ٹیک دیا۔ پھر نجائے کیا ہوا کہ اس کے تصور میں بیلا کی موسیٰ کا سراپا ابھر آیا۔ نیلی زمین پر زرد پھولوں والی سوتی ساڑھی میں ملفوف جسم، گھونگھٹ میں چھپا چہرہ اور بتائی جانے والی عمر کے مقابلے میں خاصا کم عمر بدن اور ایک ٹانگ سے لنگراتی ہوئی سراپا قیامت۔ وہ کماری کے دلفریب نشیب و فراز میں یوں غوطہ

کڑی نظروں سے گھور کر دیکھا۔

”جی جی۔۔۔ سوامی جی۔۔۔ سمجھ گیا۔ سمجھ گیا۔“ وہ جیسے ہکلائے کی مشق کرنے لگا۔

”کیا سمجھا رہے ہو اسے سوامی؟“ اچانک ایک آواز نے ان دونوں کو چونکا دیا۔ دونوں نے دروازے کی جانب گردن ایک ساتھ گھمائی۔ کماری تب تک ان دونوں کے قریب پہنچ کر چھڑی دیوار کے سہارے نکلا چکی تھی۔ ”یہ سمجھا سمجھایا ہے۔ اس کے بجائے خود کو یہ سمجھانے کی کوشش کرو کہ تم جس کام کو تر حلوہ سمجھ رہے ہو وہ لوہے کے پنے چبانے سے کم نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟“ سوامی اسے خود سے چند قدم دور بیٹھ کر کرشن کے بت کی جانب ہاتھ جوڑتے دیکھ کر غرایا۔

”مسلمانوں کے بارے میں یا تو تمہارا علم بڑا ناقص ہے یا تم جان بوجھ کر انہیں اہمیت نہیں دے رہے۔ اور یہ دونوں ہی باتیں خطرناک ہیں سوامی۔“ کماری اپنی ساڑھی کا پلو سینے پر کھینچتے ہوئے اس کی جانب متوجہ ہوئی۔

”اے۔۔۔“ ایک دم سوامی نے پنڈت کی جانب انگلی اٹھائی۔ ”تم چلو یہاں سے۔ ایک گھنٹے سے پہلے ادھر مت آنا۔ چلو۔“

”جی سوامی جی۔۔۔ پنڈت کے حلقے سے آواز بڑی مشکل سے نکلی۔ اس کا چہرہ اس طرح دھکرا رہے جانے پر ایک دم سرخ ہو گیا تاہم وہ خاموشی سے اٹھا اور مندر سے نکل گیا۔

”دوسروں کو منٹ نہ مجھے کی تمہاری عادت بہت پختہ ہو گئی ہے سوامی۔ کسی دن اس بات پر تمہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔“

”مجھے پانڈھ شالہ کا پچر سمجھنے کے بجائے کام کی بات کرو کماری۔ کیوں آئی ہو؟“ سوامی نے بگڑ کر کہا اور اس کی طرف سیدھا ہویٹھا۔

”تم نے گنگا کی زبان کیوں کٹوائی؟“ کماری نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بڑی سرد مہری سے پوچھا۔

”تم نے پوچھنے والی کون ہوتی ہو؟“ سوامی کے لہجے میں غرور اور تحارت نمایاں تھی۔

”کوئی نہیں۔ تاہم میں تمہیں یہ بتا دوں کہ تم کسی بڑے کشت میں پھنسنے والے ہو۔“

”پھر تو تمہیں خوش ہونا چاہئے کماری۔“ سوامی نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”ویسے بائی دینی دے کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ کس قسم کا کشت ہے جس کے بارے میں تم مجھے سماچار دیئے آئی ہو؟“

”خوش تو میں واقعی بہت ہوں گی سوامی بس ذرا سہ آ لے۔۔۔ رعبی بات کشت کی تو اس سے بڑا کشت تمہارے لئے اور کیا کھڑا ہوگا کہ مونٹس بابو نے تمہارے لئے اپنے ہر دے میں کرودھ کو جگہ دے

دی ہے۔ ان سے پیر پیدا کر کے کیا تم یہاں پھل پھول سکو گے؟“

”ہنہ۔۔۔“ سوامی نے تحارت سے کہا۔ ”مونٹس بابو۔۔۔ مونٹس بابو۔۔۔ یہ سالا پنڈت بھی ابھی یہی راگ الاپ رہا تھا اور اب تم بھی مجھے اسی سے ڈرا رہی ہو۔ کیا کر سکتا ہے وہ میرا؟ ہاں۔۔۔ میرے ایک منتر کی مار ہے وہ۔ چیونٹی کی طرح مسل دوں اسے جب چاہوں۔“ سوامی نے انگلی اور انگوٹھے کے درمیان جیسے مونٹس کو مسلا۔

”بھول ہے تمہاری سوامی۔“ کماری ہنس پڑی۔ ”میں حویلی میں رہ کر رزاتی اور مونٹس کے بارے میں جو کچھ جان چکی ہوں تم اس سے بالکل انجان ہو۔ صرف ایک بات جان لو تو تمہارا سانس رک جائے گا اور وہ یہ کہ رزاتی اور مونٹس کو ایک دوسرے سے الگ کرنے کی بات سوچنا کسی دیوانے کے سپنے سے زیادہ نہیں ہے۔“

”مجھے تمہاری کسی انفارمیشن پر شک ہے نہ اس سے میں اختلاف کر سکتا ہوں کماری۔“ سوامی نے صاف گوئی سے کہا۔ ”پر تو ابھی میں نے ان دونوں میں دراڑ پیدا کرنے کی کوشش کی ہی کب ہے؟ ابھی تو میں اپنے مہرے بچھا رہا ہوں۔ کھیل تو ابھی شروع ہونا ہے۔۔۔ اور کھیل شروع ہوگا تو تم جان پاؤ گی ناں کہ سوامی کس بلا کا نام ہے۔“

”وہ میں جانتی ہوں۔“ کماری نے نفرت سے کہا۔ ”میں جانتی ہوں کہ تمہیں کس نام سے پکارنا چاہئے۔ فی الحال میں یہ سن لو کہ جتنی جلد ہو سکے اپنا کام کر کے یہاں سے نکل جاؤ۔ دیر کرو گے تو یہیں رہ جاؤ گے اور یہ میں نہیں کہہ سکتی کہ تب تمہارا گھکانہ یہ گاؤں ہو گیا۔۔۔“ کماری نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”ہوں۔۔۔“ سوامی نے پہلی بار اس کی کسی بات پر طنز یا غیر سنجیدگی سے پرہیز کیا۔ چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر سر اٹھایا اور غیر محسوس انداز میں ہلا کر رہ گیا۔ شاید اسے کماری کی بات میں وزن نظر آیا تھا۔

”میں اب چلتی ہوں۔“ کماری اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اگر تم صرف ان چند باتوں کے لئے مجھ تک آئی تھیں تو مجھے حیرت ہے۔“ سوامی نے اس پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔

”تم ٹھیک سمجھ۔“ کماری نے کرشن بھگوان کی جانب سر جھکا کر واپسی کے لئے قدم اٹھایا۔ ”میں اصل میں گنگا سے ملنے آئی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر رہ نہ سکی اور تمہیں آئندہ کے لئے محتاط رہنے کا کہنے چلی آئی۔ چلتی ہوں۔“ وہ اٹھی۔ دیوار سے لگی اپنی چھڑی ہاتھ میں لی اور لاپرواہی سے چلتی ہوئی خارجی دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ سوامی کے ماتھے پر شکنیں ابھریں اور وہیں جم کر رہ گئیں۔ وہ بڑی کینہ توڑ نظروں سے کماری کی جھلکی کر گھور رہا تھا جو اب اس کی نگاہوں کی دسترس میں نہ تھی مگر اسے یہی لگ رہا تھا کہ وہ مل کھاتا رہیں جو داس کا منہ چڑانے کے لئے اب بھی وہیں موجود ہے۔

☆=====☆=====☆

بیلا نے پروین کو بی بی سے ملایا۔ پھر اسے ساتھ لئے ہوئے اس کے کوارٹر پر چلی آئی جس کی چابی وہ آتے ہوئے لے آئی تھی۔ منوں میں اس نے کوارٹر میں پروین کا سارا سامان سیٹ کر دیا۔ سامان تھا ہی کیا؟ اس کے اور شہزادے کے کپڑے دو انیاں اور چند سفری برتن۔ باقی کی ساری ضرورت کی چیزیں اس نے سنور سے نکلا کر کچن میں ڈال دیں۔ بستر اور لحاف وہاں پہلے سے موجود تھے۔ پروین کے سامنے چائے کے ساتھ خشک میوہ جات کی پلیٹ رکھ کر وہ اس کے پاس آ بیٹھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ پروین سے ساری باتیں پوچھے۔ وہ کون ہے؟ اس کا مونہس بابو سے کیا تعلق ہے؟ وہ کیوں اور کہاں سے آئی ہے؟ کب تک یہاں رہے گی؟ وغیرہ وغیرہ۔۔۔ مگر اسے اس کا موقع نہ ملا۔ کماری نے اسے آواز دے لی۔ وہ صبح سے ہندو بستی گئی ہوئی تھی۔ اب لوٹی تو اسے بی بی سے پتہ چلا کہ مونہس نے کسی عورت کے ساتھ اسے نئے کوارٹر میں بھیجا ہے۔

”آئی موسیٰ۔“ بیلا نے جواب میں کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”میری موسیٰ آگئی۔ میں ابھی اسے مل کر آتی ہوں۔ اگر وہ تھکی نہ ہوئی تو تمہیں بھی اس سے ملاؤں گی۔“

”اچھا۔“ پروین نے شہزادے پر لحاف ٹھیک کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ”میں انتظار کروں گی تمہارا۔“

اسی وقت کماری کی آواز پھر ابھری اور خاصی قریب سے۔ پھر اس سے پہلے کہ بیلا جواب میں کچھ کہتی، کماری اپنی سفید ساڑھی میں لپٹی چھری نیکی اندر چلی آئی۔ پروین اسے دیکھ کر چونکی تو بیلا نے ایک گہرا سانس لیا۔

”میں آ ہی رہی تھی موسیٰ جی۔“ وہ منک کر بولی۔ پروین کی حیرت اب بھی برقرار تھی۔ ایسی کم عمر اور حسین موسیٰ اس نے پہلے کب دیکھی تھی۔

”نہستے۔“ کماری نے پروین کی جانب دیکھ کر ہاتھ جوڑے۔ جواب میں اس نے بھی بے اختیار ہاتھ جوڑ دیے پھر جھینپ کر ہاتھ کھول دیے۔ میساختہ بیلا کی ہنسی نکل گئی۔ اس پر کماری اور پروین بھی مسکرا دیں۔

”میں نے سوچا، خود ہی جا کر دیکھ آؤں، کون آیا ہے؟“ باوجودیکہ کماری بڑے گھمبیر لہجے میں بولی تھی مگر اس کی آواز کے لوج نے پروین پر حیرت کا دوسرا حملہ کیا۔

”موسیٰ۔“ یہ ہیں پروین۔ مونہس بابو کی خاص مہمان۔ شہر سے آئی ہیں۔ کچھ دن یہیں رہیں گی۔“ بیلا نے تعارف کرایا۔ ”اور پروین جی۔ یہ ہیں میری موسیٰ۔ لگتی نہیں پرتو ہیں۔ اب کیا کیا جا سکتا ہے۔“ وہ مجبوری سے بولی تو ان دونوں کی ہنسی نکل گئی۔

”بیٹھے ناں۔“ پروین نے کماری سے کہا تو وہ ”دھنواؤ“ کہہ کر بستر کے پاس پڑے موڑھے پر بیٹھ گئی۔ ”چائے کا ایک کپ مجھے بھی مل جائے تو۔۔۔“ کماری نے بیلا کی جانب دیکھا۔

”چائے۔۔۔“ اچانک بیلا حواس باختہ ہو گئی۔ ”ہے بھگوان۔۔۔ یہ کیا ہو گیا۔“ وہ پلٹی اور دروازے کی جانب بھاگی۔ ”میں ابھی آئی موسیٰ۔ مونہس بابو چائے کے انتظار میں ہوں گے۔ ارے ارے یہ کیا ہو گیا مجھ سے۔“ وہ کچھ بھی سنے بغیر باہر نکل گئی۔

”پگلی ہے۔“ کماری مسکرائی۔ ”مونہس بابو کے کام میں تو اس کی جان انگی رہتی ہے۔“

”میں آپ کے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں۔ آپ بیٹھے۔“ پروین اٹھی۔

”نہیں نہیں۔ تم کٹش نہ کرو۔ ابھی بیلا لوٹ آئے گی۔“ کماری نے اسے روکنا چاہا۔

”کٹش کیا؟ دو منٹ میں چائے بن جائے گی۔“ پروین نے اپنا کپ بھی اٹھالیا جو سرد ہو چکا تھا۔

”تو چلو۔ میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔ کچن میں تم چائے بنانا اور ساتھ ساتھ مجھے اپنے بارے میں کچھ بتانا بھی۔“

پروین اور کماری کچن میں چلی آئیں۔ پروین نے چائے بنانے کے دوران اسے مختصر اشنہزادے کے بارے میں بتایا کہ وہ کس قدر خطرناک بیماری سے صحت یاب ہوا ہے اور اب ڈاکٹروں کے کہنے پر اسے کھلی آب دہوا میں خالص نمک اس لئے لے کر آئی ہے کہ یہاں اس کا بھائی ملازم ملازم ہے۔ یہ بات وہ نہ چھپا سکی کہ شہزادے کا سارا علاج رزاقی اور مونہس کے کہنے پر ہوا ہے۔ ان کے اس احسان کے تذکرے پر وہ بے اختیار آبدیدہ ہو گئی۔ کماری خاموشی سے اس کی بات سنتی رہی اور اس کا شانہ تھپک کر اسے حوصلہ دیتی رہی۔ مونہس اور رزاقی کا ایک نیا روپ اس کے سامنے آیا تھا۔ پھر دونوں کمرے میں لوٹیں تو بیلا بھی واپس آ گئی۔

کماری نے اسے پروین کے بارے میں اپنے طور پر آگاہ کیا تو اس کے چہرے پر خزاں ہی چھا گئی۔ کچھ عرصے سے کسی کا بھی دکھ جان کر اس کا یہی حال ہوتا تھا۔ کمرے میں سکوت گہرا ہوتا چلا گیا۔ پروین سر جھکائے بے خیالی میں سوئے ہوئے شہزادے کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ بیلا خاموش تھی اور کماری ساڑھی کا کوندانتوں میں دبائے کسی گہری سوچ میں غرق تھی۔ چائے کا کپ اس کے ہاتھ میں ایک بھی گھونٹ لئے بغیر ہی سرد ہو چکا تھا۔

بیلا نے پروین کو کھانا پکانے سے منع کر دیا۔ اسے بتا دیا کہ جب وہ دوپہر کو کوہلی سے لوٹے گی تو اس کے لئے کھانا لیتی آئے گی۔ دو چار دن بعد وہ آرام سے کھانا وغیرہ پکانا شروع کر لے ابھی اس کی ضرورت نہیں۔ پروین اس کے خلوص سے بیحد متاثر ہوئی اور شہزادے کے لئے دودھ گرم کرنے کے لئے کچن میں چلی گئی جو اب جاگنے کے لئے پرتول رہا تھا۔ کچھ دیر بعد کماری اور بیلا اپنے کوارٹر میں چلی

دوں میں تم اپنے مونس بابو کی باہوں میں ہوگی۔“
”سج سوامی جی۔“ بیلا کھل اٹھی۔

”ہاں۔۔۔“ سوامی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”پرنتو تم نے ہماری اداس باہوں کا کچھ خیال نہیں کیا۔۔۔ کیا یہ اچھی بات ہے؟“

”میں آپ کی شرط کے مطابق آپ کو خوش کر چکی ہوں سوامی جی۔“ بیلا نے سوامی کو بیباکی سے دیکھا اور چمک کر کہا۔ ”اب فی الحال آپ مجھ سے کوئی آشنا نہ رکھئے۔“

”ایسا کیا؟“ سوامی جیسے اس سے کھیل رہا تھا۔ اس کا موڈ ایک دم خوشگوار ہو گیا۔ شاید یہ بیلا کی بیباکانہ گفتگو کا چٹکار تھا۔

”بس ایسا ہی ہے۔“ بیلا نے ایک اداسے جواب دیا اور بیٹھے بیٹھے مل کھا گئی۔ سوامی اس کے اس خنرے پر ذوق ہی تو ہو گیا۔ بیباکانہ اس نے بیلا کا ہاتھ تمام لیا جسے بیلا نے دھیرے سے چھڑا لیا۔ ”میں نے کہا نا سوامی مہاراج۔ فی الحال اس کی کوئی آشنا نہ رکھئے۔“

”یعنی بعد میں اس کی آشا کی جاسکتی ہے؟“ سوامی نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

”سے آنے پر دیکھا جائے گا۔“ بیلا نے بڑے ناز سے کہا۔

”تو کچھ دیر بیلا! وہ سے بہت قریب ہے جب تم ہماری رت چمکے گی پیاس کا دامن اپنے اس نرم و گداز بدن سے لبالب بھر دو گی۔“

”کتنا قریب سوامی مہاراج؟“ وہ جلدی سے بولی۔

”اتنا ہی قریب جتنا اس سے تم ہم سے قریب ہو۔“ سوامی نے اس کی جانب ہاتھ دراز کیا۔
”یعنی۔۔۔“

”چند دن۔۔۔ صرف چند دن بیلا۔ پھر وہاں تم مونس بابو کے ساتھ اور یہاں ہمارے ساتھ ہو گی۔“ سوامی کا لہجہ بڑا عجیب سا ہو گیا۔

”کیا مجھے خوشی سے مر جانا چاہئے؟“ بیلا نے سرگوشی کی۔

”مریں ہمارے اور تمہارے دشمن بیلا۔ تم کیوں مرو۔“ سوامی نے اسی لہجے میں جواب دیا۔ اس بار بیلا خاموش رہی۔ وہ شاید سوامی کی بات کو من ہی من میں تول رہی تھی۔

”تم نے یہ تو پوچھا ہی نہیں بیلا کہ ہم نے تمہیں بلایا کیوں تھا؟“ کچھ دیر بعد سوامی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

”جی سوامی جی۔۔۔ آپ حکم دیجئے، کیوں یا دیکھا تھا داسی کو؟“ بیلا نے اسے دالہانہ انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

آئیں۔

اپنے سونے کے کمرے میں پہنچ کر کماری تو کمر سیدھی کرنے کے لئے لیٹ گئی اور بیلا حویلی کی طرف نکل گئی جہاں اسے دو پہر کا کھانا تیار کرنا تھا۔ پھر کماری کی آنکھوں میں تھکن کے نام پر اترتی نیند نے پاؤں پیارے اور اس کی مدد بھری آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔

☆=====☆=====☆

”کیسی ہو بیلا؟“ سوامی نے اپنی کوشڑی میں چٹائی پر ٹانگیں پیارتے ہوئے اسے بڑی بھوکے نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”آپ کی دیا ہے سوامی جی۔“ بیلا نے اس سے نظریں چرا لیں۔

”کیا بات ہے سُندی۔ جب تک تمہیں بلایا نہ جائے تم ہم سے ملنے ہی نہیں آتیں؟“ سوامی نے چبا چبا کر پوچھا۔

”ایسی تو کوئی بات نہیں سوامی جی۔“ بیلا نے انگلیاں مروڑتے ہوئے جواب دیا۔ ”بس حویلی سے فرصت ہی نہیں ملتی۔“

”حویلی سے یا۔۔۔ مونس بابو سے؟“ سوامی نے ذرا رک کر معنی خیز لہجے میں بات پوری کی تو بیلا کے چہرے کا رنگ ایک چلی کے لئے بدل گیا مگر دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل گئی۔

”ایسی بھی کوئی بات نہیں سوامی جی۔“ اس کے انداز میں اداسی پا کر دواہی چونکا۔

”کیا بات ہے۔ تمہارے سبجے میں خراشا کیوں جھلک رہی ہے؟“

”آشا والی کوئی بات بھی تو اب تک نہیں ہوئی سوامی مہاراج۔“ اس کے لہجے میں طنز سا لہر آیا۔
”میں آج بھی اسی جگہ کھڑی ہوں جہاں حویلی میں داخلے کے وقت تھی۔“

”یعنی مونس بابو۔۔۔“

”میں ان کی نظر میں حویلی کی ایک اچھی ملازمہ ہوں اور بس۔۔۔“ بیلا کی آواز میں یاسیت ابھری۔ ”اس سے آگے میرے لئے کچھ بھی نہیں ہے وہاں۔“

”تو تمہیں مجھ سے بات کرنا چاہئے تھی بیلا۔ بتانا چاہئے تھا کہ معاملہ وہیں کا وہیں ہے۔“ سوامی نے ذرا بگڑ کر کہا۔ ”یہ تو ہماری ودیا کا اظہان ہے کہ ہماری ران تلے سے نکلی ہوئی بیلا ابھی تک اپنی اچھیا کے انوسار پھل پر اپت نہیں کر سکی۔“

”میں تو سمجھتی تھی کہ آپ انتریا می ہیں اس لئے آپ کو کچھ بتانے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ آپ میرا دھیان رکھے ہوئے ہوں گے۔“ بیلا نے شکایت آمیز نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

”ہم اپنے کام میں ایسے لکھے بیلا کہ تمہیں وقتی طور پر دوسرا بیٹھے۔ بہر حال تم فکر نہ کرو۔ چند ہی

رہی ہے۔

”کیا بات ہے بیلا۔ لگتا ہے تم کچھ کہنا چاہتی ہو۔“ وہ اسے غور سے دیکھ کر بولا۔

”جی۔۔۔ نہیں تو۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں سوامی جی۔“ وہ گڑبڑائی پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ سوامی

نے اسے نظروں میں تو لا پھر کہا۔

”بیلا۔ کسی وہم کو سن میں جگہ نہ دو۔ میں موجود ہوں ناں۔ اگر میں ایک دن میں تمہیں حویلی کے

اندر پہنچا سکتا ہوں تو اور کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ جو کام تمہیں سونپا ہے اسے ذمہ داری سے پورا کرنا۔“ اس کا

لہجہ تنبیہی ہو گیا جس میں دھمکی کا عنصر نمایاں تھا۔

”آپ نچھت رہیں سوامی جی۔ جیسا آپ نے کہا ویسا ہی ہوگا۔“ بیلا نے اس کے لہجے کی گہرائی

پر دھیان دیا یا نہیں اس کا تو سوامی کو پتہ نہ چلا ہاں یہ اطمینان اسے ہو گیا کہ بیلا اس کے کہے میں ہے اور

اس کا کام ہو کر رہے گا۔ ”آگیا دیجئے۔“ وہ ہاتھ جوڑ کر ذرا سا اس کی جانب جھکی پھر اٹھ پائوں کو ٹھکڑی

سے نکل گئی۔

سوامی خاموشی سے بند ہوتے دروازے کو تکتا رہ گیا، جس کے باہر مندر کے کمرے میں بیٹھا

پنڈت مالا کے والے گھار ہاتھا۔

”کیا بات ہے بیلا؟ ہم سے بات کرنا بھی اب تمہاری ہے تمہارے من پر۔“ بیلا اس کے قریب

سے انجان بن کر گزر گئی تو اس نے پیچھے سے آواز دی۔۔۔ اور اس کا منہ حیرت سے کھلنے کے بعد

شرمندگی سے بند ہو گیا جب بیلا اس کی بات کا جواب دیے بغیر مندر سے نکل گئی۔

☆=====☆=====☆

دروازہ کھلا تو ہوا کو آمدورفت کے لئے آزادی ملی۔

کھڑکیوں پر پڑے پردے پچھلے پہر کے سرد جھونکوں کے دوش پر کسی بدمست رقصہ کی طرح

لہرانے لگے۔ کمرے کا ماحول ایک دم سخ ہو گیا۔ کاریڈور کی روشنیاں خاموش اور کمرے میں نائٹ بلب کی

خواب آلود سیدھلکی سبز روشنی کی پلکیں نیند سے بوجھل لگ رہی تھیں۔

سفید ساڑھی میں ملفوف وہ ہیولہ یوں آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا جیسے اس کے پیروں میں ہوا

نے پازیب باندھ رکھی ہو جس کی چھن چھن سے ماحول کو آلودہ ہونے سے بچانے کے لئے وہ پھونک

پھونک کر قدم اٹھا رہا ہو۔

پھر ایک دم وہ رزاتی کے بستر کے پائنتی کی طرف دروازے سے تین چار قدم اندر رک گیا۔

رزاتی نے کراہ کر روٹ بدلی تھی۔

آنکھوں اور پھر ماتھے کو مسلتے ہوئے رزاتی کے لبوں سے ایک بار پھر کراہ نکل گئی۔ اس نے محسوس

”آج رات رزاتی بابو کی کافی میں پہلی دوائی کے ساتھ چٹکی بھر یہ راکھ بھی ملا دینا۔“ سوامی نے

ایک پڑیا اس کی جانب بڑھائی۔

”یہ۔۔۔ کیا ہے یہ سوامی جی؟“ بیلا نے گڑبڑا کر پوچھا۔

”ویسا ہی ایک اور ہر جیسا تم اب تک رزاتی بابو کے شریر میں اتارتی چلی آئی ہو۔“ سوامی نے

بڑی شانتی سے جواب دیا۔ ”بس اس کے رزاتی بابو کے جسم میں جاتے ہی وہ ہمارے کام کے آدمی بننے

پر ایک دم تیار ہو جائیں گے۔“

بیلا چوکی۔ ”اس میں کوئی خطرے کی بات تو نہیں سوامی جی؟“ اس نے دھیرے سے پوچھا اور

پڑیا مٹھی میں دبالی۔

”ہمارے ہوتے ہوئے کوئی خطرہ تم تک پہنچ سکے کیا یہ سمجھو ہے بیلا؟“ سوامی نے مسکرا کر جیسے

اس کی ڈھارس بندھائی۔

”سمجھو تو نہیں ہے سوامی جی پرنتو۔۔۔“

”سب کچھ بھول جاؤ بیلا۔ یہ آخری داؤ ہیں جو میں جلدی جلدی کھیل جانا چاہتا ہوں۔ میرے

پاس اب زیادہ سے نہیں ہے کہ راہ ہمار سکوں۔ تم اس کام کو بہر حال آج رات کر ڈالنا۔“ سوامی نے زور

دیتے ہوئے کہا۔

”جی۔۔۔“ بیلا نے پڑیا چولی میں رکھ لی۔

”یہ کہو تمہاری وہ موی کیسی ہے؟“ سوامی کا لہجہ ایک دم زہریلا ہو گیا۔

”بالکل ٹھیک۔“ بیلا نے جواب دیا۔ ”صبح آئی تو تمہیں کماری جی آپ کے پاس۔“

”ہاں۔۔۔“ سوامی دھیرے سے مکاری ہنسی ہنسا۔ ”اس کی طبیعت خراب ہوتے دیر بھی تو نہیں

لگتی ناں۔“

”جی۔۔۔ تو میں چلوں؟“ بیلا نے اسے اجازت طلب نگاہوں سے دیکھا۔

”جونہی کوئی اچھا سا چار بنے مونس بابو کے بارے میں تو مجھے فوراً خبر کرنا۔ میں آج ہی سے

تمہارے کام پر بیٹھ رہا ہوں۔“ سوامی کا اشارہ شاید اپنے جتنز منتر کی طرف تھا۔

”جی۔۔۔“ بیلا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ دراصل وہ جب سے آئی تھی اس نے کتنی ہی بار چاہا

کہ سوامی سے مونس بابو کی کہی ہوئی راجیہ والی بات کے بارے میں پوچھے مگر ہر بار نجانے کیوں اس کی

زبان پر تالا پڑ گیا۔ شاید یہ مونس بابو سے کئے ہوئے وجہن کا احساس تھا جو اسے رازداری کے نام پر سوامی

سے بھی اوٹ رکھنے پر مجبور کر رہا تھا۔ اس وقت بھی اس کا جی بڑی شدت سے چاہا کہ سوامی سے اس بات

کی پوچھتاچھ کرے مگر پھر زبان پر گرہ پڑ گئی۔ سوامی نے محسوس کر لیا کہ وہ کوئی بات کرنا چاہتی ہے مگر جھجک

نہ چاہتا تھا مگر بیلا کی لائی ہوئی کافی پینے کے کچھ دیر بعد وہ ایسا خبر ہوا کہ اب بھی غنودگی اس کی جان نہ چھوڑ رہی تھی۔

”نہیں نہیں۔۔۔“ راجیہ کا سراپا اسے اٹھنے سے منع کرتا ہوا ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ”میرے قریب آنے کی کوشش نہ کیجئے گا صاحب۔ میں آپ کی راجیہ ہی ہوں مگر میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ یہ جسم نہیں میری روح ہے۔ میں آپ کے بغیر رہ نہیں سکی اور دیوانہ وار آج پھر چلی آئی مگر آپ جو میری امانت ہیں۔۔۔ خود کو کس طرح برباد کر رہے ہیں؟ کیا یہ جائز ہے صاحب؟“ راجیہ نے درد بھری آواز میں کہا۔

اس کی کھلی زلفیں سینے اور شانوں پر پھیلی ہوئی تھیں۔ سسک کر اس نے چہرہ دونوں ہاتھوں میں لیا تو اس کی زلفوں نے اس کے اوپری دھڑکڑھانپ لیا۔

”راجیہ۔۔۔ تم راجیہ ہی ہونا؟“ پگلوں کے انداز میں اس نے سوال کیا۔

”میں آپ کی راجیہ کی روح ہوں صاحب۔ آپ کو اس میں شک کیوں ہے؟“ بلکتی ہوئی راجیہ نے سراٹھایا تو اس کی آنکھوں سے چھم چھم برستے آنسو رزاتی کے دل پر تیزاب بن کر گرے۔ ”مجھے آپ کا حال دیکھ کر سارے بدن تن توڑ کر لوٹا پڑا۔۔۔ مگر کیسی بد قسمتی ہے کہ نہ میں آپ کو چھو سکتی ہوں نہ آپ مجھے۔“ وہ اسے دیوانہ وار تکتے ہوئے بولی۔

”ہاں۔۔۔ میں تو بھول ہی گیا کہ میرے اور تمہارے درمیان کیسی مجبوری حاصل ہے۔“ رزاتی بستر پر پڑے پڑے نشتے کے عادی کسی شخص کی طرح ڈولتے ہوئے بولا۔ اس کی آنکھیں درد سے پھٹی جا رہی تھیں۔ وہ جو کچھ دیکھ رہا تھا اس پر یقین کرنا اس کے لئے ممکن نہ تھا مگر وہ اپنے آپ کو محسوس کر کے جان چکا تھا کہ یہ کوئی خواب نہیں ہے۔ جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے ایک حقیقت ہے۔ ایک سچائی ہے۔ اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔

”راجے۔۔۔“ ادھر میرے پاس بیٹھو ناں!“ اس نے آنکھ سے راجیہ کو اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ ”بے فائدہ ہے صاحب۔۔۔“ وہ پچھلے سے انداز میں مسکرائی۔ ”نہ آپ مجھے چھو کر محسوس کر سکیں گے نہ میں آپ کو۔ ابھی تو مجھے واپس جانا ہے۔ میں نے بتایا تو تھا آپ کو کہ آپ سے ملنے کی اجازت بڑی مشکل سے ملے پاتی ہوں۔“

”اجازت۔ کس سے اجازت لینا پڑی تمہیں۔ کہتے ہیں روحیں بڑی طاقتور ہوتی ہیں۔ جہاں چاہیں جاسکتی ہیں آسکتی ہیں پھر تمہیں کس سے اجازت لینا پڑتی ہے؟ ارے ہاں۔ یاد آیا۔ میں سمجھ گیا۔“ ایک دم جیسے اسے کوئی خیال آ گیا۔ پھر اس کے لہجے میں طنز گھل گیا۔ ”ہاں۔ تمہیں اپنے اور میرے خدا سے اجازت لینا پڑتی ہوگی مگر۔۔۔ اس نے تمہیں مجھ سے ملنے کی اجازت دے کیسے دی؟ اسے رحم کیسے آ گیا تم پر اور مجھ پر۔ وہ تو ہم دونوں بلکہ تینوں کو جدا کرنے کا عظیم الشان کام کر کے بہت خوش ہوگا۔ ہے ناں؟“

کیا کہ کمرہ بالکل سرد ہو رہا ہے اور شاید اسی لئے اس کا سارا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ اس نے پورا زور لگا کر آنکھیں کھولیں اور کہنیوں کے بل اٹھنا چاہا مگر جسم نے انکار کر دیا۔ سارا جسم بے حس و حرکت تھا۔ سوائے زبان، کان اور آنکھوں کے جسم کا اور کوئی عضو اس کے کہنے میں نہیں تھا۔ وہ شریاویں جیسے لہجے میں رک رک کر بول سکتا تھا۔ خواب آلود کیفیت میں سامنے والے کی کہرے بھری آواز سن سکتا تھا۔ جو کچھ وہاں موجود تھا اسے جانتی ہوئی تصویروں جیسا دیکھ سکتا تھا اور بس۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا تو اپنی مرضی سے۔ دماغ محسوس کر رہا تھا تو اپنے انداز میں۔ وہ کسی دھواں دھواں وادی میں ہواؤں کے دوش پر محو پرواز تھا۔

پھر۔۔۔

ایک دم اس کا سارا جسم جھنجھٹا اٹھا۔ دماغ پر سن ہو جانے کی کیفیت طاری ہوگئی۔ دل اچھل کر حلق میں آ رہا اور وہ ایک ٹک اپنے بستر کی پائنتی اس ہیولے کو ناقابل یقین نگاہوں سے دیکھتا رہ گیا جو اپنی جگہ بہت کی طرح ساکت کھڑا تھا۔

اسے لگا جیسے اس کی روح، جسم کا ساتھ چھوڑ گئی ہو۔ حواس مختل ہو گئے ہوں۔ سوچنے سمجھنے کی ہر حس بے جان ہوگئی ہو۔ وہ سفید ساڑھی میں ملبوس اس سراپا ناز کو اور وہ پری وشن رزاتی کو ایک ٹک گھورے جا رہی تھی۔ کتنی ہی دیر گزر گئی تب کمرے میں ایک شیریں آواز نے ارتعاش پیدا کیا۔

”صاحب۔۔۔“

اور۔۔۔ رزاتی کا جسم ایک جھٹکے سے اس سحر سے آزاد ہو گیا۔ حواس میں جان پڑ گئی اور دیوانگی نے آنکھیں کھول لیں۔ اس نے آنکھیں جھپک جھپک کر خود کو خواب کی سی اس کیفیت سے باہر لانا چاہا مگر اس کا ذہن مزید گہری دھند میں لپٹتا چلا گیا۔ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا مگر اسے اپنی سوچ، اپنی قوت ارادی پر کوئی اختیار نہ رہ گیا تھا۔ کسی ٹرانس میں آئے ہوئے شخص کی طرح وہ راجیہ کے وجود اور آواز کو قبول کرتا اور ان پر ایمان لاتا چلا گیا۔

”میں آپ کی ایسی دیوانگی کے قابل نہیں ہوں صاحب۔“ اس سحرہ کے ہونٹ پھر ملے تو رزاتی کا سارا جسم لرز کر رہ گیا۔

”راجیہ۔۔۔“ اس کے لبوں سے ایک سرگوشی آزاد ہوئی۔

”ہاں۔۔۔ راجیہ۔“ ہیولے نے اقرار کیا اور اس کی آواز ٹوٹ گئی۔ ”آپ کی راجیہ۔“

”تم۔۔۔“ رزاتی نے بستر سے اٹھنا چاہا مگر اس کا سارا جسم اس قدر روزنی ہو رہا تھا کہ وہ محض ہلکی سی حرکت کر کے رہ گیا۔ آج سے پہلے تو اس کی یہ کیفیت ہرگز نہ ہوئی تھی۔ راجیہ کے انتظار میں آج وہ سونا ہی

ہوں۔ ابھی مجھ اپنی دید کی پیاس بجھانے دیجئے۔ میں پھر آؤں گی آپ کو دیکھنے۔ آپ سے ملنے۔ آپ سے باتیں کرنے۔ بس یہ خیال رہے کہ کسی تیسرے نے اگر ہمیں دیکھنے یا میرے بارے میں جاننے کی کوشش کی تو میرا اور آپ کا یہ رابطہ ہمیشہ کے لئے ٹوٹ جائے گا۔

”نہیں نہیں۔“ اضطراب کے عالم میں رزاقی نے ہاتھ اٹھا کر کہنا چاہا مگر ہاتھ کو حرکت نہ دے سکا۔

”میں کسی سے تمہارے آنے کا ذکر نہیں کروں گا۔ کسی کو نہیں بتاؤں گا مگر تم اب کب آؤ گی راجے۔ میری جان۔۔۔“ وہ ہانپنے لگا۔

”میرے بس میں ہو تو میں واپس ہی نہ جاؤں صاحب۔“ شکستہ سی آواز میں راجیہ نے کہا اور اس کی آنکھیں ایک بار پھر نم ہو گئیں۔ ”مگر ابھی یہ میرے بس میں نہیں ہے۔“

”تو کس کے بس میں ہے راجیہ۔“ رزاقی نے بیٹابی سے پوچھا۔ ”کس کے بس میں ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے تمہیں میرا بنادے تمہاری واپسی کا راستہ بند کر دے۔ کون ہے وہ؟ مجھے بتاؤ۔ میں اپنا سب کچھ دے کر بھی تمہیں اپنے پاس روک لوں گا۔“

”وہ ایک ہی شخص ہے صاحب جو اس ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہے۔ آج میں آپ کو اس کا نام بتانے ہی کے لئے آئی ہوں۔“

”کون ہے وہ؟ جلدی بولو۔ میں ابھی اس کے پاس جا کر اس سے تمہارے اور اپنے ملن کی بھیک مانگ لوں گا۔“

”پہلے آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ آپ میرے یا اس شخص کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائیں گے۔ مونس بھائی کو بھی نہیں۔“

”مونس کو بھی نہیں؟“ حیرت سے رزاقی نے پوچھا۔ ”وہ جو میرا سایہ ہے اسے بھی نہیں۔ راجیہ! اس کے سوا اور کون ہے جس پر میں اعتماد کر سکتا ہوں؟“

”ابھی نہیں صاحب۔ جب میں لوٹ آؤں گی تب انہیں بتائیے گا۔ ابھی وہ نہ آپ کی باتوں پر یقین کریں گے نہ اس معاملے میں ہماری کوئی مدد کریں گے بلکہ آپ کو بھی اس راستے پر چلنے سے منع کریں گے۔ روکیں گے جس پر چل کر آپ مجھ تک اور میں آپ تک پہنچ سکتی ہوں۔“

”لیکن راجیہ۔۔۔“

”آپ کو میری قسم ہے صاحب۔“ راجیہ نے ملتی لہجے میں کہا۔ ”میری اتنی سی بات مان لیجئے۔ جب ہمارا ملن ہو جائے گا تو انہیں میں خود سب کچھ بتا دوں گی مگر تب تک میری خاطر زبان پر کچھ مت لائیے گا۔ آپ کو اپنی جنت کی قسم۔“

”راجیہ۔“ رزاقی تڑپ اٹھا۔ ”تیم نے میری جنت کی قسم کیوں دے دی۔ مجھ اس طرح بے دست و پا

”آپ جو بھی کہہ لیں صاحب مگر مجھے دنیا میں آپ کے پاس آنے کے لئے بڑی کٹھن منزل سے گزرنا پڑا ہے۔ مجھے اپنے آپ سے الگ ہونا پڑا ہے۔“

”اپنے آپ سے الگ ہونا پڑا ہے۔ میں سمجھا نہیں راجیہ۔“ رزاقی مزید الجھ گیا۔

”صاحب۔“ راجیہ نے درد بھرے لہجے میں کہا۔ ”میں سوامی دھیرج داس کی وجہ سے آج آپ کے سامنے کھڑی ہوں۔ روح کی شکل میں ہی سہی مگر آپ تک کسی بھی حال میں پہنچنے کے لئے میں نے سب کچھ قبول کیا۔“

”کیا قبول کرنا پڑا تمہیں راجیہ۔“ ایک دم رزاقی کسی نشہ ٹوٹنے کے شکار شخص کی طرح پھر گیا۔

”اس سوامی کے بچے نے کیا کیا تمہارے ساتھ؟ مجھے بتاؤ۔ میں اس کا خون پی جاؤں گا۔“ وہ اٹھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بڑے قہر سے بولا۔

”ایسا کچھ نہیں ہے صاحب۔ اس نے تو مجھے اپنے کسی عمل کے ذریعے دنیا میں آنے کا راستہ دیا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو میں قیامت تک آپ سے ملنے آپ کو دیکھنے آپ سے بات کرنے کو ترجیحی رہتی۔ بلکتی رہتی۔“

”یعنی۔۔۔“ رزاقی نے حیرت سے کہنا چاہا۔

”ہاں صاحب۔ یہ سب اسی کی وجہ سے ممکن ہو سکا ہے۔ اس کے دل میں نجائے کیا نرم آیا کہ اس نے مجھے آپ تک پہنچانے کے لئے اپنے طور پر ہی سب کچھ کر ڈالا۔ بغیر کسی لالچ اور طلب کے نہ راجیہ نے تشکر سے بتایا تو رزاقی کا دماغ مانتے نہ مانتے اور ممکن ناممکن کے دھاگوں میں الجھ کر رہ گیا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ اس کا دل اب بھی اس بات کو تسلیم نہ کر رہا تھا کہ یہ سب جو ہوا ہے اور ہو رہا ہے اس کا سرا سوامی کے ہاتھ میں ہے۔

”ایسا ہی ہے صاحب۔ آپ کو دھیرے دھیرے سب پتہ چل جائے گا۔ ابھی تو مجھے واپس جانا ہے۔“ راجیہ نے اسے حسرت سے دیکھ کر کہا۔

”واپس جانا ہے تمہیں؟ کہاں؟“ رزاقی چونکا۔

”وہیں۔ جہاں سے میں آئی ہوں۔ جہاں سے مجھے لایا گیا ہے۔“ وہ بڑے پُر درد انداز میں بولی۔

”میں اب تمہیں واپس کہیں نہیں جانے دوں گا راجیہ۔“ وہ بیٹابی سے بولا اور اٹھنے کے لئے پورا زور لگا دیا مگر اس کا جسم بستر سے چند انچ اوپر اٹھا اور تھم گیا۔ پینہ یوں اس کے مساموں سے بہہ نکلا سانس یوں بے قابو ہو گیا جیسے اس نے پہاڑ کی چوٹی تک جانے کے لئے دوڑ لگائی ہو۔ جسم کو حرکت نہ دے سکے کا احساس اس کے لئے اذیت دہ ہوتا جا رہا تھا۔

”میں آتی رہوں گی صاحب۔ جب جب مجھے راستہ ملے گا میں آتی رہوں گی۔ ابھی آپ بیکل نہ

رہا ہے؟“ راجیہ نے درد بھرے لہجے میں اسے راستہ بھایا۔

”ہاں۔۔۔“ وہ جیسے مطمئن ہو گیا۔ ”ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ میں ایسا ہی کروں گا۔ اس کی نظر غیر اختیاری طور پر کھلی کھڑکیوں کی جانب اٹھ گئی۔

”اور وعدہ کیجئے کہ آپ اب آنسو بہائیں گے نہ آپ بھریں گے۔ میں لوٹ آئی ہوں ناں۔ اب کیا غم؟“

”ہاں۔“ رزاتی کے چہرے پر تسلی کے رنگ ابھرے۔ ”ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ یہ میرے اختیار میں تو نہیں ہے۔ داج پھر بھی میں کوشش کروں گا۔ کہ خود کو سنبھال سکوں۔“

”تو بس کل سے مجھے اپنا صاحب واپس چاہئے۔ وہی ہنستا کھلتا تھقے لگا تا صاحب جس نے کبھی غم کا لفظ سنا بھی نہ تھا۔“

”ہوں۔۔۔“ رزاتی نے سر اثبات میں ہلایا اور مسکرانے کی کوشش کی۔

”تو میں اب چلوں؟“ راجیہ نے اس کی جانب جگر پاش حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔

”اتنی جلدی؟“ رزاتی تڑپ سا گیا۔

”میں پھر آؤں گی صاحب۔“ وہ اٹنے پاؤں پیچھے ہٹی۔ ”بہت جلد آؤں گی۔ آپ سے دور رہ کر جو بھی بل کرے گا غفران کے الاؤ میں چلے ہوئے گا۔ پناہ خیال رکھے گا اور کل رات سوامی سے ضرور مل لیجے گا۔“ وہ اٹنے پاؤں دروازے سے نکلی اور اندھیرے میں گم ہو گئی۔

رزاتی ایک لمحے کے لئے مہبوت سا پڑا رہا پھر راجیہ کے چلے جانے کے خیال سے اس کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا اس نے بستر سے اٹھنا چاہا مگر جسم کی ناقابل فہم نااطاقی نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ بے اختیار اس نے تکیے پر سر پٹک دیا۔

اس کا دل سینے میں راجیہ راجیہ کا شور مچا رہا تھا۔ لیوں پر بھی یہی نام چل رہا تھا۔ آنکھوں میں بھی یہی ایک لفظ جل جل جل کر رہا تھا مگر۔۔۔ راجیہ وہاں کہاں تھی؟

☆=====☆

شہزادہ حویلی میں کیا آیا کہ وہاں کی اداسی کا رنگ ایک ہی دن میں پھیکا پڑ گیا۔ بی بی اور بیلا کے ساتھ ساتھ کماری بھی اس کے ساتھ ایسی مانوس ہوئی کہ وہ انہیں اپنا اپنا سا لگنے لگا۔ پروین حویلی والوں کا پیار دیکھ کر نہال ہوئی جا رہی تھی اس نے لا لکھنؤں کر کے ساری صورت حال بتائی۔ وہ اس کی باتوں پر آبدیدہ ہو گیا۔ کن فرشتوں کے ساتھ اس کے ہاتھ سے ظلم ہو گیا تھا؟ وہ سوچتا اور سسک پڑتا۔

شہزادے کی معصوم باتیں اور حرکاتیں بہار کا ایسا جھونکا ثابت ہوئیں جس نے ایک دم وہاں کا ماحول رنگین کر ڈالا۔ بی بی کا جی چاہتا تھا کہ وہ رزاتی کو بلائے یا شہزادے کو اس کے کمرے میں لے جائے۔ شاید

نہ کرو۔“

”میں نے آپ کو بے دست و پا نہیں کیا صاحب۔ اپنے اور آپ کے لئے کوئی مشکل کھڑی ہو جانے کا راستہ روکا ہے۔“ راجیہ نے درد بھری آواز میں کہا تو رزاتی کا دل تسک گیا۔

”ٹھیک ہے راجیہ۔ میری جان۔“ وہ ٹوٹتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میں زندگی میں پہلی بار اپنے آپ سے کچھ چھپاؤں گا۔ نوٹس میرا ہی ٹکس ہے۔ اس کے سامنے جھوٹ بولنا تو میرے بس میں نہیں۔ ہاں ہونٹ سی لوں گا۔ زبان پر تالا لگا لوں گا۔۔۔ کاش تم مجھے جنت کی قسم نہ دیتیں۔“ اس نے جیسے ہار مان لی۔

”آپ اگر اس بات پر ناخوش ہیں تو میں اپنی قسم واپس لے لیتی ہوں صاحب۔۔۔ آپ بے شک نوٹس بھائی کو سب کچھ بتا دیں مگر اس کے بعد ہمارا ملن ہو سکے گا اس بات کو بھول جائیے۔“ راجیہ نے بچھے لہجے میں کہا۔

”نہیں نہیں راجیہ۔“ رزاتی نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں خود کو سنبھال لوں گا۔ تم ایسی کوئی بات نہ سوچو جو ہمارے ملن میں رکاوٹ ڈال دے۔ کہو۔ مجھے کس شخص سے ملنا ہوگا؟“

”سوامی دھیرج داس سے۔“ راجیہ نے آہستہ سے کہا۔

”سوامی سے؟“ رزاتی ایک بار پھر حیرت زدہ رہ گیا۔

”ہاں صاحب۔“ راجیہ بولی۔ ”وہی ایک شخص ہے جو مجھے ایک دوسرے جہان سے یہاں تک لایا ہے اور وہی ہے جو یہ جانتا ہے کہ ہم دونوں کا ملاپ کیسے کب اور کس شکل میں ممکن ہے۔“

”اوہ۔۔۔“ رزاتی اسے بغور دیکھ کر رہ گیا۔ پھر کچھ دیر بعد بولا۔ ”ٹھیک ہے راجے۔ تو میں اس سے کب ملوں؟“

”کل آدھی رات کے بعد آپ اسے بستی کے مندر میں جا کر مل لیجئے گا۔ وہ آپ کو سب بتا دے گا کہ ہمارا ملن کیسے ممکن ہے مگر فی الحال تو خود کو سنبھال لے۔ ہوش میں آئیے۔ آپ کا یہ حال میرے دل پر نشتر چلا رہا ہے۔“

”تمہارے بغیر کیسا حال اور کیسا ہوش راجیہ؟“ پھیکسی زنجی مسکراہٹ رزاتی کے لبوں پر ابھری۔ ”بہر حال میں کوشش کروں گا کہ خود کو سنبھالوں لیکن میں اس سے مندر جا کر کیسے مل سکتا ہوں؟ بستی والے کیا کہیں گے؟ میرے پاس وہاں جانے کا کوئی معقول بہانہ بھی تو نہیں ہے۔“ رزاتی نے دھیرے دھیرے کہا اور جسم کو ایک بار پھر حرکت دینا چاہی مگر سوائے شراپیوں کے سے انداز میں بات کرنے کے وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ اسے راجیہ کی ہر بات سچ لگ رہی تھی وہ سب کچھ یوں مانتا جا رہا تھا جیسے کوئی بچہ اپنے کچے ذہن پر کسی ایسے شخص کی باتوں کو ثبت کر رہا ہو جس کی ہر بات پر اسے پورا یقین ہو۔ جس کی ہر بات ماننا اس کا فرض ہو۔

”آپ کی کوتاہیے بغیر بھی تو وہاں جا سکتے ہیں۔ رات کے اندھیرے میں کون دیکھے گا کہ کون کہاں جا

”ہاں۔ اس کی نہ کوہاں میں بدلنے کے لئے بھی وقت درکار ہوگا۔ اچھا بیٹا۔ بہر حال تم کو شش ضرور کرنا۔“

”یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے بی بی۔“ مونس پھیکے سے اعزاز میں ہنسا۔ ”آپ کی دعائیں جاری ہیں ناں؟“

”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے بیٹا؟“ بی بی نے کہا اور ہنس پڑی۔ اس نے کیا بات کے بات حساب چکایا تھا۔

”اور بی بی۔ ذرا پروین کو تو میرے پاس بھیجئے۔ کہنے گانا دار اس سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔“

”اچھا بیٹا۔ ابھی بھیجتی ہوں۔“ انٹر کام تپائی پر رکھ کر بی بی اپنی جگہ سے اٹھی اور واپس بیلا اور کماری کے پاس آ بیٹھی جو شہزادے سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے میں محو تھیں۔ پروین نے بی بی کی مثال اس کے کندھوں پر لا ڈالی۔

”جیتی رہو بیٹی۔“ بی بی نے اسے دعا دی۔ پھر اس کی جانب نگاہ اٹھائی۔ ”مونس تمہیں یاد کر رہا ہے۔ نادر تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔ تم اس کے آفس چلی جاؤ۔“

”جی بی بی۔“ پروین کا دل دھڑک اٹھا۔ ”میں ابھی جاتی ہوں۔“ اس نے شہزادے کی جانب دیکھا جو بیلا کو غصے سے گھور رہا تھا۔ ”کیا ہوا شہزادے؟“ وہ اس کی طرف بڑھی۔

”کب سے کہہ رہی ہے کہ کہانی سناتی ہوں کہانی سناتی ہوں۔ کہانی تو سناتی نہیں، بس پیچیاں لیتی جا رہی ہے۔“ شہزادے نے ہاتھ نچا کر بڑی صاف زبان میں بیلا کی شکایت کی۔

اس کی بات پر پروین تو مسکرا دی مگر بی بی اور کماری کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا جبکہ بیلا نے شہزادے کو قالین پر لٹا کر اس پر بوسوں کی بوچھاڑ کر دی۔

”تُو نے میری شکایت تو کر دی ناں۔ اب کیا ہے چنوونے۔۔۔ تیرے یہ پھولے ہوئے گال میں کھانہ لگی تو بیلا نہ کہنا۔“ وہ اس پر ٹوٹی پڑ رہی تھی۔

”بس کر بیلا بس کر۔ باؤلی ہوئی ہے۔ بچ گھبرا جائے گا۔“ بی بی نے ہنسی روکتے ہوئے بیلا کو پکار کر کہا مگر وہ کہاں سنتی؟ اسے تو شہزادے کے گال کشمیری سیب لگ رہے تھے۔ پروین مسکراتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

کارڈ میں ویرس پہنچی تو اس کی نظر بے اختیار رزاتی کے کمرے کی جانب اٹھ گئی جس کا دروازہ وہ صبح سے بند ہی دیکھ رہی تھی۔ اس کے دل پر چوٹ سی لگی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ رزاتی کو دیکھے مگر اس نے ابھی تک رزاتی کی صرف تصویر ہی دیکھی تھی۔ یہ مونس اور رزاتی کی اکٹھی اتری ہوئی تصویر تھی جو مونس نے اپنے عین پیچھے دیوار پر فریم کرا کے لگا رکھی تھی۔ اس کے قدموں کی رفتار ہلکی ہو گئی۔ سر جھکائے دل

وہ بہل جاتا مگر ساتھ ہی اسے یہ خوف بھی تھا کہ کہیں شہزادے کو دیکھ کر اس کے زخموں کا منہ نہ کھل جائے۔ وہ محبت اور شفقت کے بجائے شہزادے کے لئے کسی اور کیفیت کا شکار نہ ہو جائے۔ یہی سوچ کر اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ پھر کچھ سوچ کر مونس سے بات کرنے کے لئے اٹھی اور فون کے قریب چلی آئی۔ شہزادہ اس وقت بیلا کے ہاتھ سے انڈوں کا آلیٹ کھا رہا تھا اور وہ ہر لقمے پر اس کا منہ چوم رہی تھی۔ کماری ان دونوں کی حرکتیں بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی جبکہ پروین بی بی کی مثال استری کر رہی تھی۔ اس نے بی بی کے لاکھ منع کرنے کے باوجود اپنے لئے کام ڈھونڈ ہی لیا تھا۔ صبح سے وہ حویلی آئی ہوئی تھی اور اسی طرح چھوٹے موٹے کاموں میں وقت گزار رہی تھی۔ کماری نے بھی بی بی سے یہ کہہ کر اس کی سفارش کی تھی کہ بی بی! اسے کام میں من لگانے دیجئے ورنہ وہ بیکاری اور اداسی کا شکار ہو جائے گی۔ تب بی بی نے اس کی بات مان کر پروین کو جو کام چاہے کر لینے کی اجازت دے دی۔

”بیلا۔۔۔ کون مونس؟“ بی بی نے دوسری جانب رابطہ قائم ہونے پر ماؤتھ پیس میں کہا اور انٹر کام گود میں رکھ لیا۔

”جی بی بی۔ میں ہی ہوں۔ خیریت؟“ مونس نے جواب دیا۔

”ہاں بیٹا۔“ بی بی نے آواز ہلکی کر لی اور اس سے شہزادے کے بارے میں بات کرنے لگی۔ مونس خاموشی سے سنتا رہا۔ جب بی بی کہہ چکی تو اس نے ایک گہرا سانس لیا۔

”بی بی۔ میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں مگر میرا مشورہ یہ ہے کہ ابھی آپ اس معاملے کو رزاتی تک نہ جانے دیں۔“ مونس نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اس کا رویہ شہزادے کو دیکھ کر کیا ہوگا؟ اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اس کی کیفیت مثبت بھی ہو سکتی ہے اور منفی بھی۔ اس کے لئے ہمیں چند دن رکتا چاہئے۔ کوئی مناسب موقع دیکھ کر میں اس سے شہزادے کا اس طرح سامنا کرانا چاہتا ہوں کہ جس سے اس کے زخم تازہ نہ ہو پائیں۔“

”یہی میں بھی چاہتی ہوں بیٹا۔“ بی بی نے جلدی سے اس کی بات کی تائید کی۔ ”میں چاہتی ہوں کہ اس کی جنت سے محرومی کا داغ اگر شہزادے کے آنے سے ہلکا پڑ سکتا ہے تو ایسا ہو جائے مگر تم ٹھیک کہتے ہو۔ اس کے لئے ہمیں فوری طور پر کوئی اقدام نہیں کرنا چاہئے۔“

”ویسے اس کا حال کیا ہے بی بی؟“ مونس نے شاید ہونٹ کاٹتے ہوئے پوچھا۔ بی بی کو اس کی آواز میں اس کی کیفیت کی جھلک محسوس ہوئی۔

”بیلا بتا رہی تھی کہ ٹھیک ہے۔۔۔ مگر تم نے اس سے بات نہیں کی مونس کسی ہل شیٹن پر جانے کی؟“

”نہیں بی بی۔ ابھی چند دن پہلے وہ انکار کر چکا ہے۔ اتنی جلدی ہاں نہیں کرے گا۔“

ہی دل میں خیریت کی دعائیں مانگتی ہوئی وہ مونس کے آفس کو جانے کے لئے کارڈور کا موڑ کر خارجی راستے کی جانب بڑھ گئی۔

☆=====☆=====☆

”پروین۔“ مونس نے اس کے آرام سے بیٹھ جانے کے بعد آہستہ سے کہا۔ ”میں نہیں جانتا کہ مجھے ایسا کرنا چاہئے یا نہیں لیکن یہاں کی صورتحال اتنی الجھی ہوئی ہے کہ تم سے بات کرنے کے سوا مجھے کوئی چارہ نہیں نظر آتا۔“

”میں کچھ بھی نہیں مونس بابو۔“ پروین حیرت سے بولی۔ ”بی بی نے تو بتایا تھا کہ آپ مجھ سے لالو کے بارے میں کچھ کہنا چاہتے ہیں۔“

”وہ تمہیں یہاں بلانے کا ایک بہانہ تھا۔ میری بات غور سے سنو۔۔۔“ کہتے ہوئے مونس نے بند دروازے کی جانب دیکھا۔ پھر آواز دباتے ہوئے آگے کو جھک آیا۔ ”لیکن میں تم سے جو بات کروں گا وہ صرف تم تک رہے گی اس بات کی ضمانت دو۔“

”اگر تم کھانے سے آپ کاطمینان ہو سکتا ہے تو میں اپنے شہزادے کی قسم کھاتی ہوں مونس بابو۔۔۔“

”بس۔۔۔ کافی ہے۔“ مونس نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ پھر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس کے لب واہوئے۔ ”بات تمہارے رزاقی بابو کے بارے میں ہے پروین۔“ پروین نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کی کنپٹیاں ایک دم سلگ اٹھیں۔ جسم کا سارا خون سمٹ کر دماغ کی جانب رواں ہو گیا۔ دل بڑے زور سے دھڑکا اور وہ مونس کی آواز کے زیر و بم میں گم ہوتی چلی گئی۔

مونس نے اسے مختصر مگر آسان الفاظ میں ہولی کے دن سے اب تک کی اتنی ہی صورتحال بتائی جو ضروری تھی پھر یہ کہتے ہوئے خاموش ہو گیا۔

”تمہارے آنے پر نجانے کیوں مجھے لگا کہ قدرت میزبانہ پر آمادہ ہو چکی ہے۔ رزاقی کے لئے میں جان دے بھی سکتا ہوں اور لے بھی سکتا ہوں پروین۔۔۔ مگر اس وقت میرے سامنے صرف ایک الجھن ایسی ہے جو اگر سلجھ جائے تو بات کا سیرامیرے ہاتھ آ سکتا ہے اور اس میں تم میری مدد کر سکتی ہو۔“

”آپ حکم دیجئے صاحب۔ میری جان بھی حاضر ہے آپ لوگوں کے لئے۔“ خلوص بھرے ان الفاظ نے مونس کے تپتے احساس پر شبنم کا چھینٹا کیا دیا کہ وہ دم دیدہ ہو گیا۔

”جان کی نہیں صرف تمہارے تعاون کی ضرورت ہے پروین۔ میں بتا چکا ہوں کہ اس سے پہلے میں بیلا کو بھی آمادہ کر چکا ہوں کہ وہ مجھے رزاقی کے بارے میں پل پل آگاہ رکھے مگر اس کی طرف سے

سب اچھے کی رپورٹ مجھے ہضم نہیں ہو رہی۔ نجانے کیوں مجھے لگتا ہے کہ کوئی ایسی بات اندر ہی اندر وقوع پذیر ہو رہی ہے جو کسی بڑے فساد کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔“

”آپ کو ایسا کیوں لگتا ہے صاحب؟“ پروین نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔ ”دیکھو پروین۔ میری طرح تمہارا بھی اس بات پر ایمان تو ہے ناں کہ مرنے کے بعد روح لوٹ کر انسانی پیکر میں ہمارے پاس نہیں آتی۔۔۔ جیسے کہ راجیہ کی روح نے رزاقی کو جھک دکھا کر دیوانہ بنا ڈالا۔“

”بالکل صاحب۔ اب تو قیامت کے دن ہی آنا سامنا ہوگا۔ یہی ہمارا ایمان ہے۔۔۔ مگر آپ نے بتایا کہ ہولی کے دن آپ نے بھی راجیہ بی بی کو دیکھا۔“

”ہاں۔۔۔“ مونس نے سر جھکا۔ ”لیکن میں اسے محض انسانی شاہت سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تاہم یہی بات میرے لئے الجھن کا باعث بھی ہے کہ اگر وہ راجیہ کی ہمشکل کوئی عورت تھی تو وہ پورے خالق نکر میں کسی مسلمان یا ہندو کے گھر میں کیوں موجود نہیں ہے؟ میں اپنے آدمیوں کے ذریعے اس بات کی تسلی کر چکا ہوں کہ یہاں ہمارے لوگوں اور ہندو بستی میں کوئی ایسی عورت موجود نہیں ہے جو راجیہ کی ذرا بھی ہمشکل ہو۔“

”لیکن اگر ایسا ہوا بھی ہے تو اس سے کوئی کیا ثابت کرنا چاہتا ہے صاحب؟“ پروین نے سوچتے ہوئے کہا۔

”یہی تو میں نہیں سمجھ پارہ پروین اور اسی بارے میں سوچتے سوچتے میرے ذہن میں ایک ایسے خیال نے جنم لیا جس کی تصدیق کے لئے میں تم سے تعاون چاہتا ہوں اور یہی وہ الجھن ہے جو اگر سلجھ گئی تو معاملہ آئینے کی طرح صاف ہو جائے گا۔“

”آپ بتائیے صاحب۔۔۔ مجھے کیا کرنا ہے میں بہت پرہی لکھی تو نہیں ہوں لیکن ایک ٹرک ڈرائیور کی بیوی ہوں۔ زندگی کی اونچ نیچ اور ظاہر باطن کی پرکھ کا جو تجربہ مجھے ہے وہ شاید آپ کو نہ ہو۔“ ”یہ وہ بات ہے پروین جو کہتے ہوئے میں جھجک رہا تھا کہ کہیں تم برانہ مان جاؤ۔ اب تم نے خود کہہ دیا ہے تو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تمہیں کیا کرنا ہے؟“

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد مونس نے پروین کی آنکھوں میں جھانکا جو اس کے بولنے کی منتظر تھی۔ ”تمہیں حویلی میں آنے جانے والوں پر نگاہ رکھنی ہوگی پروین۔۔۔ خاص طور پر رات کو۔ ان کی ہر قسم کی سرگرمیوں کی مجھے پل پل رپورٹ ملنی چاہئے۔ ساتھ ہی رزاقی کے کمرے پر ممکنہ حد تک نگاہ رکھنا ہوگی تمہیں۔ وہاں رات کو کون آتا ہے کون جاتا ہے؟ سب تمہارے علم میں رہنا چاہئے۔ شاید اسی دوران تمہاری ملاقات اس روح سے بھی ہو جائے جو رزاقی کی حالیہ دیوانگی کا سبب بن چکی ہے۔ بولو۔ ایسا کر

روازہ بند کر دیا۔ مندر کے بڑے سے کمرے میں سامنے ہی کرشن درگا اور کالی کے بت اسے آتا دیکھ کر جیسے حیران ہو رہے تھے۔

وہاں اس وقت بہت کم روشنی تھی جس سے ماحول بڑا پر اسرار ہو رہا تھا۔ رزاتی کو لگا جیسے کرشن کنہیا بانسری ہونٹوں سے لگائے اس کی جانب تسخّر سے دیکھ رہا ہو۔ درگا کی نگاہوں میں طنز اور کالی کی پوری طرح کھلی آنکھوں سے اس کے لئے سرد مہری کا اظہار ہو رہا ہو۔ اس کا جی چاہا لوٹ جائے مگر اسی وقت سوامی اس کے آگے آگے چل پڑا ساتھ ہی اس کی آواز نے رزاتی کو بھی اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر دیا۔

”آخر آپ کی پتی کی آتما نے آخر آپ کو میرا راستہ دکھا ہی دیا رزاتی بابو۔ آئیے کام کی بات کریں۔“ وہ کرشن کے بت کے سامنے فرش پر بھیچنی چٹائی پر یوں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا کہ بت اس کے بائیں طرف تھا۔

بیٹھے رزاتی بابو۔ یہاں اس وقت ہم دونوں کے سوا کوئی موجود نہیں ہے۔“ اس نے رزاتی کو اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ رزاتی ایک پل کو بھجکا پھر سر جھٹک کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

”میں اس وقت جل پان سے تو آپ کی سیوا کر نہیں سکوں گا رزاتی بابو، تاہم اگر آپ چاہیں تو میں اس سرد موسم میں بدن میں تپش کے لئے آپ کو کڑوا پانی پیش کر سکتا ہوں۔“ سوامی نے کسی لاگ لپٹ کے بغیر کہا۔ رزاتی کو اس کے لہجے میں کئی طنز کا نشانہ ملے۔

”نہیں سوامی جی۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے منع کر دیا۔ ”میں یونہی ٹھیک ہوں۔“

”جیسے آپ کی اچھیا۔“ سوامی نے کندھے اچکائے۔ پھر جیسے کسی نے ٹیپ ریکارڈر کا بٹن آن کر دیا۔ وہ ر کے بغیر کہتا چلا گیا۔ ”آپ کی پتی کی آتما سورگ میں آپ کے لئے بہت بیا کل تھی رزاتی بابو۔ میں نے آپ کے دکھ کو اپنا دکھ جان کر محض انسانیت کے ناطے اسے اپنی دیا کے بل پر یہاں بلوایا ہے یہاں تک تو آپ جانتے ہیں ناں؟“

”جی ہاں۔۔۔ راجیہ بتا تو یہی رہی تھی۔“ بڑی مشکل سے رزاتی کے حلق سے آواز نکلی۔ وہ عجیب سی بے چینی کا شکار ہو رہا تھا۔ شاید یہ اس بات کا اثر تھا کہ اس نے آج کافی کا کپ حلق کے بجائے کھڑکی سے باہر اندیل دیا تھا تا کہ غنودگی اسے اپنی لپٹ میں نہ لے سکے۔ یہاں تک بھی وہ ٹوٹے بدن اور کانپتے رگ وریشے کے ساتھ پہنچا تھا اور اب سوامی کے سامنے بیٹھا وہ سارے بدن میں چیونٹیاں سی رنگتی محسوس کر رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ کسی سخت شے کے ساتھ سارے جسم کی کھر کھراہٹ کر ڈالے۔

”آپ کی پتی کی آتما کے بارے میں میں نے جو کچھ آپ سے کہا تھا رزاتی بابو، کیا اس پر اب آپ کو شواہس آیا؟“ سوامی نے اس کی حالت کا بغور جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

سکوگی؟“ مونس نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”اس میں کیا قباحہ ہے صاحب۔“ پروین نے اطمینان سے جواب دیا۔

”سوچ لو پروین۔ راتیں سردھی ہیں اور لمبی بھی۔ رات بھر جاگنا۔۔۔“

”میں نے کہا ناں صاحب میں ایک ٹرک ڈرائیور کی بیوی ہوں۔ راتوں کو لالو کے انتظار میں جاگنا میری زندگی کا حصہ بن چکا ہے۔۔۔ اور رزاتی بابو اگر آپ کے لئے تو میں قیامت تک جاگ سکتی ہوں۔“ اس کی آواز رندہ گئی اور وہ خاموش ہو کر ہونٹ کاٹنے لگی۔ پھر ذرا دیر بعد سنبھلی اور کہا ”اور اگر کسی پر آپ کو شک ہے تو مجھے اس کا نام بتائیے اور بس۔۔۔ بے فکر ہو جائیے۔“

”یہ بات بھی تم نے اچھی کہی پروین۔“ مونس سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر کچھ دیر بعد جیسے گوگو کے عالم میں بولا۔ ”بات ابھی پوری طرح واضح ہے نہ شک کا پودا بہت تیار ہے پروین مگر میں اندھیرے میں ایک تیر چھوڑنا چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے نشا نے پر جا لگے اور یہ بھی ممکن ہے کہ میرا شبہ محض اوہم ہی ثابت ہو۔“

”آپ کہتے تو مونس بابو۔ وہم اور شک کو اگر پرکھنا نہ جائے تو انھیں بڑھ جاتی ہے۔ آپ نام بتائیے شاید میں نام سن کر ہی آپ کی کچھ سلی کر سکوں۔“

”تو سنو پروین۔ میں لمبی چوڑی تمہید باندھے بغیر بتاتا ہوں۔ اس کا نام ہے۔۔۔“

مونس ایک پل کو رکا اور پھر اس کے بولوں نے جو نام اگلا اسے سن کر پروین یوں اچھی جیسے اسے بچھونے کاٹ لیا ہو۔

☆=====☆=====☆

سیاہ چادر میں لپٹا ایک سایہ ہندو بستی کے مندر کی دیوار کے ساتھ اندھیرے سے ابھر کر دیوار کے ساتھ ٹکا کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ اس کا سارا جسم اس سرد رات میں بھی پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ کچھ دیر تک وہاں کھڑا وہ سانس برابر کرتا رہا۔ پھر کمرے میں ڈوبی فضا کا جائزہ لے کر اپنی جگہ سے حرکت کی اور میز ہیٹاں چڑھ کر مندر کے کھڑے ہوئے دروازے کے پاس جا رکا۔ ایک بار ادھر ادھر دیکھا۔ ہڈیوں میں اترتی چیخ و ہمتا پا کانپ اٹھا۔ ذرا رک کر اس کا ہاتھ بلند ہوا اور دستک کے لئے چوبی دروازے کی طرف دراز ہوا کہ ایک دم بڑی ہلکی سی آواز کے ساتھ دروازہ یوں کھل گیا جیسے دوسری جانب کھڑے سوامی دھیرج داس کو اس کی آمد اور دستک کا پوری طرح علم تھا۔

”آئیے رزاتی بابو۔۔۔ میں آپ ہی کی راہ دیکھ رہا تھا۔“ اس کی پاٹ دار آواز ابھری تو سیاہ چادر میں ملفوف رزاتی نے دیکھا کہ عقب سے بڑتی روشنی میں اس کے سامنے دبلے پتلے سوامی کا جثہ اس وقت کسی دیو کی طرح رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ ”اندرا آجائیے۔ باہر بہت ٹھنڈ ہے۔“

سوامی نے ایک طرف ہٹ کر اسے راستہ دیا اور رزاتی ہچکچا کر اندر داخل ہو گیا۔ سوامی نے

کے وہ دھپ جل رہے تھے جن کی لواس کے چہرے پر پھیلی بھوری چٹانوں کی سی سختی کو دیکھ رہی تھی۔
”میں نے اب تک ایسی کوئی بات نہیں کہی رزاتی بابو جس سے آپ اس وہم میں مبتلا ہو جائیں
کہ میں آپ کو اُن دھری بنانا چاہتا ہوں۔۔۔ آپ اس بارے میں ٹھٹھٹ ہو جائیے اور پہلے میری ایک
بات کا جواب دیجئے۔“

”پوچھئے۔“ رزاتی چادر کو کس کر جسم کے گرد لپیٹ کر سکتے ہوئے بولا۔

”جب اپنے دھرم کے معاملے میں آپ اس قدر سخت ہیں کہ کسی سمجھوتے کے لئے تیار نہیں
ہوتے تو پھر میری کالی شکلیوں سے لایہ اٹھانے کے لئے آپ نے خود کو کیسے تیار کر لیا؟“ بڑا چبھتا ہوا سا
سوال تھا سوامی کا جس نے رزاتی کو ایک پل کے لئے خاموش کر دیا۔ اسے سر جھکائے کچھ سوچتے پا کر
سوامی کے ہونٹوں پر بڑی ہراساں مسکراہٹ رینگ گئی۔

”سوامی جی۔۔۔“ کچھ دیر بعد رزاتی نے بڑی دھیمی آواز میں کہا۔ ”ہمارے مذہب میں انسانی
جان کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ حکم ہے کہ جب جان خطرے میں ہو اور محسوس ہو کہ بھوک اور پیاس کی
وجہ سے موت واقع ہو جائے گی تو مردار اور حرام شے بھی اتنی مقدار میں استعمال کر سکتے ہو جس سے جان
بچ سکے۔ میں اپنے سچے دین کی اسی رعایت سے فائدہ اٹھانے جا رہا ہوں۔ جادو ٹونہ اور ساحرانہ قوتوں
کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے لیکن میں اس وقت جاں بلب ہوں۔ جب تک راجہ کی روح میرے
سامنے نہ آئی تھی تب تک میرے سانس لینے کا سبب میری مجبوری تھی مگر اب میں جانتا ہوں کہ اگر اب
مجھے راجہ نہ ملے تو میں زعمہ درگور ہو جاؤں گا۔ اس لئے میں آپ کے عمل سے اس حد تک فائدہ اٹھانا چاہتا
ہوں جس حد تک میں ایک زعمہ لاش بنارہنے کے بجائے جیتے جاگتے انسان کی طرح سانس لے
سکوں۔“

”آپ بہت کٹھور ہیں رزاتی بابو۔ مجھ سے سہانا بھی مانگ رہے ہیں اور میرے ہی دھرم کو جھوٹا
بھی کہے جا رہے ہیں۔ میری سہائیا آپ کے لئے مردار اور حرام شے کھانے کے برابر بھی ہے اور آپ
اس کے لئے راضی بھی ہیں۔۔۔“

”میرا یہ مطلب۔۔۔“ رزاتی نے کہنا چاہا۔

”آپ کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رزاتی بابو پر تو اب جو بات ہوگی وہ برابری کی سطح پر آ کر ہو
گی۔“ سوامی کا لہجہ سرد ہو گیا۔ ”آپ کو اپنی جتنی کا جیتا جاگتا شریہ چاہئے اور مجھے اس کے جواب میں منہ
مانگی مراد۔ کیونکہ اس اٹھو کو سمجھوتے کے لئے کالی شکلیوں کو بہت کچھ جھینٹ کرنا پڑے گا اور۔۔۔“
”تو آپ کھل کر کہئے کہ مجھے آپ کی کیا سیوا کرنا ہوگی۔ روپیہ پیسہ زمین جائیداد حویلی۔۔۔ کیا
پیش کروں میں آپ کی خدمت میں۔ آپ صرف آدمی زبان سے اشارہ کر دیجئے میری طرف سے

”سوامی جی۔ پلیز۔۔۔ آپ مجھ سے کچھ مت پوچھئے۔ بس راجہ سے ملاپ کے لئے جو کر سکتے
ہیں کر ڈالئے۔ جس رات سے وہ مجھ تک آئی ہے اس رات سے اب تک میں ملن کی آس میں جل رہا
ہوں۔ اگر آپ نے کسی سے محبت کی ہے تو آپ جانتے ہوں گے کہ فرقت کا لاد کیا ہوتا ہے اور اس میں
جیتے جی جل جانا کن عذاب ناک لمحات کا نام ہے۔“ رزاتی نے جتنی لہجے میں کہا۔ راجہ کی محبت نے اسے
ہر کدو فر سے عاری کر ڈالا تھا۔ لگتا تھا وہ کسی بھی قیمت پر اس سے ملن کا تہیہ کر چکا ہے۔

”آپ ٹھیک کہتے ہیں رزاتی بابو۔۔۔ میں اس اگنی کی آغ سے بھی واقف ہوں اور محبوب سے
ملن کی آس میں پل پل مرتیو جل پینے کی اذیت سے بھی آشنا ہوں۔۔۔ میں جو کچھ کر سکتا ہوں وہ ضرور
کروں گا پرنتو آپ جانتے تو ہیں ناں کہ میں کالی شکلیوں کا پجاری ہوں اور انہی سے کام لے کر میں
آپ کے کام آ سکتا ہوں۔“

”جی ہاں۔۔۔ میں جانتا ہوں۔“ رزاتی کے لہجے میں تھکن سی اتر آئی اور سر جھک گیا۔ ”لیکن کیا
میں جان سکتا ہوں کہ کیا آپ نے راجہ کی روح کو بھی اپنی انہی قوتوں کے بل بوتے پر۔۔۔“

”میرے پاس اور کوئی طاقت ہے ہی نہیں رزاتی بابو۔ میں آپ سے جھوٹ بول کر آپ کا دل
نہیں رکھ سکتا۔ میں آپ کی جتنی کی آتما کو اپنی کالی شکلیوں ہی کے بل پر دو بارہ آپ کے سامنے لا سکا
ہوں۔۔۔ تاہم ابھی تک میں نے ایسا کچھ نہیں کیا جس کے بعد وہ اپنا شریہ پر اپت کر کے آپ کے لئے
جیتی جاگتی راجہ بن جائے۔“
”اور وہ عمل آپ کب کریں گے سوامی جی؟“ رزاتی نے بیٹابی سے پوچھا تو سوامی کے ہونٹوں پر
بڑی عجیب سی مسکراہٹ کھیل گئی۔

”میں جانتا ہوں آپ کے لئے ایک ایک پل بھاری ہو رہا ہے رزاتی بابو پرنتو۔۔۔“
”رکئے مت۔ کہہ ڈالئے جو آپ کے من میں ہے۔“ رزاتی نے اس کی خاموشی کا وقفہ طویل
ہوتے دیکھ کر بالا خر کہا۔

”پرنتو یہ رزاتی بابو۔۔۔ کہ آپ کا اب تک کا کام تو میں نے انسانیت کے ناطے کر ڈالا۔ اب
آگے کا کام بڑا کٹھن ہے۔ آسان تو اب تک کا کام بھی نہیں تھا مگر ایک آتما کو اس کے شریر میں واپس
پرویش کرنا ایک ایسی انہونی ہے جس کے لئے ہمارے دھرم میں تو بڑی گنجائش ہے آپ کے دین میں
اس کا تصور ہی ناپید ہے۔“

”میرے جسم میری جان کی ضرورت ہے تو لے لیجئے سوامی جی مگر پلیز۔۔۔ میرے دین کا نام
مت لیجئے گا۔ میں مرتد ہو کر جینے سے بہتر سمجھتا ہوں کہ ایک فرقت گزیدہ کی موت مر جاؤں۔“ رزاتی کی
آواز میں ایک دم ٹھہراؤ سا آ گیا۔ اس کی ساری بیقراری اس کی آنکھوں میں سمٹ کر رہ گئی جہاں آشا

سوامی نے کہا تو وہ پھر چونکا۔

”وہ کیا؟“

”یہ میں آپ کو وقت آنے پر بتاؤں گا۔۔۔ کیوں یہ بتا دیجئے کیا آپ اپنوں کی جدائی سہن کر پائیں گے؟“

”راجیہ کے لئے میں اپنے آپ سے بھی جدا ہونے کے لئے تیار ہوں۔۔۔“ بجد جذباتی لہجے میں رزاتی نے کہا تو سوامی بیساختہ مسکرا دیا۔

”میں نے کہاناں رزاتی بابو۔ آپ کی محبت دیوانگی کی اس سیما کو چھو رہی ہے کہ اس کے ادب میں، میں اپنی سب شریٹیں خود ہی ختم کرتا جا رہا ہوں۔ اپنے سب نیم خود ہی توڑتا جا رہا ہوں اور اسی لئے میں آپ سے اپنی منہ مانگی مراد آپ کا کام ہو جانے کے بعد طلب کروں گا۔“ سوامی نے اسے بڑی گہری نظروں سے دیکھا۔

”لیکن مجھے پتہ تو ہونا چاہئے کہ آپ کیا۔۔۔“ رزاتی نے کہنا چاہا۔

”آپ کے لئے آپ کی جان اور دھرم سے بڑھ کر تو کوئی شے قیمتی نہیں ہے ناں رزاتی بابو؟“ سوامی نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اور وہ میں نہیں مانگوں گا۔ اب اس کے علاوہ میں آپ سے کیا مانگ

لوں؟ کیا اس کی کوئی اہمیت ہے؟“

”نہیں۔“ بے اختیار رزاتی کا سر فنی میں مل گیا۔

”تو بس۔۔۔ آپ اس بارے میں نچخت ہو جائیے اور خود کو ذہنی طور پر اس بات پر آمادہ کیجئے کہ میں جو کچھ آپ کے لئے کرنا چاہ رہا ہوں اس میں آپ پوری طرح مجھ سے بہت رہیں گے۔“

”میں تیار ہوں۔ بولئے مجھے کیا کرنا ہوگا۔“ رزاتی نے ایک عزم سے کہا۔

”صرف یہ کہ آج کے بعد آپ ہر رات اپنی پتی کی آتما کی راہ نہارنے کے بجائے سکون سے نیند لینا شروع کر دیں۔“ سوامی نے ایک دم رزاتی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ”میں آپ کو وچن دیتا ہوں کہ آج سے ٹھیک تیسری رات آپ کی پتی کی آتما اپنے شریر میں پرویش کر جائے گی اور اسی رات وہ جیتی جاگتی آپ کے پاس چلی آئے گی۔ تب آپ اسے چھو سکیں گے۔ اسے محسوس کر سکیں گے۔ اس کا لمس۔۔۔“

”آپ سچ کہہ رہے ہیں سوامی جی؟“ ایک دم رزاتی کی آواز اور بلیکس بجد بوجھل ہو گئیں۔ اسے لگ رہا تھا کہ اندھیرے کا ایک طوفان ہے جو سوامی کی سرخ سرخ آنکھوں سے کسی دیو قامت سائے کی طرح خارج ہوتا ہوا اس کی آنکھوں میں اترتا چلا جا رہا ہے۔ اس کے حواس پر ٹھنڈی بج سی مردنی چھانے لگی۔ سارا جسم کسی لالٹھ کی طرح اکڑ گیا اور دل کی دھڑکن ڈوبتی چلی گئی۔ وہ لالٹھ چاہنے کے باوجود

انکار نہیں ہوگا۔“ رزاتی کا لہجہ بڑا ٹھوس تھا۔

”یہ سب چیزیں میرے کس کام کی رزاتی بابو۔ مایا تو ہم کالی کے بھگتوں کے ہاتھ کا میل ہے۔ ہم اپنی کالی ودیا سے جو چاہیں جب چاہیں حاصل کر لیں۔“ سوامی کے لہجے میں تکبر نے پاؤں پھارے۔ ”میں تو آپ سے کچھ اور چاہتا ہوں۔“

”تو کہئے ناں۔۔۔ میں راجیہ کے لئے آپ کے دامن میں کچھ بھی ڈال سکتا ہوں۔ کچھ بھی۔۔۔“ رزاتی نے اس کی جانب دیکھا اور ایسی بیتابی سے کہا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اب وہ بات کسی فیصلے کی بجائے جڑھانا چاہتا ہے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے بدن میں ریگتی چوٹیاں اب کچھ مٹی جارہی تھیں۔ اس کے لہو میں ڈنک سے چل رہے تھے۔ اسے کس چیز کی طلب ہو رہی تھی وہ نہیں جانتا تھا مگر یہ طلب ایسی تھی جو اس کے جسم و جان میں انگارے سے بھرتی چلی جا رہی تھی۔ سرد اور بریلے انگارے جو اس کے بدن میں بار بار کچکی دوڑا رہے تھے۔ اس کی حالت پر سوامی کا پوری طرح دھیان تھا لیکن وہ جان بوجھ کر اس طرف سے انجان بنا ہوا تھا۔

”کچھ بھی کا مطلب جانتے ہیں آپ رزاتی بابو؟“ ایک دم سوامی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

”جانتا ہوں۔“ رزاتی نے سر جھٹکا جیسے وہ آخری حد تک داؤ کھیل جانے کا ارادہ کر چکا ہو۔ ”آپ بولئے کیا چاہئے آپ کو؟“

”میں آپ کی اپنی پتی سے دیوانگی کی حد تک اس پریت سے بہت متاثر ہوں رزاتی بابو۔۔۔“ اچانک سوامی کا لہجہ مٹھاس میں ڈوب گیا۔ ”اس لئے کچھ بھی مانگنے سے پہلے آپ کو میں وہ بات یاد دلانا چاہتا ہوں جس پر ابھی تک آپ نے غور ہی نہیں کیا۔“

”وہ کیا؟“ رزاتی چونکا۔

”اگر میں آپ کا کام کر دوں اور آپ اپنی پتی کا شریر دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو آپ اپنے سگوں اور گاؤں والوں کو کیا جواب دیں گے۔ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں ناں آپ۔۔۔ جب آپ کی پتی دیہانت کے بعد ایک بار پھر جیتی جاگتی صورت میں سب کے سامنے آئے گی تو اس کا کیا کارن بتائیں گے آپ ان لوگوں کو۔۔۔ خاص طور پر مونس بابو کو؟“

اور اس کی بات سن کر رزاتی ایک دم سن ہو گیا۔ سوامی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس طرف تو اس کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ آخر وہ لوگوں کو کیا بتاتا کہ راجیہ کس طرح دوبارہ زندہ ہو کر اس کے پاس چلی آئی؟ مونس ہوتا یا بی بی۔۔۔ اسے گاؤں والوں سمیت کسی ایک کو بھی سمجھنا مشکل ہو جاتا۔ وہ کس کس کا منہ بند کرتا! ”میرے پاس اس سمیا کا مل بھی ہے رزاتی بابو۔“ اسے سوچ کے ہنور میں غوطے کھاتا دیکھ کر

یقین نہ آیا مگر اس میں شک کی بات تھی نہ شبے کی۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ وہ سفید ساڑھی میں ملبوس اس کی جانب والہانہ پیار بھری نظروں سے نکتی اس کی راجیہ ہی تو تھی۔ ہاں۔۔۔ وہ راجیہ ہی تھی۔ اس کے دل نے صدادی تو دماغ نے اس پر تائید کی مہر ثبت کر دی۔

”جب جب آپ کی پتی کی آتما پرویش کرتی ہے تو میرا حال آپ سے بھی برا ہوتا ہے رزاتی بابو۔۔۔ آپ کی محبت کی خشکی ہے جو آپ کے دماغ کی رگیں سلامت رہ گئیں ورنہ تو عام انسان اس کیفیت کو سہن ہی نہیں کر پاتا۔۔۔“ سوامی نے بڑے گھمبیر لہجے میں کہا تو رزاتی چونکا۔ اسی وقت سوامی نے راجیہ کی جانب نگاہ کی۔

”راجیہ جی۔۔۔ اپنے پتی کے اتنا قریب آ کر کیا محسوس کر رہی ہیں آپ؟“

”بہت اچھا۔۔۔“ راجیہ کے گداز ہونٹ ہولے سے وا ہوئے مگر نگاہوں کا مرکز اب بھی رزاتی ہی تھا۔ ”مجھے جنت میں گزارے ہر پل سے زیادہ یہ لمحے قیمتی لگ رہے ہیں سوامی جی جن میں میں اپنے صاحب کے سامنے موجود ہوں اور وہ میرے سامنے۔۔۔ اور مجھے یہ اقرار کرنے میں کوئی حجاب نہیں کہ یہ سب آپ کی تپسیا کا پھل ہے۔ میں آپ کی احسان مند ہوں اور رہتی دنیا تک میری روح آپ کے اس احسان کے بوجھ تلے دبی رہے گی۔“

”راجیہ۔۔۔“ رزاتی کے لبوں سے سرگوشی آزا ہوئی اس نے اٹھنا چاہا۔

”ابھی نہیں رزاتی بابو۔۔۔ بس تین راتوں کا انتظار اور۔۔۔ اس کے بعد آپ اپنی ہر منو کا منا پوری کرنے کے لئے آزاد ہوں گے۔ میری آپ سے پتی ہے کہ اتا و لے نہ ہوں۔ بنانا کھیل کہیں بگڑ نہ جائے۔“ سوامی نے کہا تو رزاتی واپس اپنی جگہ بیٹھ گیا مگر اس کی آنکھوں میں لپکتی بیتابی سے اس کے دل کا حال عیاں تھا۔ اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ راجیہ کو باہوں میں بھر کر وہاں سے غائب ہو جائے۔

”تو کیا میرے صاحب نے رضامندی ظاہر کر دی؟“ ایک دم خوشی اور فرط حیرت سے راجیہ نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لئے۔

”سچ کہوں راجیہ جی۔ آپ کے پتی آپ کو دیوانگی کی حد تک چاہتے ہیں۔“ سوامی نے راجیہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ اپنی جان دے کر بھی آپ تک پہنچ جانا چاہتے ہیں پرتو میں نے درمیان کا راستہ نکال لیا ہے۔ اب بہت جلد آپ دونوں کا ملن ہو سکے گا۔“

”کتنی جلد سوامی جی۔۔۔ اور کتنی دیر ہے ابھی ہمارے ملاپ میں؟“ بیتابی کے مارے کرشن کے بُت کے سامنے جلتے ہون کے پاس سے گزر کر راجیہ آگے چلی آئی۔

”صرف تین راتوں کا فاصلہ ہے آپ کے اور آپ کے پتی کے درمیان راجیہ جی۔ پھر آپ دونوں ہوں گے اور۔۔۔“

سوامی کی نگاہوں سے اپنا رابطہ نہ توڑ سکا۔

”میں نے جو کہا آپ کو اس پر اتم و شواہ ہونا چاہئے رزاتی بابو۔“ سوامی کی آواز اس قدر خوفناک ہو گئی کہ اگر وہاں کوئی تیسرا سننے والا ہوتا تو اس کا دل بیٹھ جاتا۔ ”سمجھ گئے آپ؟“

”ہاں۔“ بڑی مدہم سی آواز رزاتی کے حلق سے خارج ہوئی اور اس کا دماغ پھٹنے کی حد تک آ گیا۔ اس کی کپٹیوں میں خون کی گردش اس قدر تیز ہو چکی تھی کہ وہاں کی رگیں پھولنا شروع ہو گئیں۔

”تو بس۔۔۔ اب آپ دھیرے دھیرے ہوش میں آجائیے۔“ سوامی نے دائیں ہاتھ کی پہلی انگلی کی نوک رزاتی کے ماتھے کے عین درمیان رکھ دی۔

رزاتی کو یوں لگا جیسے اس کی پیشانی پر کسی نے دھکتا ہوا انگارہ رکھ دیا ہو۔ اس کا سارا جسم ایک دم برقی سردی کے احساس سے آزاد ہو کر آگ کے الاؤ میں جا پڑا۔ جھر جھری لے کر اس نے اپنی منوں وزنی آنکھیں کھولنا چاہیں اور اس بار اسے زیادہ قوت صرف نہ کرنا پڑی۔ سوامی نے انگلی اس کے ماتھے سے ہٹا کر ہاتھ اپنی گود میں گرالیا اور اس کی نگاہوں سے پل بھر کو اپنی نظروں کا رابطہ کاٹ دیا۔ ٹھیک اس ایک پل میں رزاتی اپنے حواس میں لوٹ آیا۔

چند لمحوں تک وہ خالی خالی نظروں سے سوامی اور اپنے ارد گرد دیکھتا رہا۔ پھر جیسے اسے اس ماحول کا ادراک ہوا جس میں وہ موجود تھا۔ ہوش کا دامن تھامنے میں اسے چند منٹ لگ گئے۔ تب وہ سوامی کی طرف متوجہ ہوا تو اس کی آنکھوں کی روشنی بحال ہو چکی تھی۔

”مجھے کیا ہوا تھا سوامی جی؟“ اس نے بیحد تھکے تھکے لہجے میں پوچھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ بھوکے پیٹ میلوں دوڑتے رہنے کے بعد بے حال ہو کر گر پڑا ہو۔

”کچھ بھی نہیں رزاتی بابو۔“ سوامی مسکرایا۔ ”آپ کی یہ حالت ایک خاص کارن سے ہوئی ہے۔“

جواب میں رزاتی اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ کر رہ گیا۔ اس کا جی نہ چاہ رہا تھا کہ زبان کو حرکت دے۔

”میں بتاؤں یا آپ اپنی آنکھوں سے اس کارن کو دیکھنا چاہیں گے؟“ سوامی کے لب مسکراہٹ کے انداز میں پھیلے۔

”میں کچھ سمجھ نہیں۔“ رزاتی کی حالت کافی حد تک سنبھل چکی تھی۔

”ادھر دیکھئے۔۔۔“ سوامی نے بایاں ہاتھ کرشن کے بُت کی طرف دراز کیا۔

بے اختیار رزاتی نے گردن گھمائی اور۔۔۔ اس کے دماغ کو ایک جھٹکا لگا۔ دل کی دھڑکن پل بھر کو تھمی پھر بے قابو ہو گئی۔ بصارت دھندلا کر جولوٹی تو آئینے کی طرح شفاف ہو گئی۔

کالی اور درگا کے درمیان کرشن کے بُت کے سامنے ہون میں دیکتے لوبان کے خوشبودار دھوئیں کے بلند ہوتے مرغولوں کے عقب میں کسی کا ہوشربا سراپا مہک رہا تھا۔ اسے ایک لمحے کو اپنی آنکھوں پر

آپ میری بات کا برا نہیں مانیں گے۔“
 ”نہیں نہیں۔ اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے۔۔۔ لیکن سوامی جی، کیا میں آپ کے عمل کے دوران یہاں نہیں رک سکتا؟“ اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔
 ”نہیں رزاتی بابو۔ ایسا مناسب ہے نہ سمجھو۔ مجھے بالکل اکیلے ہی سارا کام کرنا ہوگا۔ آپ اس کے لئے مجھے شکستہ کیجئے۔۔۔“ اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔

”نہیں نہیں سوامی جی۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں چلتا ہوں۔ یہ بتا دیجئے کہ مجھے اب کب آنا ہو گا یہاں؟“

”سنیچر کی رات ٹھیک ایک بجے آپ کو پیچھے شمشان میں ہونا چاہئے رزاتی بابو۔۔۔ آپ اکیلے آئیں گے اور اپنی پتی کے جیتے جاگتے شریروں کو باہوں میں بھر کر واپس لوٹ جائیں گے اس کا میں آپ کو دین دے چکا ہوں۔۔۔ پرنتو۔۔۔“ اس نے تنبیہی انداز میں انگلی اس کی طرف اٹھائی۔ رزاتی اس کے بولنے کا منتظر رہا۔ ایک پل گزرنے کے بعد سوامی نے بڑے صاف لہجے میں کہا۔ ”یہ یاد رہے کہ آج یہاں جو باتیں ہوئیں۔۔۔ جو کچھ آپ نے دیکھا جو کچھ سنا وہ سب آپ کے ہر دے میں دفن ہو جانا چاہئے۔ کسی بھی بات کے کھل جانے پر میں اپنے چسکار سے ہاتھ اٹھا لوں گا اور آپ سے شام بھی نہیں چاہوں گا۔“

”ایسا کچھ نہیں ہو گا سوامی جی۔ آپ بے فکر رہئے۔۔۔ رزاتی نے بے اعتماد لہجے میں کہا اور اٹھ گیا۔ پھر ”تو میں اب چلوں“ کہتے ہوئے اس نے راجیہ کی طرف نظر اٹھائی اور ٹھٹک کر رہ گیا۔ راجیہ وہاں کہاں تھی؟ لوہان کے خوشبودار دھوئیں کے مرغولے اس کی چکیلی کمر کی یاد ضرور دلارہے تھے مگر وہ وہاں موجود نہیں تھی۔

”وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ راجیہ۔۔۔“ ہکلاتے ہوئے رزاتی نے سوامی کی طرف دیکھا۔
 ”چلی گئی آپ کی پتی کی آتما۔۔۔ وہ آپ کو وداع ہوتے نہ دیکھ سکتی تھی رزاتی بابو۔ میں نے کہا ناں کہ مجھ جیسا کل ہر دہی بھی آپ دونوں کی پریت کے سامنے سیس نوانے پر مجبور ہو گیا ہے۔۔۔ ایسی پریت ایسی دیوانگی ایسا جنون۔۔۔ میں نے دیکھا نہ سنا۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”بہر حال اب آپ چلئے۔ سس ہو چکا ہے کہ میں راجیہ جی کی آتما کو شریر دینے کا ٹھن کام شروع کروں۔“
 رزاتی نے ایک طائرانہ نگاہ مندر کے اکلوتے کمرے پر ڈالی۔ پھر ایک گہرے سانس کے ساتھ سر جھکائے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ سوامی اس کے عقب میں چلا آ رہا تھا۔ اس نے خود رزاتی کے لئے دروازہ کھولا اور ایک طرف ہو گیا۔ رزاتی نے گردن گھما کر ایک بار پھر کرشن کے بت کی جانب دیکھا شاید اس امید پر کہ وہاں راجیہ موجود ہوگی مگر اس کی نظر نا کام لوٹ آئی۔ اداسی چہرے پر لئے وہ

”سچ سوامی جی۔۔۔“ ایک دم راجیہ کی پلکیں نم ہو گئیں۔ آواز بھرا گئی اور چہرہ متغیر ہو گیا۔ ”آپ سچ کہہ رہے ہیں ناں؟“ اس نے رزاتی کی جانب دیکھا جو اسے دیوانوں کی طرح محبت پاش نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ راجیہ اب اس سے چار پانچ فٹ کے فاصلے پر کھڑی تھی اور وہ اس کے بدن سے البتی پروفیسی کی مہک سے مشام جاں کو معطر کر رہا تھا۔

”مجھے آپ سے جھوٹ بول کر کیا ملے گا راجیہ جی۔۔۔ بہر حال آپ اپنے شریر میں پرویش کرنے کے لئے تیار ہو جائیے۔ ابھی رزاتی بابو کے جانے کے بعد میں اپنی ودیا کے سب سے بڑے چسکار کا پہلا زینہ طے کروں گا۔ اس دوران آپ جس اذیت سے گزریں گی میں اس کے بارے میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ کیا آپ اب بھی اس کے لئے تیار ہیں؟“

”بے شک۔۔۔“ راجیہ نے ایک عزم سے کہا اور رزاتی کی جانب ایک حیا آلود مسکراہٹ اچھالی۔ ”مجھے اپنے صاحب کو پانے کے لئے اگر آگ کے دریا میں ڈوب جانا پڑے تو بھی میں آف نہ کروں گی۔“

”کیا مطلب؟“ رزاتی نے اس کی بات پر گھبرا کر کہا۔ ”کیا کوئی بہت تکلیف دہ عمل ہے سوامی جی جس کے لئے راجیہ کو ایسی اذیت برداشت کرنا ہوگی؟“

”آپ اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے رزاتی بابو۔ سوامی یحسد نجدگی سے بولا۔ ”ایک آتما کا اپنے شریر میں غیر فطری طور پر سس سے پہلے پرویش کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی حیوت انسان کے بدن سے دھیرے دھیرے آہستہ آہستہ کند چھری سے کھال کھینچنا۔۔۔“

”کیا اس کا اور کوئی راستہ نہیں ہے سوامی جی؟“ رزاتی بے کلی سے بولا تو راجیہ کو اس پر بے طرح پیارا آ گیا۔

”صاحب۔۔۔“ وہ نظروں سے اسے چومتے ہوئے گویا ہوئی۔ ”آپ کیوں فکر کرتے ہیں۔ یہ اذیت تو کچھ بھی نہیں۔ اس سے زیادہ بھی کچھ ہو تو میں آپ کے لئے سہہ جاؤں گی۔ آپ کو پالنے کا یقین میری سب سے بڑی طاقت بن چکا ہے۔ آپ بالکل نہ گھبرائیں۔ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ کیوں سوامی جی؟“ اس نے تائید چاہنے والی نگاہیں سوامی کی جانب اٹھائیں۔

”میں آپ دونوں کی محبت دیکھ دیکھ کر پاگل ہوا جا رہا ہوں راجیہ جی۔ آپ واقعی ہر اذیت ہنس کر سہن کر جائیں گی اس کا مجھ و شو اس ہو گیا ہے۔“

اسی وقت دور کہیں کسی کلاک نے رات کے تین بجنے کا اعلان کیا۔ سوامی نے غور سے سنا۔ پھر ایک گہرا سانس لے کر رزاتی کی طرف دیکھا۔

”رزاتی بابو۔ اب آپ کو وداع ہو جانا چاہئے۔۔۔ میری تندرودیا کا سس ہوا چاہتا ہے۔ آشا ہے

پروین نے شہزادے کو دوائی کھلا کر سنانے سے پہلے نیند آور شربت کا ایک چمچ بھی پلا دیا۔ وہ خوابِ خرگوش کے مزے لے رہا تھا اور اب صبح تک اس کے جاگنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر اس نے سارے گھر کی لائٹیں آف کیں۔ نیلی گرم شال میں لپٹی پاؤں میں فلیٹ بوٹ پہنے باہر نکلی۔ کمرے کا دروازہ بے آواز بند کیا اور بلی جیسی چال چلتی دے پاؤں چھت پر چلی آئی۔ کوارٹروں کی سنگھی چھت پر چاروں طرف چار چارٹ بلند منڈیر تھی جس سے نیچے یادائیں بائیں کے ایک دو کوارٹروں کے صحن میں جھانکنا بہت آسان تھا۔ ہر دو کوارٹروں کی دیواروں کے درمیان جو ایک سے دو فٹ کی خالی جگہ تھی وہاں ہر دیوار میں ہوا اور روشنی کی آمد و رفت کے لئے ایک ایک کھڑکی بنائی گئی تھی۔ لوگوں نے ان کھڑکیوں کو روک کر فٹ کرنے یا گیلے رکھنے کے لئے استعمال کر رکھا تھا۔

چاند کی آخری تاریخیں چل رہی تھیں۔ اندھیرا اور کھرا گاؤں کی کھلی فضا میں ویسے ہی کھل کھلتا ہے اور اس وقت تو اسے حقیقتاً پوچھنے والا کوئی نہیں تھا اس لئے چاروں طرف صرف اور صرف سناٹے کا راج تھا۔

منڈیری کی دیوار میں خوبصورتی کے لئے جو روزن بنائے گئے تھے اس وقت وہ پروین کے بہت کام آئے۔ وہ بائیں کوارٹر کے صحن میں اندھیرے کے باوجود سب کچھ صاف صاف دیکھ سکتی تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ پیلا کے کمرے کی لائٹ ابھی تک جل رہی تھی۔ وہ خود تو رات کو بھی اکثر چوہلی میں رہتی تھی یہاں اس کی موسیٰ کماری کو شاید کچھ پڑھنے پڑھانے کی عادت تھی کہ وہ پچھلے پہر تک لائٹ جلائے رکھتی تھی۔ پچھلی دوراتوں سے وہ دائیں بائیں کے کوارٹروں کی نگرانی کر رہی تھی۔ سناٹے کس کوارٹر سے کوئی مشتبه شخص برآمد ہو جاتا۔ مونس بابو کو جس پر شک تھا وہ شخص انہی کوارٹروں میں سے کسی ایک میں موجود تھا۔ سردی میں ٹھنڈی ٹھار دیوار کے ساتھ لگے بیٹھے بیٹھے پروین کا جسم درد کرنے لگا مگر اسے اپنا کام پوری ذمہ داری سے سرانجام دینا تھا اس لئے خاموشی سے وہیں بیٹھی رہی۔

پون گھنٹہ گزرا تو کماری کے کمرے کی لائٹ بھی آف ہو گئی۔ پروین نے ایک طویل سانس لیا اور ایک بار اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ سب کچھ ویسے کا ویسا ہی تھا جیسا پچھلی دوراتوں سے تھا۔ اس کا جی چاہا کہ نیچے چلی جائے۔ پھر کچھ دیر اور وہیں رکنے کا سوچ کر بیٹھی رہی۔ کبھی کبھی انسان کی جھٹی جس سے آنے والے کسی لمحے کا پہلے سے پتہ دے دیتی ہے۔ پروین کو بھی لگ رہا تھا کہ آج کچھ نہ کچھ ہو رہا ہے۔ کیا؟ یہ وہ نہ جانتی تھی۔

تقریباً آدھ گھنٹہ اور گزرا تو اس کی قلفی جمن شروع ہو گئی۔ نیند تو خیر کیا آتی مگر سردی نے اسے خاصا مضطرب کر دیا۔ اٹھنا چاہتی تھی کہ مونس بابو سے کیا ہوا وعدہ آنکھیں ملتا ہوا سامنے آن کھڑا ہوا اور وہ ایک دم اپنی جگہ جم کر رہ گئی۔ جسم سے سردی کا احساس ایک دم ناپید ہو گیا۔ اس نے پیلا کے صحن میں دیکھتے

کھلے دروازے سے باہر نکلا۔ سوامی نے بڑی بڑا سر اسرار مسکراہٹ کے ساتھ دروازہ بند کر لیا اور چاروں طرف پھیلے اندھیرے کی چادر اس کے دل کی طرح مزید سیاہ ہوتی چلی گئی۔

رزاقی چادر میں سرمہ لیٹتا ہوا تیزی سے بیڑھیاں اتر گیا۔ اندھیرے سے بگلے ملتے کھرے میں ادھر ادھر دیکھ کر اطمینان کیا اور تیز تیز قدموں سے میدان پار کر کے کھیتوں میں اتر گیا جہاں لوگوں کی آمد و رفت سے بن جانے والی پگڈنڈی اسے سیدھا حویلی کی پشت پر اس کے کمرے کی کھڑکیوں تک لے جاتی جن میں سے ایک سے کوہ کردہ یہاں تک پہنچا تھا۔

کھیتوں سے گزرتے ہوئے جب وہ اس جگہ پہنچا جہاں سے تقریباً چالیس پچاس گز کی دوری پر خانہ خدا کی پر شکوہ عمارت سے اس کا سامنا ہوا تو ایک بار پھر اس کے قدم زمین میں گڑ گئے۔ جب وہ سوامی کے پاس جا رہا تھا تب بھی اس کے قدم بے اختیار اس جگہ پہنچ کر ٹھم گئے تھے۔ اس بار بھی دل نے اس کے سینے میں وہ دھماکا مچائی کہ اس کا سارا جسم پسینہ پسینہ اور سرد ہو گیا۔ آنکھوں میں گیل گیل سا غبار اتر اور ہر شے دھندلائی چلی گئی۔ مسجد پہلے دن کی طرح بقعہ نور بنی ہوئی تھی۔ مسجد کا دروازہ بند کرنے سے پہلے اس کی چلائی ہوئی روشنیاں آج بھی روشن تھیں مگر وہاں اذان اور نماز کے لئے کوئی موجود نہیں تھا۔

ایک ہوک سی اس کے سینے سے اٹھی۔

”یہ میں کیا کر رہا ہوں؟ کیا ٹھیک ہے؟“ اس نے جیسے خود سے سوال کیا۔

”اس میں بڑا بھی کیا ہے؟“ کسی اور نے اس کے اندر سے سوال کے جواب میں سوال کیا۔

”کسی مرض کے علاج کے لئے الکھل اگر دوائی کے طور استعمال کی جائے تو دین اس کی اجازت دیتا ہے۔ میں بھی تو یہی کر رہا ہوں۔“

دلیل بڑی بودی گھی مگر اس وقت ”ڈوبتے کو تنکے کا سہارا“ کے مصداق اس کے لئے ایسی کوئی بھی بات بہت کافی تھی جو اس کے ضمیر پر بوجھ بنے اس کے اس فعل کے سامنے کاغذ کی دیوار کھڑی کر سکتی جس کا وہ مرتکب ہونے جا رہا تھا بلکہ ایک حد تک مرتکب ہو چکا تھا۔

بڑی مشکل سے اس نے بے قابو دل کو سنبھالا۔ منوں وزنی قدموں کو حرکت دی اور سیاہ چادر میں اپنے من کا داغ چھپانے کی سعی کرتا ہوا حویلی کی عقبی سمت چل پڑا۔ سرد ہوانے اسے احساس دلایا کہ اس کے چہرے پر پھیلتی ہی کا آنکھوں سے بڑا گہرا تعلق ہے مگر ہونٹ بیٹھے سر جھکائے وہ چلتا رہا۔ اس وقت رک جانے کا مطلب تھا کہ وہ اپنے کئے ہوئے فیصلے کی طنائیں کھینچ لیتا اور یہ اسے ابھی کسی قیمت پر گوارا نہیں تھا۔

☆=====☆=====☆

رات آدھی سے زیادہ ڈھل چکی تھی۔

کر یہ انکشاف چونکا دینے والا ثابت ہوا کہ وہ عمارت ہندوؤں کا مندر تھی۔ جس کے ماتھے پر سوسائیک کا نشان اور دائیں بائیں دیواروں پر بچوں کی شبیہیں کھدی تھیں۔ عین درمیان میں چھت کے پاس کرشن اور کالی کے دو چھوٹے چھوٹے مُت بھی نصب تھے۔

سایہ مندر کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا جب پروین نے مندر کی جنوبی دیوار سے ذرا سا سر نکال کر یہ سب کچھ جانچ لیا۔ سیڑھیاں چڑھ کر اس سائے نے آہستہ سے چوٹی دروازے پر دستک دی۔ ایک پل کے بعد دروازہ کھلا اور سایہ پلک جھپکتے میں اندر ریگ گیا۔ دروازہ فوراً ہی بند ہو گیا اور چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔

گنتی ہی دیر گزر گئی۔

پروین کے خیال میں یہ وقفہ آدھ گھنٹے سے کم نہ تھا۔ سوچ سوچ کر آخراں نے لوٹ جانے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح اکیلے وہاں ٹھہرے رہنے سے وہ کسی بھی خطرے سے دوچار ہو سکتی تھی۔ ویسے بھی مونس بابو نے اسے اس طرح لیڈی جیمز بانڈ بننے کو نہیں کہا تھا۔ اس نے من ہی من میں کچھ طے کیا اور دبے پاؤں پلٹ پڑی۔

ہانچتے کانپتے جب وہ کوارٹروں کے پاس پہنچی تو حویلی کے عقبی حصے میں رزاقی بابو کے کمرے کی کھڑکیوں پر نگاہ پڑی۔ کچھ سوچ کر اس نے ادھر ادھر دیکھا اور اس طرف چل پڑی۔ کھڑکیوں کے پاس رک کر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ دوز بالکل سائے روشنیوں کی آغوش میں ہمسکتی سید کا انتظار سے بہت بھلا لگا۔ کھڑکیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ اندر سے چٹنی نہ لگائی گئی تھی۔ اس نے چھن چھن کر باہر آتی مدھم سی سبز روشنی میں بڑی آہستگی سے درمیانی کھڑکی کے ایک پت پر دباؤ ڈالا۔ پت بے آواز کھٹک چلا گیا اور اس کے آگے پڑا ہوا پردہ بھی دائیں بائیں ہٹ گیا۔

پروین فوراً ایک طرف ہو گئی۔ اس کا دل بہت زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اسے ایک دم احساس ہوا کہ اس نے کیسی غلط حرکت کی تھی۔ اگر رزاقی بابو جاگ رہے ہوں تو؟ چند لمحوں کی طرح چلتا سانس برابر کرتی رہی۔ جب اتھل پھتل ذرا کم ہوئی اور کھڑکی کھلنے پر کسی ردِ عمل کا اظہار بھی نہ ہوا تو اس نے اندر جھانکنے کی ہمت کی۔ سامنے رزاقی کا بستر بالکل سونا پڑا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو ذرا بلند کیا اور ڈرتے ڈرتے کمرے میں دائیں بائیں جائزہ لیا۔ کمرہ خالی تھا۔ وہ بری طرح چونکی۔ اس کی نظر دیوار گیر کلاک پر پڑی جہاں رات کے ڈھانچے بج رہے تھے۔

رزاقی بابو اس وقت کہاں ہیں؟ اس وقت وہ بی بی یا مونس بابو کے پاس تو ہونے لگے۔ کیونکہ مونس بابو نے اسے بتایا تھا کہ وہ لوگ کسی بھی ضرورت اور کام کے سلسلے میں رزاقی کے کمرے میں خود جانا مناسب سمجھتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ اسے اپنے پاس بلایا جائے۔ اور پھر رات کے اس پہر اگر ان کا بی بی

ہوئے سردیوار کے ساتھ لگا دیا۔ پھر وہ ایک کھٹکے کی بلکی سی آواز تھی جس نے اس کے سارے حواس کو ہوشیار کر دیا۔ چونکہ اس نے آواز کی سمت دیکھا اور اس کی کنپٹیاں آگ کی طرح دھک اٹھیں۔ بیلا کے کھن میں سر تا پایہ لبادے میں ملبوس ایک سایہ اس کی نگاہوں کے احاطے میں آ گیا۔ وہ دروازے کے قریب کھڑا تھا۔ دروازہ کھول کر ایک بار اطمینان کے لئے دائیں بائیں دیکھا اور باہر نکل گیا۔ پروین کے پاس سوچنے کا وقت نہ تھا۔ اس نے ایک دم اپنی جگہ چھوڑ دی۔ پیروں میں فلیٹ ہونے کے باعث آواز کا خدشہ بہت کم تھا۔ پھر بھی ممکنہ حد تک احتیاط کے ساتھ دوڑتی ہوئی وہ نیچے آئی۔ کمرے کے بند دروازے کی جانب دیکھا۔ پھر دل ہی دل میں بیٹے کو اللہ کے سپرد کرتی ہوئی وہ آہستہ سے اپنے کوارٹر کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ باہر نکلتے ہی اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ سولنگ کے فرش پر دبے پاؤں چلتا وہ سایہ اسے بائیں ہاتھ آخری کوارٹر کے پاس نظر آیا۔ ایک دم دیوار کے ساتھ چپک کر پروین نے خود کو اس کے مڑ کر دیکھنے سے بچانے کی کامیاب کوشش کی اور سانس روک لیا۔ سائے نے کہیں کہیں ٹھنٹاتے تاروں کی مدھم سی کھر آلود روشنی میں اپنا لبادہ جسم کے گرد سمیٹا اور کوارٹروں کی حد بندی سے نکل گیا۔ پروین نے شال کو جسم کے گرد خوب کس کر لپیٹتے ہوئے کسی تیز رفتاری کی طرح دوڑ لگا دی۔

وہ سینکڑے بھی کم وقتوں میں وہ آخری کوارٹر کے کونے پر پہنچ گئی۔ ذرا سا سر باہر نکال کر اس نے بائیں طرف جھانکا۔ سایہ اس سے پیچھے تین قدم دور چلا جا رہا تھا۔ اب اس کی رفتار میں بہت تیزی آ چکی تھی اور اس کا رخ گاؤں کی غربی سمت تھا۔ پروین کھلی جگہ پر اس کے پیچھے جانے سے ایک پل کو بچکا پانی پھر اللہ کا نام لے کر اس نے قدم بڑھا دیا۔ سایہ اس سے دم بدم دور ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس کی رفتار کافی تیز تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ پروین کو اس کا پیچھا کرتے ہوئے بڑی احتیاط سے کام لینا پڑ رہا تھا کہ کہیں وہ سایہ اس کی آہٹ نہ سن لے۔ تاہم اپنی سی کرتے ہوئے وہ مناسب فاصلے سے اس کے پیچھے بچ بچا کر چلتی رہی۔ پھر تقریباً پانچ منٹ چلتے رہنے کے بعد وہ سایہ جب ایک میدان میں داخل ہوا تو پروین کا سارا جسم سنسناتا اٹھا۔ گاؤں آتے ہوئے اس نے اس جگہ ”ہندو بستی“ کا بورڈ اپنی آنکھوں سے پڑھا تھا۔

اس وقت وہ جس جگہ موجود تھی وہ کھیتوں کے پار مسجد سے تقریباً دو فرلانگ دور مگر عین اس کے سامنے ایک ٹوٹے پھوٹے مکان کا کھنڈر تھا۔ وہ اس کی اوٹ میں ہو گئی۔ اگر اسے ایک پل کی بھی دیر ہو جاتی تو سایہ اسے دیکھ لینے میں کامیاب ہو جاتا۔ ایک دم ہی اس نے پلٹ کر نظریں چاروں طرف دوڑائی تھیں۔ پھر اطمینان بھرے انداز میں وہ آگے چل پڑا۔ ایک ٹانے کے بعد پروین بھی اپنی جگہ سے نکلی اور دبے پاؤں اسی طرف چل پڑی جس طرف وہ سایہ تیز رفتاری سے میدان پار کر کے ایک ایسی عمارت کی طرف جا رہا تھا جو بیحد مختصر تھی۔ شاید ایک دو کمروں پر مشتمل ہوگی مگر پروین کے لئے قریب جا

کو کھنگالنے لگی۔

اسے شک تھا کہ ہندو بستی میں جانے والا سایہ بیلا کے کوارٹر ہی سے روانہ ہوا تھا مگر وہ تھا کون؟ یہ سوچ سوچ کر اس کا دماغ پلپلا ہورہا تھا۔ سوچ کا محور دوسری الجھن یہ تھی کہ اس سائے پر جب اس کی پہلی نگاہ پڑی تو وہ دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ اب یہ اس نے نہیں دیکھا تھا کہ وہ سایہ بیلا کے کمرے سے نکلا تھا یا باہر سے اندر آیا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ جب پروین دوسری جانب کے کوارٹروں کا جائزہ لے رہی تھی تو اس دوران وہ سایہ باہر سے اندر آیا اور بیلا کے کوارٹر میں گھوم پھر کر جب واپس جا رہا تھا تو پروین نے اسے دیکھ لیا۔ اگر وہ سایہ باہر سے آیا تھا اور اس کا تعلق بیلا کے کوارٹر سے نہیں تھا تو اسے واپس نہیں آنا چاہئے تھا۔ اور اگر وہ بیلا کے کوارٹر والوں میں سے کوئی تھا تو اسے لوٹ کر یہیں آنا چاہئے تھا۔ مگر کسے؟ بیلا یا کماری کے علاوہ تیسرا کون تھا جو وہاں سے نکلا تھا؟ اپنے سوالوں کو جواب کا لبادہ اوڑھانے کے لئے اب وہ دوبارہ اپنی جگہ بیٹھ کر سردی میں شگورہی تھی۔

کتنی ہی دیر بعد تھک جانے والے پیروں کو سکون دینے کے لئے اس نے بے آواز حرکت کی تو کلائی پر بندھی ٹھنسی سی گھڑی پر نظر ڈالی۔ پتہ چلا کہ اسے یہاں بیٹھے ایک گھنٹہ ہونے کو ہے۔ ایک دم اسے کسی خیال نے چونکا یا تو وہ جھکی جھکی اٹھ کھڑی ہوئی۔ منڈیر سے ذرا پرے جا کر وہ سیدھی گھڑی ہوئی اور مخالف سمت میں جا رہی۔

سیدھا کھڑا ہونے پر منڈیر اس کے سینے تک آتی تھی۔ اندھیرے میں وہاں گھڑی وہ کوئی بھوت پرست ہی لگ رہی تھی۔ اس نے باہر نظر دوڑائی۔ یہاں سے اگر وہ سامنے دیکھتی تو تقریباً آدھ فرلانگ دور حویلی اس کے دائیں طرف تھی۔ اس کا عقی حصہ وہ صاف دیکھ سکتی تھی۔ رزاقی بابو کے کمرے کی کھڑکیاں اس کی نظر میں تھیں۔ اس کے بالکل مقابل تین ساڑھے تین فرلانگ دور مسجد کی عمارت اسے واضح طور پر دکھائی دے رہی تھی۔ اگر وہ ذرا سارخ بائیں طرف پھیر لیتی تو ہندو بستی تک کا حصہ اس کی نظروں کے سامنے عیاں تھا۔ مندر کو وہ بہر حال نہ دیکھ پاتی تاہم مندر کے پہلو میں کھنڈر مکان اسے یہاں سے بھی کسی بھوت گھر جیسا نظر آ رہا تھا۔ اگر وہ کوارٹروں کی چھت کے آخر پر چلی جاتی تو شاید مندر بھی دکھ جاتا مگر اس وقت اسے یہاں سے ہٹنا مناسب نہ لگا۔ اس کام کو اس نے بعد پر رکھا اور کچھ سوچ کر دونوں بازو منڈیر پر رکھ لئے۔ پھر ان پر ٹھوڑی ٹکائی اور نظریں ہندو بستی کی جانب سے باہر کو آتے رستوں پر جمادیں۔ اب اگر کوئی غور سے دیکھتا تو یوں لگتا جیسے منڈیر پر کوئی بڑا سایہ لالہ اونڈھا رہا ہے۔

وہ شال میں مٹی سٹائی کسی فرض شناس فوجی کی طرح سامنے دیکھ رہی تھی اور سوچیں تھیں کہ اس کے دل و دماغ میں شورش برپا کئے ہوئے تھیں۔ کبھی اس کا دھیان اس سائے کی جانب چلا جاتا جو مندر میں جاگم ہوا تھا۔ کبھی اسے رزاقی بابو کا خیال آ جاتا جو اپنے کمرے میں نہیں تھے۔ وہ سایہ کون تھا؟ رزاقی

یا مونس بابو سے ملنا ضروری بھی تھا تو۔۔۔ اس کی نظر کمرے کے دروازے پر جا پڑی اور سوال ادھور رہ گیا۔ جواب مکمل مل گیا۔ دروازے کی اندر سے چنچنی چڑھائی گئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ رزاقی بابو کو یا تو اپنے کمرے میں ہونا چاہئے۔ کمرے میں نظر نہیں آ رہے تو ہاتھ روم میں۔۔۔ مگر ہاتھ روم سے کسی قسم کی آواز نہ آ رہی تھی۔ اسے وہاں کھڑے دس منٹ سے زیادہ کا وقت گزر گیا تھا۔ اگر وہ وہاں تھے تو اب تک رزاقی بابو کا ہاتھ روم سے لوٹ آنا چاہئے تھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ رزاقی بابو کا ہاتھ روم میں نہیں ہیں۔ تو پھر کہاں ہیں؟

اس سوال کا جواب صرف یہ تھا کہ رزاقی بابو کمرے میں نہیں ہیں۔ اور جہاں وہ ہیں اس کے بارے میں وہ کچھ نہ جانتی تھی۔ اس کا سارا جسم ایک بار پھر سنسناتا اٹھا۔ یہاں آتے ہی اسے جس قسم کی صورتحال سے واسطہ پڑ گیا تھا وہ سنسنی خیز اور دلچسپ تو ضرور تھی مگر اندھیرے کے تیسری خطرات بھی تھی۔ یہاں کیا ہو رہا ہے؟ اس بارے میں تو مونس بابو بھی بے خبر تھے وہ بیچاری کیسے جان پاتی۔ اور یہ تو وہ سمجھتی ہی تھی کہ انجان صورتحال میں زیادہ دور تک اندر جانا ہمیشہ نقصان دہ ہوتا ہے۔

اچانک ایک خیال نے اسے بری طرح چونکا دیا۔ اس نے پلٹ کر اس راستے کی جانب دیکھا جس پر چلتے ہوئے وہ اس کے تعاقب میں ہندو بستی تک گئی تھی۔ وہاں بعد نظر تک کسی شخص کے آثار نہ پا کر اسے کسی حد تک اطمینان تو ہوا مگر پھر بھی کم نہ ہوئی۔ وہ دھیرے سے کمرے کی گھڑی کو اپنی پہلی پوزیشن پر لائی اور بچی ڈھلان سے نیچے اتر آئی۔ ادھر ادھر دیکھا۔ پھر تیز تیز قدموں سے اپنے کوارٹر کی طرف چل پڑی۔ اس کے دل میں ایک خیال بری طرح کھلبلی مچا رہا تھا جس کی تصدیق کے لئے وہ اڑی چلی جا رہی تھی۔

تین منٹ بعد وہ پھولے ہوئے سانس کے ساتھ بیلا کے کوارٹر کے دروازے پر آ رہی۔ دائیں بائیں نظر دوڑائی۔ اطمینان ہو جانے پر اس نے آہستہ سے دروازے پر دباؤ ڈالا۔ دروازہ بے آواز کھلتا چلا گیا۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔۔۔ دروازہ بھیڑ کر وہ وہاں سے ہٹی اور بیلا کے کمرے کی گھڑی پر آ رہی۔ گلوں کے درمیان ذرا سا سر جھکا کر اس نے کمرے میں جھانکا۔ سامنے بستر پر کوئی کبل اوڑھے سو رہا تھا۔ شاید کماری۔ ہاں وہ کماری ہی تھی جس کی چھتری بستر کے ساتھ دیوار سے جکھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ رہ گئی بیلا تو وہ آج رات حویلی میں رک گئی تھی۔ وہ تیزی سے اپنے کوارٹر میں چلی آئی۔ اس کا ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کیا۔ دالان پار کیا۔ کمرے کی کنڈی کھولی۔ نائٹ بلب کی مدھم روشنی میں سوئے ہوئے شہزادے پر نگاہ ڈالی۔ پھر اطمینان بھر اسانس لے کر دروازہ بھیڑتی ہوئی دبے پاؤں چھت پر چلی آئی۔ اپنی سابقہ جگہ بیٹھ کر اس نے روزن میں نظر جمائی اور خیالوں

بابورات کے اس پہر کہاں تھے؟ مونس بابو کا شک کس حد تک درست تھا؟ سوال پر سوال اس کی مت مارے دے رہا تھا اور جواب کے نام پر وہ محض اپنا دماغ تھکا رہی تھی جواب شل ہو چکا تھا۔

اس نے سن ہو جانے والے پیروں اور بے جان ہوتی ٹانگوں کا زاویہ بدلنے کے لئے جسم کو حرکت دینا چاہی اور چونک کر رک گئی۔ ایک سایہ ہندو بستی سے باہر آ رہا تھا۔ اس کی رفتار خاصی تیز اور رخ حویلی کی جانب تھا۔ پروین کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سردی لہر سرایت کر گئی۔ اس نے بڑی آہستگی سے ایک پاؤں کا وزن دوسرے پر منتقل کیا اور اس سر تا پایا سیاہ وجود پر نگاہیں جمادیں جو سیدھے راستے سے اس طرف آنے کے بجائے کھیتوں میں اتر گیا تھا۔ پروین کو یقین تھا کہ یہ وہی سایہ ہے جس کا پیچھا کرتے ہوئے وہ مندر تک چلی گئی تھی مگر اب وہ سیاہ لبادے میں ملبوس نہیں تھا بلکہ شاید اس نے کالی چادر یا شال میں بدن چھپا رکھا تھا۔

چلتے چلتے وہ سایہ کھیتوں کے درمیان پگھلنے لگا۔ اس کا رخ مسجد کی طرف تھا۔ چند لمحوں پہلے وہ اپنی جگہ ساکت کھڑا مسجد کو دیکھتا رہا۔ پھر جب چلا تو یوں لگا جیسے اپنے آپ کو گھسیٹ رہا ہو۔ اس کی ساری تیزی ہوا ہو گئی اور کسی نیم مردہ شخص کی طرح سر جھکائے دھیرے دھیرے چلتا ہوا وہ حویلی کی پشت کی جانب آ گیا۔ یہ فاصلہ بمشکل تین چار منٹ کا تھا جو اس سائے نے دس بارہ منٹ میں طے کیا۔ پھر پروین کی آنکھیں اگر حیرت سے پھٹ گئیں تو دل کی دھڑکن ختم جانے کی حد تک سست پڑ گئی۔ سارا بدن بے جان ہو گیا تو اس میں حیرت کی کیا بات تھی؟ حیرت تو سب ہوتی جب وہ ان سب کیفیات سے دو چار نہ ہوتی کیونکہ وہ سایہ عین رزاقی کے کمرے کی درمیانی کھڑکی کے پاس آ کر رکا۔ کھڑکی اندر کو کھولی۔ ادھر ادھر دیکھے بغیر چوٹ تھام کر اپنا آپ بلند کیا۔ کمرے کے اندر داخل ہوا اور کھڑکی بند کر لی۔

پروین کو اپنے دونوں سوالوں کا جواب مل گیا کہ وہ سایہ کون تھا؟ اور رزاقی بابورات کے اس پہر کہاں ہیں؟

☆=====☆=====☆

مونس تب تک کسی بے جان بُت کی طرح ساکت بیٹھا پروین کی جانب تکتا رہا جب تک اس نے اپنی بات ختم نہ کر لی۔

پروین نے خاموش ہو کر خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور مونس کی حالت کا جائزہ لینے لگی جواب بھی خالی خالی نظروں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ چند لمحوں کے اندر اسی سائے کی نذر ہو گئے جس کی تہہ میں نجانے کتنے طوفان دم سادھے پڑے تھے۔ پروین کو نجانے کیوں لگ رہا تھا کہ مونس کی یہ چُپ اس کی اندرونی ٹوٹ چھوٹ کا مظہر ہے۔

پروین کا اندازہ بڑی حد تک درست تھا۔ مونس نے جو کچھ سنا اس پر یقین کر لیا اس کے لئے واقعی مشکل ہو رہا تھا۔ رزاقی اس طرح بھگ جائے گا یہ تو وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ رات کے اندھیرے میں ہندو بستی کے مندر میں وہ یقیناً سوامی دھیرج داس سے ملنے گیا ہوگا۔ اب یہ پہلی بار ہوا تھا یا وہ اس سے پہلے بھی وہاں جا چکا تھا؟ اس کے بارے میں کوئی کیا کہہ سکتا تھا۔ دوسری بات جس کا اسے پورا یقین تھا یہ بھی کہ رزاقی سوامی سے صرف اور صرف راجیہ کے سلسلے میں ملنے گیا ہوگا۔ اور یہ ایسی بات تھی جو اس کے دل میں نشتر اور دماغ میں ٹیس بن کر اتر گئی تھی۔ محبت اس کے لئے ناقابل فہم جذبہ نہیں تھا مگر نفس کی خاطر ایمان کو داؤ پر لگا دینا اس کے لئے رزاقی کے حوالے سے بہت تکلیف دہ خبر تھی۔ وہ خود کو رزاقی کا سایہ کہتا تھا مگر حالات نے اس کی نفی کرنے کی ایک ایسی کوشش کی تھی جس کا گھاؤ مونس کو روح پر محسوس ہوا۔

”صاحب جی۔۔۔“ کتنی ہی دیر گزر گئی تو پروین نے اسے ہوش و حواس کی دنیا سے آواز دی۔ وہ چونکا اور بڑی آہستگی سے پروین کی جانب نگاہ اٹھائی۔ ”آپ ایک دم بہت پریشان ہو گئے۔“ وہ اسے حوصلہ دیتی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی تو اسے اپنی آواز کھوکھلی اور بے تاثیر لگی۔

”پریشان۔۔۔“ مونس نے دھیرے سے دہرایا۔ ”نہیں تو پروین۔ پریشان نہیں“ میں بے وزن ہو گیا ہوں۔“ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس کا جی چاہا کہ وہ کہے۔ ”یہ محبت کیا چیز ہے پروین جو

مجھے مونس کہہ کر بلاؤ۔ زیادہ ہی ادب کرنا ہو تو سب کی طرح مونس بابو کہہ لو مگر یہ صاحب جی۔۔۔“
”جی صا۔۔۔“ کہتے کہتے پروین رک گئی پھر ذرا سا جھینپ کر بولی۔ ”مونس بابو۔“

”ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔“ مونس نے اسے شاباشی کی نظروں سے دیکھا۔ ”تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ تم نے بتایا کہ جو سایہ بیلا کے گھر سے ہندو بستی کی جانب روانہ ہوا تھا، تمہیں شک ہے کہ وہ رزاتی ہی تھا۔ میں یہ سوچتا ہوں کہ اگر وہ رزاتی ہی تھا تو وہ بیلا کے ہاں کیا کر رہا تھا؟ کیا وہ وہاں صرف گھومنے پھرنے کے لئے گیا تھا؟ ہرگز نہیں۔ رزاتی کا وہاں کوئی کام نہیں تھا پروین۔ وہ سایہ رزاتی کا نہیں تھا۔ اس پر سوچتا ہوں تو ذہن میں کچھ اور الجھنیں کھڑی ہو جاتی ہیں۔۔۔ اور انہی الجھنوں میں میرے اس سوال کا جواب چھپا ہوا ہے کہ اگر بلکہ یقیناً وہ سایہ رزاتی کا نہیں تھا جو بیلا کے ہاں سے روانہ ہوا تو پھر وہ سایہ کس کا تھا؟“

”اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا مونس بابو۔“ پروین سوچ زدہ آواز میں بولی۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میرا ذہن ابھی تک اس ادھیڑ بن میں پھنسا ہوا تھا کہ میں نے جب اس سائے کو دیکھا تو وہ دروازے کے قریب تھا۔ میں سمجھی کہ وہ اس وقت باہر سے اندر آیا جب میں دوسری طرف کا جائزہ لے رہی تھی اس لئے اسے اندر داخل ہوتا نہ دیکھ سکی اور جب وہ واپس جا رہا تھا تب میری نگاہ اس پر پڑی مگر اب آپ کی بات پر غور کرتی ہوں تو یقین ہو رہا ہے کہ وہ سایہ پہلے سے اسی گھر میں موجود تھا اور اپنے وقت پر وہاں سے ہندو بستی کے لئے روانہ ہوا۔ ایک اور بات بھی ہے جو آپ کے شبے کو تقویت دیتی محسوس ہو رہی ہے۔ اور وہ یہ کہ جو سایہ بیلا کے گھر سے نکلا اس کی اور رزاتی بابو کی جسامت میں کچھ فرق تھا۔ پھر رزاتی بابو اس کی طرح برقع نمالبادے میں ملبوس نہیں تھے۔ وہ صرف کالی چادر لپیٹے ہوئے تھے۔ کپڑے ان کے گہرے رنگ کے ضرور تھے مگر ان کے جسم پر برقع یا چٹن نہیں تھا۔“

”بس۔۔۔“ جوش سے مونس نے بائیں ہاتھ کا مکا دائیں ہتھیلی پر مارا اور پروین کی جانب انگلی دراز کی۔ ”یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ وہ رزاتی نہیں تھا۔ بیلا کا میں پتہ کرا چکا ہوں وہ رات بھر چلی میں بی بی کے پاس رہی۔ کماری کا تم بتا رہی ہو کہ بستر پر سو رہی تھی تو پھر وہ کون تھا جو بیلا کے گھر سے نکل کر ہندو بستی کے مندر میں گیا؟ اگر اس بات کا علم ہو جائے تو الجھن کا حل سامنے آ جاتا ہے۔۔۔“

”مگر اس کا پتہ کیسے چلے گا مونس بابو۔۔۔“ پروین کے لہجے میں حیرت اور تجسس دونوں کا رنگ بہت گہرا تھا۔

”اب میں خود اس معاملے کو دیکھوں گا پروین اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہونے میں دیر اس لئے نہیں لگے گی کہ تمہاری ایک رات کی محنت نے میرے سارے فاصلے ختم کر کے مجھے اس نادیدہ دشمن کے در پر لا کھڑا کیا ہے جس کے بارے میں جاننے کا بس ایک ہی طریقہ ہے۔ مسلسل اور چوکی ٹھیکری پہرہ جیسی

انسان کو عرش سے فرش پر لا پھینکتی ہے۔۔۔ مگر نہیں۔ یہ محبت نہیں۔ یہ کچھ اور ہے۔ شاید گمراہی اسی کا نام ہے۔ محبت تو خدا کی سنت ہے۔ رسول کا حکم ہے۔ وہ انسان کو بستی میں کیسے لا کھڑا کر سکتی ہے۔ یہ محبت نہیں، نفس کی وہ چال ہے جو کسی بھی ایسے جواری کو بالآخر چاروں شانے چت کرنے پر قدرت رکھتی ہے جس کا اپنے آپ پر سے اعتماد اٹھ جائے۔ عقائد کمزور ہو جائیں تو بے یقینی کی دیمک بڑی تیزی سے ایمان کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیتی ہے یہ میں نے آج سنا۔ یہ میں نے آج دیکھا پروین۔۔۔“

مگر وہ آنسوؤں سے لبالب آنکھیں جھپک کر رہ گیا۔ اس کے رخساروں کو تر ہوتا دیکھ کر پروین کا چہرہ ایک دم اتر گیا۔ اس نے جلدی سے سر جھکا کر نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا۔ نجانے کیوں اس کا اپنا جی چاہ رہا تھا کہ وہ چیخ چیخ کر روئے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ رزاتی مندر میں کیا کرنے گیا تھا مگر یہ وہ سمجھ گئی تھی کہ بات ایسی ہی انہونی اور ناقابل برداشت ہے جس نے مونس جیسے دل گردے کے آدمی کو زلادیا۔ ”بہر حال پروین۔۔۔“ رومال سے آنکھیں خشک کرتے ہوئے مونس نے خود کو سنبھالا۔ ”تم نے جو کر دکھایا“ میں شاید خود اتنی جلدی وہاں تک نہ پہنچ پاتا۔ تمہارے اس احسان کے لئے میں۔۔۔“

”میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا صاحب جی۔۔۔“ جلدی سے کہہ کر پروین نے نظر اٹھائی اور مونس کے چہرے پر حیرت کی لہر دوڑی۔ ”مجھے یہ بتائیے کہ اب کیا کرنا ہے؟“
”اب۔۔۔“ مونس نے رومال تھم کر کے جیب میں ڈالا اور اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”پہلے تو مجھے یہ سوچنا ہے پروین کہ اب تک بیلا مجھے سب اچھے کی رپورٹ کیسے دیتی رہی؟“ وہ کمر پر ہاتھ باندھ کر کمرے میں ٹپکتے لگا۔

”اس میں مجھے بیلا کا قصور نظر نہیں آتا۔“ پروین نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”جس طرح رزاتی بابو رات کی خاموشی میں چپ چاپ کھڑکی سے کود کر ہندو بستی میں چلے گئے اور لوٹ آئے ان کے کمرے کے دروازے کی باہر کی جانب کے لوگ تو ساری رات یہی سمجھتے رہتے ہوں گے کہ وہ اندر سو رہے ہیں۔ پھر یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ کل رات سے پہلے بھی وہ وہاں جاتے رہے ہوں گے۔ ممکن ہے کل رات وہ پہلی بار ہی وہاں گئے ہوں۔“

”تمہاری باتوں میں وزن ہے پروین۔“ مونس نے اس کی باتوں کو غور سے سنا اور بدستور ٹپکتے ہوئے کہا۔ ”اور ویسے بھی اب یہ ثانوی درجے کی بات ہوگئی ہے کہ بیلا اصل صورتحال سے واقف تھی یا نہیں؟ اصل سوال اور ہے جس پر میری سوچ کی سوئی انک گئی ہے۔“

”وہ کیا صاحب؟“ پروین نے پوچھا۔
”ایک منٹ۔۔۔“ مونس نے رک کر اس کی جانب نگاہ کی۔ ”ایک تو تم مجھے یہ صاحب جی کہنا چھوڑ دو۔ اس سے بڑی غیریت کی بو آتی ہے۔ میں تمہیں پروین کہتا ہوں۔ تمہارا نام لیتا ہوں۔ تم بھی

اور ورم آلود ہیں۔
”مونس بابو۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟“ ناشتہ لگا کر وہ میز سے دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔

”ہاں۔۔۔ کیا ہو گا میری طبیعت کو؟“ مونس نے اس کی جانب دیکھا پھر نظریں چرائیں اور چائے کا کپ اپنی طرف سرکایا۔

”کچا کھ رہے ہیں آپ؟“ بیلا نے بڑے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

”میں تم سے جھوٹ کیوں بولوں گا بیلا۔“ مونس نے چائے کا کپ لیا۔

”مونس بابو۔ آپ نہیں تو پھر آپ کی آنکھیں جھوٹ بول رہی ہیں۔“ بیلا نے آہستہ سے کہا اور اس کے چہرے پر نظر جمادی۔

”کیا مطلب؟“ مونس چونکا اور کپ واپس میز پر رکھ دیا۔

”آنکھیں یا تو رت جگے سے سرخ ہوتی اور سوچ جاتی ہیں یا کسی اپنے کی وجہ سے آنسو بہانے اور یا پھر آنسو پینے کی کوشش میں۔۔۔ چوتھی کوئی وجہ میرے علم میں نہیں ہے۔ اگر ہے تو آپ بتا دیجئے۔“ بیلا نے بڑی نرمی سے کہا۔

”پگلی ہوتی۔“ مونس ہولے سے ہنسا۔ پھر ایک دم ہی اس کا جی پھر آیا۔ اس کا اپنا ایک ہی تو تھا اس کا اپنا جو اس سے دور بھاگا جا رہا تھا۔ رزاقی کا خیال کیا آیا مونس کے لئے آنسو ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے اپنی سیٹ سے اٹھا اور کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔

بیلا کا رنگ ایک دم سرسوں جیسا زرد پڑ گیا۔ مانو کسی نے اس کا سارا لہو نچوڑ لیا ہو۔ اس کا دل سینے میں دھڑکنا بھول گیا۔ اس کے مونس بابو نے اس کے آنے سے پہلے آنسو بہائے تھے اسے علم ہو گیا۔ اس کے مونس بابو کی آنکھوں میں اب پھر آنسو تھے وہ جان چکی تھی۔ ایک آگ کی لہر تھی جو ایک دم اس کے دماغ سے نکلی اور سارے جسم میں آتش فشاں کے بلاوے کی طرح پھیلتی چلی گئی۔

”مونس بابو۔۔۔“ بیلا کے کپکپاتے لبوں سے سرگوشی سی نکلی۔

”پلیز بیلا۔۔۔ اس وقت تم چلی جاؤ۔ برتن بعد میں لے جانا۔“ مونس نے اپنی جگہ کھڑے

کھڑے پلٹ کر دیکھے بغیر اس کی جانب بازو دراز کر کے اسے جانے کا اشارہ کیا۔

”جی مونس بابو۔۔۔“ بیلا کا جگر خون ہو گیا۔ وہ ایک پل اور نہ رکی۔ ہونٹ کاٹتی ہوئی پلٹی اور کسی

گولے کی طرح چکر اکر کرے سے نکل گئی۔ باہر نکلتے ہوئے اس کے کانوں میں مونس کی ہلکی سی سسکی کی آواز گچھلے ہوئے سیسے کی طرح اترتی چلی گئی۔ وہ کسی طرف دیکھے بغیر جیسے بھاگتی ہوئی اپنے کوارٹر کو جانے والے راستے پر ہوئی۔

گمراہی۔ بس۔۔۔ مجھے صرف اپنے ناویدہ دشمن کے دروازے پر دستک دینا ہے۔ دروازہ کھولنے والا اپنا چہرہ مجھ سے کیسے چھپا سکے گا یہ سوچنے کی مہلت میں اسے نہیں دوں گا۔“ مونس کی آواز کا اتار چڑھاؤ اس کے اندرونی جذبات کا غماز تھا۔ اس کے اندر تو صرف اور صرف رزاقی کو اس کھائی میں گرنے سے بچانے کی دھن سمائی ہوئی تھی جسے رزاقی منزل کا آخری زینہ سمجھ کر اس کی جانب آنکھیں بند کر کے بھاگا چلا جا رہا تھا۔

”تو اب میرے لئے کیا حکم ہے؟“ پروین نجاب نے کیوں چاہتی تھی کہ مونس اب بھی اس کے ذمے کوئی کام لگائے۔ ایک تو اسے اس سنسنی خیز صورتحال میں مزہ آنے لگا تھا۔ دوسرے وہ اپنے محسنوں کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا چاہتی تھی۔

”میں جانتا ہوں پروین تم فوری طور پر اس معاملے سے الگ نہیں ہونا چاہتیں۔“ مونس نے اسے ممنونیت سے دیکھا۔ ”مگر تم جو کر چکی ہو تمہیں اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہے۔ تمہارے آنے پر میں نے جو یہ محسوس کیا تھا کہ تم میرے لئے اللہ کی طرف سے غیبی مدد کا سامان ہو تو وہ غلط نہیں تھا۔ اس لئے تم خود کو بالکل فارغ نہ سمجھو اور اپنی رات کی ڈیوٹی رہو بلکہ اب تمہیں زیادہ چوکس ہو کر جاگنا ہو گا۔ مجھے نجاب نے کیوں لگ رہا ہے کہ بہت جلد ہم اس سارے گورکھ دھندے سے نجات پانے والے ہیں۔ میری چھٹی حس کا اشارہ ہونہ وہ یہ میری تیسری آنکھ کا پیغام ضرور ہے پروین۔ اور میری تیسری آنکھ جب جب جاگ رہی ہے انہوئیاں وارد ہوتی ہیں۔ بس تم یہ دعا کرو کہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی انہوئی ہمارے حق میں ہو۔“

”آمین۔“ میا اختر پروین کے لبوں سے نکلا۔ پھر اس نے اجازت طلب نگاہوں سے مونس کی جانب دیکھا۔ ”تو اب میں چلوں؟“

”ہاں۔“ مونس نے جواب میں کہا۔ ٹھیک اسی وقت دروازے پر باہر سے دستک دینے کی مانوس آواز ابھری۔ مونس اپنی جگہ پر ٹھٹھک گیا۔ ”لیس۔۔۔“

دوسرے ہی لمحے دروازہ کھلا اور بیلا لبوں پر مخصوص مسکراہٹ سجائے ناشے کی ٹرائی دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

”سمسکار مونس بابو۔“ اس نے ٹرائی میز کے قریب روکتے ہوئے ہاتھ جوڑے۔ جواب میں مونس نے اسے بغور دیکھتے ہوئے ہلکا سا سر ہلا دیا۔ بیلا نے مسکراہٹ کی ایک لہر پروین کی جانب بھی اچھالی جو جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اسے نجاب نے کیوں لگا کہ بیلا زبردستی مسکرا کر ان کی کوشش کر رہی ہے۔

”اچھا مونس بابو۔ اللہ حافظ۔“ پروین نے سلام کیا اور کمرے سے نکل گئی۔

”اللہ حافظ۔“ مونس نے دیر سے کہا اور اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔ بیلا نے اس کے سامنے ناشتہ چٹا اور سارا وقت اس کے چہرے کی جانب دیکھتی رہی۔ اسے لگ رہا تھا کہ مونس کی آنکھیں سرخ سرخ

☆=====☆

”یہ کیسے ہو سکتا ہے سر؟“ سوامی دوسری طرف سے بات سن کر بھونچکا رہ گیا۔ ”میں تو ابھی تک ان کے انتظار میں ہوں۔۔۔ مجھ سے انہوں نے رابطہ ہی نہیں کیا تو میں کیسے جان لیتا کہ وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں؟“

”ان دونوں کو یہاں سے روانہ ہوئے آج ساتواں دن ہے سوامی۔“ ایک دنگ آواز نے سوامی کے کان سے لگے موبائل میں گونج پیدا کی۔ ”اگر وہ تم تک نہیں پہنچے اور کوئی رابطہ بھی نہیں کیا تو اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ وہ دشمن کے ہتھے چڑھ گئے ہیں۔“

”میں۔۔۔ میں۔۔۔“ سوامی ہکلا کر رہ گیا۔ پھر ذرا سنبھلا اور خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔ ”سر۔۔۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ دونوں ہمیں ڈانچ دے گئے ہوں۔“

”ہونے کو سب کچھ ہو سکتا ہے سوامی پرنتو ہم بالکل اندھیرے میں ہیں۔ انہیں سیما پار کرانے کا ذمے دار شوالا پور کا کھیا ہے جو ہمارے پورے بھروسے کا آدمی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ شوالا پور سے ان دونوں کو سیما پار کرانے کا کام اس نے خود کیا۔ سیما پار جانے کے بعد ان کا سفر کیول دو گھنٹے کا تھا اور وہ چوکی پار کر کے خالق نگر میں داخل ہو جاتے۔۔۔ مگر ان دونوں نے سیما پار کرانے کے بعد کھیا سے بھی رابطہ نہیں کیا۔ ان کے پاس جو آلہ ہے وہ تمہاری ڈیمانڈ کے مطابق پہلی ہیپ کے طور پر روانہ کیا گیا تھا۔ اب انہیں پرتھوی کھائی یا آکاش نکل گیا اس بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔“

”میں سمجھ رہا ہوں سر۔۔۔ صورتحال واقعی بڑی سیریس ہے۔ بہر حال میں اپنے طور پر ان دونوں کا پتہ کرانے کی کوشش کرتا ہوں۔ آشا ہے کہ کوئی نہ کوئی کلیو ہاتھ لگ جائے گا۔“

”جلدی کچھ کرو سوامی ورنہ معاملہ اگر پاکستان آرمی تک جا چکا ہے تو سب سے زیادہ تم خطرے میں ہو اور ہم تمہارا نقصان کسی حالت میں سہن نہیں کریں گے۔“

”مجھے لگتا ہے ایسا کچھ نہیں ہے سر۔“ اچانک کسی خیال کے تحت کچھ سوچ کر سوامی نے کہا۔ ”اگر وہ دونوں پاکستان آرمی کے ہتھے چڑھ گئے ہوتے تو اب تک میں یہاں آرام سے نہ بیٹھا ہوتا“ ان کا مہمان بن چکا ہوتا۔۔۔ مگر یہاں دور دور تک ایسے کسی خطرے کے آثار نہیں ہیں۔ اس لئے مجھے دوسری بات زیادہ سچی لگتی ہے کہ وہ دونوں اسلئے سمیت چمپت ہو گئے۔ اسلحہ کی لاکھ کی مالیت کا ہو گا جسے وہ بآسانی یہاں کے سیکرٹری کے ہاتھ بچ کر غائب ہو سکتے تھے۔“

”ہو سکتا ہے۔“ دوسری جانب سے سوچ میں ڈوبی آواز ابھری۔ ”پرنتو وہ دونوں ایسے تھے نہیں سوامی۔ وہ اس سکوڈ کے لوگ تھے جن کے کالر پر سائنڈ کوٹ کیا رہتا ہے تاکہ پکڑے جانے پر وہ اپنی جان دے دیں۔“

”میں آپ کی بات سے سمجھتا ہوں سر مگر دھرم آج کاغذ کے ٹکڑوں کے مقابلے میں بہت ہلکا بک رہا ہے۔ ہندو ہو یا مسلمان سب کی آنکھوں میں نیلے اور سرخ رنگ کی چکا چوند نے طوفان مچا رکھا ہے۔“

”جو کچھ بھی ہوا، ہم اس سے لاعلم ہیں اور یہ ہمارے لئے اچھا نہیں ہے۔ تم اپنے طور پر بڑی احتیاط سے چھان بین کرو اور ہاتھ پیر بچا کر رہو۔ تمہارے لئے پیش آؤ رہیں کہ ذرا سا خطرہ بھی دیکھو تو آپریشن چھوڑ کر اڑ پھو ہو جاؤ۔“

”تھینک یوسر۔۔۔“ سوامی کا پسلیوں کھایا سیدہ اپنی اہمیت کے خیال سے پھول گیا۔ ”اور تم بتا رہے تھے کہ خالق نگر کے مالک کو ہاتھ میں بکھرنے کے لئے تم کوئی خاص طریقہ آزما رہے ہو۔“

”لیس سر۔“ سوامی نے جلدی سے کہا۔ ”پرنتو آپ اس بارے میں مجھ سے ابھی کچھ مت پوچھئے۔ سہ آئے پر میں اس کے بارے میں آپ کو خود ہی سب کچھ بتا دوں گا۔ اس سے تو میں بس ایک سہاٹا چاہتا ہوں آپ سے۔“ سوامی کے دماغ میں بیلا اور کماری کا سراپا ابھرایا۔

”ہاں ہاں۔ بولو کیا بات ہے؟“

”بنارس کے شانتی آشرم میں نینتا نامی ایک کنیا نے دیے تو وہ میرے آڈیوں کی نگاہوں میں ہے مگر میں چاہتا ہوں کہ اس کے سلسلے میں اگر کسی بھی قسم کی صورتحال کو بینڈل کرنا پڑے تو میرے آڈیوں کے لئے آپ کی طرف سے گرین سگنل اوپن رہے۔ اس سلسلے میں کیول اتنا بتا دوں کہ جو کھیل میں یہاں کھیل رہا ہوں اس کے بنیادی کردار کو صرف اس لڑکی نینتا کے کارن ہی میں اپنے بس میں کر پایا ہوں۔“

”اوہ۔۔۔“ دوسری جانب سے جیسے معاملے کی نزاکت کا احساس ظاہر ہوا۔ ”تو ٹھیک ہے۔ تم اپنے آڈیوں سے کہہ دو کہ مجھ سے اسی نمبر پر ایس ڈی ڈی کے کوڈ کے ساتھ جب ضرورت سمجھیں رابطہ کر لیں۔ ان کی ہر ڈیمانڈ پوری کر دی جائے گی۔“

”تھینک یوسر۔۔۔“ سوامی کا چہرہ تہمتا اٹھا۔ ”بہت بہت دھنیو او۔“

”اور کچھ؟“

”نوسر۔ میں بہت جلد آپ کو ان دونوں کے بارے میں کال کروں گا۔“

”اوکے۔ اور اینڈ آل۔“ دوسری جانب سے رابطہ کاٹ دیا گیا۔

سوامی نے موبائل آف کیا اور اسے کرتے کی جیب میں ڈال لیا۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھا اور کوٹھڑی سے نکل آیا۔ اپنی گدی پر بیٹھا پنڈت اسے دیکھ کر چوکنٹا ہو گیا۔

”پنڈت۔۔۔“ وہ گدی پر آ کر بیٹھتے ہوئے سردمہری سے بولا۔ ”اس نندکار کو بلاؤ فوراً۔ اسے کہو ویر اور دیو کو ساتھ لیتا آئے۔ بہت ضروری کام ہے۔“

”جی مہاراج۔“ پنڈت نے اٹھتے ہوئے دھوئی سنبھالی۔ ”میں ابھی کسی کو بھیج کر انہیں بلواتا ہوں۔“ وہ تھلھلتا ہوا خارجی دروازے کی طرف بڑھ گیا جس کے باہر ڈھلتی دوپہر کی زرد زرد چھیلی نظر آرہی تھی۔

آدھ گھنٹے بعد نندکار ویر اور دیو کو لئے حاضر ہو گیا۔ سوامی نے بغیر کسی تمہید کے بات شروع کی جو اس کے اندرونی اضطراب کی نشانی تھی۔

”تم دونوں بھارت ماتا کے نام پر ایک چھوٹا سا کام کر سکو گے؟“ سوامی نے اپنے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھے ویر اور دیو پر نظر ڈال کر پوچھا۔

”جرو کر کریں گے مہاراج۔“ دیوانے بڑے جوش سے کہا۔ ”بھارت ماتا کے لئے ہماری جان بھی حاجر ہے۔“ ویر نے بھی سر اثبات میں ہلا کر اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔

”ایک بار اور سوچ لو۔“ سوامی کی گہری نظریں ان پر جم گئیں۔

”سوچنا کیا ہے مہاراج؟ آپ حکم دیں کہ ہمیں کرنا کیا ہے۔“ ایک دم ویر کی زبان سے نکلا۔

سوامی کے لبوں پر بڑی بڑی مسکراہٹ ابھری۔ ان دونوں کے پیچھے بیٹھا نندکار بالکل خاموش تھا۔ وہ گیا پنڈت تو وہ کسی چھل گزیدہ بلبل کی طرح سر بہوڑائے سوامی کی ہر بات پر غور کرنے کی اپنی ہی کوشش کر رہا تھا۔

”کام بڑا نازک ہے مترو۔۔۔“ سوامی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”کام ہے کیا مہاراج؟“ ویر نے جیسے الجھ کر پوچھا۔

”کام۔۔۔“ سوامی نے ایک گہرا سانس لیا۔ ”دو آدمیوں کا پتہ لگانا ہے کہ وہ خالق نگر کی سیما سے اندر آتے ہی کہاں غائب ہو گئے؟“ سوامی ان دونوں کو یوں گھور رہا تھا جیسے قصائی ذبح کرنے سے پہلے بکروں کو دیکھتا ہے۔ ”سات دن پہلے وہ سیما پار آئے تھے۔ ایک کا نام نریندر اور دوسرے کا وکرم ہے۔ ان کا کھوج لگانے کے لئے تمہارے پاس زیادہ سے نہیں ہے۔ دو یا زیادہ سے زیادہ تین دن کے اندر اندر یہ کام ہو جانا چاہئے۔ اب بولو تم یہ کام کر سکتے ہو یا نہیں؟ اور کرو گے تو کیسے؟“ سوامی نے بڑے سرد لہجے میں یوں پوچھا جیسے بازار سے ذال خرید لانے کا حکم دیا ہو۔

”سے بہت کم ہے مہاراج اس کام کے لئے۔“ ویر نے منمننا کر کہا۔

اسی وقت سوامی کا بابا یاں ہاتھ سامنے آیا اور اس نے سرخ نوٹوں کی دو گڈیاں ان دونوں کے سامنے پھینک دیں۔

”اب کیا خیال ہے؟“ وہ اسی برقیلے لہجے میں بولا۔

ایک دم ویر اور دیو کی نظروں میں چمک ابھری۔ ایک دوسرے کی جانب معنی خیز انداز میں دیکھ کر انہوں نے نظروں کا رخ سوامی کی طرف پھیرا۔

”اس کی کیا جرورت ہے مہاراج؟“ دیوانے تکلفا کہا۔

”اسی کی تو ضرورت ہے دیو۔“ سوامی نے طنز سے جواب دیا۔ ”یہی تو ہے وہ شستر جو سے کی ڈور بھی کاٹ دیتا ہے۔ کیوں میں نے سچ کہا ناں؟“

”آپ انتریامی ہیں مہاراج۔“ دیو کی آواز میں انکساری ابھری۔ ”ایسے کاموں میں مایا تو کھرچ ہوتی ہے۔ کسی کو ساتھ ملانے۔۔۔“

”نہ نہ۔۔۔“ ایک دم سوامی نے ہاتھ اٹھا کر تیزی سے کہا۔ ”ہرگز نہیں۔ کسی تیسرے کو ساتھ ملانے کے بارے میں سوچنا بھی مت۔ اگر ایسا ہی کرنا ہوتا تو مجھے کیا پڑی تھی تم لوگوں سے بات کرنے کی۔ میں کسی بھی باہر کے آدمی سے مطلب نکال لیتا۔ یہ کام ایسے گہت طریقے سے ہونا چاہئے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔۔۔ اور یہ کام صرف تم دونوں کرو گے۔۔۔ صرف تم دونوں۔ اگر کسی تیسرے کو اس کی بھٹک بھی پڑی تو۔۔۔“ سوامی نے تنبیہی انداز میں ان کی جانب انگلی اٹھائی۔

”جی مہاراج۔“ اس کے لہجے میں بھانے کی دھمکی پوشیدہ تھی کہ ویر اور دیو کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔

”آخری بات۔۔۔ اب اس کام سے پنڈت اچھڑا کر ابھی تمہارے لئے آسکھو ہے۔ اب یہ کام یا تو تم کرو گے یا کسی کام کے نہیں رہو گے۔“ سوامی کا لہجہ خوفناک ہوتا چلا گیا۔ ”اور اس کا کارن یہ ہے کہ میری بات تمہارے کانوں تک چلی گئی ہے۔ اب یا تو ان کانوں کو میرا حکم سننا ہے یا کچھ بھی نہیں سننا۔۔۔ اور ایسے کان تو صرف مردوں کے ہوتے ہیں جو کچھ نہیں سنتے۔ یہ تو تم اچھی طرح جانتے ہوناں؟“

”جی۔۔۔ جی مہاراج۔“ دیو ابکھلایا۔ ویر اس سے پہلے ہی بدم ہو چکا تھا۔

”تو اٹھاؤ یہ سرخ کاغذ اور یہ تپتاؤ تمہیں اور کیا چاہئے اپنا کام پورا کرنے کے لئے؟“

”کچھ نہیں مہاراج۔“ دیوانے ایک گڈی اپنی ڈب میں اڑی اور دوسری ویر کی جانب بڑھادی جسے اس نے جھپٹ کر صدری میں چھپالیا۔ ”اس کام کے لئے میرے دماغ میں ایک ترکیب ہے۔“

”کچھ میں بھی تو سنوں تم کیسے یہ کام کرنا چاہو گے؟“ سوامی نے دلچسپی سے پوچھا۔

”ہم دونوں ڈھور ڈنگر چرانے کے لئے چوکی کے قریب ہی کے ساداب میدان میں جاتے ہیں مہاراج۔ وہاں کے ایک دو پھونجیوں سے ہماری دعا سلام بھی ہے۔ بس باتوں باتوں میں ان سے ٹوہ نکالیں گے۔“ اس بار دیوانے بدھی مان ہونے کا اظہار کیا۔

”ہوں۔“ سوامی اس کی بات پر سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھایا۔ ”فی الحال

لیلا ابرم پار ہے۔ مجھ جیسا منس آپ کی بدھی میں سائی تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ آپ بدھی مان ہیں مہاراج۔
آپ مہا بدھی مان ہیں۔ پنڈت نے جڑے ہوئے ہاتھ ماتھے پر رکھ کر سوامی کی جانب سر جھکا دیا۔
”اور پہلا جواب یہ ہے پنڈت مہاشے۔۔۔“ سوامی اپنی اتنی تعریف سننے کے بعد بھی اسے
معاف کرنے پر تیار نہیں تھا۔ ”کہ جب تم پیدا ہوئے تھے تو تمہیں گڑھتی کیا کسی گدھے کے پیشاب کی
دی گئی تھی؟“

”نہیں تو مہاراج۔“ ایک دم پنڈت نے آنکھیں کھول کر جواب دیا۔ ”پرنتو آپ یہ کیوں پوچھ
رہے ہیں؟“ اس کے چہرے پر حیرت پھیل گئی۔
سوامی نے تو ہاتھ پیٹ لیا اور نند کمار کو اچھو لگ گیا۔ ہنسی روکنے کی ناکام کوشش نے اسے جھوٹی
کھانسی کا مظاہرہ کرنے پر مجبور کر دیا۔

”ہے رام۔۔۔“ سوامی نے لا چاری سے کہا تو نند کمار کی کھانسی اور تیز ہو گئی۔
”ارے۔۔۔ نندو تمہیں کیا ہو گیا۔ ٹھہرو میں تمہارے لئے پانی لاتا ہوں۔“ پنڈت نے اٹھنا چاہا
۔ پھر جیسے اسے کچھ خیال آ گیا۔ ”پرنتو میں کیوں جاؤں؟ تم جا کر باہر پڑے گھڑے سے گھد پانی پی لو
ناں۔“ وہ واپس اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

”میل ٹھیک ہوں پنڈت جی۔ آپ کشت نہ کریں۔“ نند کمار نے کھانسی پر قابو پاتے ہوئے
آنکھوں میں بھر آئے والا پانی آستین سے پونچھا۔ سوامی ماتھے پر ہاتھ رکھے یوں بیٹھا تھا جیسے ذرا بھی ہلا
تو بوا سیر کا خون پھوٹ نہ پڑے گا۔

☆=====☆=====☆

بیلا اپنے کمرے میں حزن و ملال کی تصویر بنی بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔
دراصل ہوا یہ تھا کہ جب وہ ناشتے کی ٹرائی لے کر جا رہی تھی تو اس نے پروین کو نمونس کے کمرے
میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس کا ماتھا ٹھکا۔ صبح ہی صبح اسے نمونس بابو سے کیا کام آن پڑا۔ تجس نے اسے
مجبور کیا۔ اس نے ناشتے کی ٹرائی آفس کے باہر بڑی آہستگی سے روکی اور خود اس طرح دروازے کے
ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی جیسے دستک دینے جا رہی ہو۔

پھر اندر کی ساری گفتگو اس نے سحر زدہ عالم میں سنی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔ پروین
اور نمونس کی ایک ایک بات اس کے کانوں میں اترتی رہی اور وہ خود کو یقین دلاتی رہی کہ وہ جاگ رہی ہے
یہ خواب نہیں۔ آخر میں جب پروین نے رخصت ہونا چاہا تو وہ ہوش میں آئی اور ایک ٹانے کے وقفے سے
اس نے دروازے پر دستک دے ڈالی۔
اتنے کم وقت میں خود کو سنبھالنا ممکن نہ تھا مگر اس نے جیسے تیسے اپنی حالت پر قابو پایا اور دروازہ کھول

اس کے سوا دوسرا کوئی طریقہ پوری بھی سمجھ میں نہیں آ رہا۔ ٹھیک ہے۔ اسی پر عمل کرو پرنتو ہاتھ پاؤں بچا کر
کام کرنا۔ کسی کو تم پر شک نہیں ہونا چاہئے۔“
”اس کے لئے آپ نشت ہو جائیں مہاراج۔ ہم دونوں ایک عرصے سے وہاں جا رہے ہیں۔
وہاں کے پھوجی ہم سے بڑا پریم کرتے ہیں۔ ہمارے ساتھ بھوجن تک کر لیتے ہیں۔ بڑے اچھے لوگ
ہیں مہاراج۔“

”کوئی مسئلہ اچھا نہیں ہوتا۔“ ایک دم سوامی بھڑک اٹھا۔ ”اس بات کو گرہ میں باندھ لو۔ آئندہ
میرے سامنے کسی مسئلے کی تعریف کی تو ٹیٹنوا دوں گا۔“ اس کا لہجہ نفرت آلود ہوتا چلا گیا۔ ”اب نکلو
یہاں سے۔ جیسا میں نے کہا ہے ویسا ہی کرنا۔ ایسی کوئی حرکت یا بات نہ کرنا جس سے وہ مشکوک ہو
جائیں۔ دن بے شک تین کے چار لگ جائیں پرنتو اپنا دھیان رکھنا۔“
”جی مہاراج۔“ وہ دونوں ہٹکاتے ہوئے اٹھ گئے۔ پھر جھک جھک کر ”نمسکار نمسکار“ کا جاپ
کرتے لے پاؤں باہر نکل گئے۔

”مہاراج۔۔۔“ ان کے جانے کے بعد پنڈت نے یوں بے صبری سے کہا جیسے اب تک بڑی
مشکل سے اپنی ہوارو کے بیٹھا تھا۔ ”ایک بات کی مجھے سمجھ نہیں آئی۔“
”باقی سب باتوں کی آگئی کیا؟“ سوامی نے طنز سے پوچھا تو نند کمار نے بڑی مشکل سے ہنسی
روکی۔ پنڈت ہونٹوں کی طرح سوامی کا منہ دیکھنے لگا۔ پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد بھی جب بات اس کے
سر سے گزر گئی تو اس نے اپنا گٹھا ہوا بڑا سا سر ہلایا۔

”باقی تو ساید سمجھ آئی گی مہاراج بس ایک بات رہ گئی۔“
”وہ بھی پوچھ لو مہاشے۔۔۔ ورنہ تم خود سوؤ گے نہ مجھے آرام کرنے دو گے۔“ سوامی نے مجبوری
بھرا سانس لیا۔

”کام تو ایسا مشکل تھا نہیں مہاراج۔ پھر آپ نے ان دو ہچڑھوں کو کیوں سوچا؟ اکیلا دیوا ہی
کا بھی نہیں تھا کیا؟ کھا کھا ڈبل مایا کھرچ کر نا پڑی۔“ پنڈت نے اپنی طرف سے بڑی عقلمندی کی بات کہی۔
”پنڈت۔۔۔ تمہاری بات کے دو جواب ہیں۔ دوسرا جواب میں پہلے دے رہا ہوں پہلا جواب
میں بعد میں دوں گا۔“ سوامی نے بڑے ضبط سے کہا۔ ”اور دوسرا جواب یہ ہے کہ میں نے احتیاط کے طور
پر دونوں کو اس کام کے لئے چننا ہے تاکہ اگر ایک بے وقوفی کر جائے تو دوسرا بات کو سنبھال لے۔“

”اچھا۔۔۔“ پنڈت نے لفظ کو کھینچ کر ادا کیا جیسے بات اس کی سمجھ میں آ گئی ہو۔ پھر اس کے
چہرے پر سوامی کے لئے تحسین کے تاثرات ابھرے۔ وہ اسے یوں دیکھنے لگا جیسے کوئی استاد اپنے ہونہار
شاگرد کو فخر سے دیکھتا ہے۔ ”یہ بات تو میں سمجھ ہی نہ پایا سوامی جی۔ واقعی آپ مہا گیانی ہیں۔ آپ کی

ایسی بات پر راضی نہ ہوگا جو اس کے لئے کرائے پر پانی پھیر دے۔۔۔ اپنے کام سے منہ پھیر کر اس کے لئے مونس بابو کو رام کرنے میں لگ جانے پر وہ کبھی تیار نہ ہوتا۔ حالانکہ اس نے اس سے کہا تھا کہ چند دنوں میں وہ مونس بابو کو اس کی جانب مائل کر دے گا مگر آج اس کی بات کو ابھی دوسرا دن تھا۔ اتنی جلدی اس سے جا کر دوبارہ تقاضا کرنا مناسب نہ تھا۔

تو پھر وہ کیا کرے؟

اس کا من چیخ اٹھا۔

”پگلی ہے ٹو۔“ اچانک کسی نے صدادی۔ وہ ٹھک گئی۔ یہ کون بولا؟ اس نے گھبرا کر سوچا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ وہ اپنے کمرے میں اکیلی تھی۔

”اپنے اندر جھانک بیلا۔ باہر تو مایا جال کے سوا کچھ بھی نہیں ہے پگلی۔“ دوبارہ جیسے کسی نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔۔۔ اور اس بار وہ ٹھنکی نہ گھبرائی۔ کسی سحر زدہ معمول کی طرح وہ بستر پر بیٹھتی چلی گئی۔ اسے پتہ چل گیا تھا کہ یہ کسی کی صدا ہے۔ کون اسے کچھ بتانا چاہتا ہے۔ سمجھانا چاہتا ہے۔

انسان کا باطن اس کا ضمیر اس کے دل کی آواز وہ سچا فریق ہے جو اسے کبھی بھٹکنے نہیں دیتا۔ فریب کھانے اور فریب دینے سے پہلے ایک بار ضرور چلتا ہے۔ اب یہ انسان کی مرضی ہے کہ وہ اس کی بات سنے یا کان آنکھ بند کرے۔

بیلا اس وقت جس صورتحال سے دوچار تھی اس میں اس کا باطن اسے تڑپنا دیکھ کر رہ نہ سکا۔ اسے مزید خود فریبی میں مبتلا دیکھنا اس کے بس میں نہ رہا تو اس نے بیلا کی ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھ کر احساس دلایا کہ وہ اکیلی نہیں ہے۔ اسے سب کچھ سچ سچ بتانے والا اونچ نیچ سمجھانے والا کوئی ہے اور ہے بھی اس کے بھیتر۔ ہر وقت ہر پل ہر گھڑی اس کے ساتھ۔

”تو بہت بھولی ہے بیلا۔“ نرم کوئل اور ملائم سی سرگوشی پھر ابھری تو بیلا نے آنکھیں موند کر سر جھکا لیا۔ وہ کچھ بولنا نہ چاہتی تھی اس آواز کو کون کے کانوں سے سننا چاہتی تھی۔ من کی صدا کون کے کانوں ہی سے سنا جا سکتا ہے اتنا تو وہ بادل ہی سمجھتی ہی تھی۔

”سوامی نے جس طرح تجھے حویلی کے اندر پہنچایا اس میں اس کی تاثرات و دیا کا کیا کمال ہے؟ ایک پختہ دوکان۔ نند کمار کو اس نے دھکا دیا ڈرا کر تیرا پنڈا اس سے چھڑا دیا۔ نندی کی مجبور خرید کر اس کی جگہ تجھے حویلی پہنچا دیا۔ تو سمجھی کہ تو مونس بابو کی باہوں میں اتر آئی پرنتو۔۔۔ کیا اب تک ایسا کچھ ہوا؟ اگر اس کی ودیا ایسی اپرم پار ہے تو اتنے دن گزر جانے پر بھی مونس بابو نے تجھے منہ کیوں نہ لگایا۔ اگر وہ تجھ سے متاثر ہوئے تو تیری بیباک اور ابلتی چلتی پریت کے بے خوف اظہار سے۔ اس پر بھی انہوں نے تجھے کھل کر کچھ دیا نہ تجھ سے کچھ لیا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ تجھے رزاقی بابو کی بھلائی کے لئے اپنی سہانچا کے لئے

کر اپنی کیفیت پر مسکراہٹ کا پردہ ڈالتے ہوئے اندر داخل ہو گئی۔

مونس کو جس حال میں چھوڑ کر وہاں سے لوٹی تھی اس کا خیال ایسا سوہان روح تھا کہ اس کا دل سینے میں کسی زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اسے سوامی کمار کی پنڈت سب کے سب ایسے گدھ لگ رہے تھے جو اس کے مونس بابو اور رزاقی کو نوچ کھانے کی تیاریاں کر رہے ہوں۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اسی وقت مونس کے پاس جائے اور اسے وہ سب کچھ بتا دے جواب تک اس نے سوامی کے کہنے پر رزاقی بابو کے ساتھ کیا تھا اور صرف اس لئے کیا تھا کہ وہ مونس کا قرب پانا چاہتی تھی۔ اسے حاصل کرنے کا خواب بیلا کی آنکھوں میں نور بن کر دمکتا تھا۔ وہ جان دے کر بھی اس کی ہو جانا چاہتی تھی مگر۔۔۔ ایک دم اسے مونس سے کئے ہوئے وعدے کا خیال آ گیا۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جان ہوا ہو گئی۔ جو اس منتشر ہو گئے۔ اس نے تو اب تک اپنے مونس بابو سے اپنے محبوب سے صرف اور صرف فریب کیا تھا۔ اسے تو چاہئے تھا کہ حویلی میں پہنچتے ہی سب سے پہلے مونس بابو کو اس سازش سے باخبر کر دیتی جو سوامی ان سب کے خلاف کر رہا تھا۔۔۔ مگر اس نے ایسا کرنے کے بجائے سوامی کے کہنے پر رزاقی کے جسم میں صرف اس لئے وہ زہر اتارنا شروع کر دیا جو رزاقی کو سوامی کے لئے موم کی ناک بنا دیتا کہ سوامی نے اسے وچن دیا تھا کہ وہ مونس بابو کو اس کا بنا دے گا۔ اپنے جال میں پھانسنے کے لئے اس نے رزاقی کو راجیہ کی آتما کے چکر میں ڈال دیا تھا۔

اس خیال کے آنے ہی ایک دم وہ چونک پڑی۔ پروین اور مونس کی باتوں سے اسے پتہ چلا تھا کہ کل رات کوئی سایہ اس کے کوارٹر سے نکل کر ہندو بستی کے مندر میں گیا تھا۔۔۔ اس سائے کو پروین رزاقی بابو کا سایہ سمجھتی تھی مگر مونس بابو کو اس پر یقین نہیں تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ بیلا کے کوارٹر سے نکلنے والا سایہ کسی اور کا تھا۔ ہاں یہ درست تھا کہ اس سائے کی طرح رزاقی بھی گیا مندر ہی میں تھا مگر اس کے لوٹنے پر پروین چھت سے اتر آئی، یہ سمجھ کر کہ وہ سایہ رزاقی بابو ہی کا تھا۔

وہ اٹھی اور کمرے میں کسی بے چین آتما کی طرح پھرنے لگی۔ اسے کسی کل قرار آ رہا تھا نہ یہ سمجھ آ رہی تھی کہ اب وہ کرے تو کیا کرے؟

کمار کی یہاں رہ کر کیا کر رہی تھی؟ اسے کچھ معلوم تھا نہ اس کا اس سے کوئی تعلق تھا۔ اسے پوچھنے کی اجازت بھی نہ تھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ابھی سوامی کے پاس جائے اور اس سے کہے کہ اس کے مونس بابو کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو روک دے۔ وہ اسے اشک بہاتا نہ دیکھ سکتی تھی۔ اسے سوامی کی تاثرات و دیا پر اتم و شواں تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ سوامی جو چاہے کر سکتا ہے۔۔۔ مگر پھر جس خیال نے اسے اس ارادے سے باز رکھنے کا کام کیا وہ یہ تھا کہ سوامی کے کہنے کے انوسار اس کا کھیل اب اتم پلوں میں تھا۔ اس وقت وہ کسی

کے بدلے پریم پانے کے خیال کو بھلا کر مونس بابو کی داسی بن جاتا ہے۔ انہیں اپنے من مندر کا دیوتا بنایا ہے تو ان سے اپنی تپسیا کا پھل نہیں مانگتا۔ یہ دیوتا کی مرضی ہے کہ وہ تجھے جو بھی دان کر دے۔۔۔ اگر اس سچ پر تیرا دشواں بیٹھتا ہے تو مونس بابو سے پریم کا دعویٰ کر۔ ورنہ اپنی زبان پر یہ پوتر شبد کبھی مت لانا۔ اچھی طرح سوچ لے۔ آج تجھے اپنا فیصلہ خود کرنا ہے۔ اپنا فیصلہ خود کرنا ہے۔ اپنا فیصلہ خود کرنا ہے۔“

آواز کی بازگشت بیلا کو ہلکورے دیتی دھیرے دھیرے دور ہوتی چلی گئی۔

کتنی ہی دیر بعد آہستہ سے بیلا نے سراٹھایا۔ اس کے صبح چہرے پر ایک عجیب سا اجالا دک رہا تھا۔ آنکھوں سے چہرے پر قطرہ قطرہ نمکتی شبنم میں اس کا کھڑا گلاب کے کھلے ہوئے پھول جیسا تروتازہ نظر آ رہا تھا۔ ہونٹوں پر خمار آلود مسکراہٹ کا نشہ کھیل رہا تھا۔

فیصلہ ہو چکا تھا۔

اپنا فیصلہ خود کرتے ہوئے تن کی میلی مگر من کی اجلی بیلا نے تول میں فرق نہ آنے دیا تھا۔ محبت کرنے والے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ بھولے بھالے، ثار ہو جانے والے۔ سیدھے سچے دیکر راگ جیسے۔

☆=====☆=====☆

رزاقی کے لئے وقت گزرا ناگھن ہو رہا تھا۔

وہ جب سے سوامی سے مل کر لوٹا، زیادہ بے چین ہو گیا تھا۔ پہلے تو بات اپنی حد تک تھی۔ امید اور ناامیدی بچپن اور بے چینی کے ساتھ آنکھ چھوٹی کھیلنے گزر رہی تھی مگر اب تو اس نے اپنا آپ داؤ پر لگا دیا تھا۔ راجیہ کے کہنے پر سوامی کی بات مان کر اس نے اپنے ضمیر کو غرض کے بھاری پتھر تلے دبا دینا چاہا تھا۔ اس میں اگر وہ کامیاب رہا تو یہ اس کی بھول تھی۔ اس کی اذہ کی نیند بھی اس سے روٹھ گئی تھی۔ اسے اپنے کئے پر احساس کے جس خنجر نے کچھ کے لگانا شروع کئے وہ اگر ضمیر کی آواز تھی تو اس کی طرف سے کان بند کرنے میں وہ ناکام رہا۔ اگر یہ اس کی فطرت کی تڑپ تھی تو وہ بری طرح اس کا شکار ہو چکا تھا۔ اگر یہ جرم اور گناہ کا ادراک تھا تو وہ خود کو ناقابل معافی مان لینے پر مجبور تھا۔۔۔ لیکن اس سب کے باوجود جب وہ راجیہ کے بارے میں سوچتا تو وقتی طور پر اسے ٹوٹے پھوٹے جواز کی چھاؤں میسر آ جاتی۔ اپنی زندہ درگور ہو جانے کی حالت اسے خود کو مجبور لاچار اور بے بس سمجھ لینے پر آمادہ کر لیتی۔ اپنے خالق سے شکوے شکایت کے اظہار پر اسے اپنا ہر فعل جائز لگنے لگتا۔ ”اسے مر جانے کی حد تک عاجز کر دینے والا اس کا خدا شاید اس طرح اس کے دکھ کا مداوا کر رہا تھا“ اس خیال نے اسے کسی حد تک مطمئن کر دیا۔ وہ یہ سمجھنے لگا کہ شاید اس کے اللہ کو اس پر رحم آ گیا اور اس نے اس کی راجیہ لوٹانے کے لئے اسے سوامی تک پہنچنے کا راستہ دکھایا۔ خود فریبی کا جال اس حد تک اس کی سوچ کے گرد کسا گیا کہ وہ اپنے جرم گناہ اور بد عقیدگی کے ہر

انہوں نے آمادہ کیا۔ یہ تو تیری اپنی تپسیا ہے کہ آج تو حویلی والوں، مونس بابو اور رزاقی بابو کی ضرورت بن چکی ہے پرنتو اس سب میں کہیں بھی سوامی کہاں ہے؟ تو مونس بابو سے محبت کا دعویٰ کرتی ہے۔۔۔ بیوقوف ہے تو۔ کیا محبت کرنے والے لفریبی ہوتے ہیں؟ کیا وہ اپنے محبوب کی سب سے پیاری چیز کو اس سے چھین لیتے ہیں؟ مگر تو تو یہی کر رہی ہے۔ مونس بابو کے لئے دنیا میں اگر کچھ ہے تو رزاقی بابو اور ان کا جیون۔ اور تو ایک دھوگی کے کہنے پر رزاقی بابو کا جیون ہی چھیننے کی کوشش کر رہی ہے۔ تیرا دھرم پریت سبھی پرنتو ان کا دھرم نشت کرنے میں سوامی کا ساتھ دینے کے لئے تو کیا کچھ نہیں کر رہی؟ اور پھر یہ سب کر کے کیا ضمانت ہے کہ مونس بابو تیرے ہو جائیں گے؟ ثبوت پرست ہے اور وہ اس پر کوئی سمجھوتہ نہیں کریں گے، یہ تو جانتی ہے۔ تو ان کے لئے اپنا دھرم تیاگ بھی دے تو کیا ضروری ہے کہ وہ تجھے اپنا لیں؟ نہیں بیلا نہیں۔ خواب دیکھنے سے کسی کو نہیں روکا جاسکتا، تجھے بھی کوئی نہیں روک رہا پرنتو تو اپنے خوابوں کی جو تعبیر چاہتی ہے وہ سمجھو نہیں۔ اور ایک آخری بات۔ کیا تو اپنا یہ سلا پکلا ہوا تن اپنے دیوتا کے چرنوں میں اریں کرنا چاہتی ہے؟ اس تن پر کہیں نندکار کے داغ ہیں تو کہیں سوامی کے دھبے۔ کہیں پنڈت کی سیاہی پوتی ہوئی ہے تو کہیں گاؤں کے کتے ہی اوباشوں کا کچڑا۔ ایسا نہ کر بیلا۔ اپنی پریت کو اس کے بستر کی زینت بنانے کے لئے اپنے محبوب کو دھو کا ندے بیلا۔ فریب نہ دے۔ بگلی اوہ رزاقی بابو کا سایہ ہے۔ اس پر جان دیتا ہے۔ اپنے محبوب کو اس کا محبوب رہیں کر۔ تو اسے نہ پائے اس غم کو اس دکھ کو اپنے محبوب کی خوشی کی خوشبو میں لپیٹ کر اسے ہدیہ کر دے۔ تو رہے نہ رہے تیرا محبوب مرے دم تک تیری یہ جھٹ بے باور کھے گا۔ تجھے یاد رکھے گا۔ جب بھی تیرا خیال آئے گا ناں تو اس کی آنکھ نم ہو جائے گی۔ اور بیلا۔ کتنے بھاگوان ہوتے ہیں وہ لوگ جن کی یاد میں کسی کی آنکھ چمک جاتی ہے یہ تجھے ابھی معلوم نہیں۔ بانوری! چکوری بن جا اپنے چندا کی۔ اس پر مر مٹنے کی رسم ادا کر۔ اس کی طرف اڑتی چلی جا۔ اڑتی چلی جا۔ بے دم ہو کر گرے گی تو شاید وہ تجھے اپنی باہوں میں سنبھال لے۔ اور ”وہ تجھے اپنی باہوں میں بھر لے“ یہ تمنا یوں بھی تو پوری ہو سکتی ہے۔ نکل آ لو بھ کی دلدل سے۔ لو بھیوں کے چنگل سے۔ تو نے اپنے تن کو جس کے نام کر دیا ہے، من کو بھی اسی کے نام کر دے۔ اری بانوری! شرطوں سے بھی کبھی کوئی کسی کو جیتتا ہے۔ غلط کہتا ہے سوامی کہ تو اس کے کام آ تو وہ تجھے مونس بابو دلا دے گا۔ اگر تانتک و دیاؤں سے دل جیتے جاسکتے تو دنیا میں کسی کا دامن اس کے محبوب کے وجود سے خالی نہ ہوتا۔۔۔ اور بگلی! جادو ٹونے سے جسے قابو کر لیا جائے کیا اس کا دل اپنی مرضی سے تیرے لئے دھڑکے گا نہیں۔ کبھی نہیں۔ وہ تو جھوٹ کے جال میں پھنسا ہوا تیرے لئے مسکرائے گا۔ ہنسے گا۔ تجھ سے پیار کے نام پر ناک کرے گا۔ اگر ایک جھوٹ کو پانے کے لئے تو یہ سارے جتن کر رہی ہے تو نہ کر بیلا۔ ان سارے جھوٹ کے پلندوں کو لپیٹ کر طاق میں رکھ دے اور ایک سچ کا دامن تھام لے۔ صرف ایک سچ، اور وہ یہ کہ تجھے ہر لو بھ ہڑلا سچ کے کانٹوں سے دامن چھڑا کر اپنے پریم

دیں۔ چند لمحے کچھ سوچتا رہا جیسے اپنے خیالات کو جمع کر رہا ہو۔ پھر کہا۔

”جب سے یہ سوامی دھیرج داس خالق نگر میں آیا ہے یہاں کی فضا میں کچھ نایدہ ہوائیاں سی چھوٹ رہی ہیں۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن لگتا یہی ہے کہ سرحدی چوکی پر پکڑے جانے والے دونوں آدمیوں کا بھی اس صورتحال سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور تھا۔۔۔ اور واقعہ اچھا ہو یا برا اس کی کھوج سب سے پہلے شک کی بنیاد پر شروع کی جاتی ہے۔“

یہاں مونس کالج ذرا سا بدلا۔ اس نے سامنے بیٹھے تینوں افراد کو بھاری ہوتی آنکھوں سے دیکھا اور تپش آلود آواز میں کہا۔

”تم لوگ جانتے ہو کہ میرے لئے رزاقی کیا اہمیت رکھتا ہے۔ میں اس کے لئے ساری دنیا کو آگ لگا سکتا ہوں۔ اس کی طرف اٹھنے والی آنکھ میرے کسی اپنے کی بھی ہوتو میں پھوڑ دوں۔ ہاتھ میرے کسی سگے کا بھی ہوتو میں توڑ دوں اور خنجر میرا اپنا ہوتو میں اپنے سینے میں بھونک لوں۔“

”سر۔۔۔“ شوکت کا سارا جسم لرز اٹھا۔ نورے اور غلام حسین کا حال بھی اس سے مختلف نہ تھا۔

آپ صاف صاف کہنے ہوا کیا؟ رزاقی بابو خیریت سے تو ہیں ناں؟“ اس کی آواز لرز رہی تھی۔

”ابھی تک خیریت سے ہے مگر۔۔۔“ رک کر مونس نے ہونٹوں پر زبان پھیری پھر ایک پل کی دیر کے بعد کہا ”ناگرم نے ذرا بھی کوتاہی کی تو خیریت نہیں رہے گی۔“

اس کے بعد اس نے پہلے ہولی کے دن کا واقعہ راجیہ کی روئے کار رزاقی کے کمرے میں آنا اور پھر گزشتہ رات کی وہ ساری کارروائی ان کے کانوں میں انڈیل دی جس سے اسے پروین نے آگاہ کیا تھا۔ تاہم پروین کا نام نہ لیا اور اس سے ان تین حکم کے اکوں کو غرض بھی نہ تھی۔ ان کے لئے مونس یا رزاقی کا حکم اہمیت رکھتا تھا اور بس۔۔۔!

”میں روحوں پر یقین تو رکھتا ہوں سر لیکن یہ بیگم صاحبہ کے لوٹ آنے کی بات حلق سے نہیں اترتی۔“ نورے نے مونس کے خاموش ہونے پر کہا۔ غلام حسین اور شوکت نے بھی سر ہلایا جو اس بات کا اظہار تھا کہ وہ بھی نورے سے متفق ہیں۔

”بات اتنی ہی نہیں ہے نورے۔ رزاقی بابو کا رات کے وقت مندر جانا کسی بڑی گہری چال کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ حویلی میں بیگم صاحبہ کی روح کا ان کے کمرے میں آنا اور اس کے بعد رزاقی بابو کا ہندو ہستی جانا۔۔۔ بات ایسی سیدھی نہیں ہے۔“ شوکت نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”اب اس ساری صورتحال کو سامنے رکھتے ہوئے ہمیں سب سے پہلے یہ کرنا ہے کہ ایسا لائحہ عمل اختیار کیا جائے جس سے نہ تو ہمارا سرحدی چوکی کی طرف جانے والے راستوں کا معاملہ ڈسٹرب ہو اور نہ رزاقی کے لئے کوتاہی ممکن ہو۔“

احساس کو اسی ایک خیال کی تھکیاں دے دے کر سلائے لگا۔

جب انسان خود فریبی اور خود غرضی کا جھولا جھولنے لگتا ہے تو اس کی آنکھوں پر اپنے مطلب کی پٹی بندھ جاتی ہے۔ کانوں میں دور کے ڈھول بجنے لگتے ہیں۔ عقل گھاس چرنے چلی جاتی ہے۔ شعور اونگھنے لگتا ہے اور احساس گناہ اس کی طرف سے رخ پھیر لیتا ہے۔

رزاقی بھی شاید اسی کیفیت کا شکار ہو گیا تھا۔ اسے صرف اور صرف راجیہ سے ملاپ کی خوش خیالی نے گھیر لیا۔ سوامی نے اسے یہ کہہ کر ایک کٹھن اور لائٹل سوال کے حوالے کر دیا تھا کہ راجیہ کا جسم پالینے کے بعد وہ اپنوں اور بیگانوں کو اس کی کیا توجیہ پیش کرے گا؟ اس کا جواب اس نے بڑی آسانی سے ڈھونڈ لیا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ راجیہ کو لے کر خالق نگر سے اس ملک سے دور کسی دوسرے ملک چلا جائے گا۔ جہاں اس سے اس بارے میں پوچھنے والا کوئی نہ ہوگا۔ اس کے خیال میں اس مسئلہ کا یہ آسان ترین حل تھا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اس کے ایسے ہر فیصلے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مونس بنے گا مگر اسے ہر قیمت پر مونس اور بی بی کو قائل کرنا تھا کہ وہ جو کر رہا ہے اسے کرنے دیا جائے۔ ہر مخالفت اور ہر اپنائیت کو اس نے اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لینے کی سوچ لی تھی۔ چاہے اس کے لئے اسے سارے رشتے ناٹے توڑ ہی کیوں نہ لینا پڑتے۔

یہ بڑے بڑے رہنما فیصلے تھے جو اس نے رات کی تنہائی میں بے جی اور بیچاری کے زانو پر سر رکھ کر آنسو بہاتے ہوئے لکے اور ان پر قائم رہنے کے لئے دل پر اپنی مظلومیت کا پتھر رکھ لیا۔

☆=====☆=====☆

شوکت نورے اور غلام حسین کے ساتھ مونس اپنے آفس میں بیٹھا تھا۔ باہر ملازم سے کہہ دیا گیا تھا کہ کسی کو بھی آفس تک نہ آنے دے۔ وہ گن سنبھالے آفس کی حدود سے باہر نکل رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کوئی خاص ہی بات ہے جو مونس بابو نے ایسا کہا ہے۔ ورنہ ایسا عام طور پر تو ہوتا نہیں کہ آفس سے دس دس فٹ دور تک کسی کو پر مارنے کی اجازت نہ ہو۔

”میں نے تم تینوں کو ایک خاص مقصد سے اکٹھے یہاں بلایا ہے۔۔۔ مگر اس سے پہلے میں یہ جاننا چاہوں گا کہ تم لوگ جس کام پر متعین ہو اس کی کیا رپورٹ ہے؟“ مونس نے اپنے سامنے بیٹھے ان تینوں پر نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”ابھی تک کسی قسم کا کوئی واقعہ وقوع پذیر نہیں ہوا سر۔“ شوکت نے جواب دیا۔ ”صورتحال پوری طرح ہمارے کنٹرول میں ہے۔“

”گڈ۔۔۔“ مونس نے اطمینان محسوس کیا۔ ”تو اب میں اپنی بات کی طرف آتا ہوں۔“ وہ ذرا سا آگے کو جھکا۔ پھر دونوں ہاتھ شے کی ٹاپ پر رکھ کر انگلیاں آپس میں پھنسا لیں اور نگاہیں ان پر جما

ایک دم اچھل کر کماری بستر پر اٹھ بیٹھی۔ ”آہستہ۔۔۔ آہستہ بولو بیلا۔“ اس کی آواز میں سختی اور سرزنش نے نل کرتلی پیدا کر دی۔ ادھر ادھر نظر دوڑا کر اس نے اطمینان کیا کہ کمرے کا دروازہ اور اکلوتی کھڑکی کے پٹ بند تھے۔ پھر اس نے گہری نظر سے بیلا کی جانب دیکھا۔ ”یہ آج تم کون سی زبان بول رہی ہو؟“

”وہ زبان کماری۔۔۔ جسے مجھے بہت پہلے سیکھ لینا چاہئے تھا۔“ بیلا نے اسی لہجے میں کہا۔ ”مجھ سے تو کہا گیا تھا کہ تم یہاں کسی بہت بڑے کام سے آئی ہو اور اس کے لئے تمہارا میرے پاس رہنا ضروری ہے پرنتو کیا ہے تمہارا وہ کام؟ یہ مجھے ابھی تک معلوم نہیں ہوا۔“

”یہ جاننا تمہارے لئے ضروری نہیں ہے۔“ کماری نے لا پرواہی سے کہا اور بستر سے اتر گئی۔ دروازہ کھول کر باہر گئی۔ صحن کا ایک چکر لگایا۔ پھر واپس کمرے میں چلی آئی۔ دروازہ اس نے تھوڑا سا کھلا چھوڑ دیا اور بستر پر آ بیٹھی۔ کبل ٹانگوں پر ڈال کر اس نے رخ بیلا کی جانب پھیرا اور اسے غور سے دیکھنے لگی۔

”تمہارا بدلا ہوا لہجہ بتاتا ہے کہ تمہیں مجھ سے یا سوامی سے کوئی شکایت پیدا ہو گئی ہے۔ اگر ایسا ہے تو کھل کر کہو بیلا۔ آخر سمیا کیا ہے تمہاری؟“

”سمیا۔۔۔“ بیلا نے دہرایا۔ پھر نچلا ہونٹ اتنے زور سے دانتوں میں دبایا کہ خون پھلک پڑا۔

”سمیا۔۔۔“ اس نے سسکی لی۔ ”سمیا میرے ہونے کی ہے کماری۔ اگر میں نہ ہوتی تو کیا فرق پڑتا اس دنیا کو اور اگر میں ہوں تو کیا فرق پڑا اس دنیا کو۔ میرا ہونا نہ ہونا برابر ہے تو پھر میں کیوں سوامی کے ہاتھوں میں کھلونا بنی ہوئی ہوں۔“ اس کے آنسو دھاروں دھار بہہ نکلے۔

”بیلا۔۔۔“ کماری نے کبل ایک طرف پھینکا۔ لپک کر اپنے بستر سے اتری اور بیلا کے پاس جا بیٹھی۔ اسے اپنے سینے سے لگایا اور اس کے آنسو پونچھنے لگی۔ ”میری جان۔ ہوا کیا؟ کچھ بتاؤ گی تو تمہاری اس کماری کو پتہ چلے گا ناں کہ وہ تمہارے لئے کیا کر سکتی ہے؟ کیا سوامی نے کچھ کہا؟“

جواب میں بیلا نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”نندکار نے۔۔۔“

اس بار بھی اس کا سر نہ میں ہلا۔

”پنڈت۔۔۔“

”نہیں نہیں نہیں۔۔۔“ بیلا نے اس کے سینے پر سر مارا اور ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔ ”مجھے کسی نے کچھ نہیں کہا۔ بس میرے مونس بابو کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ یہ مجھ سے کہن نہیں ہو رہا۔۔۔“

”مونس بابو کی آنکھوں میں آنسو۔۔۔“ کماری کی زبان سے بیساختہ نکلا اور اس نے بیلا کا سر سینے کے ساتھ جھینچ لیا۔ ”مگر کیوں؟“

”آپ کے ذہن میں اگر کوئی پلان ہے تو حکم کیجئے سر۔“ غلام حسین نے زبان کھولی۔

”میرے ذہن میں جو کچھ ہے اس کے لئے ضروری ہے، پہلے مجھے یہ بتایا جائے کہ اگر تم تینوں میں سے کسی کو سرحدی معاملے کی طرف سے ہٹایا جائے تو اس سے وہاں کی صورتحال میں گڑبڑ کا اندیشہ تو نہیں؟“

”نہیں سر۔“ شوکت نے جلدی سے کہا۔ ”ادھر کا معاملہ بڑا چوکس جا رہا ہے۔ وہاں صرف ہم میں سے ایک آدمی بھی نگرانی کرتا رہے تو باقی کے آدمیوں کی مدد سے سب کچھ کنٹرول میں رہ سکتا ہے۔“

”شیور۔۔۔“ مونس نے ان تینوں کو باری باری دیکھا۔

”لیس سر۔“ شوکت ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ غلام حسین نے اس کی تائید کی۔

”تو ٹھیک ہے۔“ مونس نے اطمینان بھرے انداز میں سر کو جنبش دی۔ ”اب یہ سن لو کہ کرنا کیا ہے۔“

”لیس سر۔۔۔“ وہ تینوں آگے کو جھک آئے۔

”نور اسرحدی صورتحال کو دیکھے گا اور تم دونوں۔۔۔“ مونس نے غلام حسین اور شوکت کی جانب انگلی اٹھائی۔

اس کی آواز آہستہ ہو گئی۔ جوں جوں وہ کہتا گیا ہمدن گوش غلام حسین اور شوکت کے ساتھ ساتھ نورے کی کپٹیاں بھی گرم ہوتی چلی گئیں۔ دھڑکنیں تیز ہوئیں اور آنکھوں میں سرخی اتر آئی۔

پانچ منٹ بعد جب وہ تینوں مونس کے کمرے سے نکلے تو ایک ایسے پلان کا حصہ بن چکے تھے جس میں کسی قسم کا جھول نہیں تھا اور جس کی کامیابی کا انہیں ایسا ہی یقین تھا جیسا اپنے ہونے اور رات میں سورج کے نہ نکلنے کا۔

☆=====☆

”کماری۔۔۔“ بیلا نے بستر پر لیٹی کماری کو دیدی اور موسیٰ کے الفاظ سے جدا کرتے ہوئے مخاطب کیا تو وہ چونگی۔ وہ بڑی دیر سے چت لیٹی چھت کو گھور رہی تھی۔ اب جو بیلا نے صدا دی تو وہ اس کے طرزِ مخاطب پر حیران ہو کر اس کی جانب متوجہ ہوئی۔ بیلا اپنے بستر پر گھٹنے کھڑے کئے دیوار سے ٹیک لگائے کبل اوڑھے بیٹھی اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”خیریت۔۔۔؟“ کماری نے اچنبھے سے پوچھا۔ ”نہ موسیٰ نہ دیدی۔ یہ آج سیدھا سیدھا کماری پر کیوں اتر آئیں تم؟“

”اگر میں نے محسوس کیا کہ تم سے کوئی رشتہ قائم رکھنا چاہئے تو ضرور پلٹ کر گزرے کل کی طرف دیکھوں گی کماری۔۔۔ ابھی مجھے صرف یہ بتاؤ کہ تم اور سوامی یہاں کیا کھیل رہا ہے بیٹھے ہو؟“

”یہ میں۔۔۔“ بیلا کا جی چاہا کہ وہ ساری بات اگل دے جو صبح اس نے پروین اور مونس کے درمیان ہوتے ہی سنی تھی مگر پھر ایک دم اس نے زبان کو گانٹھ دے لی۔ کماری ہو یا کوئی اور وہ اب کسی پر اعتبار کرنے کو تیار نہ تھی۔ ”یہ میں نہیں جانتی۔“ اس نے آنسوؤں میں بات بدل دی۔ ”مگر کیا یہ معمولی بات ہے؟“

”نہیں۔ معمولی بات نہیں ہے بیلا مگر اس کا کوئی تو کارن ہوگا؟“ کماری اس کا سر تھپکتے ہوئے سوچ میں ڈوبی آواز میں بولی۔

”کارن یہ ہے کہ وہ رزاقی بابو کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ آج دوسرا دن ہے کہ رزاقی بابو کسی سے نہیں ملے۔ مونس بابو نے ملنا چاہا تو انہیں بھی ٹال دیا۔ حالانکہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ انہوں نے مونس بابو سے ملنے سے انکار کیا ہو۔“

”اوہ۔۔۔“ کماری کے لبوں سے ایک طویل سانس خارج ہوا۔ ”تو یہ بات ہے۔“

”ہاں۔“ بھولپن سے بیلا نے کہا تو کماری کی ہنسی نکل گئی جسے اس نے جلدی سے دبایا۔ ”مگر اس میں میرا کیا قصور ہے پگلی جو تم نے ایک ہی پل میں مجھ سے سارے ناٹے توڑ لئے۔ نہ موسیٰ نہ دیدی۔ میں خالی کماری رہ گئی۔“

”تم تو سب جانتی ہو ناں کہ وہ سوامی کیا کر رہا ہے یہاں۔۔۔ تم یہ بھی جانتی ہو گی کہ رزاقی بابو سے اپنا کام نکالنے کے لئے ابھی اسے اور کتنا سے لگے گا۔ جب تک تمہارا کھیل سماجت نہیں ہو جاتا تب تک میرے مونس بابو کی پریشانی کیسے ختم ہو سکتی ہے۔ اسی لئے میں تم سے بھی ناراض ہوں۔ تم دونوں مل کر جو کچھ کر رہے ہو اس کے بارے میں تم دونوں مجھے کچھ بتانا نہیں چاہتے تو نہ سہی مگر یہ پہلے دن طے ہو گیا تھا کہ میرے مونس بابو کو کچھ نہیں ہوگا اور نہ انہیں پریشان کیا جائے گا۔“

”یہ کس کس کے سچ طے ہوا تھا؟“ کماری نے اس کا سر چٹایا سے پکڑ کر اٹھایا اور اس کی متورم اور بھیگی ہوئی آنکھوں میں جھانکا۔

”میرے اور سوامی کے سچ۔“ بیلا نے دھیرے سے جواب دیا۔

”اور تم نے اس حرامی کی بات پر دوش اس کر لیا۔“ زہر خند کے ساتھ کماری کے لبوں سے نکلا۔

”بیلا۔۔۔ وہ ایسا راکشس ہے جو اپنے مطلب کے لئے اپنی سگی ماں کے ساتھ بھی منہ کالا کر سکتا ہے۔ اس کے لئے ہر رشتہ ہر ناٹہ ایسے کچے دھاگے کے برابر ہے جسے ہلکے سے جھٹکے سے توڑا جا سکتا ہے۔ تم سے کہے ہوئے وجہ کو وہ کیا سمجھتا ہے۔“ نفرت کے مارے کماری کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ”اسے جتنا میں جانتی ہوں اور کوئی کیا جانے گا۔“

”اگر ایسی بات ہے تو تم اس کے ساتھ کیوں ہو؟“ بیلا نے بال اس کی گرفت سے آزاد کراتے

ہوئے پوچھا۔ تاہم اس کی نظروں سے رابطہ ختم نہ کیا۔

”یہ میری مجبوری ہے بیلا۔“ کماری کی آواز ٹوٹ گئی۔ ”اگر مجبوری کی زنجیر میرے پاؤں میں نہ ہوتی تو میں کب کا اسے ترک کی طرف روانہ کر چکی ہوتی مگر۔۔۔ اب بہت تھوڑا سہ رہ گیا ہے اس زنجیر کے ٹوٹنے میں۔ بہت تھوڑا۔“

”کتنا؟“ آہستہ سے بیلا نے پوچھا۔

”شاید ایک رات یا ایک دن۔“ بے خیالی میں کماری کے لبوں سے نکلا۔ ساتھ ہی وہ چونک پڑی۔ شاید اسے اپنے الفاظ سے کسی راز کے افشا ہونے کا احساس ہو گیا تھا کہ اس نے جلدی سے بات بدلنا چاہی۔ ”میرا مطلب ہے۔۔۔“

”رزاقی بابو کے استعمال ہونے کا وقت آ گیا۔ یہی ناں؟“ بیلا نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”آہستہ بیلا۔“ کماری نے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا اور کھلے دروازے سے باہر نظر دوڑا کر رہ گئی۔ ”اس بارے میں کوئی بات مت کرو۔“

”ڈرتی ہو؟“ اس بار بیلا نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”کیا تم نہیں ڈرتیں؟“ کماری نے الٹا اس سے سوال کر دیا۔

”نہیں۔“ بیلا نے لاپرواہی سے کہا۔ ”میں نے سارے ڈر سارے خوف سارے اچھے اتار چھینے ہیں۔ اب تو کھل چھینے کا مزہ آئے گا۔ جب پیار کیا تو ڈرنا کیا؟ اس بات کی کچھ مجھے بہت دیر سے آتی تھی۔۔۔ آگئی۔ تم نے بھی کبھی سے پریم کیا ہوتا ناں کماری! تو آج تم بھی ایسی ہی بے خوف ہو جاتیں جیسی میں ہوں۔“

”یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ میں نے پریم نہیں کیا؟“ دھیرے سے کماری نے کہا اور اس کے ہاتھ کی گرفت بیلا کے بازو پر سخت ہو گئی۔ ”ہو سکتا ہے کہ تمہاری طرح میں بھی اس آگ میں آپ ہی آپ جل رہی ہوں۔“

”کیا سچ؟“ بیلا نے بے اختیار کہا اور اس کے سامنے ہونٹھی۔ اس کے چہرے پر ایک دم بہاری ناچ اٹھی۔ ”تم سچ کہہ رہی ہو کماری۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔“ تھکی تھکی سی آواز میں کہہ کر کماری نے رخ پھیر لیا۔

”مجھ سے نظر ملا کر بات کرو۔ کون ہے وہ؟ کہاں ہے؟ کیا دلی میں؟“ بیلا بچوں کی طرح سوال پر سوال کرتی چلی گئی۔ کماری کی ٹھوڑی پر ہاتھ ڈال کر اس نے اس کا چہرہ اپنی طرف گھمانا چاہا مگر کماری نے آہستہ سے اس کا ہاتھ پرے کر دیا۔

”وہ میری دنیا کا منٹ نہیں ہے بیلا۔“

راستے پر پاؤں دھر دیا۔ میں تو تمہیں روک بھی نہیں سکتی۔
 ”روکنے سے کچھ نہیں ہوگا کماری جی۔“ بیلا پگلوں کے انداز میں مسکرائی۔ ”اب تو چل چلاؤ
 ہے۔ جب سے میں نے یہ گیان پایا ہے ناں تب سے ایک کنارہ ہے جو مجھے اپنی جھولی میں جھولا جھلارہا
 ہے۔ اس نشے سے نکلوں تو کچھ سوچوں اور یہ میں جان گئی ہوں کہ اس نشے سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ہے۔
 کہیں بھی نہیں ہے۔“
 ”بیلا۔۔۔“ کماری نے اس کے بالوں پر ٹھوڑی رکھ کر آنکھیں موند لیں۔ بے اختیار اس کے
 آنسو پھوٹ رہے۔

”بڑا مزہ ہے اس دکھ میں کماری جی کہ تمہارا محبوب تمہارا نہ ہو اور تم اس کی ہو کر مر جاؤ۔ مجھے ایسی
 موت جس بھاء بھی ملے لے لوں۔ اگر تم بھی میری ہی طرح ندی کے اس کنارے جیسی ہو جس کا ملن
 دوسرے کنارے سے اکسمبو ہے تو تم بھی کچھ ایسا ہی کر ڈالو کماری جی کہ خود کو محبوب پر غار دو۔ امر ہو جاؤ
 گی قسم سے۔“

بیلا سرشاری سے کہے جارہی تھی اور کماری کے آنسو تھے کہ قسم ہی نہ رہے تھے۔ وہ سسک رہی
 تھی۔ اس کے سینے میں ایک الاؤ دہک اٹھا تھا۔ بیلا جیسی سیدھی سادی گاؤں کی گنوار چھو کر ہی نے اسے
 وہ گیان دان کر دیا تھا جس کے آگے ساری دنیا کی دیا بچ تھی۔

”کماری جی۔۔۔“ بیلا نے سراٹھایا۔
 ”کیا کماری جی کماری جی کہہ کر اپنے اور میرے بیچ دیوار کھڑی کرتی جارہی ہے۔ مجھے کماری
 دیدی کہہ۔ مجھے موسی دیدی کہہ۔۔۔ با نوری! میں بھی تیرے ہی جیسی جل مرنے والی ہوں۔۔۔ میرا
 پریتم بھی میری اصل سے انجان ہے۔۔۔ مگر آج میں تیری قسم کھاتی ہوں بیلا۔ سے آیا تو اس کی مرتیو کی
 مالا اپنے گلے میں پہن لوں گی مگر اس پر آج نہ آنے دوں گی۔“

”ہاں۔۔۔“ بیلا نے اسے مخمور نگاہوں سے دیکھا اور ایک الیسی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”اب تم
 میری کماری دیدی ہو۔ موسی دیدی ہو۔ میں جانتی ہوں کہ پریم دیوانے جھوٹی قسم نہیں کھایا کرتے۔ مجھے
 تمہاری قسم پر اعتبار ہے کماری دیدی۔“ وہ بے دم سی ہو کر اس کی باہوں میں جھول گئی۔

”بیلا۔۔۔“ کماری نے اسے سنبھالا اور بستر پر لٹا دیا۔ بیلا کی حالت سے یوں لگتا تھا جیسے اس
 نے کئی جام شراب کے چڑھار کھے ہوں۔ وہ کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ کماری نے کمبل اس کے جسم پر برابر کیا
 اور کان اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

”میرے مونٹس بابو کی آنکھوں میں آنسو تھے۔۔۔ میں انہیں روتا ہوا نہیں دیکھ سکتی کماری
 دیدی۔ ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھنے سے پہلے میں مر کیوں نہ گئی۔ مر کیوں نہ گئی۔“

”کیا آتما ہے کوئی؟“ چل کر بیلا نے پوچھا۔
 ”شاید۔۔۔ ہم دونوں میں سے ایک ضرور کسی دوسری دنیا سے تعلق رکھتا ہے۔“ وہ اسی لہجے میں
 بولی۔۔۔ ”خیر چھوڑو۔ تمہیں اس سے کیا؟ تم اپنی کہو۔ اب تو بڑے بڑے زرنے لینے لگی ہو۔ کیا مل
 گیا؟“ وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔
 ”گیان۔۔۔“ بیلا نے آنکھیں موند لیں۔ ہاتھ جوڑ کر سینے پر رکھ لئے اور غماز آلود لہجے میں
 کہا۔ ”اپنے ہو کر بھی نہ ہونے کا گیان۔ کسی کے سب کچھ ہونے کا گیان۔“
 ”کیا بات ہے بیلا رانی؟ کیا مونٹس بابو نے چھو لیا؟“ کماری نے اس کی جانب عجیب سی نظروں
 سے دیکھا۔

”ایسا ہمارا سو بھا گیا کہ؟“ بیلا نے آنکھیں کھولیں اور ان میں تیرتی نمی ایک دم ابل پڑی۔
 ”یہ تو خوش نصیبوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے کہ ان کا محبوب انہیں چھو لے۔ انہیں سو بھار کر لے۔ اور کچھ نہیں
 تو انہیں پیار سے دیکھ ہی لے۔“
 ”بگلی۔۔۔ تم کہنا کیا چاہتی ہو میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔“ کماری الجھ گئی۔ ”جو کہنا ہے کل کر
 کہو۔ پہیلیاں نہ بچھاؤ۔“

”صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کماری کہ سواری جو کھیل کھیل رہا ہے آج سے میں اس میں سواری کا
 مہرہ نہیں ہوں۔ چاہو تو اسے جا کر بتا دو۔ میں اب رزاقی بابو کے جسم میں وہ زہر نہیں اتاروں گی جس کے
 کارن وہ اس کے لئے موسم کی ٹاک بنے جارہے ہیں۔“
 ”بیلا۔۔۔“ کماری ٹپ کر پرے ہو گئی۔ ”جانتی ہو تم کیا کہہ رہی ہو؟“ اس کی آواز میں خوف
 اور کڑواہٹ ایک ساتھ ابھرے۔

”جانتی ہوں۔“ بیلا نے پھر لا پرواہی سے کہا۔ ”میں نے کہا ناں پیار کیا کوئی چوری نہیں کی پھر
 گھٹ گھٹ کر یوں مرنا کیا۔۔۔ سے آئے گا تو اپنے مونٹس بابو پر جان دے کر ملکت ہو جاؤں گی مگر اب
 سواری کے ہاتھوں میں نہیں کھیلوں گی کماری جی۔“

”وہ تمہارا کیا حشر کرے گا جانتی ہو؟“ کماری نے خوفزدگی کے عالم میں کہا۔
 ”ضرورت نہیں سمجھتی۔“ بیلا کا لہجہ اب بھی ہر خوف سے بے نیاز تھا۔ ”زیادہ سے زیادہ مار ڈالے
 گا تو میں کہہ چکی ہوں کماری جی کہ عشق میں جینا عشق میں مرنا اور ہمیں اب کرنا کیا؟ مار ڈالے۔ کون
 بیوقوف اپنے مونٹس بابو پر غماز ہونے سے ڈرتا ہے۔ اب تو انتظار ہی اس لمحے کا ہے جس کے ماتھے پر
 میری وہ مرتیو لکھی ہے جو مونٹس بابو کے لئے آئے۔“
 ”بیلا۔۔۔“ کماری نے لپک کر اسے باہوں میں بھر لیا۔ ”بگلی۔ یہ تمہیں کیا ہو گیا؟ تم نے یہ کس

”تیرے مونس بابو کی قسم بیلا۔۔۔ اب وہ نہیں ہوگا جو سوا می چاہتا ہے۔ وہ ہوگا جو میں چاہتی ہوں۔ جو تم چاہتی ہو۔ جو تیرے مونس بابو چاہتے ہیں۔“

دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بچھنے وہ بیٹی۔ چھڑی اٹھائی اور اس کے سہارے کمرے سے نکل گئی۔ اس کا رخ خارجی دروازے کی طرف تھا۔ کوارٹر سے باہر آ کر اس نے ایک پل کے لئے کچھ سوچا پھر پروین کے دروازے پر چلی آئی۔ دستک دی تو کوئی جواب نہ آیا۔ اس نے دوسری بار پھر تیسری بار دستک دی تب دوسری طرف سے کسی کے قدموں کی آہٹ ابھری۔

”کون؟“ پروین نے دروازے کے قریب آ کر اندر سے پوچھا۔

”میں ہوں کماری۔“ اس نے لہجہ نازل کرتے ہوئے جواب دیا۔

”ارے۔۔۔“ پروین نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ ”آپ اس وقت۔“ وہ اس کی جانب دیکھ کر حیرت سے بولی۔ ”خیریت تو ہے نا؟“

”ہاں۔ خیریت ہی ہے۔“ وہ ہچکے سے انداز میں مسکرائی۔ ”وہ۔۔۔ بیلا کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ اگر بخار کی کوئی دوا یا شربت۔۔۔“

”جی ہاں۔ کیوں نہیں۔ شہزادے کی وجہ سے مجھے ہر وقت اپنے ساتھ چھوٹا مونا میڈیکل سنور رکھنا پڑتا ہے۔ اندر آئیے ناں۔ آپ باہر کیوں کھڑی ہیں؟ اور یہ بیلا صبح تک تو ٹھیک تھی۔ بخار کیسے ہو گیا اسے؟“

”میں یہیں ٹھیک ہوں۔ تم دو آلا دو۔ پھر مجھے ذرا سستی تک جانا ہے۔“ کماری نے معذرت خواہانہ لہجے میں اس کے آدھے سوال کا جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ آپ رکئے۔ میں ابھی دوا لاتی ہوں۔“ کہہ کر پروین لوٹ گئی۔ کماری وہیں کھڑے کھڑے ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ چند لمحوں کے بعد پروین نے اسے ایک بخار کا اور دوسرا کھانسی کا شربت لاتھا۔ ”بچوں کے لئے خوراک۔۔۔“

”میں دیکھ لوں گی۔ تمہارا بہت بہت دھنواؤ۔“ کماری دوا لے کر جلدی سے پلٹ گئی۔ پروین اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ پھر دروازہ بند کر کے لوٹ گئی۔

واپس آ کر کماری نے دیکھا بیلا بے سدھ سو رہی تھی۔ ماتھا چھو اتو خاصا گرم تھا۔ اس نے بواچھ کھانسی کے شربت کا بخار کے شربت میں ملایا اور منہ کھول کر بیلا کے حلق میں انڈیل دیا۔ وہ اوں آں کر کے نکل گئی۔ اسی دوران اس نے دوسرا چھ بھی کس کر کے اس کے منہ میں الٹ دیا۔ بیلا نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھنا چاہا مگر کماری نے اسے تھپک کر لٹا دیا۔ وہ کسی بچے کی طرح منہ چلاتی ہوئی کبل میں دبک گئی۔

کھانسی کا شربت ٹرا کھولا زور کے بغیر نہیں ہوتا یہ وہ جانتی تھی۔ بیلا کی بڑبڑاہٹ کوئی چاند نہ چڑھا دیتی اس خیال سے کماری نے اسے ڈبل ڈوز دے دیا۔ اب خاصی دیر تک وہ پڑی سوئی رہتی۔ چند لمحوں تک وہ اسے نیند کی وادیوں میں اترتے دیکھتی رہی پھر اطمینان کا سانس لے کر پلٹی۔ اپنی نیلے بارڈر اور زرد پھولوں والی سوئی ساڑھی کا پلوسر اور سینے پر یوں جھپکا کہ اس کا چہرہ دیکھنا ممکن نہ رہا۔ پھر کالی شال کندھوں پر ڈالی اور کمرے کا دروازہ بند کر کے صحن میں چلی آئی۔ نظراٹھا کر دیکھا۔ پروین اور ان کے کوارٹر کی سانچھی قد آدم دیوار کے پار صحن میں اندھیرا تھا۔ اطمینان سے سر ہلاتی ہوئی وہ باہر کا دروازہ کھول کر گلی میں آئی۔ دروازہ خوب مضبوطی سے بھیڑا اور چھڑی کی نوک سے ٹھک ٹھک کی مدھم آواز پیدا کرتی چل پڑی۔

چھت پر موجود پروین نے کماری کو ہندو بستی کو جانے والے راستے پر قدم بڑھاتے دیکھا تو آہستہ سے پیچھے ہٹی اور تیزی سے نیچے آ گئی۔ اپنے صحن میں رکے بغیر وہ باہر نکلی۔ بیلا اور اس کے کوارٹر کے درمیان دو فٹ چوڑی گلی میں داخل ہوئی اور اس کھڑکی کے سامنے آ کر جس کے نچلے آدھے پٹ کاٹ دیے گئے تھے۔ کھڑکی کے اوپری بچ جانے والے حصوں کو مستقل طور پر بند کر دیا گیا تھا اور نچلے خالی حصے کو تین چار گیلے رکھ کر بند کر دیا گیا تھا۔ کھڑکی کے اس حصے کو گیلے اٹھا کر کوئی بھی کمرے کے اندر جا سکتا تھا اس لئے وہاں چار چار انچ کے فاصلے پر لڑکی کی سرانجام لگا کر گلیوں کو ان کے اندرونی طرف رکھا گیا تھا۔

پروین نے احتیاط کے نام پر ادھر ادھر دیکھا پھر درمیان والے موئیے کے کھلے کے پتوں میں ہاتھ ڈالا اور اس میں چھپایا گیا ایک جدید منی واک مین نکال لیا۔ مونس بابو نے اسے بتایا تھا کہ اس کا دوران یہ چھ گھنٹے ہے۔ اس میں فور سائڈ ڈکیٹ چلتی تھی اور ہر سائڈ نوے منٹ پر مشتمل تھی۔ ایک ٹریک ختم ہونے پر دوسرا ٹریک خود بخود آن ہو جاتا تھا۔ اس نے یہ واک مین آج شام حویلی سے لوٹ کر یہاں چھپایا تھا۔ اب رات کے دس بج رہے تھے۔ بیلا اور کماری کی گفتگو ریکارڈ کر کے مونس بابو کیا جانا چاہتے تھے وہ خوب سمجھتی تھی۔

واک مین گریبان میں اڑس کر اس نے سلاخوں کے بیچ سے جھانک کر کمرے کا جائزہ لیا۔ وہاں دو بستر لگے تھے جن میں سے ایک پر بیلا دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہی تھی اور دوسرا لہجینا کماری کا تھا۔ کچھ سوچ کر وہ گلی سے نکلی اور دبے پاؤں بیلا کے کوارٹر میں داخل ہو گئی۔

بیلا اور کماری کے سونے کے کمرے کے ساتھ دوسرے کمرے کے دروازے پر تالا لگا تھا۔ لیکن اسی دوسرے کمرے کے ساتھ بنا ہوا تھا جس کا دروازہ اور لائٹ دونوں بند تھے۔

سونے کے کمرے میں پہنچ کر اس نے کماری کے بستر کا تکیہ اٹھایا۔ اسے دونوں طرف سے جھان

نگاہ جاری۔ اس نے ایک لمحے کو کچھ سوچا پھر اس کا چہرہ کسی خیال سے سرخ ہو گیا۔ ”تو وہ یہاں بھی اپنی خباثتوں میں مست ہے۔“ اس کی بڑبڑاہٹ سن کر پنڈت کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہو گئے۔

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں کماری جی؟“ وہ جلدی سے صفائی دینے کے انداز میں بولا۔

”باہر بلاؤ اسے۔ مجھے اس سے ضروری کام ہے۔“ ڈپٹ کر کماری نے کہا تو پنڈت کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر منہ نہ کر رہا۔ ٹھیک اسی وقت ایک دھڑاکے سے کوٹھڑی کا دروازہ کھل گیا۔

بے ترتیب سانسوں کے ساتھ صرف دھوتی میں بلبوس سواری باہر نکلا اور دو قدم بڑھ کر رک گیا۔ اس کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں اور سارا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔

”کیا بات ہے؟ اور تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟“ وہ کماری کو قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا۔

”میں۔۔۔“ کماری نے کچھ کہنا چاہا مگر ہونٹ چبا کر رہ گئی۔ سواری کی حالت سب کچھ بتا رہی تھی۔ کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔ پنڈت دم دبا کر ایک طرف جا بیٹھا۔

”ہاں تم۔۔۔“ وہ جھلا کر بولا۔ ”اگر کوئی بات کرنا تھی تو تم موبائل پر بھی کر سکتی تھیں۔ یہاں آ کر میرے رنگ میں بھگ ڈالنا کیا ضروری تھا؟“

”تم یہاں رنگ کھینچنے آئے ہو یا بھگ گھونٹنے؟“ مجھے معلوم نہیں تھا سواری۔۔۔ پرتو کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ تم اندر کس کے ساتھ رنگ رالیاں بنا رہے تھے؟“

”نہیں۔۔۔“ سواری نے زور سے نفی میں سر جھٹکا تو اس کے لمبے لمبے بال ہوا میں لہرا کر رہ گئے۔ ”نہیں پوچھ سکتیں تم۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے اور تمہیں اس میں دخل دینے کا اختیار نہیں ہے۔ پھر بھی میں بتا دیتا ہوں کہ میں یہاں ہر رات کسی نہ کسی ناری کے ساتھ گزارتا ہوں۔ آج بھی گزار رہا ہوں اور جب تک یہاں ہوں ایسا ہی کرتا رہوں گا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے تم جانتی ہو کہ میں ناری کے بغیر زیادہ دیر نہیں رہ سکتا۔“

”خوب جانتی ہوں۔“ کماری نے زہر خند سے کہا۔ ”اور میری بھوش والی بھی تمہیں یاد ہوگی کہ تمہارا سر و ناس بھی کسی عورت ہی کے ہاتھوں ہو گا۔“

”بکومت۔۔۔“ وہ ایک دم آپے سے باہر ہو گیا۔ ”جو کہنے آئی ہو جلدی سے کہو اور دفعتاً ہو جاؤ یہاں سے۔ میرا موڈ اور خراب مت کرو۔“

”موڈ خراب ہو تو ٹھیک ہو جایا کرتا ہے سواری دھیرج داس پرتو جب انسان کا سر خراب آ جائے تو وہ ٹلا نہیں کرتا۔ میں تمہیں یہی بتانے آئی ہوں۔“

”ایسی بکواس تم فون پر بھی کر سکتی تھیں۔“ وہ جھلا کر بولا۔ ”اگر صرف یہی کہنے آئی ہو تو تم نے کہا

کر دیکھا۔ پھر بستر کی چادر اٹھائی۔ کچھ نہ ملا۔ آخر میں اس نے گدا اٹھا کر دیکھا اور حیرت سے اس کا سر گھوم گیا۔ ایک چھوٹا سا موبائل وہاں موجود تھا جو آف تھا۔ اس نے اسے ہاتھ میں لے کر اس کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ یہ کسی غیر ملکی کمپنی کا جدید موبائل تھا۔ کچھ سوچتے ہوئے اس نے موبائل وہیں رکھا۔

گدا اور چادر برابر کر دی۔ پھر دبے پاؤں حرکت کرتے ہوئے کمرے میں ادھر ادھر پڑے مختصر سے سامان کا اس نے خوب اچھی طرح جائزہ لیا مگر کوئی ایسی چیز نہ ملی جسے وہ مونس بابو کے لئے اہم خیال کرتی۔ کماری کے بستر تلے ایک چھوٹا سا لٹینی نظر آیا جسے تالا لگا ہوا تھا۔ اس نے بہت کوشش کی مگر وہ نہ کھلا۔ جب وہ اسے کھولنے کی کوئی محفوظ ترکیب سوچ رہی تھی تو اچانک بیلا نے کراہ کر روٹ بدلی۔

پروین نے جلدی سے اٹپٹی بستر تلے سر کا یا اور اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ پھر اس سے پہلے کہ بیلا کے کراہنے کی مدد میں آواز دوبارہ اس کے کانوں میں پڑتی وہ خاموشی سے باہر نکل گئی۔ بیلا جاگنے کے بعد اگر اسے دیکھ لیتی تو وہ اپنے وہاں موجود ہونے کا کوئی جواز پیش نہ کر سکتی تھی۔ اس لئے وہ تیز رفتاری سے باہر آئی، بیرونی دروازہ سابقہ انداز میں بھیڑا اور اپنے کوارٹر میں داخل ہو گئی۔

تقریباً دو منٹ بعد وہ شہزادے کو کیمبل میں لپیٹے کندھے سے لگائے باہر نکلی اور دروازے کو تالا لگا کر حویلی کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس کے بائیں ہاتھ میں ایک کالا شاپر بھی تھا جس میں واک مین اس انتظار میں دم سادھے پڑا تھا کہ کب آئے گا۔

اس وقت اگر وہ کوشش بھی کرتی تو کوارٹروں کے سامنے موجود درختوں میں سے ایک درخت کے پھیلے ہوئے تنے کے عقب میں چھپے کھڑے اس شخص کو نہ دیکھ پاتی جو سر شام سے وہاں موجود تھا اور پروین کی اب تک کی ساری کاوشوں کا معنی شائد تھا۔

☆=====☆=====☆

”کماری جی۔۔۔ آپ اس وقت؟“ پنڈت نے مندر کا دروازہ کھولا اور سامنے کھڑی کماری کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”سواری کہاں ہے؟“ کماری نے بغیر کسی تمہید کے چھوٹے ہی پوچھا اور مندر میں قدم رکھا۔

”جی۔۔۔ وہ تو۔۔۔ وہ تو۔۔۔“ پنڈت ہکا کر رہ گیا۔

”کیا ہوا؟“ کماری نے اسے تیز نگاہوں سے گھور کر دیکھا۔ ”اور یہ دروازہ بند کرو۔“ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا تو پنڈت نے جلدی سے مندر کا دروازہ بند کر لیا۔ ”ہاں۔ اب بتاؤ۔ کہاں ہے وہ؟“

کماری نے مندر میں ادھر ادھر نظر دوڑائی۔

”جی۔۔۔ وہ یہیں ہیں۔۔۔ مگر۔۔۔“ پنڈت کی زبان پر پھر تالا پڑ گیا۔

”یہیں ہے۔“ کماری نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا اور کوٹھڑی کے بند دروازے پر اس کی

اور میں نے سن لیا۔ اب نکلو یہاں سے۔۔۔ مگر یاد رکھنا اگر تم نے دوبارہ اس طرح مجھے تنگ کیا تو میں اسے سہن نہیں کروں گا۔“ وہ غرا کر پلٹ گیا۔

”یہ تو تم نے پوچھا ہی نہیں سوامی کہ میں نے یہ بات کہی کیوں؟“ کماری نے بڑے سرد لہجے میں کہا تو سوامی ٹھٹک گیا۔ اس نے آہستہ سے رخ کماری کی جانب پھیرا۔ اسے کماری کے لہجے میں کچھ ایسا محسوس ہوا تھا جسے وہ نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

”تمہاری بیلا بہت پریشان ہے سوامی۔“ کماری نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”تو۔۔۔“ وہ پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا۔

”اس نے اپنے مونہں بابو کی آنکھوں میں آنسو دیکھے ہیں۔“

”پھر۔۔۔“ سوامی کا لہجہ اب بھی ویسا ہی نککھنے لگے جیسا تھا۔

”کل کی رات میں اپنا کام ختم کر لو ورنہ تمہارا حویلی میں سب سے اہم مہرہ۔۔۔ یعنی بیلا تمہارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ وہ اس بات کو لے کر بہت ڈکھی ہے کہ تم نے ابھی تک اس کے اور مونہں بابو کے ملن کے لئے کچھ نہیں کیا۔ الناس کے مونہں بابو کو ایسی پریشانی میں ڈال دیا ہے کہ وہ رزاتی بابو کے لئے آنسو بہانے پر مجبور ہو گئے۔“

”اچھا۔۔۔“ تمسخر سے سوامی نے کہا اور اس کے مونہں پر بڑی مکروہ مسکراہٹ نے جنم لیا۔

”میں نے کیا میرج جو روکھول رکھا ہے جو وہ چاہتی ہے کہ میں اس کا اور مونہں بابو کا ملاپ کر ادوں۔“

”تم نے اسے وچن تو یہی دیا تھا سوامی؟“ چہتے ہوئے لہجے میں کماری نے کہا۔

”وچن۔۔۔ ہا ہا ہا۔۔۔“ وہ منہ پھاڑ کر ہنسا۔ ”وچن تو میں سب کو دیتا ہوں کماری۔ کیا عینا کو نہیں دیا تھا میں نے وچن؟“ استہزاء سے انداز میں کماری کی جانب دیکھ کر اس نے پوچھا۔

”خاموش۔۔۔“ ایک دم کماری حلق کے بل چیخ پڑی۔ ”خبردار جو اپنی پلید زبان سے نینا کا نام لیا۔ ورنہ میں تمہارا خون کر دوں گی۔“ اس کا چہرہ لال بھوکا اور آنکھیں کبوتر کے خون جیسی سرخ ہو گئیں۔ وہ دانت پیستے ہوئے سوامی کو کسی زخمی ناگن کی طرح گھور رہی تھی۔ ”سوامی۔۔۔“ پھر کھولتے ہوئے لہجے میں اس نے کہا۔

”میں تیری کھورتا کے زخموں کو بھولی ہوں نہ اس وچن کو جو میں نے نینا کو دیا تھا۔

یہ تو سے کی زنجیر ہے جس نے میرے ہاتھوں میں بے بسی اور لاچارگی کی بیڑیاں پہنا دی ہیں ورنہ۔۔۔“ اس نے اس زور سے دانت بھینچے کہ اس کے جبڑوں کی ہڈیاں ابھر آئیں۔

”ورنہ کیا۔۔۔؟“ سوامی ایک دم برف جیسا سرد ہو گیا۔ اس کے لہجے میں گھبراہٹ تھی نہ خوف۔ وہ بڑی لا پرواہی سے کماری کو گھور رہا تھا اور پنڈت۔۔۔ وہ دھوتی کا پلو سر پر لئے منہ چھپانے کی ناکام کوشش کرتا ہوا خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ زمین میں گھس جانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اس

نے اس زور سے دانت بھینچے کہ اس کے جبڑوں کی ہڈیاں ابھر آئیں۔

”ورنہ کیا۔۔۔؟“ سوامی ایک دم برف جیسا سرد ہو گیا۔ اس کے لہجے میں گھبراہٹ تھی نہ خوف۔ وہ بڑی لا پرواہی سے کماری کو گھور رہا تھا اور پنڈت۔۔۔ وہ دھوتی کا پلو سر پر لئے منہ چھپانے کی ناکام کوشش کرتا ہوا خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ زمین میں گھس جانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اس

نے اس زور سے دانت بھینچے کہ اس کے جبڑوں کی ہڈیاں ابھر آئیں۔

”ورنہ کیا۔۔۔؟“ سوامی ایک دم برف جیسا سرد ہو گیا۔ اس کے لہجے میں گھبراہٹ تھی نہ خوف۔ وہ بڑی لا پرواہی سے کماری کو گھور رہا تھا اور پنڈت۔۔۔ وہ دھوتی کا پلو سر پر لئے منہ چھپانے کی ناکام کوشش کرتا ہوا خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ زمین میں گھس جانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اس

نے اس زور سے دانت بھینچے کہ اس کے جبڑوں کی ہڈیاں ابھر آئیں۔

”ورنہ کیا۔۔۔؟“ سوامی ایک دم برف جیسا سرد ہو گیا۔ اس کے لہجے میں گھبراہٹ تھی نہ خوف۔ وہ بڑی لا پرواہی سے کماری کو گھور رہا تھا اور پنڈت۔۔۔ وہ دھوتی کا پلو سر پر لئے منہ چھپانے کی ناکام کوشش کرتا ہوا خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ زمین میں گھس جانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اس

کے منہ سے رام رام کی آواز بھی پوری طرح نہ نکل رہی تھی۔

”ورنہ تم کب کے نرک کے سفر پر روانہ ہو گئے ہوتے۔ نینا کے کارن میں اگر آج تمہاری بندی ہوں تو کل آزاد بھی ہو سکتی ہوں۔ سوچو تب تمہارا کیا ہو گا جب میرے ہاتھ سے سے کا بان چھوٹے گا اور تمہارے ہر دے کو چیرتا ہوا نکل جائے گا۔“ کماری کی آواز میں لپکتی آگ میں تھکن سی اتر آئی۔ چہرہ مٹا ہوا لگنے لگا اور آنکھوں کی چمک میں نمی کا چھینٹا لگ گیا۔ ”بہت جلد وہ سے آئے گا سوامی جب میں نینا سے کیا ہوا اپنا وچن بھا کر رہوں گی۔ میں نے کبھی تم سے چھل کیا نہ چھپ کر وار کروں گی۔ تم بھی جانتے ہو۔

۔۔۔ پرنتو مجھے اتنا نہ ستاؤ کہ میں سب کچھ بھول کر تمہارے لئے درگا کا شراب بن جاؤں۔“

”بس۔۔۔“ سوامی نے ہاتھ اٹھا کر جیسے اسے خاموش ہو جانے کا حکم دیا۔ اس کی آواز اب بھی سرد اور پُر اطمینان تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ ”تم نے جو کہنا تھا کہہ لیا۔ جو کرنا ہو گا کرتی رہنا مگر یہاں ہم آپس کے بھید بھاؤ چکا نے نہیں آئے۔ تم یہاں میری آگیا کا پالن کرنے پر مجبور ہو ورنہ جانتی ہی ہو کہ نینا والا معاملہ الجھا رہے گا۔۔۔ ہاں وہ تم کچھ کہہ رہی تھیں کہ بیلا۔۔۔“

”اگر تم نے بیلا کے جذبات سے مزید کھلواؤ کرنے کی کوشش کی تو اب وہ تمہارے چھل میں نہیں آئے گی سوامی اس لئے بیلا کے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ سوچو۔ میں نہیں چاہتی کہ تمہاری ذرا سی لاچارہی تمہارے ساتھ مجھے بھی لے ڈوبے۔“

”تمہارے چاہنے یا نہ چاہنے کے کچھ نہیں ہو گا۔ تم ٹھنچ رہو۔ بس کل کسی طرح بیلا کو میرے پاس بھیج دینا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ سوامی نے اسے تمسخر سے دیکھ کر کہا۔

”ابھی تو وہ بخار کے مارے بے سدھ پڑی ہے۔ کل شاید نہ آ سکے۔“

”تو پرسوں بھیج دیکھ۔ نرسوں بھیج دینا۔ یہاں کونسا بارات لوٹ جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ ویسے تم اسے مونہں بابو کے حوالے سے میرا سند یہ دو گی تو وہ بخار کی حالت میں بھی اڑتی چلی آئے گی۔“

”اچھا۔۔۔“ کماری کے دماغ میں کچھ دیر پہلے کی اپنی اور بیلا کی گفتگو کی فلم چل گئی اور وہ دل ہی دل میں اس پر ہنس دی مگر اس کے لہجے سے سوامی کچھ اور سمجھا۔

”مظہمت کرو۔ آتما کر دیکھ لینا۔ مونہں بابو کا نام ہی اس کے لئے ٹانک بن جائے گا اور وہ بھاگی بھاگی یہاں چلی آئے گی۔“ وہ خشکی سے بولا۔

”بہت زردی ہو تم سوامی۔ کسی کے ہر دے سے کھیلنا اور اپنی غرض کے لئے ہر پستی میں گر جانا تمہی کو شوبھا دیتا ہے۔۔۔ چلتی ہوں نہیں چاہتی کہ کل تم مجھے الزام دو کہ میں نے تمہیں سے پر خبردار نہیں کیا تھا۔“

کماری جانے کے لئے پلٹی۔ پھر پنڈت کے پاس سے گزرتے ہوئے کہا۔

”پنڈت۔ دروازہ بند کر لو اور کوٹھڑی کے باہر دروازے پر ہاتھ لٹک کر بیٹھ جاؤ۔ سوامی جیسے

”پنڈت۔ دروازہ بند کر لو اور کوٹھڑی کے باہر دروازے پر ہاتھ لٹک کر بیٹھ جاؤ۔ سوامی جیسے

”پنڈت۔ دروازہ بند کر لو اور کوٹھڑی کے باہر دروازے پر ہاتھ لٹک کر بیٹھ جاؤ۔ سوامی جیسے

”پنڈت۔ دروازہ بند کر لو اور کوٹھڑی کے باہر دروازے پر ہاتھ لٹک کر بیٹھ جاؤ۔ سوامی جیسے

”پنڈت۔ دروازہ بند کر لو اور کوٹھڑی کے باہر دروازے پر ہاتھ لٹک کر بیٹھ جاؤ۔ سوامی جیسے

”پنڈت۔ دروازہ بند کر لو اور کوٹھڑی کے باہر دروازے پر ہاتھ لٹک کر بیٹھ جاؤ۔ سوامی جیسے

”پنڈت۔ دروازہ بند کر لو اور کوٹھڑی کے باہر دروازے پر ہاتھ لٹک کر بیٹھ جاؤ۔ سوامی جیسے

”پنڈت۔ دروازہ بند کر لو اور کوٹھڑی کے باہر دروازے پر ہاتھ لٹک کر بیٹھ جاؤ۔ سوامی جیسے

”پنڈت۔ دروازہ بند کر لو اور کوٹھڑی کے باہر دروازے پر ہاتھ لٹک کر بیٹھ جاؤ۔ سوامی جیسے

”پنڈت۔ دروازہ بند کر لو اور کوٹھڑی کے باہر دروازے پر ہاتھ لٹک کر بیٹھ جاؤ۔ سوامی جیسے

”پنڈت۔ دروازہ بند کر لو اور کوٹھڑی کے باہر دروازے پر ہاتھ لٹک کر بیٹھ جاؤ۔ سوامی جیسے

”پنڈت۔ دروازہ بند کر لو اور کوٹھڑی کے باہر دروازے پر ہاتھ لٹک کر بیٹھ جاؤ۔ سوامی جیسے

”پنڈت۔ دروازہ بند کر لو اور کوٹھڑی کے باہر دروازے پر ہاتھ لٹک کر بیٹھ جاؤ۔ سوامی جیسے

”پنڈت۔ دروازہ بند کر لو اور کوٹھڑی کے باہر دروازے پر ہاتھ لٹک کر بیٹھ جاؤ۔ سوامی جیسے

”پنڈت۔ دروازہ بند کر لو اور کوٹھڑی کے باہر دروازے پر ہاتھ لٹک کر بیٹھ جاؤ۔ سوامی جیسے

دیکھا۔ بیلا ویسے ہی بخار میں بیہوش پڑی ہے۔ کماری ہندو بستی گئی ہے اور رزاتی بابو آج کافی پئے بغیر ہی سو گئے ہیں۔ میں شہزادے کو بی بی کے پاس چھوڑنے گئی تو ساری صورتحال جان کر پھر آپ کے پاس آئی ہوں۔“

”پھر بھی مجھے رزاتی سے فوراً بات کرنا ہوگی پروین۔ میں خود اس کے کمرے میں جا رہا ہوں۔ میں یہ ٹیپ اسے سنوانا چاہتا ہوں۔۔۔ مگر نہیں۔۔۔“ ایک دم وہ اپنی جگہ ٹھک گیا۔ ”یوں نہیں۔ اس طرح تو بات بگڑ جائے گی۔ رزاتی اسے ہماری ایسی کوئی اسکیم بھی سمجھ سکتا ہے جو اسے اس معاملے سے توڑ لے۔ یہ معاملہ اس مندر ہی میں انجام تک پہنچنا چاہئے۔ اب جس رات بھی رزاتی وہاں جائے گا وہ اس سازش کے آخری لمحات ہوں گے۔“ اس نے وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے بڑا مناسب فیصلہ لیا۔ ”اب رہ گیا بیلا کا معاملہ۔۔۔“

”مونس بابو۔“ پروین نے اس کی بات اچک لی۔ ”میری آپ سے ایک درخواست ہے۔“ وہ جیسے منت سے بولی۔

”پروین۔۔۔ ایسا کیوں کہتی ہو میری بہن۔“ مونس اپنی سیٹ کے پاس رکا اور اسے محبت پاش نظروں سے دیکھ کر بولا۔ ”تم نہیں جانتیں رزاتی کو بچا لینے کے لئے تم نے میری کس قدر مدد کی ہے۔ خدا تمہیں نہ بھیجتا تو شاید میں اب بھی اندھروں میں ٹانگ ٹوٹا ہوا ہوتا۔ تم جو کہنا چاہتی ہو بلا جھجک کہو مگر یہ سوچ لینا کہ ہم سانپوں کے جنگل میں گھوم رہے ہیں۔ شاخ سمجھ کر جس پر ہاتھ رکھیں گے وہ اگر شیش ناگ نکل آیا تو یہ تصور ہمارا ہوگا اس کے ڈس لینے کا نہیں۔“

”آپ نے مجھے بہن کہا مونس بابو۔“ پروین کی آواز بھگ گئی۔ ”بہن واری آپ پر اور رزاتی بابو پر۔۔۔ میں اس رشتے کے قابل ہوں یہ جان کر مجھے اپنے رب کی مہربانیوں پر پیارا آ گیا۔ اب اگر آپ نے مجھے ایسے انمول رشتے سے نواز ہی دیا ہے تو میں کہنا چاہوں گی کہ بیلا کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کن اقدام کرنے سے پہلے ایک بار نہیں سو بار سوچئے گا۔“

”پروین۔۔۔ تم جو کہنا چاہتی ہو میں سمجھ رہا ہوں۔“ مونس نے اس کی بات کا اثر لیتے ہوئے کہا۔ ”مگر یہ یاد رکھو کہ وہ سوامی اور کماری کے ساتھ رزاتی کو برباد کرنے کی سازش میں شروع سے شریک ہے۔“

”مانتی ہوں۔۔۔ مگر کس کے لئے؟ مونس بابو سوامی کی یہ مکروہ شرط اس نے کس کے لئے مان لی؟ اور آج وہ اگر سب کچھ تیاگ کر اپنی زندگی کی پرواہ کے بغیر سوامی سے بغاوت پر اتر آئی ہے تو بھی کس کے لئے؟ صرف آپ کے لئے۔ وہ بچی جو آپ کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی سمجھ نہیں سکی اور اپنے دھرم سے لے کر دھرم والوں تک کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی ہے یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس میں اس

بھانڈے جیسے دلالوں کو کسی پل بھی آواز دے سکتے ہیں۔“

کماری چو بی دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے سوامی کا قہقہہ اور پنڈت کے ہکلا نے کی آوازیں سنیں مگر کی نہیں۔ مندر کی گئی چٹی سیڑھیاں اترتے ہوئے اس نے چہرہ خوب اچھی طرح ساڑھی کے پلو اور شال میں چھپایا اور چھڑی نیکی ہوئی اندھیرے میں گم ہو گئی۔۔۔ اس بات سے بے خبر کہ مندر کے دروازے سے چپکا کھڑا ایک سایہ بڑی تیزی سے لپک کر اس وقت بائیں طرف دھری گھڑوچی کے عقب میں چلا گیا تھا جب وہ باہر نکلنے کے لئے دروازے کی طرف آ رہی تھی۔ اس نے کماری اور سوامی کی گفتگو کا ایک ایک لفظ دروازے سے چپکے چپکے سنا تھا۔ اپنی اور سوامی کی باتوں کے الٹ پھیر میں گم کماری اس بات سے بھی بے خبر چلی جا رہی تھی کہ اب وہ سایہ بڑے مناسب فاصلے اور مشاقی سے کماری کا تعاقب کر رہا تھا۔

☆=====☆

واک مین کی واک کا اختتام ہو چکا تھا۔

فیثہ اب خاموشی کے ساتھ ریگ رہا تھا۔ جب وہ بھی تھم گیا تو مونس نے ہاتھ بڑھا کر ٹیپ ریکارڈر آف کر دیا۔ اس کا چہرہ مختلف کیفیتوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ جوش اور کامیابی کے قریب پہنچ جانے کے احساس نے اس کی حالت عجیب سی کر دی۔ محسوسیت سے اس نے پروین کی جانب نظر اٹھائی جو اسے بغور دیکھ رہی تھی۔

”پروین۔۔۔ میں۔۔۔ میں جتنا نہیں سکتا۔۔۔“ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے تھوک نکل کر حلق تر کیا۔ ”تم نے آج دوسری بار کتنا بڑا کام کیا ہے۔ سب کچھ آئینے کی طرح صاف ہو گیا ہے پروین سب کچھ۔۔۔“ وہ اپنی سیٹ سے اٹھا اور بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ”یہاں کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے وہ بے شک ابھی پوری طرح سامنے نہیں آیا مگر جو پتہ چلا ہے وہ اس قدر مکمل اور خوفناک ہے کہ میں اسے برداشت نہیں کر پا رہا۔ رزاتی کو یہ لوگ کوئی ایسی دوا دے رہے ہیں جس نے اس کے اعصاب کو کھوکھلا اور دیک زده کر دیا ہے۔ بیمار اور کمزور ذہن کسی بھی طاقتور اور ایسی قوت کے مالک شخص کے ٹرانس میں آسانی سے چلا جاتا ہے جو بعض خاص مشقیں کرنے کے بعد دماغی طور پر دوسروں سے برتر ہو جائے۔۔۔“ یہاں تک کہہ کر وہ رک گیا۔ ایک دم اسے کسی خیال نے جیسے خوفزدہ کر دیا۔

”پروین۔۔۔ ہمیں بیلا کو روکنا ہوگا۔ وہ رزاتی کو آج بھی کافی میں۔۔۔“

”نہیں مونس بابو۔ اب ایسا کچھ نہیں ہوگا۔“ پروین نے جلدی سے اس کی بات کاٹ دی۔ ”آپ نے جو کچھ ٹیپ ریکارڈر میں سنا وہ اتنا بڑا سچ ہے کہ شاید میں نے اس سے پہلے ایسا سچ کبھی سنا

کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ پھر یہ آواز کس کی تھی؟

”غور سے سنو۔ اپنے من کی آواز پر کان دھرو۔ تم جو اس پگی کی محبت کو اصولوں اور رشتوں ناطوں کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتے ہو کیا نہیں جانتے کہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ بیلا نے جو کچھ کیا اپنی محبت پانے کے لئے کیا۔ بے شک اسے سوامی نے چھل کپٹ کے نام پر اپنے جال میں پھانسا مگر وہ اس کے چنگل میں پھنسی تو اسی لئے تھی ناں کہ تمہیں حاصل کر لے۔ اس نے سوامی کی شرط پوری کرنے کے لئے اگر رزاقی کو داؤ پر لگا دیا تو صرف اس لئے کہ وہ سوامی سے تمہاری ضمانت حاصل کر چکی تھی، اس وعدے کے نام پر کہ تمہیں کبھی کچھ نہیں ہوگا اور وہ اپنے جادو ٹونے سے تمہارا دل اس کی طرف پھیر دے گا۔۔۔ لیکن جو نبی اس نے تمہاری آنکھ میں نمی دیکھی وہ بغاوت پر اتر آئی۔ سب کچھ بھول گئی۔ سوامی کا خوف، موت کا ڈر، کسی عذاب ناک صورتحال سے دوچار ہو جانے کا وہم۔ سب کچھ اس کے من سے نکل گیا۔ یاد رہا تو صرف یہ کہ اس کے منس بابو کو دکھ دیا گیا اور جس کی وجہ سے دکھ ملا اس نے اس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اسے صرف تم سے غرض تھی منس! رزاقی رہے نہ رہے اسے اس سے کوئی مطلب نہیں تھا۔۔۔ لیکن آج جب اس نے محسوس کیا کہ تمہاری آنکھ میں نمی رزاقی کے سبب اتری ہے تو اس نے اس کھیل میں مزید مہرہ بننے سے ہاتھ اٹھا لیا۔۔۔ وہ تمہاری آنکھوں میں خوشی کے نام پر بھی آنسو براداشت نہیں کر سکتی منس! جانتے ہو اس کا یہ فیصلہ اس کے اندر اذیت ناک موت کے قریب تر لے گیا ہے۔ سوامی کو جب اس بات کا یہ چلے گا تو کیا وہ اسے معاف کر دے گا؟ ہرگز نہیں۔ منس! وہ اسے ایسی موت مارے گا کہ تم بیلا کو ڈھونڈتے رہ جاؤ گے اور اس کا نشان نہیں ملے گا۔“

”نہیں نہیں۔۔۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔“ اضطرابی طور پر منس کے ہونٹوں سے نکلا۔

مجھے جو سزا دینا ہوگی میں خود بیلا کو دوں گا مگر اسے سوامی جیسے درندے کے ہاتھ نہیں پڑنے دوں گا۔“ وہ اپنی سیٹ پر گر سا پڑا۔

”یہی اچھا ہے۔“ دل کی آواز اب بھی اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ ”اپنوں کو خود ہر دے دیا جائے تو دکھ کم ہوتا ہے لیکن اگر انہیں غیروں کو سوئپ دیں ناں منس! تو سانسون میں بچھتاوے کی ایسی ریت اڑنے لگتی ہے جو انسان کو دم گھٹ کر مر جانے پر مجبور کر دیتی ہے۔“

واک مین اس کی نظروں کے سامنے خاموش پڑا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر اسے سناٹے بھری نگاہوں سے نکلتا رہا۔ پھر بڑی آہستگی سے اس کا ہاتھ حرکت میں آیا اور ریواسنڈ کا بن دبا دیا۔

وہ ابتدا سے اس دیوانی کے مین سننا چاہتا تھا جس کے نوحوں پر ایک ہی صدا کا راج تھا۔ ”منس بابو۔۔۔ منس بابو۔۔۔ منس بابو۔۔۔“

☆=====☆=====☆

کے بچنے کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ آپ اس کے بارے میں ایک دم کوئی بھی سخت فیصلہ کیسے کر سکتے ہیں منس بابو۔۔۔ اور ایک بات اور۔ میں ایک عورت ہونے کے ناطے جو محسوس کر چکی ہوں اسے آپ کے کانوں تک پہنچانا اس وقت بہت ضروری سمجھتی ہوں اور وہ یہ ہے منس بابو کہ آپ اس کی اپنے لئے محبت سے واقف ہیں۔ کیا نہیں؟“ پروین نے بیلا کا نہ انداز میں منس کی جانب دیکھا۔

”پروین۔۔۔“ منس نے لرز کر اس سے نظروں کا ناطہ توڑ لیا۔

”نظر چرا لینے سے حقیقت بدل نہیں جایا کرتی منس بابو۔“ پروین کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔ ”آپ کی گھبراہٹ گواہی دے رہی ہے کہ میں نے سچ کہا۔۔۔ آپ دونوں کا ملن ممکن ہے یا نہیں؟ میں اس بارے میں کچھ کہنا چاہتی ہوں نہ کوئی بحث کرنا چاہتی ہوں لیکن یہ ضرور کہوں گی منس بابو کہ بیلا کو صفائی کا ایک موقع ضرور دیجئے۔ اس ٹیپ میں اس کی قید آواز کو کم از کم ایک بار اور ضرور سنئے گا مگر اکیلے میں۔۔۔ میرے جانے کے بعد۔۔۔ جب آپ بالکل تنہا ہوں۔ کوئی دوسرا آپ کے آس پاس ہونہ خیالوں میں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

منس کے ہاتھ کرسی کی پشت کو اس قدر سختی سے گرفت میں لئے ہوئے تھے کہ اس کی انگلیاں خون سے محروم بالکل سفید نظر آ رہی تھیں۔ اس نے پروین کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ بھی مزید کچھ کہے بغیر اسے بڑی گہری نظروں سے دیکھ کر خاموشی کے ساتھ باہر نکل گئی۔

منس نے دھیرے سے نظریں اٹھائیں اور سامنے میز پر پڑے واک مین پر جمادیں۔ وہ اسے ایک ٹک گھور رہا تھا اور بیلا کے پہلے دن اس کے پاس آنے سے لے کر اب تک کے عرصے کی فلم اس کے دماغ کے پردے پر چل رہی تھی۔ اسے ہولی کے دن اپنے سامنے بیلا کا دلہانہ رقص یاد آیا۔ اس کی ہر بات کو حکم سمجھ کر مان لینا یاد آیا۔ اس کے لئے اپنا آرام تیاگ دینا یاد آیا۔ اس کی نظروں میں چھپی وہ پیاس یاد آئی جس میں ہوس نہیں کسی اور ہی جذبے کی پیش کر وٹیں لیتی تھی۔ اپنے لئے اس کے الفاظ میں ڈھکے چھپے پیغام یاد آئے۔ اس کی ہر بات کو اپنے دل کا دھرم کہنا یاد آیا۔۔۔ اور وہ سب یاد آیا جو اس کے نہاں خانہ دل میں پل پل محفوظ تھا۔ وہ ابتدا ہی میں جان گیا تھا کہ بیلا اس پر مرتی ہے مگر اس نے اسے کبھی ایک خاص حد سے آگے بڑھنے دیا نہ وہ خود اس لکیر کے پار آئی۔ شاید وہ خود بھی سمجھتی تھی کہ اس کے اور منس کے درمیان مذہب اور اونچ نیچ کی جو دیوار حائل ہے اسے پائمان دونوں کے لئے ممکن نہیں۔ اسی لئے وہ خاموشی سے اس کی پوجا کرتی جا رہی تھی۔۔۔ مگر رزاقی کو دووا کے نام پر زہر دینے کی بات یاد آئی تو اس کے سارے احساسات ایک پل کے لئے پھر منتشر ہو گئے۔ اس نے اس کی جان رزاقی کو اس سے چھین لینے میں اس کے دشمنوں کا ساتھ دیا تھا۔ کیا یہی محبت ہے؟

”ہاں۔۔۔ یہی تو محبت ہے۔“ کسی نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔ وہ چونکا۔ وہاں اس

ہوئے کہا۔

”یہ بنگی مونس بابو سے پیار کرتی ہے پروین۔“ جواب میں ہچکیاں لیتی کماری نے بستر کے پاس پڑے موڑھے پر گرتے ہوئے بتایا۔

”کیا؟“ پروین نے یوں ظاہر کیا جیسے وہ اس بات پر حیرت زدہ رہ گئی ہو۔

”ہاں پروین۔“ کماری نے اپنی بھیگی پلکیں اٹھائیں۔ ”یہ اس بیہوشی کے عالم میں بھی بار بار مونس بابو کو پکار رہی ہے۔ اگر یہ بات مونس بابو یا حویلی کے کسی منٹ کے کانوں میں پڑ گئی تو کیسا طوفان آئے گا، یہ تم بھی سمجھ سکتی ہو۔“

”یہ آپ نے کیسا انکشاف کیا کماری جی۔“ پروین کسی حد تک اس صورتحال سے واقعی پریشان ہو گئی اور اس کے پاس ہی دوسرے موڑھے پر بیٹھ گئی۔ ”آپ کی بات بالکل درست ہے کہ اگر کسی کو پتہ چل گیا تو بہت برا ہوگا۔“

”اسی لئے میں ڈاکٹر کو بلانے کے حق میں نہیں ہوں۔ بیلا کی زبان سے نکلے ہوئے ”مونس بابو“ کے الفاظ اگر ہم دونوں کے علاوہ کسی تیسرے کے کان میں پڑ گئے تو بہت بڑی سمسیا کھڑی ہو جائے گی اور میں زیادہ پریشان اس لئے ہوں کہ بیلا کا تو جو ہو گا سو ہو گا، مونس بابو بھی لوگوں کی زبان پر آ جائیں گے۔ ہتیر کی بات کیا ہے کون جانے لیکن کوئی یہ نہیں مانے گا کہ مونس بابو کا بیلا سے کوئی سمبندھ نہیں ہے۔۔۔۔۔“

کماری نے بڑی خوفناک بات کی طرف بڑا واضح اشارہ کیا تھا۔ پروین کا تو اس طرف دھیان ہی نہ گیا تھا۔ اس نے سر ہلاتے ہوئے کماری کی بات پر غور کیا تو لگا دھٹک کہہ رہی تھی۔

”پھر اب کیا کیا جائے؟“ کچھ دیر بعد پروین نے بیلا کے سرخ ہوتے چہرے کی طرف تشویش بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”صبح میں حویلی گئی تو بی بی بیلا کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔ ناشتہ کھانا سب اسی کو کرنا ہوتا ہے۔ اب صبح کا کام تو میں کر آئی تھی۔ دوپہر اور رات کا بھی میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں لیکن بی بی اور مونس بابو کو بیلا کے حویلی نہ آنے کی وجہ کیا بتائی جائے۔ اگر اس کی بیماری کا انہیں پتہ چلا تو بی بی ہو یا مونس بابو سب ڈاکٹر کو بلوانے پر تشریف لائیں گے اور اگر نہ بتایا جائے تو۔۔۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا کماری جی۔۔۔۔۔“ پروین نے بے بسی سے ہاتھ کھڑے کر دیئے۔

”اگر تم میری تھوڑی سی سہائتا کرو تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔“ کماری نے جیسے من ہی من میں کوئی فیصلہ کر لیا۔

”آپ کہئے۔ مجھ سے جو ہو سکا میں ضرور کروں گی۔“ پروین نے خلوص سے کہا۔

”تو صرف یہ کرو کہ کل صبح تک کسی طرح بیلا کو سنبھال لو۔۔۔ صرف کل صبح تک۔“ کماری کا لہجہ

بیلا کا بخار تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اس پر ایسی مدد ہوشی طاری تھی جسے نہ غنودگی کہا جاسکتا تھا نہ بیہوشی۔

کماری اس کی بگڑتی حالت سے گھبرا گھبرا گئی۔ پروین اور وہ صبح سے بیلا کے سر ہانے بیٹھی کبھی اس کا سر اور کبھی جسم دیا رہی تھیں۔ پروین کے دیے ہوئے شربت سے اس کا بخار ہلکا ہوا نہ ٹائلس یہ ہوا کہ وہ مسلسل نیند میں تھی مگر اس کی یہ نیند کماری کے لئے پریشانی کا باعث تھی۔ وجہ یہ تھی کہ کسی بھی وقت وہ کروٹ بدلتی اور بے اختیار اس کی زبان پر ”مونس بابو“ کے الفاظ آ جاتے۔ جب جب ایسا ہوا کماری نے بڑی وحشت بھری نظروں سے پروین کی جانب دیکھا۔ ایک آدھ بار تو پروین نے یوں ظاہر کیا جیسے اس نے سنا ہی نہ ہو مگر یہ ایسی بات نہ تھی جسے بار بار نظر انداز کیا جاتا۔ پروین جان چکی تھی کہ بیلا اور کماری کا باطن اپنا چولا بدل چکا ہے مگر وہ اس بات کو ان دونوں پر عیاں نہ کر سکتی تھی ابھی اسی میں بہتری تھی۔ اس لئے وہ کماری کی پریشانی کم کرنے کے خیال سے اٹھ گئی۔

”میں مونس بابو کو جا کر بتاتی ہوں تاکہ وہ ڈاکٹر کو بلوا دیں۔ بیلا کی حالت ایسی نہیں ہے کہ ہم ٹوکوں میں الجھ رہیں۔“

”نہیں نہیں۔ ایسا نہ کرو پروین۔“ کماری کی گھبراہٹ اور بڑھ گئی۔ اس نے متوحش نظروں سے بے سدھ بیلا کی جانب دیکھا پھر پروین کی طرف دیکھ کر اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔ ”مگر کیوں؟“ پروین نے حیرت سے کہا۔ ”آپ دیکھ رہی ہیں اس کا بخار بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اب تو یہ بڑبڑانے بھی لگی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بخار نے اس کے دماغ پر اثر شروع کر دیا ہے اور یہ کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔“

”میں سب سمجھتی ہوں پروین۔“ کماری نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ”مگر میری بہن۔ اپنے خدا کے نام پر میری بات مان لو۔ ایسا مت کرو۔“ اس نے منت کرتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیے۔

”یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟“ پروین واقعی بوکھلا گئی۔ اس نے جلدی سے کماری کے ہاتھ تھام کر کھول دیے۔ ”آپ جو چاہتی ہیں اس کی وجہ تو بتائیے۔ میرا مطلب تو یہ تھا کہ بیلا کی بگڑتی ہوئی حالت کہیں اسے۔۔۔۔۔“

”اسے مر ہی جانا چاہئے پروین۔“ سسک کر کماری نے کہا اور دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا۔ ”یہ زندہ ہے ہی کب؟“

”کماری جی۔“ پروین نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ لگتا ہے کوئی بہت بڑی بات ہے جو آپ زبان پر نہیں لارہیں۔ اگر آپ مجھے اپنے اعتماد کے قابل سمجھتی ہیں تو خدا کے لئے کہہ ڈالئے بات کیا ہے؟ کیا ہوا ہے؟“ پروین نے اپنے آپ کو بالکل لاعلم ظاہر کرتے

ناں۔ ہم ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ اماؤس کی آخری رات خیریت سے گزر جائے تو سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔“

”اچھا اچھا۔“ پروین اس کے پہلو بچا جانے اور بات پر پردہ ڈال دینے کی قائل ہو گئی۔
کماری نے اس کی بات کا کوئی جواب دینے کے بجائے بیلا کا بخار چیک کرنے کے لئے پروین کی لائی ہوئی تھرمواسٹک بیلا کے ماتھے پر رکھی اور دیوار گیر کلاک پر نظر جمادی۔ آدھے منٹ بعد اسٹک چیک کی تو اس کے چہرے پر ہلکی سی اطمینان کی پرچھائیں ابھری۔

”شکر ہے بھگوان کا۔ بخار ایک پوائنٹ تو کم ہوا۔“

”شکر ہے۔“ پروین نے بھی چھت کی جانب دیکھ کر بیساختہ کہا۔

”بیلا کا بخار ٹوٹ رہا ہے۔ تم حویلی جانا چاہو تو بے شک چلی جاؤ۔ رزاقی بابو کو کسی چیز کی ضرورت نہ پڑ جائے۔“ کماری نے تھرمواسٹک تپائی پر ڈال دی۔ ”میں تمہاری بیحد آ بھاری ہوں پروین کہ اس کھن سے میں تم مجھے بالکل ایک چھوٹی بہن جیسی سہانا دے رہی ہوں۔“ کماری چھتری کے سہارے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”بیلا مجھے بھی بہت عزیز ہے کماری جی۔“ پروین نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ ”اسے کل صبح تک بالکل اچھا ہو جانا چاہئے۔“
”بھگوان سے میں یہی پرار تھا کر رہی ہوں پروین۔۔۔ اور مجھے یقین ہے کہ تمہاری دعا سے ایسا ہی ہوگا۔“

”انشاء اللہ۔“ کہہ کر پروین مسکرائی اور بیلا پر ایک نظر ڈال کر کمرے سے نکل گئی۔

☆=====☆

”سر۔۔۔ ایک اہم خبر ہے۔“ نورے کی آواز میں بیتابی محسوس کر کے مونس چونکا۔

”کہہ ڈالو نورے۔ زکوٰۃ۔“ اس نے جلدی سے کہا اور موبائل پر اس کے ہاتھ کی گرفت ذرا سخت ہو گئی۔

”سر۔۔۔ گاؤں کے دو ہندو چوکی کے پاس ہرے میدانوں میں اپنے جانور چرانے آتے ہیں۔ آج وہ یہاں چوکی کے ایک فوجی سے کچھ سُن گن لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔“
”زکوٰۃ نورے۔ کہتے جاؤ۔ میں نے جو پوچھنا ہوگا بعد میں پوچھوں گا۔“ مونس نے اس کے رکنے پر ٹوکا۔

”جی سر۔۔۔“ نوراجلدی سے بولا پھر بے ٹکان کہتا چلا گیا۔ ”میں انہیں جانتا ہوں سر۔ ویرا اور دیوانام ہیں ان کے۔ کئی سالوں سے وہ یہاں آتے ہیں۔ میں نے انوار سے کہہ رکھا تھا کہ کسی بھی قسم کی

بڑا عجیب اور ناقابل فہم ہو گیا۔

”کل صبح تک کیا یہ خود بخود ٹھیک ہو جائے گی؟“ پروین نے اچھی سے پوچھا۔

”اس کا ٹھیک ہونا نہ ہونا اتنا اہم نہیں“ پروین جتنا اس کی حالت کا دوسروں سے پوشیدہ رہنا ضروری ہے۔ میں بستی جا رہی ہوں۔ واپسی پر اس کے لئے کوئی دوا لیتی آؤں گی۔ تم بس اس دوران اس کے پاس رہنا اور حویلی کھانا پکانے جانا ہو تو۔۔۔“

”اسے اس حال میں اکیلا چھوڑ کر جانا کیا مناسب ہوگا؟“ پروین اس کے خاموش ہو جانے پر بولی۔
”یہی سوچ کر میں پُپ ہو گئی ہوں پروین۔“ کماری کے چہرے پر ابھن کا جال پھیلتا ہی جا رہا تھا۔
”ابھی ساڑھے دس ہوئے ہیں۔ مجھے کھانا تیار کرنے کے لئے ساڑھے گیارہ تک وہاں ہونا چاہئے۔ اس وقت تک اگر لوٹ آئیں تو آپ بیلا کے پاس رہے گا“ میں حویلی چلی جاؤں گی۔ شہزادے کو میں صبح ہی بی بی کے پاس چھوڑ آئی تھی۔ اس کی طرف سے تو مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔“

”نہیں۔ یہ مناسب نہیں رہے گا۔“ کماری نے جیسے کچھ اور سوچ لیا۔ ”تم ساڑھے گیارہ بجے حویلی چلی جانا۔ میں بستی نہیں جا رہی۔ جب تم دوپہر کا کھانے سے فارغ ہو کر لوٹو گی تو دیکھوں گی کہ مجھے بستی جانا چاہئے یا نہیں۔ اس وقت بیلا سے اہم میرے لئے اور کچھ نہیں ہے۔“

”یہ تو اور بھی اچھا ہے۔“ پروین نے اطمینان محسوس کرتے ہوئے کہا۔
”پرنو تم بی بی کو بیلا کے بارے میں کیا بتاؤ گی؟“ کماری نے ہاتھ بیلا کے ماتھے پر رکھ کر بخاری شدت محسوس کرنا چاہی۔

”میں نے صبح ہی انہیں بتا دیا تھا کہ رات بھی بیلا اس لئے نہیں آسکی کہ اسے بخار آ رہا ہے۔ انہوں نے پوچھا تو میں نے انہیں دوا وغیرہ کے بارے میں اطمینان دلا دیا کہ علاج ہو رہا ہے۔ ایک آدھ دن میں صحت ہو جائے گی۔“

”یہ تم نے بہت اچھا کیا پروین۔“ کماری نے اسے ممنونیت سے دیکھا۔ ”میری ایک سمسیا تو تم نے حل کر دی۔“

”اور دوسری۔۔۔“ پروین مسکرائی۔

”وہ آج رات ہمیشہ کے لئے دور ہو جائے گی۔“ کماری نے دھیرے سے کہا اور پیار سے بیلا کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

”آج رات۔۔۔؟“ پروین کا دل بڑے زور سے دھڑکا۔ ”آج رات کیا خاص ہونے والا ہے کماری جی؟“

”کچھ خاص نہیں ہونے والا پروین۔“ کماری نے خود کو سنبھالا۔ ”اماؤس کی آخری رات ہے

اسی وقت کھلے دروازے میں اسے پروین کھڑی دکھائی دی جو اسے اجازت طلب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”ارے پروین۔۔۔ آؤ۔۔۔ رک کیوں گئیں؟“

”سلام مونس بابو۔“ وہ اندر داخل ہوئی تو بیدار ہو رہی تھی۔

”کیا بات ہے۔ تم کچھ پریشان ہو۔“ مونس نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”میں بیٹھوں گی نہیں مونس بابو۔ آپ کو صرف یہ بتانے آئی تھی کہ بیلا رات سے بہت سخت بیمار ہے۔“

”کیا ہوا ہے؟“ ایک پل ٹھہر کر مونس نے بڑی آہستگی سے پوچھا اور نظر جھکا کر پیپر ویٹ سے

کھینچنے لگا۔

”بجاری میں ہڈیاں بک رہی ہے۔۔۔ اور ہڈیاں صرف ”مونس بابو“ مونس بابو“ کے گرد چکرار ہا

ہے۔“ کھڑے کھڑے پروین نے کہا اور مسلسل اس کی جانب دیکھتی رہی۔

”کوئی دوا دی اسے یا ڈاکٹر کو بلوانا پڑے گا؟“ پیپر ویٹ مونس کے ہاتھ سے نکل کر میز پر لڑھک گیا۔

”کماری کا کہنا ہے کہ اگر کسی نے اس غشی کے عالم میں اس کی زبان سے آپ کا نام سن لیا تو بات

کونھوں چڑھ جائے گی۔“

”پھر کیا ہوگا؟“ مونس نے ایک دم سر اٹھایا۔ ”لوگوں کی بک بک کا خیال کیا کسی کی زندگی سے

زیادہ اہم ہے۔ تم جاؤ اس کے پاس۔ میں ابھی ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں۔“

”مونس بابو۔۔۔“ پروین کا چہرہ ایک دم کھل اٹھا۔ ”آپ کا یہ کہہ دینا ہی بیلا کو ہوش میں لے آئے

گا۔ آپ وقت نوٹ کر لیجئے۔ ابھی اسی پل سے اس بچی کا بخار ٹوٹنا شروع ہو گیا ہوگا۔“

”میں نے کیا اسے انجکشن دے دیا جو اس کا بخار۔۔۔“ مونس ہولے سے مسکرایا۔

”دل کو دل سے راہ ہوتی ہے ناں مونس بابو۔“ عجیب سے لہجے میں پروین نے کہا۔ ”تو یقین

کیجئے اگر آپ نے دل سے بیلا کے لئے یہ الفاظ کہے ہیں تو یہ اس کے لئے پیغام حیات ثابت ہوں

گے۔ ایک خیر خواہ کی زبان سے نکلے ہوئے چند لفظ دور ہوتے ہوئے بھی پاس ہونے کا وہ کرشمہ دکھا

دینے پر قادر ہوتے ہیں جو کسی ڈاکٹر کے کسی انجکشن، کسی گولی اور کسی کپسول سے ممکن نہیں ہوا

کرتا۔“ پروین نے بڑے محتاط الفاظ میں کہا تو مونس ہنس پڑا۔

”اب ایسا بھی کیا پروین۔۔۔ بہر حال میرا تو یہی مشورہ ہے کہ اس کے لئے ڈاکٹر کو بلوانا لینا

چاہئے۔“

”آپ اس کی بات کو چھوڑیے اور جو میں بتا رہی ہوں اسے سنئے۔“ پروین نے ایک دم سنجیدگی

اختیار کر لی۔ پھر اس نے تفصیل سے اپنی اور کماری کی گفتگو دہرا دی۔

بات ہو اگر وقت گزار کر کارروائی کر سکتا ہو تو مجھے پہلے آگاہ کر دے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ جس فوجی سے

وہ دونوں ٹوہ لینے کی کوشش کر رہے تھے اس کا نام نصیر ہے۔ اس سے ان دونوں کی سالوں سے دوستی ہے۔

نصیر نے انہیں کسی بات کا مثبت جواب دینے کے بجائے ادھر ادھر کی باتوں میں ٹال دیا اور لوٹ کر انوار

سے بات کی۔ انوار نے فوری طور پر مجھ سے رابطہ کیا اور میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ وہ باتوں میں ان

دو اسلحہ سمگلرز کے بارے میں سوہ لے رہے تھے جنہیں ہم نے سات آٹھ دن پہلے آری کے حوالے کیا

تھا۔ ابھی تک ان دونوں کو یہ باور نہیں کرایا گیا کہ ان پر چوکی والوں کو شک ہو گیا ہے کیونکہ ان دونوں نے

ایک تو بات یوں شروع کی جیسے عام طور پر حالات حاضرہ پر گفتگو کی جاتی ہے اور اس میں اسلحہ سمگلروں

کے بارے میں بھی بات سے بات نکل آئے۔ دوسرے میں آپ کے علم میں لائے بغیر کوئی کارروائی

نہیں کرانا چاہتا تھا۔“ نور ایک گہرا سانس لے کر خاموش ہوا تو مونس نے ایک پل کو سوچا پھر زور دے کر کہا۔

”ان دونوں پر بالکل ہاتھ نہیں ڈالنا نور۔ انوار سے کہو کہ نصیر کے ذریعے انہیں قابو میں

رکھے۔ انہیں شبہ نہ ہو کہ ہم ان کی طرف سے الٹ ہو گئے ہیں۔ انہیں یہی بتایا جائے کہ مدت سے

یہاں سرحد پار کرنے کا ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا جس میں سمگلر ملوث ہوں۔ تم اس بارے میں شوکت اور

غلام حسین کو اطلاع دے دو تاکہ وہ ان دونوں پر اپنے آدمیوں کا کڑا سپرہ لگا دیں۔ ہمیں ان کے ایک

ایک پل کی خبر ملنی چاہئے۔ میں بھی شوکت سے بات کرتا ہوں۔“

”لیں سر۔۔۔“ نور نے مستعدی سے جواب میں کہا۔ ”انوار سے آپ خود بات کرنا چاہیں تو

میں اسے بتا دوں سر۔“

”نہیں۔ بس تم میرا پیغام اسے پہنچا دو کہ پوری طرح محتاط رہے۔“

”اوکے سر۔“

”اور کچھ؟“

”نور۔۔۔“ نور نے کہا اور مونس نے رابطہ کاٹ دیا۔

یہ بڑی اہم بات تھی جسے سرحدی چوکی کے باہر ایک بیٹوں نے کچھ کیا تھا۔ ورنہ اگر نصیر اسے عام سی

بات سمجھ کر صرف یہی کہہ دیتا کہ پچھلے دنوں دو سمگلر پکڑے گئے تھے تو خبر وہاں تک پہنچ جاتی جہاں اسے

نہیں پہنچنا چاہئے تھا اور مونس کو پورا یقین تھا کہ وہ رپورٹ کو کسی ایسے شخص کے کہنے پر یہ معلومات حاصل

کرنا چاہتے ہیں جسے خالق نگر میں امن بر الگ رہا ہے۔

اس کے دماغ میں بیلا کے حوالے سے جو ابھن کھڑی ہو گئی تھی اسے سلجھانے میں اسے پوری

رات لگ گئی۔ صبح فجر کے بعد کہیں جا کر اس نے بستر کی شکل دیکھی مگر اب نورے کی اطلاع نے اسے

ایک دم یقین دلادیا کہ بہت جلد کچھ ایسا ہونے والا ہے جو اب اس معاملے کو انجام تک لے جائے گا۔

”اوہ۔۔۔“ مونس کے ہونٹ پر خیال انداز میں سکر گئے۔ ”اس کا مطلب ہے کہ آج کی رات بہت اہم ہے۔“

”مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے مونس بابو کہ آج رات کچھ ہونے والا ہے۔ آپ پوری طرح انتظام کر لیجئے۔“

”انتظام تو ایسا ہے پروین کہ دشمن سوچ بھی نہیں سکتا۔ اندھیرے کے ایسے تیر چھوڑ رکھنے کا بندوبست ہے کہ۔۔۔“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔ پھر اس کی جانب نظر اٹھائی۔ ”تم حویلی میں دوپہر کا کھانا تیار کرنے کے بعد فوراً ہی بیلا کے پاس لوٹ جانا اور سب سے اہم بات۔۔۔“ مونس نے ہاتھ سینے پر باندھ لئے۔ ”رات ہوتے ہی تم بیلا کے کوارٹر سے ہٹ جاؤ گی۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی جو کچھ بھی کرنا چاہتا ہے اسے کھل کر کرنے دیا جائے۔“

”اور اگر کماری مجھے بیلا کے پاس چھوڑ کر کہیں جانا چاہے تو؟“ کسی خیال کے تحت پروین نے پوچھا تو مونس چونک اٹھا۔

”یہ تم نے بہت اچھا کہا پروین۔۔۔ ایسا ہو بھی سکتا ہے اور اگر ایسا ہی ہو تو تم بیلا کے پاس رہو گی اور مجھے موبائل پر بل کی صورت حال سے آگاہ کرو گی۔“ اس نے دراز سے ایک چھوٹا سا بڑا خوبصورت موبائل فون نکال کر اس کی جانب بڑھا دیا۔ ”اس میں میرا رزاقی کا اور دوسرے تمام ایسے اہم گھرنا موبائل کے ساتھ فیڈ ہیں جن سے تمہارا رابطہ کرنا ضروری ہو سکتا ہے۔ موبائل آبریت کرنا تو جانتی ہو نا؟“ آخر میں اس نے پوچھا۔

”اب تو چوہڑے چماروں نے بھی یہ سوغات لے رکھی ہے مونس بابو۔ لالو نے چند دن پہلے ہی لے کر دیا تھا مگر میرا سیٹ جلدی میں گھر پر رہ گیا۔ میں آسانی سے اسے چلا لوں گی۔ آخر کو میٹرک پاس ہوں۔“ پروین نے ایسی سادگی سے کہا کہ مونس کی ہنسی نکل گئی۔

”میں نے جھوٹ کہا کیا؟“ پروین نے سیٹ کا جائزہ لیا اور مسکراہٹ دبا کر بھولپن سے پوچھا۔

”نہیں۔“ مونس نے سر ہلایا۔ ”مگر لگا ایسے ہی جیسے تم نے چوہڑا چار مجھے کہا ہو۔“

”استغفر اللہ۔۔۔“ پروین نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ”میں ایسا کیسے کہہ سکتی ہوں مونس بابو۔ اس طرح تو میں خود بھی چوہڑی چمارن ہو جاؤں گی۔ آپ نے مجھے بہن جو کہا ہے۔“ اور اس کی بات پر مونس کھکھلا کر ہنس پڑا۔ ساتھ ہی پردہ یں کی بھی ہنسی چھوٹ گئی۔

”بڑے دنوں کے بعد ہنسا ہوں پروین۔“ وہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ”ڈر لگتا ہے کہیں اس کی قیمت چکانا میرے بس سے باہر نہ ہو۔“

”ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا مونس بابو۔ اب سب کچھ ٹھیک ہونے کا وقت آ رہا ہے۔ یہ میرا دل کہتا

ہے اور دل صرف وہ جھوٹ بولتے ہیں جن میں کھوٹ ہوتا ہے۔“

”سچ کہتی ہو پروین۔“ مونس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”تو میں چلتی ہوں میرے اچھے بھیا۔ اللہ آپ کو اور رزاقی بابو کو اپنے حبیب کریم ﷺ کے صدقے اپنی امان اور حفاظت میں رکھے۔“

”آمین۔“ مونس نے بے اختیار کہا۔ ”اور سنو۔“ اس نے جانے کے لئے پلٹتی پروین کو روک لیا۔ ”یہ مت سمجھنا کہ تم وہاں اکیلی ہو۔ میرے آدمی ہر وقت تمہاری رہائش گاہ کے ارد گرد موجود رہتے ہیں۔ کسی بھی خطرے کے وقت تم انہیں اپنے پاس پاؤ گی۔ اس لئے قطعاً گھبراہٹ نہ مت۔“

”مگر میں نے تو وہاں کسی کو نہیں دیکھا۔“ پروین نے حیرت سے کہا۔

”وہ جنوں کی نسل سے ہیں۔ جب چاہیں نظر آتے ہیں اور جب چاہیں چھپ جاتے ہیں۔“

مونس نے ایسی سنجیدگی سے کہا جس سے ظاہر تھا کہ وہ مذاق کر رہا ہے۔

جواب میں پروین اطمینان بھری مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھتی کمرے سے نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد چند لمحوں تک مونس کسی گہری سوچ میں گم خاموش بیٹھا رہا۔ پھر وہ اس وقت چونکا جب اس کی جیب میں پڑے موبائل کے دبائے بیٹرنے سے کسی کال کی آمد کے بارے میں بتایا۔ اس نے موبائل نکال کر دیکھا۔ غلام حسین کی کال تھی۔

”ہی۔۔۔ غلام حسین۔۔۔“ مونس بول رہا ہوں۔“ اس نے موبائل کا ریسیونگ بٹن دبا کر کان سے لگا لیا۔

”سر۔“ غلام حسین نے کہنا شروع کیا۔ ”دیو اور دیو آج صبح اپنے ڈھور ڈنگر لے کر چوکی کے ہرے میدانوں میں آنے سے پہلے نندکار سے ملے اور اسے اپنی کل کی کارکردگی کے بارے میں بتایا۔ بات صاف ہو گئی ہے سر۔ وہ باقاعدہ ان دو خود کشی کر لینے والے سمگلروں کے بارے میں چھان بین کر رہے ہیں کہ وہ خالق مگر کی چوکی پار کرنے کے بعد کہاں غائب ہو گئے۔“

”اوہ۔۔۔“ مونس نے جیسے اس کامیابی پر قلعاری ماری۔ ”یہ نندکار وہی ہے ناں جو ہندوستانی کی اکثر عورتوں کے پیچھے پڑا رہتا ہے؟“

”جی ہاں سر۔۔۔ بالکل وہی۔ اس کے پاس ذرا مال نکلتا ہے اور وہی مال اسے نکلنے نہیں دیتا۔۔۔ اب دوسری اہم خبر سر۔“

”وہ بھی کہڑا لو۔“ مونس نے جلدی سے کہا۔

”سر۔۔۔ نندکار کے ذریعے دیو اور دیو کی رپورٹ مندر کے جس شخص تک پہنچے گی اس کا نام ہے۔۔۔“

”بیلا کہاں ہے اور تم کون ہو؟“ اس نے چھوٹے ہی پوچھا۔

”بیلا کورات سے بخار ہے صاحب جی۔ میرا نام پروین ہے۔ اس کے تندرست ہونے تک میں ہی آپ کی سیوا کروں گی۔“ پروین نے اسے جی بھر کر ایک نظر دیکھا پھر اس کے لئے ناشتہ چھنے لگی۔ اس نے آج رزاتی کو کھل کر پہلی بار دیکھا تھا اور اس شاہ بلوط جیسے پر شکوہ انسان کو دیکھ کر اس کا دل نجانے کیوں بھر آیا۔ راجیہ اور جنت کا خیال اس کے دل میں نہیں بن کر ابھرا اور بے اختیار اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں داب لیا۔

رزاتی اس کی کیفیت سے بے خبر ناشتے کی میز پر آ بیٹھا۔ اس نے دوسری بار اسے نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔

”کیا کافی کا ایک کپ بنانے کے لئے بھی نہیں آ سکتی تھی وہ؟“ بچوں کی طرح منہ پھلا کر رزاتی نے کہا تو پروین کو بے طرح اس پر پیار آ گیا۔

”کافی میں بنادوں آپ کے لئے صاحب جی؟“ اس نے جلدی سے پوچھا۔

”پہلے نندی بنایا کرتی تھی۔ پھر بیلا آئی۔ اب تم۔۔۔ میں کیا روز روز بدلتے ہاتھ کی کافی پیتا رہوں گا؟“ وہ اب بھی خفا تھا۔

”مجبوری ہے صاحب جی۔ بس ایک آدھ دن میں بیلا ٹھیک ہو جائے گی تب تک آپ میرے ہاتھ کی اچھی بُری کافی برداشت کر لیجئے۔“

”تو جاؤ۔ جیسی بھی بنا سکو ایک کپ بنا کر لے آؤ۔۔۔ جلدی۔۔۔ میں ناشتے کے فوراً بعد پینا چاہوں گا۔“

”جی صاحب جی۔“ پروین الٹے پاؤں باہر نکل آئی۔

بھاگتی ہوئی کچن میں پہنچی۔ کافی کا سامان موجود تھا۔ اپنا تجسس دور کرنے کے لئے اس نے بہت تلاش کیا کہ کہیں پڑا ہوا وہ زہر مل جائے جو بیلا اب تک رزاتی کے جسم میں اتارنے کے لئے کافی میں ملائی آئی تھی مگر اسے وہاں ایسی کوئی چیز نہ ملی۔ اب اسے کیا معلوم کہ وہ پڑیا تو پولی تھین کے چھوٹے سے پیک میں بند ہر وقت بیلا کے بلاؤں میں رہتی تھی جسے اس نے گزشتہ دو پہر سوامی سے کٹ جانے کے فیصلے کے فوراً بعد فاش کر دیا تھا۔

کافی کا کپ منی ٹرے میں سجائے پروین واپس رزاتی کے کمرے میں پہنچی تو وہ ناشتہ ختم کر کے نیپکن سے ہاتھ پونچھ رہا تھا۔ اس کے سامنے کافی کا کپ رکھ کر وہ ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ رزاتی کو اس کی بنائی ہوئی کافی کیسی لگتی ہے؟

رزاتی نے خاموشی سے کافی کا کپ اٹھایا اور ایک چھوٹا سا سپ لیا۔ ادھر پروین کا سانس سینے

”سوامی دھیرج داس۔۔۔“ مونس نے غلام حسین کی بات پوری کر دی۔

”ایک سیلنٹ سر۔۔۔ بالکل صحیح سمجھے آپ۔“ غلام حسین نے شخصین آمیز لہجے میں کہا۔

”آج کا دن بہت اچھا ہے غلام حسین۔ آج صبح سے بہت اچھی اچھی خبریں آرہی ہیں۔ لگتا ہے آج کی رات معرکے کی رات ہوگی۔“

”کیا سچ سر؟“ ایک دم غلام حسین کی آواز کڑک ہو گئی۔

”ہاں غلام حسین۔ دعا کرو کہ آج رات ہماری الجھنوں کی آخری رات ہو۔“

”ایسا ہی ہو گا سر۔۔۔ اور اگر آج اچھی خبروں کا دن ہے تو تیسری خبر بھی سن لیجئے اور وہ یہ کہ ویرو اور دیوا آج بھی نصیر سے ہلکے پھلکے انداز میں اپنے مطلب کی بات اگلوانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ نصیر کو آج انوار صاحب نے خاص طور پر ان دونوں کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کے لئے فری کر رکھا ہے۔“

”ہاں غلام حسین۔ مجھے علم ہے اس بات کا۔ میں انوار الحق سے بات کر چکا ہوں۔ نصیر کو ان سے کھیلنے دو اور سنو۔۔۔ آج شام کے بعد خاموشی سے ویرو دیوا اور نند کمار کو اٹھا لو۔ میں بی ایس ون میں انہیں شام چھ بجے ملنا چاہوں گا۔“ مونس کی آواز جیسی ہو گئی۔

”او کے سر۔۔۔“ غلام حسین کو جیسے ہاتھ پیر ہلانے کا کام کا انتظار ہی تھا۔

”آج رات کے آپریشن کی تیاری کے لئے بھی شام کو نو سکس کریں گے۔“

”یس سر۔۔۔“ غلام حسین نے جواب میں جیسے سلیوٹ کھینچ مارا۔ مونس نے موبائل کان پر ہاتھ کر کلیر کاٹن دایا اور جیب میں ڈال لیا۔ اس کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں ناچ رہی تھیں۔ سب کچھ اس طرح خاموشی سے ترتیب سے سلیقے سے اپنے انجام کی طرف رواں ہو گیا تھا کہ اسے کسی بھی جگہ جھول رہ جانے کے خیال سے اول تا آخر اپنے پلان کا جائزہ لینے کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔

☆=====☆=====☆

رزاتی کے لئے آج کی رات کا انتظار کیسا عذابناک اور جان لیوا تھا یہ اسی کو علم تھا۔

آج دوسرا دن تھا کہ بیلا اس کے لئے کافی لے کر نہ آئی تھی۔ گزشتہ رات تو اس نے جیسے تیسے گزارا کر لیا مگر آج کا سارا دن اس نے بڑی مشکل سے کاٹا تھا۔ بار بار اس کا حلق خشک ہو جاتا۔ پیاس کے مارے گلے میں کانٹے سے اُگتے محسوس ہو رہے تھے مگر عجیب بات تھی کہ یہ پیاس پانی کی نہ تھی۔ اس کا جی مچل مچل جا رہا تھا کہ بیلا کے ہاتھ کی کافی پئے۔ جسم میں بڑی درد بھری سی آٹھنیں ہو رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ اسے بیلا کے ہاتھ کی بنی کافی کا نشہ لگ گیا ہے جو ہیر وڈن کے نشے کی طرح اس پر حاوی ہو چکا ہے۔ صبح ساڑھے آٹھ بجے جب بیلا کے بجائے ایک اور جوان اور خوبصورت سی لڑکی اس کے لئے ناشتہ لے کر آئی تو وہ چونکا۔

میں اٹک گیا۔ رزاتی نے کپ واپس میز پر رکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ایک لمحے کے بعد اس نے سر سینے پر جھکا لیا۔

”اچھی ہے۔“ دھیرے سے اس نے کہا تو پروین نے رکا ہوا سانس خارج کیا۔

”شکریہ صاحب جی۔“ پروین نے مسرت بھرے لہجے میں کہا اور ناشتے کے برتن اٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔ اسے رزاتی کے ”اچھی ہے“ کے دو الفاظ نے سر سے پاؤں تک سرشار کر دیا تھا۔

ادھر پروین کمرے سے نکلی۔ ادھر رزاتی نے کافی کا کپ اٹھایا اور اسے ہاتھ روم میں جا کر غصے سے فلش کر دیا۔ بیلا اور پروین کے ہاتھ کی کافی میں کوئی مناسبت ہی نہ تھی۔ نجانے بیلا کے ہاتھ میں کیا جادو تھا جو اسے نندنی کی بنائی ہوئی کافی میں بھی کبھی محسوس نہ ہوا تھا اور آج پروین کی بنائی ہوئی کافی۔۔۔ اس کا منہ یوں بن گیا جیسے اس نے کاری نیو کیچر کا گھونٹ لے لیا ہو۔ اس نے کبھی کسی کا دل نہ دکھایا تھا اس لئے پروین کو بھی یہ نہ کہہ سکا کہ آئندہ کبھی میرے لئے کافی بنانے کا تکلف نہ کرنا۔۔۔ لیکن ہوا یہ کہ کافی کے ایک ہی گھونٹ نے کچھ دیر بعد اس کی جسمانی اٹھن کو بڑی حد تک کم کر دیا۔ اسے افسوس ہونے لگا کہ اس نے جلد بازی میں کافی کیوں ضائع کر دی۔ اب پروین کو بلا کر دوبارہ کافی کی فرمائش کرنا بھی اسے اچھا نہ لگا۔ وہ کھڑکی میں کھڑا ہو کر باہر کا نظارہ کرنے لگا۔

جب سے راجیہ اور جنت والا حادثہ ہوا تھا وہ اپنے کمرے سے کم کم ہی نکلتا تھا۔ کام ایسا کوئی تھا نہیں جو ننانے کے لئے اسے ڈالوئی اور نر کے حساب سے اپنے آفس میں جانا پڑتا۔ مونٹ تھا کہ وہ سب کچھ سنبھالے ہوئے تھا۔ مونٹ کا خیال آیا تو گزرا ہوا کل اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ راجیہ اور جنت کے تہقہور اور چلبلی پن سے لبریز زندگی کی مسرتیں اور خوشیاں دامن میں بھر کر ان کے قدم بہ قدم چلتا ہوا وہ کل جس کے ایک ایک پل پر سکون ہی سکون تحریر تھا۔ مچانے وہ وقت کہاں چلا گیا؟ اس نے بڑے دکھ اور اداسی سے سوچا۔ پھر جیسے اسے اندر سے کسی نے دلا سہ دیا۔ بس آج کی رات شروع ہونے کی دیر ہے کہ اس کے لئے زندگی کی رعنائیاں لوٹ آنے کے موسم کی ابتدا ہو جائے گی۔ اس کی راجیہ لوٹ آئے گی۔ اس کا سکون، سکھ اور مسکراہٹیں لوٹ آئیں گی۔ سوامی دھیرج داس نے کہا تھا کہ وہ دوسروں کے سامنے راجیہ کے لوٹ آنے کی کیا توجیہ پیش کرے گا؟ اور اس نے یکے من سے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ راجیہ کو لے کر فوری طور پر یہاں سے بیرون ملک چلا جائے گا۔ شاید یہی وہ راستہ تھا جسے سوچ کر سوامی نے کہا تھا کہ وہ اس معاملے میں بھی رزاتی کی مدد کرے گا۔

سارا دن اس نے کمرے میں آنے والی رات کے بارے میں سوچتے اپنے خیالوں کو بٹتے ادھیڑ گزے گزار دیا۔ دوپہر کا کھانا بھی پروین ہی لے کر آئی اور رات کا کھانا اس نے اسے جلدی لے آنے کو کہہ دیا۔ پروین جانتی تھی کہ وہ کس لئے جلدی کھانا کھا لینا چاہتا ہے تاہم اس نے سوائے تعمیل کے

کچھ کیا نہ کہا۔ رات کا کھانا رزاتی نے آٹھ بجے ہی کھا لیا اور پھر پروین کی بنائی ہوئی کافی کا کپ لئے بستر میں گھس گیا۔ جیسے تیسے اس نے کافی زہر مار کی تاکہ بدن کی ٹوٹ پھوٹ میں جو کی آسکے اس سے محروم نہ رہے۔۔۔ اور واقعی کافی نے اس کے جسم کو خاصا سکون بخش دیا۔ کافی ختم کر کے وہ اٹھا۔ دروازہ اندر سے بند کیا۔ نائٹ بلب جلایا اور دوبارہ بستر میں آ گیا۔ اب اسے رات کے اس پہر کا انتظار تھا جب وہ خاموشی سے سوامی کے پاس جانے کے لئے کھڑکی کے راستے باہر کود جاتا۔

☆=====☆=====☆

پروین دوپہر کے کھانے کے کام سے فارغ ہو کر جب حویلی سے نکلنے لگی تو بی بی نے اسے خاص طور پر کہا کہ وہ اس کی طرف سے بیلا کو پوچھے اور اگر ڈاکٹر وغیرہ کی ضرورت ہو تو فوراً خبر کرے۔ پروین تقریباً ڈیڑھ بجے حویلی سے واپس بیلا کے کوارٹر پہنچی تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی کہ بیلا کماری کے سینے سے کمر لٹکے بستر پر نیم دراز چائے پی رہی ہے۔ اسے دیکھ کر کماری مسکرا دی۔ بیلا نے کپ ہونٹوں سے ہٹا کر اس کی جانب دیکھا اور آگے ہو کر اٹھنا چاہا۔

”آں ہاں۔۔۔“ پروین نے اسے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔ ”آرام سے چائے پیو بیلا جانی۔ شکر ہے تمہاری آنکھ کھلی۔۔۔ تم نے تو ہمیں ڈرا ہی دیا تھا۔“ وہ اس کے پاس پہنچ کر موزے پر بیٹھ گئی۔ ”اب اس کو بخار کیا ہے؟“ اس نے کماری سے پوچھا۔

”بخار تو اترا گیا ہے پروین۔“ کماری نے مطمئن لہجے میں کہا۔ ”ابھی چائے کے ساتھ زبردستی اسے دو سلاکس کھلا چکی ہوں ورنہ تو یہ بھوک ہڑتال پر مبنی بیٹھی ہے۔ اب دس منٹ بعد شربت دوں گی اسے تاکہ دوبارہ بخار نہ آجائے۔“

”کچھ نہیں ہو گا اب اسے۔“ پروین نے تسلی دینے کے انداز میں کہا۔ ”یہ بتائیے کماری جی۔ اس کا بخار اترا کتنے بجے؟“

”بس تمہارے جانے کے بیس پچیس منٹ بعد ایک دم اس کا سارا جسم ٹھنڈا پڑ گیا۔ میں تو گھبرا ہی گئی مگر دو تین منٹ بعد اس نے آنکھیں کھول دیں تو میری جان میں جان آئی۔“

”مطلب یہ کہ تقریباً گیارہ بجے کا وقت تھا۔“ پروین نے مسکرا کر پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ آں۔۔۔ لگ بھگ یہی وقت ہو گا۔“ کماری نے اندازے سے بتایا۔ ”مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“

”اس وقت میں نے بیلا کے لئے ایک بابے سے دعا کرائی تھی اور مجھے یقین تھا کہ اسی وقت بیلا کا بخار اترا گیا ہو گا۔“

”کمال ہے۔“ کماری نے حیرت سے کہا۔ ”اس قدر پہنچا ہوا ہے وہ بابا۔“

”ہاں۔“ پروین نے بیلا کی جانب دیکھا جو اسے اچھنبے سے تک رہی تھی۔ ”اس کی ایک ہی پھونک سے بیلا جی اٹھی، تو میں خود دیکھ رہی ہوں۔“

”کون ہے وہ بابا؟“ بڑی کمزوری آواز میں اس نے پوچھا تو پروین کی ہنسی نکل گئی۔
”تم چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤ تو ملو ادوسں گی تم سے۔ ابھی تو آرام کرو۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
”ارے۔۔۔“ کماری نے جلدی سے کہا۔ ”بیٹھو ناں۔ ابھی تو آئی ہو۔ ابھی چل دیں۔“
”نہیں کماری جی۔ میں تھک گئی ہوں۔“ پروین نے مصنوعی انگڑائی لی۔ ”بیلا کے حصے کا کام کرتے کرتے جسم اکڑ گیا ہے۔“

”دید ی۔“ بیلا نے شرمندگی سے کہا۔ ”میرے کارن آپ کو بہت کشت اٹھانا پڑا۔“
”تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔ نو۔ رزاقی بابو کو تمہارے ہاتھ کی کافی کی طلب نے بڑا بے حال کر رکھا ہے۔ باقی کام تو میں نمنا ہی ملوں گی مگر انہیں کون سمجھائے کہ تم بیماری کے سبب ایک کپ کافی بنانے کے لئے بھی حویلی نہیں آ سکتیں۔“

”ایسا کہا کیا انہوں نے؟“ بیلا نے بیتابی سے پوچھا۔
”ہاں۔“ پروین نے صاف گوئی سے ساری بات بتادی۔
”کماری موسیٰ۔ میں ابھی جا رہی ہوں حویلی۔“ بیلا نے کبل اتار پھینکا۔
”ارے ارے۔۔۔ کیا کر رہی ہو گیلی۔“ پروین نے لپک کر اسے زبردستی بستر پر لٹا دیا۔ ”میں نے انہیں کافی بنا کر پلائی۔ انہوں نے اسے پسند بھی کی۔ ایسی فکر کی کوئی بات نہیں کہ تم دڑنگے مارتی ہوئی اس حال میں حویلی پہنچ جاؤ۔ ابھی آرام کرو۔ ایک دو دن میں جب بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی تو رزاقی بابو کی کافی اور مونس بابو کی چائے تم ہی بناؤ گی۔ میں تو فوراً دستبردار ہو جاؤں گی کچن سے۔ بڑا کام ہے بابا وہاں۔“ پروین نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

”پروین ٹھیک کہہ رہی ہے بیلا۔“ کماری نے بھی تائیدی کی۔ ”ابھی تمہارا ایک دو دن کام میں الجھنا اچھا نہیں ہے۔“

ان دونوں نے اسے ایسا مجبور کیا کہ وہ بادل نخواستہ پھر بستر پر دراز ہو گئی۔ تاہم اس کے انداز سے لگتا تھا کہ اسے جو نبی موقع ملا وہ حویلی کی طرف اٹھ دوڑے گی۔

☆=====☆

مونس نے اپنے پیچھے آٹو میٹک ڈور کو بند ہوتے محسوس کیا اور ہیمنٹ سیل ون کی سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔

کئی کمروں پر مشتمل یہ ایسی جدید سہولیات پر مشتمل ساؤنڈ پروف جگہ تھی جس سے خاص خاص مواقع پر ہی کام لیا جاتا تھا۔ ملازموں اور محرموں کی عارضی حوالات سے لے کر ان کی زبان کھلوانے کے لئے چھوٹے موٹے عقوبت خانے تک کا یہاں پورا انتظام تھا۔

سیڑھیوں کے بعد ایک لمبا کارڈیڈور تھا جس کے دونوں طرف کمرے بنے ہوئے تھے۔ مونس نے اپنے پیچھے آتے غلام حسین کی جانب مڑے بغیر پوچھا۔
”کس کمرے میں ہیں وہ؟“

”تین نمبر میں سر۔“ وہ پیچھے ہی سے بولا۔
دائیں ہاتھ دوسرے کمرے کا نمبر تین تھا۔ مونس وہاں رکا تو غلام حسین نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ مونس نے اندر قدم رکھا تو وہاں موجود چار آدمیوں کی ایڑیاں بچ اٹھیں۔ جن میں شوکت بھی تھا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

”سر۔۔۔“ اس نے سلیوٹ کرتے ہوئے مونس کو آنکھ سے اشارہ کیا۔ مونس نے اس کے اشارے پر بائیں جانب دیوار کے ساتھ رکھی لوہے کی ایسی کرسیوں پر بیٹھے تین افراد کی جانب نظر اٹھائی جن کے پائے زمین میں گڑے تھے۔ تینوں کے ہاتھ کلائیوں پر سے کرسیوں کے ہتھوں پر اور پیر کرسیوں کے پایوں پر موجود کڑوں میں جکڑے ہوئے تھے۔

مونس کو دیکھتے ہی ان تینوں کے چہرے تاریک پڑ گئے۔ خوف جو پہلے ہی ان کی آنکھوں سے جھانک رہا تھا اب وحشت میں بدل گیا۔ مونس کا ہر قسم کے تاثر سے عاری چہرہ ان کے لئے وعید کا مظہر نظر آ رہا تھا۔

بالکل سامنے دیوار کو گھورے جارہے تھے مگر ان کی آنکھوں سے آنسو برابر بہہ رہے تھے۔ ایسی ٹوٹکی دیکھ کر مونس اور شوکت مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

”اب کیا کہتے ہو نندکار؟“ ایک پل بعد مونس نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔ ہونٹ کانٹے ہوئے نندکار نے سر جھکا لیا۔ اس کے چہرے پر مردنی چھانگی اور رنگ سرسوں جیسا پیلا پڑ گیا۔ ہولے ہولے اس کا بدن کپکپا رہا تھا یہ سب لوگوں نے محسوس کیا۔

”خاموش رہنے سے کام نہیں چلے گا نندکار۔“ مونس نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”ویر اور دیوا اپنی غداری کا اقرار کر چکے ہیں جس میں تم برابر کے شریک ہو۔ تم اپنے جرم کو نہ بھی تسلیم کرو تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی زبان کھول دو۔ ہو سکتا ہے اس سے تمہاری سزا میں کچھ تخفیف ہو جائے۔۔۔ بولو۔ تم لوگ یہاں کیا کھڑا گ پھیلا نا چاہ رہے ہو؟“

چند لمحوں تک نندکار نچلا ہونٹ چباتا رہا جیسے کوئی فیصلہ کرنے کی کوشش میں ہو پھر اس نے دھیرے سے کہا۔

”جسے یہ دونوں غداری کہہ رہے ہیں میں اسے دلش بھگتی کا نام دیتا ہوں مونس بابو۔ میں نے کوئی غداری نہیں کی نہ ہی مجھے اپنے کئے پر کوئی پچھتاوا ہے۔ میں نے جو کیا اپنے من سے کیا اور اپنے مہمان بھارت کے لئے۔۔۔“

اور شوکت کا ہاتھ گھوم گیا۔ باقی کے الفاظ اس کے منہ ہی میں رہ گئے۔ کمرے میں کسی بڑے جاندار پٹانے کے پھوٹے جیسی چٹاخ کی زوردار آواز گونجی۔ نندکار کا بایاں گال باقاعدہ پھٹ گیا۔ ہونٹوں سے خون بہہ نکلا۔ دو تین دانت ٹوٹ کر اس کے حلق میں جا گرے ہوں گے جو وہ اوغ اوغ کی بے ربط آوازیں نکالتا ہوا بائیں طرف کو جھک گیا مگر چونکہ ہاتھ پاؤں جکڑے ہوئے تھے اس لئے محض بل کھا کر رہ گیا۔

”تیرے مہمان بھارت کی تو۔۔۔“ شوکت نے گرجتے ہوئے پوری قوت سے دوسرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ نندکار کی تشریف بڑے زور سے گھوم کر واپس اپنی جگہ پر آئی اور زبان کٹ کر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں تکلیف کی شدت سے آنسو آ گئے۔ گریبان اور پھر ناف تک اس کا کرتا منہ سے بہتے لہو میں تر بتر ہونے لگا۔ مونس جواب تک خاموش کھڑا تھا اس نے شوکت کو دوسرے چھتر کے بعد ہاتھ اٹھا کر مزید خبر گیری سے روک دیا۔

”کتے کے پلے۔ انسان جہاں جہنم لیتا ہے جہاں رہتا ہے وہ اس کے لئے سب سے مقدس جگہ ہوتی ہے۔ اس کی آن بان اور حفاظت کے لئے وہ کٹ مرتا ہے۔ تو یہیں پلا بڑھا اور اسی جگہ کی تباہی پر کمر باندھ لی۔ تیری بوٹیاں اگر چیلوں کو کوں نہ ڈال دیں تو میرا نام۔۔۔“

”ہوں۔۔۔“ مونس ان کے سامنے چار کا اور انہیں بڑی سردنگا ہوں سے گھورنے لگا۔ پھر اس نے درمیانی کرسی پر جکڑے بیٹھے شخص کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ”تم نندکار ہونا؟“

”جی۔۔۔ جی مہاراج۔۔۔“ وہ گھگیا کر بولا۔ ”میں بہت شریف آدمی ہوں جی۔ یہ لوگ نہ جانے کس کارن مجھے یہاں اٹھلائے ہیں۔“

”کارن بھی بتاتے ہیں تمہیں۔ پہلے ذرا تعارف تو ہو جائے۔“ مونس نے نندکار کے دائیں طرف والے شخص پر نگاہ ڈالی۔

”یہ دیوا ہے سراور یہ ویرو۔“ غلام حسین نے بائیں طرف رونی شکل بنائے بیٹھے شخص کا نام بھی بتا دیا۔ ”یہ دونوں قبول کر چکے ہیں کہ انہوں نے سوامی دھیرج داس کے کہنے پر نصیر سے ٹوہ لینے کی کوشش کی تھی۔ سوامی نے انہیں دس دس ہزار روپے دیے تھے اس کام کے لئے۔“

”ارے۔۔۔“ مونس نے حیرانی سے کہا۔ ”اتنی جلدی بک دیا انہوں نے سب کچھ۔“

”جی سر۔۔۔“ شوکت ذرا سا مسکرایا۔ ”ان دال بھات کھانے والوں کا پیشاب تو دو ہی تھپڑوں کے بعد خطا ہو گیا تھا سر مگر یہ نندکار ذرا اڑا ہوا ہے اپنی بات پر۔ یہ کہتا ہے کہ اس کا سوامی سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ ہی اسے ویر اور دیوا کے کسی معاملے کی خبر ہے۔“

”جھوٹ بکتر ہے یہ مہاراج۔“ اچانک زوردار روتے ہوئے دیوا نے سراور اٹھایا۔ ”یہ سب جانتا ہے۔ یہی ہمیں سوامی کے پاس لے کر گیا تھا۔ یہ سوامی نا کھا ص آدمی ہے۔ اسے سب کچھ ہے کہ سوامی یہاں کیا نالٹ کر چائے بیٹھا ہے۔“

”نالٹ۔۔۔؟“ حیرت سے مونس نے ان تینوں کو باری باری دیکھا۔ نندکار کا چہرہ دیوا کی بات پر ایک دم تاریک پڑ گیا۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر انہیں تر کرنا چاہا۔ پھر تھوک نکل کر رہ گیا۔

”جی مہاراج۔۔۔ اسی کے بہکاوے میں آ کر ہم سوامی کے پاس چلے گئے۔ اس نے ہم دونوں کو دس دس ہزار روپے دیے کہ دو آدمیوں کا پیہ لگاؤ جو کچھ دن پہلے دنیو گولی کے ساتھ سیما پار آئے مگر پھر گائب ہو گئے۔“ دیواروئے جارہا تھا اور یکے جا رہا تھا۔ ”اس نے ہمیں لوبھ دیا تھا مہاراج کہ سوامی اور روپے بھی دے گا۔ ہم گریب لوگن اس کے چھل میں آ گئے سرکار اور یہ پاپ کر بیٹھے۔ ہمیں ماچہ کر دیو سرکار۔ ہم آئندہ کبھی ایسا گندا کام نہیں کریں گے جس سے گداری کی بو آتی ہو۔“ وہ چپ ہوا تو ویر بھی اس کی بھین بھین میں شامل ہو گیا۔ وہ دونوں یوں رو رہے تھے جیسے ابھی ابھی ان کی میا کی اترھی اٹھی ہو۔

”خاموش۔۔۔“ غلام حسین نے ایک قدم آگے بڑھ کر چھتر مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا تو ویر اور دیوا ایک دم یوں چپ ہو گئے جیسے کسی کھلونے کی چابی اچانک ختم ہو گئی ہو۔ اب وہ دونوں ہونٹ بیچنے

”وہ یہاں خالق نگر میں۔۔۔ مندر بنانے کا منصوبہ لے کر آیا ہے۔“

یوں محسوس ہوا جیسے وہاں کوئی بم پھٹا ہو۔ غلام حسین کا دماغ بھک سے اڑا تو شوکت کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ باقی کے تین آدمیوں کو بھی جیسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ رہ گیا مولنس۔۔۔ تو وہ باقاعدہ لڑکھڑا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی نگاہوں میں کڑکتی جلیوں کے سے جھماکے ہو رہے تھے اور وہ ایک ننگ مندر کا کوہے یقینی سے گھورے جا رہا تھا۔

پھر سر جھکائے مندر کا بولتا رہا اور وہ سرزدہ سے اس کی بات سنتے رہے۔ اتنا بڑا منصوبہ۔۔۔ اتنی بڑی سازش۔۔۔ مولنس کو بڑی مشکل سے اس پر اعتبار آیا کہ وہ بروقت ایک بہت بڑی ناشدنی سے بچ گئے ہیں۔

”اوہ میرے خدا۔۔۔“ مندر کا خاموش ہوا تو مولنس نے پیشانی مسلتے ہوئے اپنی جگہ چھوڑ دی۔
”سر۔۔۔“ شوکت نے اسے باہوں میں سنبھال لیا۔ ”کیا ہوا سر؟ آپ کی طبیعت۔۔۔“
”میں ٹھیک ہوں شوکت۔ بالکل ٹھیک ہوں۔“ مولنس نے اس کا بازو تھکا۔ ”بس۔۔۔ ایسی خوفناک حقیقت سے پالا پڑا ہے کہ میں لڑکھڑا کر رہ گیا۔“ مولنس کے لبوں پر پھینکی سی مسکراہٹ ابھری۔
”یہ ہندو۔۔۔ یہ پوری قوم حرامزادی ہے سر۔۔۔“ نفرت سے غلام حسین نے کہا اور قہر آلود نظروں سے ان تینوں کو دیکھ کر دانت پیسنے لگا۔ ”ان کی جان بخشی کر کے آپ نے۔۔۔“ وہ کہتے کہتے لڑکھڑا گیا اور ہونٹ کاٹنے لگا۔
وہاں موجود ان پانچوں میں سے کسی کا بھی بس نہ چل رہا تھا کہ مندر کا دیر و اور دیر واپر بھوکے کتے پھوڑ دیتا۔

”میں نے ان کی جان بخشی کا ضرور کہا تھا غلام حسین۔۔۔ ساتھ ہی یہ بھی تو کہا تھا کہ میں انہیں ایسی سزا دوں گا کہ یہ نہ زندوں میں رہیں گے نہ مردوں میں۔“ اچانک مولنس کی آواز میں وہی درندگی عود کر آئی جس نے چند لمحے قبل اسے اور شوکت کو خاموش کر دیا تھا۔

”مہاراج۔۔۔“ بیک وقت دیر و اور دیر واپر پڑے۔ مندر کا نے بھی ورم آلود آنکھوں کے ساتھ گھبرا کر مولنس کی جانب دیکھا۔

”ان تینوں کو دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دینے کا انکشن دے دو۔۔۔“ مولنس کہہ کر پلٹ گیا۔
”کل رات انہیں ان کی بستی میں پھینک دینا۔۔۔ ان پاگل کتوں کو زیادہ دیر اپنے ہاں رکھنا ٹھیک نہیں۔“

”سر۔۔۔“ شوکت اور غلام حسین کی ایڑیاں بج اٹھیں اور چہروں پر ایسا سکون تیر گیا جس میں دلی اطمینان جھلک رہا تھا۔

”مہاراج۔۔۔“ دیر و اور دیر واپر کو بات کی کچھ کچھ سمجھ آئی جبکہ مندر کا پوری بات سمجھ گیا۔ اس کے

”نہ نہ شوکت۔ ایسا کچھ مت کہو جس پر ہم قائم نہ رہ سکیں۔ ان کے لئے سزائیں نے سوچ رکھی ہے۔ خالق نگر سے بھی زیادہ یہ میرے رزاقی کے مجرم ہیں۔ ہمارے دین کے مجرم ہیں۔ یہ صرف خالق نگر کے مجرم ہوتے تو میں انہیں حکومت وقت کے حوالے کر دیتا مگر انہوں نے تو میرے رزاقی کو دکھ دیا ہے۔ اسے کھلونا بنا کر اس کے جذبات کے ساتھ ہمارے دین کے ساتھ کھلوا کر کیا ہے۔ اور یہ تو زمین و آسمان جانتے ہیں کہ رزاقی کے دشمن کو مولنس معاف کر دے یہ اس کے ہاتھ کی لکیروں میں کہیں نہیں لکھا۔ انہیں تو میں ایسی خوفناک سزا دوں گا کہ یہ نہ زندوں میں رہیں گے نہ مردوں میں۔ موت ان سے یوں دور بھاگے گی جیسے اس وقت رحم ان سے دور ہے۔“

”مہاراج۔۔۔“ جو رہم تو اپنے پاپ کا اقرار کر چکے ہیں۔ ہمیں تو ماپھ کر دیجئے۔ ہمیں سجانہ دیجئے۔ ہم دوبارہ کبھی ایسا نہیں کریں گے مہاراج۔۔۔“ دیو ایک دم بلبلایا تو ویر بھی اس کی آہو زاری میں دھاڑیں مارتا ہوا شریک ہو گیا۔

”میں۔۔۔ میں سب کچھ بتانے کو تیار ہوں مولنس بابو۔۔۔“ مندر کا نے بڑی مشکل سے سراٹھایا اور لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔ ”بس آپ میری جان بخش دیجئے۔“ دو ہی تھپڑوں میں اس کی ساری دلش بھگتی ہوا ہو گئی۔

”بخش دی۔“ مولنس نے ایک پل کی دیر کے بغیر یوں کہا جیسے اسے مندر کا نے اسے الفاظ کی پہلے سے توقع تھی۔

”سر۔۔۔“ شوکت اور غلام حسین نے بیک وقت کہا اور بڑی اضطرابی نظروں سے مولنس کی جانب دیکھا۔ جیسے انہیں مولنس کی اس بات سے اختلاف ہو۔

”میں نے کہہ دیا تو کہہ دیا شوکت۔ ان کی جان نہیں لی جائے گی۔“ مولنس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ اس کا لہجہ بڑا عجیب سا ہو رہا تھا۔ شوکت اور غلام حسین اس کی آواز میں چھپی درندگی کو محسوس کر کے ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔

”بولو۔۔۔“ سچ بتاؤ کیا ہو رہا ہے یہاں؟ یہ سوچ کر زبان کھولنا کہ تمہاری زبان سے نکلا ہوا جھوٹ کا ایک لفظ میری دی ہوئی رعایت واپس لینے کے لئے کافی ہو گا۔“ مولنس نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھتے ہوئے کہا۔

”سو امی۔۔۔ دھیرج۔۔۔ داس۔۔۔“ مندر کا نے انک انک کر کہنا شروع کیا۔ ایک تو اس کی زبان کٹ گئی تھی۔ دوسرے دانت ٹوٹ جانے کے باعث اسے بولنے میں دقت ہو رہی تھی۔ مولنس شوکت غلام حسین اور باقی کے تین آدمی پوری طرح سے اس کی طرف متوجہ تھے جبکہ دیر و اور دیر واپر اٹھوڑیاں سینے پر ٹکائے بغیر آنسوؤں کے سسکیاں لے رہے تھے۔

جانتی تھی کہ آج کی رات کچھ ہونے والا ہے۔ کیا ہونے والا ہے؟ یہ تو اسے پوری طرح علم نہ تھا مگر اتنا تو علم تھا ہی کہ جو بھی ہونے والا ہے اس کا تعلق صرف رزاتی سے ہے۔

دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے کارڈ اور پارکیا اور حویلی سے نکل کر بیلا کے پاس چلی آئی جس کی تیمارداری میں کماری نے اپنی جان ہلکان کر لی تھی۔ اس وقت بھی وہ بیٹھی اس کا سر دبا رہی تھی۔ پروین کو دیکھتے ہی بیلا نے اپنا ہاتھ کماری کے سر دباتے ہاتھ پر رکھ کر اسے مزید مشقت سے روک دیا۔

”دیکھو پروین۔ کماری موسیٰ باز نہیں آ رہی۔“ اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔
”کیا ہوا؟“ پروین مسکرائی اور بستر کے قریب چلی آئی۔ ”کس بات سے باز رکھنا چاہتی ہو تم انہیں؟“

”دیکھو ناں۔ اپنی پرواہ کئے بغیر کل سے میرے لئے اپنی جان ہلکان کر رہی ہے۔ اب بھی میں کب سے کہہ رہی ہوں کہ بس کرو بس کرو مگر یہ ہے کہ سنتی ہی نہیں۔ اس کے ہاتھ بھی نہیں تھکتے میری سیوا کرتے کرتے۔“

”اچھا۔ تو یہ بات ہے۔“ پروین ہنسی۔ ”ارے بھئی۔ تم تو خوش قسمت ہو کہ ایسی موسیٰ ملی ہے تمہیں۔ ورنہ تو لوگ کسی کی مشکل میں آکھ بچا کر نکل جاتے ہیں۔“
”تم تو بھئی ہو بیلا۔“ کماری نے دوسرا ہاتھ اس کے چہرے پر پھیر کر اس کی زلفیں سمیٹتے ہوئے پیار سے کہا۔ ”کل کیا ہو جائے کون جانے۔ آج تو مجھے اپنی سیوا کر لینے دو۔“ ایک دم اس کی آواز بھگ سی گئی۔

”کل کیا ہونا ہے کماری موسیٰ؟“ ایک دم بیلا نے اس کا ہاتھ ہوا ہاتھ چوم لیا اور اٹھ بیٹھی۔ ”تمہیں کچھ ہونے سے پہلے میں اس دنیا کو آگ نہ لگا دوں۔“ وہ اس سے لپٹ گئی اور بچوں کی طرح سسکنے لگی۔
”میں نے کہا ناں تم بھئی ہو۔“ کماری نے اسے سینے میں چھپا لینے کی کوشش کرتے ہوئے اس کے چہرے اور ماتھے کے کتنے ہی بوسے لڈالے۔ ”میں کہاں سے اتنی قیمتی ہو گئی کہ تم میرے لئے ساری دنیا کو ہضم کرنے چل پڑیں۔“ بڑی درد بھری مسکراہٹ تھی جو کماری کے ہونٹوں پر لہرائی۔ پھر وہ پروین کی جانب دیکھ کر بولی۔ ”اسے سمجھاؤ پروین۔ کیسی دیوانیوں جیسی باتیں کر رہی ہے۔“
”میں اسے کیوں سمجھاؤں کماری جی۔“ پروین نے ان دونوں کے پیار کا یہ انداز دیکھا تو اندر سے موم کی طرح پگھل گئی۔ ”محبت کرنے والوں کے درمیان میں کیوں آؤں؟ یہ جو کہہ رہی ہے اس کے دل کی آواز ہے۔ آپ اسے سن رہی ہیں اور آپ جانتی ہیں کہ یہ سچ کہہ رہی ہے۔ آپ کی آنکھوں کی نمی اس بات کا ثبوت ہے کہ بیلا سے آپ کا پیار کس انتہا کو چھو رہا ہے۔“

حلق سے ”مونس بابو“ کی چیخ نکلا نکلی۔
”ایسا نہ کریں مونس بابو۔ ہمیں پاگل کر کے آپ کو کیا ملے گا؟ آپ مجھے جان بخش دینے کا وجہ دے چکے ہیں۔“ اس کا حلق پھٹ گیا۔

”میں نے تمہاری جان نہیں لی تمہارا۔۔۔ میں نے اپنا وعدہ کہاں توڑا ہے؟ تم لوگوں نے جو غدار کی اس کی سزا دی ہے اور بس۔“ وہ دروازے کی جانب چل پڑا۔

”مہاراج۔۔۔“ ویرو اور دیوا اب سمجھے کہ انہیں کیا سزا دی جا رہی ہے۔ ”ہمارے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں مہاراج۔ ہم پر دیا کیجئے۔۔۔“ وہ گڑ گڑانے لگے۔

”خالق مگر میں بسنے والا ہندو ہو یا مسلمان۔۔۔ اس کی دیکھ بھال ہمیشہ سے حویلی والوں کی ذمہ داری رہی ہے۔ تمہارے بال بچوں کو بھی کبھی کوئی دقت نہیں ہوگی۔ بے فکر ہو کر پاگل ہو جاؤ۔“ بے رحمی سے بڑے سرد لہجے میں مونس نے باواز بلند کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

”مہاراج۔۔۔“ ان تینوں کی چیخیں کمرے میں گونجنے لگیں۔ آنسو دھاروں دھار بہہ نکلے۔ وہ ہاتھ پیر آزاد کرانے کے لئے چھلنے لگے۔ حلق پھاڑ پھاڑ کر ”مونس بابو“ کو آوازیں دینے لگے مگر وہ تو اپنا فیصلہ سنا کر جا چکا تھا۔

پھر غلام حسین شوکت اور باقی کے تینوں آدمی بھی ان کی آواز سنا کر چیخیں اٹھائیں اور آنسوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے یوں کمرے سے نکل گئے جیسے وہ سب کے سب بہرے ہوں۔ کچھ نہ سن سکتے ہوں۔۔۔ اور یہ تو ہونا ہی چاہئے تھا کہ اپنے وطن کے دشمنوں کے لئے ان کے کان بے سماعت اور آنکھیں بے بصر ہو جاتیں۔ انہیں دکھائی دیتا تو صرف یہ کہ ان کا وطن غداروں دشمنوں اور ایجنٹوں سے پاک کس طرح ہو سکتا ہے؟

☆=====☆=====☆

رات کے نونچ چکے تھے۔

پروین ابھی ابھی بیلا کے ہاں سے نکل کر اپنے کوارٹر میں آئی تھی۔ شہزادے کو وہ آج بی بی کے پاس سونے کے لئے چھوڑ آئی تھی۔ بی بی نے کچھ نہ پوچھا کہ وہ شہزادے کو اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جا رہی۔ اسے تو رات کو گرم گرم بستر میں گھس کر شہزادے کی ننھی ننھی معصوم باتوں کا مزہ لینے کا موقع ہاتھ آیا تھا۔ اس لئے اس نے فوراً ہی شہزادے کو گود میں بٹھالیا۔ شہزادے نے بھی یوں اس کے سینے سے لگ کر انگوٹھا منہ میں لے لیا جیسے اسی کا سا سودھرا ہو۔ پروین مطمئن ہو کر اٹھی۔ رزاتی کو کافی کا کپ پہنچایا جو بڑی بیتابی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ کافی کا کپ تپائی پر رکھ کر جو نبی وہ باہر نکلی رزاتی نے کمرے کا دروازہ بند کر کے اندر سے لاک کر لیا۔ سوچ میں ڈوبی پروین کے لبوں سے بیساختہ ایک آہ نکل گئی۔ وہ

گامت۔

”اب ایسی کوئی ضرورت نہیں پڑے گی پروین۔ بیلا اب ٹھیک ہے۔ میں بھی کل سے اس کی مٹھی چانپی کرتے کرتے تھک گئی ہوں اس لئے آج کی رات گھوڑے گدھے سب بچ کر سوؤں گی۔“

”یہ بھی ٹھیک ہے۔“ جواب میں مسکرا کر پروین نے کہا اور چل پڑی۔ ”اچھا بیلا جانی۔ صبح ملیں گے۔“ جواب میں بیلا محض سر ہلا کر رہ گئی۔ باہر کا دروازہ بند کرنے کی غرض سے کماری چھڑی ٹیکتی پروین کے ساتھ ہی کمرے سے نکل آئی۔

”میں تمہارا شکریہ ادا کر کے تمہاری محبت اور خلوص کا تول کم نہیں کرنا چاہتی پروین۔“ خارجی دروازے میں رک کر کماری نے پروین کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”میں شاید بہت جلد واپس لوٹ جاؤں۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ میرے بعد تم بیلا کا پورا پورا خیال رکھو گی۔“

”ارے۔۔۔“ پروین کا دل اچھل کر حلق میں آ رہا۔ ”آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں جیسے آج رات ہی کہیں جا رہی ہوں؟“ وہ زبردستی مسکرائی۔

”سے کب“ کیا اگل کھلا دئے کون کیا کہہ سکتا ہے پروین؟“ کماری بڑی صاف زبان بول رہی تھی۔ ”مجھے وچن دو کہ تم بیلا اور مونس بابو کے معاملے کو سلجھانہ سکیں تو اسے بگڑنے بھی نہ دو گی۔ اس پنگی کا بھرے جہان میں کوئی بھی نہیں ہے۔ یہی غم مجھے کھائے جا رہا ہے۔“ کماری کی آواز میں اداسی کا مد و جزر نہریں لے رہا تھا۔

”اگر کوئی خاص بات ہے تو آپ مجھ سے کہہ سکتی ہیں کماری جی۔ میں آپ کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچنے دوں گی۔“ پروین نے دل سے کہا۔ وہ چاہتی تھی کہ کماری اس پر کھل جائے۔

”کوئی خاص بات نہیں ہے پروین۔ خاص باتیں خاص لوگوں کی ہوتی ہیں۔ میں تو عام بھی نہیں ہوں۔ بس تم میری بیلا کا خیال رکھنا۔“ چھلک آنے والے آنسوؤں کو پلکوں کے اندر ہی روک لینے کی کوشش کرتے ہوئے کماری نے نچلا ہونٹ زور سے دانتوں میں دبایا۔

”اس کی آپ فکر نہ کریں لیکن مجھ سے وعدہ کریں کہ مجھ سے ملے بغیر یہاں سے جائیں گی نہیں۔“ پروین کا دل خشک پتے کی طرح سینے میں لرز رہا تھا۔

”کوشش کروں گی۔“ وہ سر جھکا کر بولی۔ پھر نجانے اسے کیا ہوا کہ چھڑی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ ایک دم اس نے پروین کو خود سے لپٹا لیا اور ہچکیوں سے رو پڑی۔ پروین نے اسے باہوں میں زور سے سمیٹ لیا اور بے اختیار اس کے رکے ہوئے آنسو بھی بہہ نکلے۔

”کماری۔“ پروین اس کے شانے پر سر رکھے سکی۔ ”مجھ پر اعتماد کر لیجئے۔ میں جانتی ہوں آپ کچھ کہنا چاہتی ہیں مگر کیا؟ بول دیجئے۔۔۔ من کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو پروین پرنتو۔۔۔“ کماری نے باہوں کا حلقہ بیلا کے گرد اور کس لیا۔ ”اسے ایسا کوئی مورد کہ پن نہیں کرنا چاہئے جس سے اس کی جان جو کھوں میں پڑ جائے۔“

”ہاں۔ آپ کی اس بات سے میں اتفاق کرتی ہوں۔ بیلا کو اپنی جان سے کھیلنے کا اس لئے بھی کوئی حق نہیں کہ اس کی زندگی اکیلے اسی کی تو نہیں ہے ناں۔ اس پر کسی اور کا بھی حق ہے۔“ پروین نے بڑی ذومعنی بات کہی۔

”کس کا؟“ ایک دم بیلا نے اس کی جانب نظر اٹھائی۔

”میرا مطلب ہے کماری جی کا۔ میرا۔ شہزادے کا۔۔۔“ وہ بات بناتی چلی گئی۔ ”کیا ہم سب تمہارے اپنے نہیں ہیں بیلا؟ کیا ہم سب کا تم پر کوئی حق نہیں؟“

”ہے کیوں نہیں۔“ اس کی آواز میں اداسی سی تیر گئی۔ وہ جو سننا چاہتی تھی پروین کے لبوں سے وہ نہ سن کر بھگی گئی۔ احساس ہو گیا تھا کہ جو سوچ رہی ہے وہ ممکن نہیں۔ ”اور یہ شہزادہ کیا سو گیا؟ آپ اسے لائی کیوں نہیں اپنے ساتھ۔ کل سے میں نے اسے دیکھا ہی نہیں۔“ بیلا نے اپنے جذبات پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔

”وہ بی بی کے پاس ہی سو گیا بیلا۔ میں نے لانا چاہا تو بی بی نے منع کر دیا۔ وہ اس سے بہت پیار کرنے لگی ہیں۔“ پروین نے آدھا جھوٹ آدھا سچ اگلا۔

”وہ ہے ہی بہت پیارا۔“ کماری نے آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا اور بیلا کو خود سے الگ کر کے بستر پر لٹا دیا۔ ”تم اب آرام کرو اور مجھے بھی سونے دو۔ کل سویرے تمہیں بہت کام کرنا ہے۔۔۔“ کماری کا لہجہ عجیب سا تھا۔

”کیسا کام کماری موسی؟“ بیلا نے پٹ سے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

”صبح حویلی نہیں جانا کیا؟“ ڈانٹنے کے انداز میں کماری نے کہا۔ ”ادھر سب تمہیں یاد کر کر کے پریشان ہو رہے ہیں اور تم پوچھ رہی ہو کیسا کام کماری موسی؟“ کماری نے اس کی نقل اتارتے ہوئے بڑی خوبصورتی سے بات بدلی تھی۔ پروین کا دل بڑے زور سے دھڑکا۔

”ہوں۔۔۔“ بیلا چند لمحے اسے بے اعتباری سے گھورتی رہی پھر کہا۔ ”میں جانتی ہوں مجھے کہاں جانا ہے اور کیا کرنا ہے؟“ اس نے پلکیں موند لیں۔

”کوئی نادانی نہیں کرو گی تم؟ سمجھیں۔“ کماری نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر زور سے دیا یا اور چھوڑ دیا۔ جواب میں بیلا خاموش پڑی رہی۔ پروین نے کچھ سوچا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ کلاک میں رات کے دس بج رہے تھے۔

”میں چلتی ہوں کماری جی۔ رات کو کسی بھی وقت ضرورت پڑے تو آواز دے لیجئے گا۔ ہر گز جھجکے

”میں ابھی چھت پر جا رہی ہوں مونس بابو۔ میری نظریں ہندوستانی کو جانے والے راستے پر لگی رہیں گی۔ جو نبی کچھ سامنے آیا میں فوراً آپ کو کال کروں گی۔“

”گڈ۔۔۔“ مونس نے جلدی سے کہا۔ ”اور ایک بار پھر بتا دوں کہ کسی بات سے خوفزدہ نہیں ہونا۔ تم ہر وقت میرے آدمیوں کی حفاظت اور نگرانی میں ہو۔“

”میں جانتی ہوں مونس بابو۔“ پروین نے اطمینان سے کہا اور دوسری جانب سے رابطہ کٹنے پر موبائل کان سے ہٹا لیا۔ ایک لمحے کو کچھ سوچا پھر اس نے گرم چادر اتار کر بستر پر ڈالی اور نیلی بھاری بھر کم شال اٹھا کر شانوں پر ڈال لی۔ کمرے کا ایک طائرانہ نظر سے جائزہ لیا اور باہر نکلتے ہوئے لائٹ آف کر دی۔ آنکھیں اندھیرے میں ڈرا دیکھنے کی عادی ہوئیں تو وہ موبائل گریبان میں چھپائے بے آواز چھت کی سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔

☆=====☆=====☆

”وہ اس وقت شمشان پہنچ چکے ہیں سر۔۔۔“ غلام حسین کی آواز موبائل پر ابھری تو مونس چونکا۔

”شمشان میں؟“

”جی سر۔“ غلام حسین نے بتایا۔ ”سوامی اور پنڈت دونوں یہاں ایک بڑا لاڈ لہکا رہے ہیں۔ ان کے چیلے چائے چلتی آگ پر گھس ڈال رہے ہیں اور سوامی چتا جیسے اس خوفناک لاڈ کے سامنے کھڑا کچھ بد بدار رہا ہے۔ میں ان سے اتنا دور ہوں کہ ان کی آوازیں تو سن سکتا ہوں مگر بڑا پیش سننا ممکن نہیں۔“

”تمہارے دیکھ لئے جانے کا امکان تو نہیں؟“

”نوسر۔۔۔ میں ایک گھنٹہ درخت کی آڑ میں ہوں۔ یہ درخت شمشان کے اندر ہی اس جگہ تقریباً دس گز دور ہے جہاں ان لوگوں نے کرایا کرم کرنے کا چھوڑا بنا رکھا ہے۔“

”گڈ۔۔۔“ مونس نے اطمینان بھرے انداز میں سر ہلایا۔ ”اور شوکت کہاں ہے؟“

”وہ مندر کے قریب کھنڈر مکان کے پاس ہے سر۔۔۔“

”ٹھیک ہے۔ اور باقی کے آدمی؟“

”سب اپنی اپنی جگہ لارٹ ہیں سر۔۔۔ کہیں کوئی کونہ کھدرا ہماری نظروں سے پوشیدہ نہیں ہے۔“

”اوکے۔۔۔ میں ٹھیک وقت پر تم لوگوں سے آن ملوں گا۔ کسی کو وہاں سے بھاگنے کا موقع نہیں ملنا چاہئے۔“

”آپ فکر نہ کریں سر۔۔۔ انشاء اللہ ہم کامران ہوں گے۔“ غلام حسین نے پورے بھروسے کے ساتھ کہا اور مونس نے موبائل پر کلیئر کاغذیں دبا دیا۔

”نہیں پروین۔ میرے پاس کہنے کے لئے کچھ بچا ہی نہیں۔“ وہ اس کی کمر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بکی۔ ”اگر بھی ایسا سے آیا تو تمہیں ضرور بتاؤں گی یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔“ وہ آہستہ سے پروین سے الگ ہوئی۔ دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھا ماور ما تھا چوم لیا۔ ”مجھے یاد رکھنا پروین۔ بھول نہ جانا۔“

”کماری۔“ پروین تڑپ کر پھر اس کے سینے سے لگ گئی۔

”اب بس۔۔۔“ کماری نے اس کے بالوں پر بوسہ دیا۔ ”کیا ساری رات روتی اور رلاتی رہو گی۔ جاؤ۔ جا کر آرام کرو۔“ کماری نے اسے بازو سے تھام کر رخ اس کے کوارٹر کی طرف کر دیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی پروین چل پڑی۔ پھر جب وہ اپنے دروازے میں داخل ہوئی تو بے ساختہ پلٹ کر دیکھا۔ کماری اپنے دروازے میں سے کھڑی نیم اندھیرے میں اجالے کی طرح دمک رہی تھی۔ اس کا صبیح و صبح وجود سوتی سا ڈھگی میں بھی چھلکا پڑ رہا تھا۔ پروین نے اس کی جانب ہاتھ ہلایا اور تیزی سے دروازے میں داخل ہو گئی۔ بظاہر اس کی کوئی وجہ نہ تھی لیکن اسے نجانے کیوں لگ رہا تھا کہ یہ اس کی کماری سے آخری ملاقات ہے۔

اپنے کمرے میں آ کر اس نے دروازہ بند کیا۔ بستر پر بیٹھ کر جلدی سے موبائل نکالا اور مونس سے رابطہ کرنے لگی۔ چند ہی سیکنڈ بعد دوسری جانب سے مونس نے کال ریسیو کر لی۔

”ہیلو پروین۔۔۔ خیریت؟“ اس نے چھوٹے ہی پوچھا۔

”خیریت ہی ہے مونس بابو۔“ پروین نے آواز دبا کر کہا۔ ”آپ یہ بتائیں کیا آج رات کچھ خاص ہونے والا ہے؟“

”تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟“ وہ چونکا۔

جواب میں پروین نے بیلا اور کماری سے اب تک کی وہ ساری باتیں دہرا دیں جن کا اختتام کماری کے آنسوؤں پر ہوا تھا۔ دوسری طرف سے مونس کی سوچ میں ڈوبی ہوئی ”ہوں۔۔۔“ بڑی دیر بعد ابھری۔

”سن کر سینے میں دفن کر لینا پروین۔ آج کی رات بہت اہم ہے ہم سب کے لئے۔ کچھ ایسا ہونے والا ہے جس کے بارے میں میں پہلے سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ دعا کرو کہ جو بھی ہو ہمارے لئے اچھا ہو۔“

”انشاء اللہ اچھا ہی ہوگا مونس بابو۔“ خلوص کے ساتھ پروین نے کہا۔ ”مگر کماری کی باتوں سے آپ کیا سمجھے؟“

”میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا پروین۔۔۔ مگر تم اس پر نگاہ رکھنے سے غافل نہ ہونا۔“

بستر سے نکل آئی۔

”میں اسی طوفان کو روکنے کے لئے جانا چاہتی ہوں بیلا۔“ کماری نے اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا۔ ”میری جان۔ مجھے جانے دو۔“

”میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔“ بیلا نے پاؤں میں چپل ڈالی۔
”ہرگز نہیں۔“ کماری نے سختی سے کہا اور بیلا کا بازو جکڑ لیا۔ ”تم یہیں رہو گی۔ میرے ساتھ نہیں جا رہیں تم۔ سنا تم نے۔“

”میں تمہارے ساتھ جا رہی ہوں کماری دیدی۔“ بیلا نے ضد بھرے لہجے میں کہا اور چادر اٹھا کر شانوں پر ڈال لی۔

”بیلا۔۔۔ بیلا۔۔۔“ کماری نے بیچاریگی سے اس کی جانب دیکھا۔ ”میری بات مان جاؤ جانی۔ تمہارے جانے سے میرے ہاتھ بندھ جائیں گے۔ میں کھل کر کچھ نہ کر پاؤں گی۔“
”خند نہ کرو کماری دیدی۔ میں کسی قیمت پر تمہیں اکیلے نہ جانے دوں گی۔“ بیلا بجل گئی۔
”خند تو تم کر رہی ہو بیلا۔“ اچانک کماری کا لہجہ ناخوشگوار ہو گیا۔ ”میں کسی خاص کارن سے تمہیں ساتھ نہیں لے جانا چاہتی اور تم ہو کہ۔۔۔“

”دیدی۔۔۔“ ایک دم بیلا کا لہجہ شکست ہو گیا۔ اس نے ٹوٹے دل سے کماری کی طرف دیکھا تو اس نے تڑپ کر بیلا کو گلے لگایا۔ ”پگنی نہ ہو بیلا۔۔۔“ میری جان۔“ کماری کا دایاں ہاتھ بیلا کی گدی پر آ گیا۔ ”مجھے معاف کر دینا۔“ کہتے ہوئے اس نے آہستہ سے کوئی رنگ دبا لی۔ دوسرے ہی لمحے بیلا کے ہونٹوں سے ہلکی سی ایک کراہ نکلی اور وہ کماری کی باہوں میں جھول گئی۔ وہ بیہوش ہو چکی تھی۔

اسے بستر پر ڈال کر کماری نے اس کے جسم پر کمبل برابر کیا۔ اسی وقت کلاک نے ٹھیک بارہ بجنے کا اعلان کیا۔ کماری نے بیلا کا ہاتھ چومنا اور نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے اسے والہانہ ہنستی ہوئی سیدھی کھڑی ہو گئی۔ پھر چھتری سنبھالی اور ایک آہ بھر کر دروازے کی جانب بڑھی۔ اسی وقت وہ موبائل کی رنگ ٹون سن کر رک گئی۔ گردن گھما کر اس نے سٹکے کے پاس اپنے بستر پر پڑے موبائل پر نگاہ ڈالی۔ ایسی بے احتیاطی اس سے پہلی بار سرزد ہوئی تھی کہ اس نے موبائل یوں کھلا چھوڑ دیا ہو۔ اسی وقت دوسری تیل ہوئی۔ کماری نے تیزی سے لپک کر موبائل اٹھایا اور سکرین پر کسی کا نام اور نمبر دیکھ کر بری طرح چونک پڑی۔ بیٹابی سے اس نے مٹن دیا اور موبائل کان سے لگالیا۔

”ہاں مدھو۔ میں بول رہی ہوں کماری۔ سب ٹھیک ہے ناں؟“

پھر دوسری طرف سے جوا کہا گیا اسے سنتے سنتے کماری کے چہرے کا رنگ بدلتا چلا گیا۔ تقریباً ایک منٹ تک مدھو کہتی رہی جسے کماری اپنی جگہ کھڑی یوں سنتی رہی جیسے وہ زندہ انسان نہ ہو پھر کا بے

☆=====☆=====☆

کمرے میں نائٹ بلب کی زرد روشنی اتنی بھی مدھم نہیں تھی کہ پلکوں کی باریک جھری سے بیلا دبے پاؤں اٹھ کر لباس بدلتی کماری کو نہ دیکھ سکتی۔

کماری تیار ہو کر بیلا کو سویا جان کر اس کے قریب آئی۔ بستر کی پٹی پر بیٹھ کر کتنی ہی دیر اس کے چہرے کو نگہاتی رہی۔ پھر جھک کر اس کے ماتھے کو بوسہ دیا۔ اٹھی، چھتری تھامی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ تب بیلا نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔
”کماری دیدی۔“

یوں لگا جیسے کماری کے پاؤں ایک دم جسم کا ساتھ چھوڑ گئے ہوں۔ وہ بیلا کے بستر سے دو قدم آگے زمین میں گڑی گئی۔ گردن گھما کر اس نے گھبرا کر بیلا کی جانب دیکھا جو پوری آنکھیں کھولے اسے بڑی عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”تم۔۔۔“ کماری کے لب تھر تھرائے۔ ”سوئی نہیں؟“
”آج بھی کیا سونے کی رات ہے؟“ بیلا اٹھی۔ پھر نیم دراز ہو کر سر ہانے سے ٹیک لگالی۔ ”میں نے آج تمہارا دیا ہوا دودھ مویے کے گیلے کو پلا دیا تھا کماری دیدی۔“

”اوہ۔۔۔“ کماری کے ہونٹوں سے ایک طویل آواز نکلی۔ وہ واپس اس کے پاس بستر پر آ بیٹھی۔
”دیکھو بیلا۔“ وہ اسے سمجھانے کے لہجے میں بولی۔

”دیکھ ہی تو رہی ہوں۔“ بیلا نے اس کے جسم پر بچی سفید براق ساڑھی پر نظریں دوڑائیں۔ ”اپرا لگ رہی ہو اس ساڑھی میں۔“

”میں جو کہنا چاہتی ہوں وہ سنو۔“ کماری نے ہاتھ اٹھا کر جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔
”میرے پاس زیادہ سے نہیں ہے۔“

”ایسا کٹھن سے ہے تو مت جاؤ ناں کماری دیدی۔“ بیلا نے اس کے شانے تھام کر لمبی لہجے میں کہا۔
”میرا جانا کتنا ضروری ہے بیلا تم نہیں جانتیں۔“ کماری نے بے بسی سے جواب دیا۔
”اسی لئے تو روک رہی ہوں کہ میں سب کچھ جان گئی ہوں۔“ بیلا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

”کیا جان گئی ہو تم؟“ کماری نے کلاک پر نگاہ ڈالی اور شانوں پر سے اس کے ہاتھ ہٹا کر اٹھ گئی۔ ”خاک نہیں جانتیں تم۔ میں اگر نہ گئی تو انتھ ہو جائے گا۔“
”اور تمہارے جانے سے جو طوفان آئے گا اس کے بارے میں کچھ سوچا ہے تم نے؟“ بیلا بھی

اس نے چاہا کہ نظر چرائے مگر کسی مقناطیسی اثر کے تحت وہ ادھر ہی دیکھتے رہنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کے دماغ میں پچھلے چار پانچ مہینوں کے واقعات کی فلم سی چلنے لگی۔ راجیہ اور جنت کے پچھڑ جانے سے لے کر دروات پہلے تک سوامی سے ہونے والی ملاقات تک کا ایک ایک لمحہ ایک تسلسل سے اسے یاد آیا۔ ہولی کے دن سے اسے دیکھ لینے سے لے کر مندر میں ہونے والی راجیہ سے ملاقات کی ایک ایک بات اس کے کانوں میں گونج گئی۔ اسے لگا کہ جیسے اس سے کہیں کوئی بہت بڑی بھول ہو گئی ہے۔ ذرا غور کرتا تو اسے احساس ہو جاتا کہ کہاں کیا ایسا ہوا ہے جواب بھی اس کے سینے میں کانٹا بن کر چھ رہا ہے؟ شاید یہ احساس اس کے اندر پہلے دن سے سانس لے رہا تھا مگر گزرے کل کی طرح آج بھی وہ اس احساس کی موجودگی سے نگاہیں چرا رہا تھا۔ جان بوجھ کر نہیں چاہتا تھا کہ اسے ایک بار پھر باطن اور ظاہر کی جنگ میں الجھنا پڑے۔

انسان کا ضمیر اس کی جسمانی موت سے پہلے نہیں مرتا اور وہ چونکہ ابھی تک زندہ تھا اسی لئے بار بار اسے اپنے بھٹک جانے کا خیال بے چین کر دیتا تھا۔ اس خیال سے بچنے کے لئے وہ خود کو اپنے ساتھ ہونے والی نام نہاد اور خود ساختہ زیادتی کے اذیت وہ خیال میں ڈبوئے رکھتا۔ خدا سے گلے شکوے کی پٹاری کا محو کھل دیتا۔ اپنے ساتھ ہونے والے حادثے کو ظلم کہہ کر مظلومیت کے زہریلے ناگوں سے اپنے فکروں اور شعوروں کو سواتار ہوتا۔ یہ رجز جب اس کو بالکل بے کردیتا تو وہ اپنی ذات کے خول میں بند اپنی راجیہ سے محبت کے نام پر ایسے زہریلے غماز اور غریب گزیدہ سروں کا قیدی ہو کر رہ جاتا جو اسے کسی بھی مثبت سوچ کے قابل نہ رہنے دیتا۔۔۔ ورنہ اگر وہ ایک پل کو بھی سوچ لیتا کہ کیا وہ دنیا میں پہلا شخص تھا جس کے بیوی بچے حادثے کی بھینٹ چڑھ گئے تھے؟ اگر نہیں تو پھر اسے کیا حق تھا کہ اپنی فریاد کو ڈبنا کر خدا سے الجھ پڑتا۔ اس نے اگر خدا کو پکارا تھا تو کیوں یہ چاہتا تھا کہ خدا اس کے چاہنے کے مطابق اس کی سنے۔ وہ قادر مطلق سنے یا نہ سنے یہ تو اس کی منشا تھی۔ اسے مشورہ دے کر شرک کے مرتکب ہونے والوں میں شامل ہونے کا عمل اسے لمحہ بہ لمحہ اس کی رحمت اور غنم سے دور لے جاسکتا تھا اس نے اس بارے میں غور نہ کیا کیونکہ اس پر سوچنا بھی اس کے لئے محال تھا۔ اسے تو یہ خود ساختہ دکھ لے ڈوبا تھا کہ اس کے خدا نے اس کی پکار نہیں سنی تو کیوں نہیں سنی؟ اس بارے میں وہ کوئی دلیل، کوئی منطق اور کسی اپنے بیگانے کی سننے کو راضی نہ تھا۔

پھر ایک دم اس کی راجیہ کی روح اس کے سامنے آ گئی۔ ساتھ ہی سوامی دھیرج داس نے اپنا چمکا روکھا کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اپنے عقیدے کی مضبوطی سے پچھڑا ہوا ایک کمزور انسان جب سوامی کی بھینٹ چڑھا تو یہ بھی نہ سوچ پایا کہ اس کی راجیہ کی روح سوامی کے پاس کیا کر رہی ہے؟ ایک پل کو یہ خیال آیا بھی تو سوامی نے اس کے جاگنے کے لئے کروٹ لیتے دماغ کو یہ دعویٰ کر کے تھپک دیا کہ یہ سب

جان بُت ہو۔ اس کی آنکھیں زندگی کی رفق سے محروم چہرہ سرخی سے جدا اور سانس آمدورفت کے الزام سے بری ہوتا جا رہا تھا۔

”ہیلو۔۔۔ کماری دیدی۔۔۔ ہیلو۔۔۔ آپ سن رہی ہیں ناں جو میں نے کہا۔ میری آواز آرہی ہے آپ کو۔۔۔؟“ مدھو پوچھ اور کہہ رہی تھی۔۔۔ ”نینا کو سوامی کے کسی آدمی نے بتا دیا تھا کہ آپ اس کے جیون کے لئے سوامی کے ہاتھوں میں کھلونا بنی پاکستان چلی گئی ہیں۔ وہ اسے سہہ نہ سکی کماری دیدی۔ آج ابھی دس منٹ پہلے اس نے آتم پتیا کر لی۔“

مگر کماری کو دماغ میں شاں شاں کی آوازوں کے سوا کچھ اور محسوس نہ ہو رہا تھا۔ پھر اس کے دائیں ہاتھ سے موبائل اور بائیں ہاتھ سے چھڑی ایک ساتھ فرش پر گرے جس کا شاید اسے احساس ہی نہ تھا۔ اس کی ہلکا سا لنگ کھائی ہوئی بائیں ٹانگ غیر محسوس انداز میں سیدھی ہوئی اور پاؤں فرش پر ٹک گیا، یوں جیسے وہ کبھی ٹانگ کے لنگ کا شکار نہ رہی ہو۔ کسی روبروٹ کے سے انداز میں اس نے پھٹی پھٹی بے نور بے روح آنکھوں سے سامنے دیکھا اور خواب میں چلتے کسی ہوش و حواس سے محروم انسان کی طرح دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

موبائل فرش پر پڑا جھجھکا رہا تھا اور اس میں سے اب بھی مدھو کی آواز ابھر رہی تھی۔ ”کماری دیدی۔ آپ جواب کیوں نہیں دے رہیں؟ آپ کو میری آواز آرہی ہے یا نہیں؟ کماری دیدی۔۔۔ کماری دیدی۔۔۔ کماری دیدی۔۔۔“

☆=====☆

رزاتی کے لئے وقت کا ٹاڈو بھر ہو چکا تھا۔

وہ بار بار کلاک کی طرف نظر دوڑاتا جس کی سوئیاں اپنی مقررہ رفتار سے ریگ رہی تھیں مگر اسے لگ رہا تھا کہ کلاک خراب ہو گیا ہے۔ وقت کے سستی سے گزرنے کا احساس اسے کوفت میں مبتلا کر رہا تھا۔ آج بھی پروین ہی اس کے لئے کافی لے کر آئی تھی۔ اس کے کمرے سے نکلتے ہی اس نے دروازہ اندر سے لاک کر لیا۔ کافی کے دو تین گھونٹ لے کر اس نے باقی کا کپ اسی طرح تپائی پر چھوڑ دیا اور بیتابی کے ساتھ کمرے میں ٹہلنے لگا۔

وقت نہ گزرنے کا احساس جب شدت اختیار کر گیا تو وہ کالی چادر جسم کے گرد لپیٹ کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔

باہر حد نظر تک اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ چاند کی آخری تاریخ تھی۔ ستارے بھی کم کم ہی اُگے تھے۔ اندھیرے کی چادر چیرتی اس کی نظریں جب دور روشنیوں میں نہائی ہوئی مسجد پر جا ٹھہریں تو بے اختیار اس کا دل سینے میں دھڑک اٹھا۔

روشنیاں چھپا رہی تھیں جیسے اسے رک جانے کے اشارے کر رہی ہوں۔
”چلو۔ رک کیوں گئے۔ وقت بہت کم ہے۔ تمہیں ٹھیک ایک بجے سوامی کے پاس شمشان میں ہونا چاہئے۔“ ماپوسی نے امید کی کرن دکھا کر ٹھوکا دیا۔

اس نے کھڑکی کی چوکت پر ہاتھ رکھے۔

”رک جاؤ۔ نادانی مت کرو۔“ اس کے اندر سے کسی نے صدا دی۔

”راجیہ کو حاصل کرنے کا یہ موقع نکل گیا تو پھر۔۔۔“ جذبات میں ابال سا آیا۔ اس نے کھڑکی

کی چوکت پر پاؤں رکھا اور باہر کود گیا۔

”میری باہوں میں چلے آؤ۔“ روشنیاں جھللا اٹھیں۔

”صاحب۔۔۔“ کہیں دور سے آواز آئی اور وہ دوڑ پڑا۔

”رک جاؤ۔۔۔“ روشنیوں کی آنکھ بھگ گئی۔

”صاحب۔۔۔“ اندھیرے سے کسی نے رگ وپے میں اتر جانے والی سرگوشی کی۔

”لوٹ آؤ۔۔۔“ روشنیاں حسرت میں ڈوب گئیں۔

”صاحب۔۔۔“ اس کے کان جیسے اسی ایک صدا کے اسیر ہو گئے۔

چھلکتی آنکھوں میں مسجد کی روشنیاں دھندلا گئیں۔

اجالوں کی باہیں پھیلی رہ گئیں۔

اندھیرے نے اسے اپنی جانب بھاگ کر آتا دیکھ کر قلعاری ماری اور اس کے لڑکھڑاتے قدموں

تلے اڑتی خاک زمین نے اپنے سر میں ڈال لی۔

☆=====☆=====☆

چونکہ سوامی نے اپنی کالی شکتیوں کی بنا پر کیا ہے اس لئے راجیہ کی روح کا رابطہ اسی سے ہے اور اسی کے واسطے سے رزاقی اپنی راجیہ کو حاصل کر سکتا ہے۔ محبت کے نام پر ان دیکھے دکھ کا شکار ہو کر اس نے اپنے اس ناقابل معافی فعل کو شرع کے ایک حکم کی آڑ لے کر جائز قرار دیا تو سوامی جیسا مشرک بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا مگر اس کے اس حیلے کو اس لئے خاموشی سے پی گیا کہ اسی حیلے کے پردے میں اس کا شکار کھیل کر سوامی کو اپنا کام سرانجام دینا تھا۔

دیوار گیر کلاک نے ساڑھے بارہ کا گھنٹا بجایا تو وہ چونکا۔

وہ کب سے کھڑکی میں کھڑا کئی فرلانگ دور ایک ناز سے سراٹھائے اپنی جانب دیکھتے خانہ خدا پر نظر جمائے سوچوں کے گرداب میں ڈوب ابھر رہا تھا۔ کلاک کی ”ٹن“ نے اسے وقت ہو جانے کا احساس دلایا تو وہ آہستہ سے حرکت میں آیا۔۔۔ مگر یہ کیا؟ اس کے ہاتھ اپنے چہرے پر پھیلی نمی میں الجھ گئے۔

کیا وہ رو رہا تھا؟

مگر کب سے اور کیوں؟

اسے پتہ ہی نہ چلا۔ رخسار ایسے تر تہے جیسے کسی نے نمکین پانی کا چھینٹا دے دیا ہو۔ ہتھیلیوں سے آنکھیں اور چہرہ صاف کرتے ہوئے اس نے ذہن پر پھیلی دھند کے پار دیکھنے کی کوشش کی اور نگاہ سامنے تپائی پر پڑی راجیہ اور جنت کی فریم شدہ تصویر پر جا ٹھہری۔ وہ ہنستی مسکراتی تصویر اسے اپنے آنسوؤں میں ڈوبی محسوس ہوئی۔ یہ آنسو کیسے تھے جو اسے کچھ سمجھنا چاہتے تھے۔ اس سے کچھ کہنا چاہتے تھے۔ اس نے ان کی کبھی سننا چاہی تو لگا کہ جیسے یہ تو پہلے سے اس کے دل میں تھا۔

دھیرے دھیرے چلتا ہوا وہ تصویر کے پاس آیا۔ گھٹنوں کے بل جھکا اور تصویر اٹھا کر ہونٹوں سے لگائی۔ آنکھوں کے سوتے ایک بار پھر پھوٹ رہے۔ وہ بچوں کی طرح سسک رہا تھا۔ اپنے پیاروں کو چوم رہا تھا۔ ان کے رخساروں پر ہونٹوں پر بوسے دے رہا تھا۔ انہیں صدائیں دے رہا تھا۔ کتنی دیر گزر گئی اسے پتہ نہ چلا۔ چونکا تو اس وقت جب اسے لگا جیسے اسے کسی نے دو تین بار وقفے وقفے سے پکارا ہو۔ ”صاحب“ کہہ کر۔

پھر ایک دم وہ جیسے جذبات کی دنیا سے باہر نکل آیا۔ آنسوؤں میں بھگی تصویر تپائی پر رکھ کر اس نے اٹھ اٹھ دیکھا۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ کلاک پر نظر پڑی ایک بجتے میں دس منٹ باقی تھے۔

”راجیہ مجھے بلا رہی ہے۔“ اسے خیال آیا۔ ”مجھے پورے ایک بجے شمشان میں ہونا چاہئے۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ چادر میں جسم کو لپیٹ کر کھڑکی کی طرف بڑھا۔ پھر رک گیا۔ کھڑکی سے باہر مسجد کی

کرنے والی بات جو اس پورے ماحول میں فطرت کے خلاف لگ رہی تھی وہ ایک ایسا شخص تھا جو سوامی کے دائیں ہاتھ لکڑی کی چوکی پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ سینے پر بندھے تھے۔ نظریں چبوترے کی کچی زمین پر گڑی تھیں اور چہرہ آگ کی سرخ لپٹوں کے عکس میں بھی زرد تھا۔

دھنسی ہوئی آنکھوں پر شرمندہ گالوں اور فحاشیت آلودہ جسم کا مظہر یہ جشہ کسی اور کا نہیں، خالق نگر کے مالک رزاتی کا تھا۔۔۔ اس رزاتی کا جسے گاؤں کی کوئی زبان ”رزاتی بابو“ کے علاوہ کسی اور نام سے پکارنا گناہ تصور کرتی تھی۔ وہی رزاتی، آج گناہ و ثواب سے لاپرواہ ہو کر اپنی مرحومہ بیوی راجیہ کی روح کو گوشت پوست کا زندہ سلامت جسم دلانے کے لئے سوامی دھیرج داس کی کالی قوتوں کا اسیر ہوا یہاں آیا بیٹھا تھا۔ صرف اس لئے کہ وہ راجیہ کی جدائی سہہ نہ پار ہا تھا۔ صرف اس طیش میں اس نے اللہ کے گھر کا دروازہ اپنے ساتھ ساتھ پورے خالق نگر پر بند کر دیا تھا کہ اس کے اللہ نے اس کی پکار نہ سنی اس کی آہ و زاری پر دھیان نہ دیا اور اس کی بیوی اور بچی کو اس کی راجیہ اور جنت کو اس سے چھین لیا۔ اپنے خدا سے ناطہ توڑنے پر آمادہ ہو کر وہ یہاں اپنے دین کے دشمنوں کے درمیان، کس کس خیال اور کیسی کیسی سوچ سے دامن چھڑا کر پہنچا تھا یہ وہی جانتا تھا اور اب بھی اس کے دل و دماغ میں کیسی جنگ جاری تھی اس سے صرف وہی واقف تھا۔

دیکھتے الاؤ نے سردرات کے دامن میں ایسی ہلکی ہلکی آنچ بھڑکی تھی کہ شہنشاہ کے بجائے پہلے پکھڑے نرم نرم اور اب برداشت سے باہر ہوئی گرمی کے احساس نے وہاں موجود ہر فرد کے جسم پر لمحہ لمحہ پسینہ چھڑکنا شروع کر دیا تھا۔

شمشان کے مغربی حصے میں کئی کئی گز کے فاصلے پر موجود چھ سات بڑے گھنے پتیل اور برگد کے درخت تھے جو اس ماحول سے دہشت زدہ خاموش دم سادھے کھڑے لگ رہے تھے۔

”رزاتی بابو۔۔۔“ اچانک ہی سوامی نے آنکھیں کھولیں اور اس کی جتنے سے میل نہ کھاتی، بھاری بھر کم آواز نے ماحول کے سینے میں شگاف پیدا کیا۔

رزاتی نے چونک کر سر اٹھایا اور متورم سرخ سرخ آنکھوں سے اس کی جانب دیکھا۔ سوامی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

”سے آن پہنچا رزاتی بابو۔ کیا آپ تیار ہیں؟“

جواب میں چند لمحے رزاتی اسے خاموشی سے گھورتا رہا پھر آہستہ سے اس کا سر اثبات میں ہلاتا سوامی کے چہرے پر اطمینان کی پڑچھائیاں کپکپا اٹھیں۔

”تو اب میری چند باتیں دھیان سے سن لیجئے۔“ اس نے رزاتی کو نظروں میں تو لا۔ پھر کہا۔ ”پہلی بات۔۔۔“ اس نے جیسے کسی شاگرد کو سبق کی دہرائی کرتے ہوئے کہا۔ ”ابھی چند لمحوں کے بعد

امادس کی آخری رات کا اندھیرا کسی مشرک کے دل جیسا سیاہ ہو رہا تھا۔

منذر کے عقب میں واقع شمشان میں کئی گز پر محیط جلتے الاؤ میں لکڑیاں کسی مایوس کی امید کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر چنچ رہی تھیں۔ شعلے ایک عام انسان کے قد سے بلند ہو چکے تھے۔ اتنی بڑی پھٹ پڑنے پر مائل چٹانے رات کے تیسرے پہر کی سردی کو چاٹ لیا تھا۔

چٹانے کے چبوترے پر اس دیکھتے الاؤ کے سامنے شمالی سمت لکڑی کی چوٹی پر لٹی پالتی مارے سوامی دھیرج داس بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ہاتھ صرف ایک کابلے تھپکے گئے میں زکارتا تھے پر بڑے سے سینہ دور کے قشعے اور بالوں کو گوندھ کر سر پر کی گئی چوٹی نے اسے براہمہ اسرار بنا دیا تھا۔ اس کے سامنے ایک بڑا ہون دھک رہا تھا۔ اپنے سامنے بڑی تھالی میں سے دو دو فقے وقفے وقفے سے لوہان اور حمل کی مٹھی بھرتا اور ہون کے دیکھتے انگاروں پر پھینک دیتا۔ خوشبو کے مرغولے اٹھتے اور تاریکی میں اضافہ کرتے ہوئے فضا میں بلند ہو کر غائب ہو جاتے۔ جب بھی وہ ہون میں برادہ پھینکتا تو اس کے بد بداتے ہونٹوں سے ”جے کالی۔ جے درگا“ کے الفاظ ایک ترتیب کے ساتھ خارج ہوتے۔ تب اس کی پھٹے بانس جیسی غیر انسانی، غراہٹ سے آلودہ آواز ماحول کے غیر فطری پن کو اور بڑھا دیتی۔ تھالی کے پاس زمین پر ایک بوتل دھری تھی جس میں کوئی غیر شفاف ہلکا زرد رنگ کا سیال تھا۔ پاس ہی ششے کا ایک گلاس اور برادے کی تھالی کے سامنے زمین پر ایک تیز دھار چھماتا خنجر پڑا تھا۔

سوامی کے بائیں ہاتھ دو تین فٹ پیچھے پنڈت گردھاری لال گیروی دھوتی اور کندھوں پر ویسے ہی رنگ کی گرم چادر ڈالے اپنے مخصوص حماقت آمیز چہرے کے ساتھ بڑی سی مالا کے دانے پھیر رہا تھا۔ ان دونوں کے بائیں ہاتھ دو دو بلے پتلے چیلے اپنے سونکھے چرخ ہاتھ سینے پر باندھے سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ ان کے جسموں پر بستی دھوتیاں اور کرتے تھے۔

یہ سب ان مشرکوں کے ڈھکوسلے نما دھرم کے حوالے سے اجنبی تھا نہ حیران کن۔۔۔ حیرت زدہ

پوری طرح کھلی آنکھیں اس وقت بڑی ڈراؤنی لگ رہی تھیں۔

آہستہ سے سوامی نے اپنے سامنے بڑی تھالی سے لوہان اور حزل کی مٹھی بھر کر ہون میں پھینکی۔ ساتھ ہی اس کی زبان سے ”جے درگا“ کے بلند بانگ الفاظ نکلے اور رزاتی کی جانب دیکھے بغیر اس نے دایاں ہاتھ سامنے دراز کر دیا۔ رزاتی کو لگا جیسے سوامی نے اسے سامنے دیکھنے کو کہا ہو۔ بے اختیار اس نے چہرہ ذرا سا گھمایا اور الاؤ کی جانب دیکھا۔

ایک دم اس کا سانس رک گیا۔ دل سینے میں دھڑکنا بھول گیا۔ جسم کا سارا ہونچ کر چہرے میں سست آیا۔ زبان اینٹھ کر رہ گئی۔ مساموں نے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ اگل دیا اور ایک ناقابل یقین منظر اس کی آنکھوں میں ظہور سا گیا۔

الاؤ کے لپکتے شعلوں کے عقب سے کسی کا دلنواز سراپا دھیرے دھیرے ابھر رہا تھا۔ سفید ساڑھی میں ملبوس، پھولوں کے گجروں، بندوں اور مالا سے سجا، شبنم سے تھرا، اندھیرے کے جنگل میں مرممر کے اجالے جیسا وہ پیکر کسی اور کا نہ تھا، اس کی راجیہ کا تھا۔ اس کی اپنی راجیہ کا۔ جو اب الاؤ کے برابر فضا میں بلند ہو کر ٹھہر چکا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ الاؤ پر ڈھکتے لپکتے شعلوں میں پاؤں پاؤں ڈوبی کھڑی ہو۔

بے اختیار رزاتی نے اپنی جگہ سے اٹھ جانا چاہا۔ مٹی سوامی نے ہاتھ جھٹک کر اسے واپس بیٹھ جانے کا ہڑے نرم اشارہ کیا۔ اس کی زبان اب بھی اشلوک اگل رہی تھی اور آنکھیں راجیہ پر جمی تھیں۔ رزاتی کسی کٹھن کی طرح واپس بیٹھتا چلا گیا مگر اس کی نظریں برابر راجیہ کے پیکر پر مرکوز تھیں۔۔۔ اور راجیہ۔۔۔ اس کے لئے تو شاید کائنات میں اس وقت سب سے اہم کام ہی رزاتی کی جانب نگراں رہنا تھا۔ وہ ایک نیک اسی کو دیکھے جا رہی تھی۔ اس کے گداز ہونٹوں پر بکھری مسکراہٹ، خود سپردگی کے انداز میں پھیلی سڈول باہیں اور نکلنے کا والہانہ انداز رزاتی کو بے قابو کئے دے رہا تھا مگر وہ سوامی کی وجہ سے مجبور تھا۔

پھر اس کی بے قراری پر شاید سوامی کو دیا آگئی۔ اس نے تھالی میں اپنے آگے سے لوہان اور حزل سے الگ پڑا سفوف دونوں ہاتھوں میں لیا اور دور سے الاؤ کی جانب اچھال دیا۔ ساتھ ہی اس نے ایک بار پھر ”جے کالی۔ جے درگا“ کے الفاظ حلق چھاڑ کر نعرے کی شکل میں ادا کئے۔

ایک جھماکا سا ہوا، جیسے بجلیاں کڑکی ہوں۔ ایسی تیز روشنی پیدا ہوئی کہ رزاتی اور پنڈت کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ سفید دھواں تھا گیا گہرا گہرا۔ وہ دھند کی دین چادر کے پار کچھ بھی دیکھنے سے عاجز ہو گئے۔ آنکھوں میں درد کی لہریں پیدا کرتی چکا چوند سے گھبرا کر رزاتی نے بائیں بازو آنکھوں کے سامنے کر لیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

اسی وقت ایک دم سوامی کی آواز میں ٹھہراؤ آ گیا۔ وہ اب اشلوک تو پڑھ رہا تھا مگر چیخ نہ رہا تھا۔

آپ کی جتنی کی آتما یہاں نمودار ہوگی اور آپ کی آنکھوں کے سامنے اپنے جسم میں پرویش کرے گی۔ آپ اس دوران بالکل خاموش رہیں گے۔ کسی عمل میں کسی طرح کوئی دخل نہیں دیں گے۔“

رزاتی پُپ چاپ اس کی جانب تکتا رہا۔ سوامی نے اس کی حالت کا بغور جائزہ لیتے ہوئے مزید کہا۔ ”دوسری بات۔۔۔ جب آپ کی جتنی کی آتما اپنا شریہ حاصل کر لے گی تو آپ اپنا وچن پورا کریں گے اور میں جو چاہوں گا آپ میرے کہنے کے انوسار اسے پورا کریں گے۔ یہی میرے آپ کے بھیتے ہوئے ہوا تھا، کیا آپ کو یاد ہے؟“

جواب میں رزاتی نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے ایک بار پھر اثبات میں صرف سر ہلایا۔ منہ سے کچھ نہ بولا۔

”تیسری اور آخری بات۔۔۔“ سوامی کی آنکھوں سے ابلتا اندھیرا رزاتی کو اب اپنے رگ و پے میں اترتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ سوامی جلدی سے اپنی بات ختم کرے اور جس کام کے لئے اسے یہاں آنا پڑا ہے، اسے پورا کر دے۔ اسی لئے بیتابی سے اس نے چوکی پر پہلو بدلا اور سینے پر بندھے ہاتھ کھول کر گود میں ڈال لئے۔

”اس سارے عمل کے دوران میں اگر آپ سے کچھ کرنے کو کہوں تو بلا حیل و حجت، بغیر چوں چراں کے اسے مان لیجئے گا۔ اسے اتنا تنگ ہو گا کہ ہمارے پاس بحث اور دیر کی گنجائش نہیں ہوگی۔ کیا آپ میری ہر بات سمجھ گئے؟“

”ہاں۔۔۔“ پہلی بار رزاتی کے ہونٹوں سے آواز نکلی مگر ایسی کمزور اور ڈوبتی ہوئی آواز جیسے اس کے جسم میں جان نام کی کوئی شے رہی نہ گئی ہو۔

”شباباش۔۔۔“ سوامی نے اسے مسکرا کر دیکھا اور سر جھٹک کر زور سے نعرہ لگایا۔ ”جے کالی۔ جے درگا۔“

اس کی گونجی آواز نے وہاں موجود ہر شخص کے دل میں کپکپی سی دوڑادی۔ پھر وہ الاؤ پر نظریں جما کر اونچی آواز میں ایسے جنت منتر اور اشلوک پڑھنے لگا، جن کو سمجھنا کم از کم رزاتی کے بس کی بات تو نہ تھی۔ ایسی تیزی اور روانی سے وہ بڑبڑکے جا رہا تھا کہ پنڈت گردھاری لال کو بھی اس کی مشاطی پر حیرت ہو رہی تھی۔ جو کچھ سوامی کی زبان سے نکل رہا تھا وہ کسی بڑے پنڈت پجاری ہی سے ممکن تھا۔ پھر اسے خیال آیا کہ سوامی، کالی کا بھگت ہے اس لئے اس سے جو بھی سامنے آئے، کم ہے۔ یہ سوچتے ہی اس کا سر بڑی عقیدت سے سوامی کی طرف جھک گیا۔

سوامی کی نظریں دم بدم آگ کی بلند ہوتی لپٹوں پر اور رزاتی کی نگاہیں سوامی کے چہرے پر جمی تھیں، جہاں اب باقاعدہ پسینے کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ اس کے دبلے پتلے چہرے پر سرخ سرخ اور

”مگر کیوں؟“ اس سارے عرصے میں پہلی بار رزاقی کی زبان سے ہوش و حواس کے حامل الفاظ ابھرے۔

”دو کارن ہیں اس کے۔“ سوامی نے دائیں ہاتھ کی دو انگلیاں اس کی طرف اٹھائیں۔ ”ایک۔۔۔ ابھی آپ نے کالی خلتیوں سے لو بھ اٹھانے کی پہلی شرط ہی پوری نہیں کی۔“

”شرط؟“ رزاقی نے اسے اچھبھ سے دیکھا۔

”ہاں رزاقی بابو۔۔۔“ سوامی کے ہونٹوں پر بڑی مکار مسکراہٹ ابھری۔ ”سمکھائی لینے کے لئے بھی ہاتھ پھیلائے کاکٹ اٹھانا پڑتا ہے۔ آپ اتنا تو کیجئے کہ اتنے بڑے کام کے لئے دو گھنٹ اس امرت جل کے حلق میں اتار لیجئے۔“ اس نے زخمی ہاتھ لوبان اور حزل کے سفوف سے باہر کھینچا۔ اور اس کی مدد سے بوتل یوں اٹھائی جیسے درد کی اذیت سے اسے کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔ گلاس میں سیال اٹھایا اور رزاقی کی طرف بڑھا دیا۔

”میں شراب نہیں پیتا۔“ رزاقی نے نفی میں سر ہلایا۔

”مدرا کہہ کر اس پوتر شے کا پیمانہ نہ کیجئے رزاقی بابو۔“ سوامی نے اسے کڑی نظروں سے دیکھا۔ اس کے لہجے سے نفی چھلک رہی تھی۔ ”یہ دو گھنٹ آپ کے حلق سے اتریں گے تو آپ اپنی پتی کے شریک چھوٹنے کی پہلی شرط پوری کر پائیں گے۔“

”یہ ہے کیا؟“ رزاقی نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ ابھی تک اس نے گلاس کو چھوا نہیں تھا۔

”یہ۔۔۔“ سوامی نے گلاس کو بڑی عقیدت سے آنکھوں سے لگایا۔ ”یہ وہ شے ہے رزاقی بابو جسے ہم اپنے دھرم میں سب سے پوتر جل سمجھتے ہیں۔“

”گنگا جل۔۔۔؟“ رزاقی نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں۔“ سوامی نے سر انکار میں ہلایا۔ ”اس سے بھی مہمان شے ہے یہ۔ اس کا ایک قطرہ گنگا میں ڈال دیا جائے ناں رزاقی بابو تو پوری گنگا پوتر ہو جائے۔ لیجئے اسے پی جائیے۔“

”جب تک آپ بتائیں گے نہیں یہ کیا ہے؟ میں نہیں پیوں گا۔“ رزاقی نے نفی میں سر ہلایا۔

”رزاقی بابو۔۔۔“ سوامی بھڑک اٹھا۔ ”آپ وچن دے چکے ہیں کہ میری کسی بات پر بچھر مچر نہیں کریں گے۔ جو میں کہوں گا بلا چون و چرا اس مانتے جائیں گے۔“

”میں صرف یہ جانتا چاہتا ہوں کہ یہ ہے کیا؟“ رزاقی جیسے اپنی بات پراڑ گیا۔

”ہوں۔۔۔“ سوامی نے گلاس پیچھے ہٹا لیا۔ پھر کڑی نگاہوں سے رزاقی کو گھورنے لگا۔ ”تو آپ یہ جانے بغیر کہ یہ کیا ہے نہیں جیتیں گے؟“

”ایسا ہی سمجھ لیں سوامی جی۔“ رزاقی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ اس دوران اس کی نظریں بار بار

چلا نہ رہا تھا۔ بلکہ اب تو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ شراب کے نشے میں دھت ہو۔ اس کی آواز لڑکھاری تھی مگر الفاظ کے ردھم میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ وہ برابر اپنی صحت کے ساتھ ادا ہو رہے تھے۔

درد سے کراہتی ہوئی آنکھیں کھولنے میں رزاقی کو کتنی ہی دیر لگ گئی۔ پھر جب اس نے آنکھیں کھول کر لاؤ کی جانب دیکھا تو حیرت سے لنگ رہ گیا۔

الاؤ کے آگے اُندھیرا چائے بلند ہوتے شعلوں کی کانپتی روشنی میں سوامی کے بالکل سامنے راجیہ زمین پر یوں کٹمی سٹائی بیٹھی خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہی تھی جیسے اسے جاڑے کے بخار نے آلیا ہو۔ اس نے سر گھٹنوں میں دے رکھا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے سینہ جکڑا ہوا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور ہونٹ نیلے پڑ چکے تھے۔

رزاقی نے سوامی کی جانب دیکھا جس نے اپنے سامنے زمین پر بڑا تیز دھار خنجر اٹھا لیا تھا۔ ایک سیکنڈ کے وقفے میں اس نے دائیں ہاتھ میں تھامے خنجر کی نوک بائیں ہتھیلی پر رکھی اور ”جے کالی“ کے زوردار نعرے کے ساتھ دائیں ہاتھ کو حرکت دے دی۔ بے اختیار رزاقی کی پلکیں جھپک گئیں۔۔۔ مگر اس سے کیا ہوتا؟ سوامی کی ہتھیلی میں ایک گہرا شکاف نمودار ہوا۔ چھل چھل کرتا لہو ابلا جسے سوامی نے دائیں ہاتھ کی اوک میں بھر لیا۔ پھر اپنے مخصوص نعرے کے ساتھ اپنے لہو کا چھینٹنا سامنے چھوٹی موٹی بنی بیٹھی راجیہ پر پہنچ مارا۔

سرخ سرخ لہو راجیہ کے چہرے پر لپکتا تھا اور چہرے پر دھبوں کی صورت میں پھیلتا چلا گیا۔ سوامی نے تین چھینے اس پر اپنے جیتے جیتے ناپاک خون کے مارے اور ہر بار وہ کراہ کر یوں تڑپی جیسے اس کے بدن پر سوامی اپنا لہو نہیں تیزاب پھینک رہا ہو۔ رزاقی اس کے ہر بار تڑپنے پر ساری جان سے کانپ کر رہ گیا۔ پھر جب تیسری بار اس پر لہو پھینکنے کے بعد سوامی نے اپنا زخمی ہاتھ تھالی کے برادے میں ٹھونس دیا تو راجیہ بے سدھ ہو کر زمین پر لڑھک گئی۔ جیسے اس میں مزید اذیت سہنے کی طاقت نہ رہی ہو۔

”آپ کی پتی رزاقی بابو۔۔۔“ تب سوامی نے بڑے پراسرار انداز میں دایاں ہاتھ راجیہ کی جانب درواز کیا۔ ”وہ اپنے شریں پر ویش کر چکی ہے۔ اس کی آتما کو اپنا جیتا جاگتا شریں مل گیا۔ آپ کی پتی پھر سے جیوت ہو گئی۔ آپ کو مبارک ہو۔“

”میں۔۔۔ میں۔۔۔ اسے۔۔۔“ رزاقی نے اٹھ کر راجیہ کی طرف بڑھنا چاہا۔

”رک جائیے رزاقی بابو۔“ سوامی نے ہاتھ اٹھا کر اسے ایک بار پھر بڑے دنگ لہجے میں روک دیا۔ رزاقی ٹھک کر آدھا اٹھا اور آدھا بیٹھا رہ گیا پھر جھنجھلا کر پورا بیٹھ گیا۔ اسے اس وقت سوامی کا روکنا بہت بری طرح کھل گیا تھا۔

”ابھی آپ اپنی پتی کے شریک کو چھو نہیں سکتے۔“

گئے۔ چہرہ غیظ سے سرخ ہو گیا اور آنکھیں ابل پڑیں۔ ”یہ۔۔۔ یہ ناپاک شے تم چاہتے ہو میں اپنے حلق میں اٹھیل لوں؟“ غضب سے بھرائی ہوئی اس کی آواز حلق میں سے پھنس پھنس کر نکلی۔ ایک دم وہ آپ سے تم پر اتر اور یہ اس کے صبر کا پیمانہ چھلک جانے کی علامت تھی۔

”خاموش۔۔۔“ ہوامی نے گلاس زمین پر رکھا اور دائیں ہاتھ میں خون آلود خنجر تھامتے ہوئے اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ لگتا تھا اس کا بس نہیں چل رہا ورنہ وہ رزاتی کا زرخرہ کاٹ دیتا۔ ”خاموش رزاتی بابو۔۔۔“ تنبیہ کے طور پر مخاطب کرتے ہوئے اس نے اپنا زخمی ہاتھ اس کی جانب دراز کر دیا۔ ”اسے ناپاک کہہ کر آپ میرا اور میرے دھرم کا ایمان کر رہے ہیں۔ میں اسے سہن نہیں کروں گا۔“

اسی وقت اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھامے راجیہ اپنی جگہ کھڑی ہو گئی۔ وہ بری طرح ڈول رہی تھی۔ اس کے لبوں سے کراہیں خارج ہو رہی تھیں جیسے سر کا درد اس کی برداشت سے باہر ہو۔ رزاتی نے اس کی جانب دیکھا اور بے قرار ہو گیا۔ اس نے اس کی طرف قدم بڑھایا۔

”خبردار رزاتی بابو۔ آپ نے اس کی طرف بڑھنے کی کوشش کی تو میں اسے جلا کر بھسم کر دوں گا۔“ ایک دم جھک کر اس نے خنجر پر کچھ پڑھ کر پھونکا اور راجیہ کے سینے کی جانب تان لیا۔

”صاحب۔۔۔“ راجیہ کے لبوں سے کراہ نکلی تو رزاتی پوری جان سے لرز گیا۔ ”یہ ایسی طرح صاحب صاحب پکارتی ابھی کے ابھی آپ کے سامنے سو گئی کڑی کی طرح جل کر پختے لگے گی رزاتی بابو۔“ ہوامی بڑی خوفناک ہنسی ہنسا۔ ”میں نے کہا ناں۔ ابھی سارے کے سارے بچے تیرے ہاتھ میں ہیں۔ میں جو چاہوں جیسے چاہوں کر سکتا ہوں۔“

”تم۔۔۔ تم۔۔۔“ رزاتی بے بسی سے ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔ اس سے راجیہ کی تکلیف دیکھی نہ جا رہی تھی۔

”صاحب۔۔۔“ راجیہ نے اس کی جانب درد سے پھٹتی آنکھیں اٹھائیں۔ رزاتی ان مدد بھری آنکھوں میں پھیلے سرخ ڈورے دیکھ کر بے قابو سا ہو گیا۔ صاف لگ رہا تھا کہ اس سرخی کی تہہ میں اذیت ہی اذیت چھپی ہے۔

”تمہاری دوسری شرط کیا ہے ہوامی؟“ رزاتی نے رخ اس کی جانب پھیر کر پچا رگی سے پوچھا تو ہوامی پھر ہنسا۔

”ایک ہی پل میں ہوامی جی سے میں صرف ہوامی ہو گیا۔۔۔ چلو۔ کوئی بات نہیں۔ غصے میں منٹ کچھ بھی کہہ دیتا ہے۔ کچھ بھی کر دیتا ہے۔۔۔ تو میں بھی آپ کو رزاتی بابو کے سنگھاسن سے کچھ درجے نیچے بٹھا دیتا ہوں۔“ ایک دم اس کی آواز اور لہجہ بدل گیا۔ اس نے بڑی کڑی نظروں سے رزاتی کو گھورا۔ ”غور سے سنو مہاشے۔ میری پہلی شرط یہ ہے کہ تمہیں یہ پورے جل پینا پڑے گا اور دوسری اور

راجیہ کی طرف اٹھتی رہیں جو اب کسمار ہی تھی۔ شاید اسے ہوش آ رہا تھا۔

”اچھا۔۔۔“ ہوامی نے مجبور ہو کر جیسے کڑوا گھونٹ لگھا۔ ”تو ٹھیک ہے۔ میں بتا دیتا ہوں کہ یہ کیا ہے مگر۔۔۔“ اس نے انگلی رزاتی کی جانب اٹھائی۔ ”یہ سمجھ لیجئے کہ اگر آپ نے اسے پینے سے انکار کیا تو اپنی جتنی تک جانے کا آدھا راستہ اپنے ہاتھوں آپ خود پر بند کر لیں گے۔“ اس نے کراہتی اور ہولے ہولے ہوش میں آتی راجیہ کی جانب ابرو سے اشارہ کیا۔

”اور باقی کا آدھا راستہ کیسے کھلے گا؟ یہ بھی کہہ ڈالئے ہوامی جی۔“ رزاتی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ شاید راجیہ کی روح کو بھول ہوامی کے بدن حاصل کرتے پا کر وہ ناامیدی کی دلدل سے نکل آیا تھا۔

”میرا خیال ہے میں وہ بھی کہہ ہی ڈالوں تاکہ ہم دونوں کے درمیان کوئی سمیا باقی نہ رہے۔“ ہوامی نے گلاس زمین پر رکھ دیا۔

رزاتی اسے مختصر نظروں سے دیکھنے لگا۔

”رزاتی بابو۔۔۔ آپ کی اس کج بخشی نے مجھے چوکنا کر دیا ہے۔ چونکہ ابھی کھیل کا ہر پتا میرے ہاتھ میں ہے اور میں بسا پ آپ کو مات دینے کی شگتی رکھتا ہوں اس لئے بغیر کسی ابھنے کے میں صاف صاف کہہ دیتا ہوں کہ اگر آپ نے میری شرطیں سننے کے بعد انکار کا سہارا لیا تو آپ کی جتنی کی آتما کو جس طرح میں اس ملک میں اس کے شر میں لایا ہوں اسی طرح اس شریر سے ملک کر کے اسے واپس وہیں لوٹا بھی سکتا ہوں جہاں سے ایک کنھن اور لمبا سفر کر کے یہ آپ تک آئی ہے۔“

”میں یہ جاننے کے لئے کہ اس گلاس میں کیا ہے اور آپ کی دوسری شرط سننے کا بیٹابی سے منتظر ہوں ہوامی جی۔“ رزاتی نے بیقراری سے راجیہ کی طرف دیکھا جو آہستہ آہستہ جکی سر د زمین سے اٹھ جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا ڈولتا ہوا بدن ظاہر کرتا تھا کہ ایک تو وہ بیحد تکلیف میں ہے دوسرے اس کے حواس قابو میں نہیں ہیں۔ اس کی آنکھیں یوں چمکی ہوئی تھیں جیسے اسے کچھ دکھائی نہ دے رہا ہو۔ شعلوں کی کپکپاتی روشنی میں وہاں کا ہیبت ناک ماحول بڑا ڈراؤنا ہو رہا تھا۔ پنڈت اور اس کے دونوں سوکھے سڑے چیلے الاؤ کے ایک طرف بدرروحوں کی طرح بے حس و حرکت کھڑے تھے۔ جیسے نہ سن رہے ہوں نہ انہیں کچھ دکھائی دے رہا ہو۔

”تو سنئے رزاتی بابو۔۔۔“ ہوامی نے اس پر نظریں یوں مرکوز کر دیں جیسے چاہتا ہو کہ رزاتی کسی بھی اور طرف سے آنکھ کان کھل طور پر بند کر لے۔ ”یہ۔۔۔“ اس نے گلاس اٹھا کر اس کی جانب بلند کیا۔ ”گنوتا کا پیشاب ہے۔“

”کیا؟“ رزاتی ایک دم اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے نحیف جسم میں جیسے شرارے سے بھر

”جی مونس بابو۔ میں ابھی دیکھتی ہوں۔“

اس دوران رزاتی ہندو بستی کی راہ پر لگ گیا تو پروین خاموشی سے نیچے اتری اور چند لمحوں کے بعد بیلا کے کمرے کے باہر اس کھڑکی پر آ پہنچی جس کے گملے میں اس نے کچھ دن پہلے واک مین چھپایا تھا۔ بڑی احتیاط سے اس نے اندر جھانکا۔ بیلا بے سدھ بستر پر پڑی تھی۔ اس کی گردن ایک طرف ڈھکی ہوئی تھی۔ جسم پر کبل بڑے غیر فطری انداز میں اوڑھایا گیا تھا، یوں جیسے کسی نے اسے گملے میں پیک کر دیا ہو۔ اس نے چند لمحوں تک بیلا پر نظر نہیں جمائے رکھیں اور بے اختیار چونک پڑی۔ اسے لگا جیسے بیلا سانس نہ لے رہی ہو۔ اس کا سینہ اسے سانس کے زیرِ وبم سے متحرک نہ محسوس ہوا تو وہ گھبرا گئی۔۔۔

”کہیں کماری اسے ہمیشہ کی نیند تو نہیں سلا گئی؟“ اس دہشت ناک خیال کا آنا تھا کہ وہ پلٹ پڑی۔ تقریباً دوڑتی ہوئی گلی سے نکل کر بیلا کے دروازے پر جا پہنچی۔ دروازہ نہ باہر کالاک تھا نہ کمرے کا۔ اس نے تیزی سے بیلا کے بستر کے قریب پہنچنا چاہا تو اس کے پاؤں کی ٹھوک سے چھڑی اور موبائل بستر کے نیچے جا پڑے۔ اس نے ایک نظر بیلا کی جانب دیکھا۔ اس پر جھگی اور کبل اس کے سینے سے ہٹا دیا۔ پھر ہاتھ اس کی ناک کے آگے کیا تو اس کی جان میں جان آئی۔ سانس چل رہا تھا مگر اس قدر آہستگی سے کہ دور سے محسوس ہی نہ ہوتا تھا۔ اس نے کبل بیلا کے سینے پر برابر کیا۔ سمجھی کہ بیلا شاید کسی دوا کے زیرِ اثر گہری نیند سو رہی ہے۔

اسمیتان کا سانس لے کر اس نے بستر کے بیچ سے کماری کی چھڑی اور موبائل نکالا، جو اس وقت خاموش تھا۔ چھڑی ایک طرف ڈالی اور موبائل کا جائزہ لینے لگی۔ پھر مونس کو اس بارے میں اطلاع دینا ضروری سمجھ کر اس نے موبائل سکرین پر مونس کا نمبر روشن کیا۔

”ہاں پروین۔۔۔ بولو۔“ فوراً ہی مونس کی آواز دہی دہی ابھری۔ ”بولو مگر ذرا جلدی۔ اس وقت صورتحال بڑی نازک ہو رہی ہے۔“ اس نے آواز دبا کر کہا۔

اسی وقت جیسے کہیں دور سے ”جے کالی۔ جے درگا“ کا بلند بانگ نعرہ پروین کے کانوں سے ٹکرایا۔ ایک دم اس کا رنگ اڑ گیا اور دل ہم سا گیا۔

”کیا بات ہے مونس بابو۔ یہ آوازیں کیسی آ رہی ہیں۔ آپ اس وقت کہاں ہیں؟“ گھبرائی ہوئی سی آواز اس کے حلق سے نکلی۔ ”میں آپ کے پاس آؤں کیا؟“

”پگلی ہوتی۔ یہ عورتوں کا کھیل نہیں ہے۔“ مونس نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”یہاں صورتحال اس قدر نپیس کر دینے والی ہو چکی ہے کہ میں تمہیں بتا نہیں سکتا۔۔۔ تم جلدی بتاؤ، فون کیوں کیا ہے؟“

جواب میں پروین نے اسے مختصر آہیاں کی ساری صورتحال بتائی۔ جسے سننے کے بعد مونس نے ایک پل کی دیر کے بغیر کہا۔

آخری شرط یہ ہے کہ۔۔۔“ اس نے آنکھیں رزاتی کی آنکھوں میں ڈال دیں۔ چند لمحوں خاموشی کی کڑواہٹ نکلنے لگے گزر گئے تو رزاتی کا سانس رکنے لگا۔ وہ پوری بیتابی کے ساتھ سواری کے بولنے کا منتظر تھا جو شاید اس کی بے چینی کا مزہ لے رہا تھا۔ پھر جب اس نے دیکھا کہ رزاتی کی برداشت جواب دینے کو ہے تو اس نے من کی ساری غلاظت ایک ہی فحشے میں اگل دی۔

”دوسری شرط یہ ہے کہ تم ہمیں یہاں رام مندر بنانے سے نہیں روکو گے۔“

یوں محسوس ہوا جیسے رزاتی کے سر پر آسمان پھٹ پڑا ہو۔ زمین قدموں تلے سے سرک گئی ہو اور ایک دم آنکھیں بے بھر ہو گئی ہوں۔ وہ کسی ایسی اندھے شخص کی طرح لڑکھڑایا جس کے ہاتھ سے اچانک کوئی اس کی لاشیں چھین کر پیچھے کودھکا دے۔

☆=====☆=====☆

رات کے بارہ بج کر سات منٹ ہوئے تھے جب پروین نے کماری کو سفید ساڑھی میں ملبوس اپنی اسٹک کے بغیر کوارٹروں کی حد بندی سے نکلتے دیکھا۔ حیرت سے اس کے دماغ نے جھٹکا کھایا۔ کماری کی ٹانگ کا ٹنگ کہاں گیا؟ وہ سوچ میں ڈوبی ہندو بستی کی جانب سر جھکائے رواں کماری کو دیکھتی رہی۔ اس کے جسم میں تناؤ سا آ گیا۔ اس نے موبائل پر مونس کو کماری کی روانگی کی اطلاع دیتے ہوئے جب یہ بتایا کہ وہ چھڑی کے بغیر چل سکتی ہے تو مونس جواب میں حیرانی سے محض ایک لمبی ”اوہ“ کر کے رہ گیا۔ پھر اسے ہوشیار رہنے کی تاکید کی تو وہ موبائل اپنی جیب کی جیب میں رکھ کر کچھ سوچتی ہوئی اپنی جگہ سے ہٹی۔ تب تک کماری ہندو بستی کے میدان میں داخل ہو چکی تھی۔

رزاتی کے کمرے کی عقبی کھڑکی ابھی تک بند تھی۔ وہ یہ سوچتی ہوئی اس طرف ٹکراں ہو گئی کہ کماری کے ساتھ بیلا ہندو بستی کیوں نہیں گئی؟ یہ خیال بھی آیا کہ ہو سکتا ہے کماری بیلا کو سوتا چھوڑ کر نکل گئی ہو۔ وہ نیچے جا کر دیکھنا چاہتی تھی مگر رزاتی کے بارے میں جب تک کوئی واضح بات سامنے نہ آ جاتی، اسے اپنی جگہ پر موجود رہنا تھا۔ اسی لئے وہ تجسس دل میں دبائے اس وقت تک چھت پر گہرے اندھیرے کا جزو بنی کھڑی رہی جب تک رزاتی اپنے کمرے کی کھڑکی سے کود کر لڑکھڑاتا ہوا ہندو بستی کی جانب روانہ نہ ہو گیا۔ پروین کو لگ رہا تھا جیسے رزاتی نے نشہ کر رکھا ہو۔ وہ قدم رکھتا کہیں تھا اور پڑتا کہیں تھا۔ اس نے دوسری بار مونس کو موبائل پر اس امر کی اطلاع دی۔ جواب میں مونس نے پوچھا۔

”پروین۔ بیلا کہاں ہے؟“

”مونس بابو لگتا ہے وہ اپنے کمرے میں سو رہی ہے کماری اسے اپنے ساتھ نہیں لے گئی۔“

”ذرا اسے جا کر دیکھ لو۔ اگر وہ جاگ رہی ہو تو حال چال پوچھ لینا اور اگر سو رہی ہو تو جگائے بغیر لوٹ آنا۔ تمہاری کال نہ آئی تو میں سمجھوں گا میری دوسری بات درست ہے۔“

قلم کتنی بھی خوفناک ہو، ہوتی تو قلم ہی ہے ناں، جس کے دہشت ناک تاثر سے اپنے اعصاب کو بچائے رکھنے کے لئے پانچ روپے کی مونگ پھلی دانہ دانہ چھیل کر کھاتے رہنا کافی ہوتا ہے۔ مونس کے منہ میں چوگم بھی کام کر رہی تھی اس کا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ تاہم وہ یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ جس طرح سوای سینٹرے بدل رہا ہے رزاقی کی جگہ کوئی بھی دوسرا ہوتا تو اسی طرح اس کے چکر میں آ جاتا۔

☆=====☆

رزاقی کئی قدم پیچھے ہٹا اور چکر اگر گرتے گرتے بچا۔ اس نے دائیں بائیں سہارے کے لئے ہاتھ پھیلائے مگر وہاں کیا تھا جسے وہ تمام لیتا۔ بڑی مشکل سے وہ اپنے کانپتے ہوئے پیروں پر کھڑا ہو سکا۔ سوای خاموشی سے اس کی حالت کا جائزہ لے رہا تھا جیسے اسے رزاقی پر اپنی بات کے ایسے ہی اثر کی توقع تھی۔

”کیا کہا تم نے؟“ کتنی ہی دیر بعد وہ سنبھلا تو اس نے سوای کی جانب چندھیائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔

”مہاشے۔۔۔ میں نے سنکر ت نہیں بولی۔ سیدی سادی ہندی میں کہا ہے کہ تم ہم لوگوں کو یہاں خالق عمر میں رام مندر بنانے دو۔ اس میں کوئی از جن نہ ڈالو۔“ سوای نے تعقیر آمیز لہجے میں کہا۔ ”گنونا کا پیشاب حلق سے اتار لو اور مندر بنانے کے راستے سے اپنی ضد سمیت ہٹ جاؤ۔ تمہاری بچی کو دکان پر لے کر گیل ابھی تمہارے ساتھ روانہ کر دوں گا۔“

”صاحب۔۔۔“ اس کی کسی بھی بات کا جواب دینے سے پہلے رزاقی کے کانوں میں ایک درد بھری کراہ نے جگہ بنالی اس نے گردن گھما کر اپنے پیروں پر بے شکل کھڑی ہوئی راجیہ کی طرف دیکھا جو اسے بڑی ہمتی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

”راجیہ۔۔۔“ رزاقی نے اسے یوں دیکھا جیسے اسے صاف نہ دکھائی دے رہا ہو۔ ”ساتم نے۔۔۔ یہ سوای کیا کہہ رہا ہے؟ ہمارے ملن کی رگوں میں اس نے کیسی کڑی شرطوں کا زہر اتار دیا ہے۔ کیا مجھے اس کی بات مان لینی چاہئے۔ تم بتاؤ؟“ رزاقی نے راجیہ کے جسم سے اٹھتی پروفیسی کی خوشبو اپنے تھنوں سے ٹکراتی محسوس کی اور بڑے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

”یہ بیجاری کیا کہے گی مہاشے۔۔۔“ سوای نے طفر سے دخل دیا۔ ”یہ تو خود میرے بس میں ہے۔ میں جب چاہوں اس کا ناش کر دوں۔ جب چاہوں اسے تم سے چھین کر واپس برہا کے اسی نرک میں دھکیل دوں جہاں یہ جنم جنم تک صاحب صاحب پکارتی رہے گی اور اس کی آواز سننے والا کوئی نہ ہوگا۔ کوئی نہیں۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔“ وہ کسی ایسے دردے کی طرح حلق پھاڑ کر ہنسا جسے اپنے شکار کو تڑپا

”تم بیلا کے پاس رہو یا چھت پر۔ اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا پروین۔ معاملات اپنے آخری مرحلے پر ہیں۔ ہاں یہ کرنا کہ اگر کماری واپس کو ارڈر پہنچے تو اسے وہیں روک لینے کی کوشش کرنا“ کہیں مت جانے دینا اور موقع پا کر مجھے فون کر دینا۔ جو موہاں کل تمہیں ملا میرا خیال ہے وہ کماری ہی کا ہے۔ اسے اپنے پاس سنبھال لو تاکہ کسی کی اس پر کال آئے تو تم اسے اسٹینڈ نہ کرو۔ باقی بیلا تو اسے آرام کرنے دو۔“ مونس کا لہجہ عجیب سا ہو گیا۔ پروین سمجھ نہ سکی کہ وہ طفر کر رہا ہے یا اسے بیلا پر پیار آ رہا تھا۔ ”ایک بات اور۔۔۔ وہاں کی تلاشی لینے کی ضرورت نہیں۔ محض وقت ضائع ہوگا اور بس۔“ مونس نے اس کے جواب کا انتظار کرنے کی زحمت ہی نہ کی اور رابطہ ختم کر دیا۔

☆=====☆

غلام حسین اپنی جگہ پر الٹ تھا تو شوکت شمشان گھاٹ میں پڑے لکڑیوں کے ڈھیر کے پیچھے چھپا، مونس کی مہر ای میں ساری کارروائی دیکھ اور سن رہا تھا۔

یہ جگہ سوای سے تقریباً چند گز دور اس کے عقب میں بائیں ہاتھ تھی جہاں سے وہ سب کچھ صاف صاف دیکھ اور سن سکتے تھے۔ جب مونس نے پروین سے آخری بار بات کر کے فون بند کیا تو یہ وہ وقت تھا جب سوای نے رزاقی کو گلاس میں بوتل سے سیال انڈیل کر پینے کے لئے کہا۔

”سر۔۔۔“ شوکت کے لبوں سے سرگوشی نکلی۔ ”یہ کہیں زہری نہ ہو؟“

”شش۔۔۔“ مونس نے اس کا ہاتھ دبا یا۔ ”خاموشی سے سنو اور چپ چاپ دیکھو۔ اگر سوای کو زہری دینا ہوتا تو اتنا سا چوڑا کھڑاگ پھیلائے کی کیا ضرورت تھی اسے۔“

بات شوکت کی کھوپڑی میں اتر گئی۔ اس نے سر اثبات میں ہلایا اور ہمہ تن چشم و گوش ہو کر نظر سامنے جمادی۔ اسی وقت سوای نے ایک بار پھر بے جے کارے بلند کئے اور مونس چونک پڑا۔ پھر اس نے اپنا سارا دھیان سامنے ہوتے ناک پر لگا دیا جہاں اس وقت سوای رزاقی کو یہ بتا رہا تھا کہ اس کے ہاتھ میں موجود پوتر جل کا ایک قطرہ ساری لنگا کو شدہ کر سکتا ہے۔ وہ اس ساری کارروائی کو ناک سے زیادہ کچھ بھی اہمیت دینے کو تیار نہ تھا اس لئے کہ وہ سوای کے پھیلائے ہوئے اس سارے گورکھ دھندے کی کچھ باتیں نہ سمجھ کر بھی یہ جان چکا تھا کہ راجیہ کی روح جب نمودار ہوئی تو الاؤ کے شعلوں میں پاؤں پاؤں ڈوبی کیسے دکھائی دے رہی تھی؟ غلام حسین الاؤ کے دوسری طرف سے ایک درخت کے عقب میں چھپا سب کچھ دیکھتا اور مونس کو بتاتا رہا تھا۔ غلام حسین کے آگاہ کرتے ہی وہ اس سارے ڈرامے اور کسی حد تک راجیہ کی روح کی حقیقت تک پہنچ گیا۔ اس لئے اگر ایک طرف اب وہ اور اس کے آدمی کسی بھی گھمبیر صورتحال سے نمٹنے کے لئے پوری طرح فارم میں تھے تو دوسری طرف اسے سوای اس کی حرکتوں اور باتوں سے کسی بھی ہونے والے انکشاف حیرت نہ ہو رہی تھی۔

پتری کو تم سے چھین لیا۔۔۔ اس سے تو میں بھلا جس نے تمہاری پتی کی آتما کو اس کا شریر دان کر کے تمہارے سامنے لا کھڑا کیا۔۔۔“

”یکو اس مت کرکتے کے بچے۔۔۔“ ایک دم رزاتی آپ سے باہر ہو گیا۔ جیسے اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی ہو۔ وہ لاواؤں میں پھٹتی کسی سوکھی لکڑی کی طرح بھڑک اٹھا۔ لہو رنگ چہرے اور کوندنی برق جیسی آواز کے حامل اس رزاتی اور چند لمحے پہلے کے نحیف و نزار بے بس رزاتی میں کوئی میل ہی نہ تھا۔ ”مہاشے۔۔۔“ سوامی حلق کے بل چنچا۔

”حرامزادے۔۔۔“ رزاتی طیش میں لرزتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ ”میرے اللہ اور میرے آقا کے ساتھ اپنا موازنہ کر رہا ہے۔ تیری ایسی جرات۔۔۔ ایسی گستاخی۔۔۔“

”صاحب۔۔۔“ راجیہ نے رزاتی کی طرف باہیں پھیلا کر اس کی طرف بڑھنا چاہا مگر رزاتی نے اس کی جانب دیکھا ہی نہیں۔

”رک جا۔۔۔“ ایک دم سوامی نے ایک بار پھر خنجر کی نوک راجیہ کی طرف سیدھی کر لی۔ اس کی گرجتی آواز نے راجیہ کے اٹھتے قدموں میں زنجیر ڈال دی۔ ”سن۔۔۔ تو ابھی تک میری اچھیا کے بندی خانے میں ہے۔۔۔ خبردار جو ایک قدم بھی آگے بڑھی۔۔۔ میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ ابھی اور اسی وقت اپنی دنیا میں واپس لوٹ جا۔۔۔“

”صاحب۔۔۔“ راجیہ نے سہم کر سوامی اور پھر رزاتی کی جانب دیکھا جو ہانپتا ہوا بڑے دکھ سے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ”صاحب۔۔۔“ مجھے روک لیجئے صاحب۔۔۔ مجھے واپس جانے سے روک لیجئے۔۔۔“ وہ سسک پڑی۔ پھر اس کی آنکھوں سے بڑے بڑے آنسو چھلک پڑے۔

”راجیہ۔۔۔“ دُکھے من کے ساتھ مگر آنچ دیتی آواز میں رزاتی نے کہتے ہوئے نظر اس پر مرکوز کر دی مگر اس کے لہجے میں اب بھی آگ کا وہی لپکا تھا جو سوامی کو گالیاں دیتے ہوئے بھڑکا تھا۔ ”تم چاہتی ہو کہ میں اس حرامزادے کی بات مان کر اپنے اللہ سے کٹ جاؤں۔ اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی ہونے کا طوق اپنے گلے سے اتار بیٹھوں؟ نہیں راجیہ نہیں۔۔۔“ رزاتی نے بڑی شد و مد سے سرفی میں ہلایا۔ ”تیرے جیسی اربوں کھربوں محبوب بیویاں میں اپنے اللہ اور اپنے آقا پر قربان کر دوں اور ارف نہ کروں۔“

”صاحب۔۔۔“ راجیہ نے اسے حیرت سے دیکھا اور اس کی پھیلی ہوئی باہیں سمٹ گئیں۔ ”یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“

”سچ کہہ رہا ہوں راجیہ۔“ رزاتی نے اسی لہجے میں کہا۔ ”پوچھ اس کتے کے حرامی پلے سے۔“ اس نے ہاتھ سوامی کی طرف دراز کیا۔ ”کیا میں نے اسے کہا نہیں تھا کہ میرے دین میرے اللہ اور

تریا کر مارنے میں سرو دل رہا ہو۔

”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے صاحب۔۔۔“ بے بسی کی سراپا تصویر راجیہ نے غم آنکھوں سے رزاتی کی طرف دیکھا۔ ”میں اس کے جال میں ہوں۔ یہی مجھے یہاں تک لایا ہے اور اسی کے ہاتھ میں ہے کہ مجھے آپ کے حوالے کرنے یا واپس بھیج دے۔ آپ سے دور۔۔۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فراق کی آگ میں دن رات جلنے کے لئے۔ آپ خود سوچئے صاحب کہ آپ کو کیا کرنا چاہئے۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔ کیا بنا سکتی ہوں آپ کو۔“ اس نے سر جھکا کر چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔

راجیہ کے جسم سے بھاگ بھاگ کر اپنی جانب آتی مہک کو رزاتی نے آنکھیں موند کر تھنتوں کے راستے یوں جسم و جان میں اتار لیا جیسے ایک اک رنگ وریشے میں اس خوشبو کا پودا لگایا جاتا ہو۔ پھر اس نے آنکھیں کھول کر پہلے راجیہ اور پھر سوامی کی طرف دیکھا۔

”تو تم چاہتے ہو کہ میں تمہاری گنوا ماتا کا یہ ناپاک پیشاب پی لوں؟“

”مہاشے۔۔۔؟“ سوامی کی آواز پھٹ گئی۔ ”اگر تیری بارتم نے اس پوتر جل کا ایمان کیا تو میں سب کچھ بھول کر اپنی اوقات پر اترا آؤں گا۔۔۔ بھول جاؤں گا کہ میں نے تمہیں کوئی وجہ دیا تھا۔ تمہارے لئے اتنا کٹ اٹھا کہ تمہاری پتی کو شریر دان کیا ہے اور یہ بھی بھول جاؤں گا کہ میں اس وقت تمہاری ہو میں کھڑا ہوں۔۔۔ تم میری شکلیوں سے انجان ہو اسی لئے جذبات میں بہہ کر بار بار میرے دھرم کا ایمان کئے جا رہے ہو۔ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ مجھے جانے والے ”حرامی“ کہتے ہی نہیں سمجھتے بھی ہیں۔۔۔“ طیش کے مارے سوامی کی باجھوں سے کف بہہ نکلا۔ وہ اس وقت کسی باؤلے کتے کی طرح منہ سے جھاگ چھوڑ رہا تھا۔

”تم چاہتے ہو کہ جس زبان سے میں اپنے اللہ کا نام لیتا ہوں جس زبان سے اپنے آقا و مولا صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتا ہوں اس زبان کو ایسا ناپاک کر لوں کہ جہنم بھی مجھے قبول کرنے سے انکار کر دے۔۔۔“ رزاتی نے دونوں ہاتھ پہلوؤں پر رکھ کر بڑے سرو لہجے میں کہا۔ ایک دم اس کی آواز غضب ناک اور چہرہ سرخ ہو گیا۔ آنکھیں آگ اگلنے لگیں۔ پھر دانت پیستے ہوئے وہ بولا تو لگا جیسے آتش فشاں کی گڑ گڑاہٹ نے گھن گرج کا چولا پہن لیا ہو۔

”تم نے ایسا سوچ بھی کیسے لیا سوامی کہ میں اپنے اللہ سے بندگی اور اپنے آقا سے غلامی کی نسبت توڑ دینے والی تمہاری یہ بات سن کر اپنے پیروں پر کھڑا رہ سکوں گا سانس لے سکوں گا اور تمہیں معاف کر دوں گا۔“ رزاتی نے ہاتھ اس کی جانب یوں دراز کیا جیسے اس کا گلا دباؤنا چاہتا ہو۔

”اللہ۔۔۔ آقا۔۔۔ ہند۔۔۔“ سوامی نے حقارت سے کہا۔ ”اپنے کس اللہ کی بات کرتے ہو مہاشے۔۔۔ جسے تم اپنے آقا کے لئے دیتے رہے مگر اس نے تمہاری ایک نہ سنی اور تمہاری پتی اور

میرے آقا کے بارے میں کبھی کچھ نہ کہے۔ ان کو اپنے اور میرے درمیان کسی طور نہ لائے مگر۔۔۔ اس نے یہی کیا۔“ نفرت سے رزاقی کا چہرہ دھک اٹھا۔

”اگر اپنے اللہ سے تجھے اتنا ہی پیار ہے تو اس کے گھر کا دروازہ تو نے خود اپنے ہاتھوں اپنے آپ پر بند کیوں کیا مگر رکھ؟“ اس کی گالیوں کو ایک طرف رکھ کر جانے کس مصلحت کے تحت ایک دم سوامی نے جھلا کر یوں کہا جیسے رزاقی کی دھکی رگ پر ہاتھ رکھنا چاہتا ہو۔

”کیا تو بھول گیا سوامی۔۔۔“ رزاقی نے بڑی حقارت سے کہا۔ ”میں نے تجھ پر پہلی ہی ملاقات میں واضح کر دیا تھا کہ یہ میرا اور میرے اللہ کا معاملہ ہے جس میں کسی کو دخل دینے کی اجازت ہے نہ ضرورت۔ میں اپنے اللہ سے کیا چاہتا ہوں اور وہ مجھ سے کیا سلوک کرتا ہے اس کا کسی دوسرے اور خاص طور پر تجھ جیسے مشرک سے کیا تعلق؟ ارے کفر کے پتلے! تو کیا جانے ایک مسلمان اور اس کے معبود کے رشتے کو۔ وہ ہماری خطائیں یوں معاف کرتا ہے جیسے کوئی ماں اپنی بگڑی ہوئی اولاد کے لاڈ دیکھتی ہے۔ ہماری گمراہیوں پر یوں پردے ڈالتا ہے جیسے کوئی باپ اپنے بچوں کے عیبوں سے چشم پوشیاں کرتا ہے۔ ہمارے گلے شکوے یوں سنتا ہے جیسے روتے بسرتے بچے پر ماں باپ کو پیار آتا ہے اور وہ اس کی ضد پوری کرنے سے پہلے جی بھر کے اس کا رونا پیٹنا دیکھتا اور اسے جی جان سے چومنا چاہتا ہے۔

میں نے اپنے اللہ سے گلے کیا تو تجھے اس سے کیا؟ اس سے شکوہ کیا تو تیرا اس سے کیا ناطہ؟ تو سمجھتا ہے اس نے میری نہیں کی تو مجھے اس کا طعنہ دینے والا تو کون؟ پھر بھی تو اس بات کو آڑ کرنا میری زندگی کے سب سے بڑے دکھ سے کھلاڑ کرنا چاہتا ہے تو یونہی سہی۔ کھیل جتنا کھیل سکتا ہے۔۔۔ زیادہ سے زیادہ کیا کرے گا تو۔۔۔ اسے واپس بھیج دے گا۔ بھیج دے۔ یہ تو مجھ سے کب کی دور جا چکی ہے۔

اسے مجھ سے چھین لے گا۔ چھین لے۔ میں اسے ہمیشہ کے لئے کھو چکا ہوں۔ سمجھ لوں گا اس کا میرے پاس یوں لوٹ آنا ایک طویل خواب تھا۔ ایک ایسا خواب جس سے بیداری ایک اٹل حقیقت ہے۔ میں اپنے ایمان کی قیمت پر اس کا فانی جسم حاصل نہیں کر سکتا۔۔۔ یہ بھی فانی۔ میں بھی فانی۔ کیا تو اس بات کی ضمانت دے سکتا ہے کہ تیری دونوں ناقابل قبول شرطیں مان لینے کے بعد میں اسے اپنی راجیہ کو لے کر صحیح سلامت اپنے گھر تک پہنچ سکوں گا؟ اسے چھونے سے پہلے اسے یا مجھے موت نہیں آجائے گی؟ نہیں ناں۔ تو پھر میں ایسا خسارے کا سودا کیوں کروں؟ جا۔۔۔ لے جا اس آتما کو جسے اپنی کالی شکستی کے بل پر بدن دینے کا تو دعویدار ہے۔ نہیں چاہئے مجھے وہ کھلونا جو مجھے میرے ایمان کی نماز سے غافل کر دے۔ نہیں چاہئے ایسا محبوب جو مجھے اللہ کے محبوب کا مجرم بنادے۔“ رزاقی کے لہجے میں ایسی گھن گرجن تھی کہ سوامی جیسا گھاگ مشرک بھی تھوک نکل کر رہ گیا۔ اس نے ایک نظر راجیہ کی طرف دیکھا جو بڑی عجیب سی نظروں سے رزاقی کو تنک رہی تھی۔۔۔ یہ نظریں۔۔۔ ان میں جلتی ہوئی مشعلیں۔۔۔

سوامی کے سن کا اندھیرا کانپ اٹھا۔

”سن لیا تو نے۔۔۔ یہ تجھ سے ملن نہیں چاہتا۔“ اس نے راجیہ کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے لئے مخاطب کیا۔

”سن لیا۔۔۔“ راجیہ کے لبوں سے سرگوشی سی آزاد ہوئی۔

”تو اب یہاں کھڑی کیا سوچ رہی ہے۔ چھوڑ دے اپنا یہ شریر اور لوٹ جا۔۔۔ اس کی دنیا سے نکل جا۔۔۔“ نکلیوں سے رزاقی کو دیکھتے ہوئے اس نے لفظوں کی جادوگری جگائی۔ شاید چاہتا تھا کہ کسی بھی لمحے رزاقی اپنا فیصلہ بدل کر اس کی طرف پلٹ آئے مگر رزاقی۔۔۔ وہ تو سپاٹ چہرے کے ساتھ راجیہ کو دیکھے جا رہا تھا اور بس۔

”کہاں لوٹ جاؤں؟“ راجیہ نے رزاقی کو دالہا نہ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”وہیں۔۔۔ اپنی دنیا میں۔۔۔ جہاں اس مورکھ کی جدائی میں آپیں بھرتے“ آنسو بہاتے“ اسے پکارتے پکارتے تیرے جنم پر جنم بیت جائیں گے مگر اس پچھتاوے کی آگ سرد نہ ہوگی کہ اپنے دھرم کی آڑ لے کر اس نے تیری ساری تمپیا“ ساری کٹھنیاں“ سارے ڈنڈ بھو گئے کے اُن گنت پل ملیا میٹ کر دیے۔۔۔ لوٹ جا۔۔۔ لوٹ جا۔۔۔“ سوامی نے خنجر والا ہاتھ پہلو میں گراتے ہوئے دوسرا ہاتھ راجیہ کی طرف جھکا۔

”نفس در لوٹ جاؤں گی سوامی۔۔۔“ راجیہ نے خواب آلودہ دالہا میں کہا۔ ”مگر تو اس ایک لمحے کا سرور تو لے لوں جس میں مجھ کو کچھ عطا ہوا ہے جس سے میں سات جنموں میں بھی محروم رہتی۔“

بری طرح چونک کر اگر سوامی نے راجیہ کی جانب دیکھا تو رزاقی کا حال بھی اس سے الگ نہ تھا۔ دونوں کی نظریں ایک ساتھ راجیہ پر مرکوز ہو گئیں۔

”کیا کہنا چاہتی ہے تو؟“ سوامی کے دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔

”تو اسے نہیں سمجھ سکے گا سوامی۔“ راجیہ نے اسی لہجے میں کہا۔ اس کی مشطوں جیسی روشن آنکھیں رزاقی کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ سیاہ بال ہلکے ہلکے ہلکے ہلکے لے رہے تھے۔ ساڑھی کا سفید پلو سرسرا رہا تھا۔ پروفنسی کی مہک فضا میں رقص کر رہی تھی۔ ہونٹوں پر ایسی خوبصورت مسکراہٹ جادو جگا رہی تھی جسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ پھر اس نے سوامی کی طرف بڑی زہریلی نظروں سے دیکھا۔

”تیرا خیر ہوس کی ناپاک مٹی سے اٹھا ہے سوامی۔۔۔ اور میں بات کر رہی ہوں عشق کے اس پوتر جذبے کی جس کا اظہار اگر لفظوں میں ممکن ہے تو میرے صاحب سے سن۔۔۔ اگر اسے کسی شکل میں دیکھنا ہو تو میرے صاحب کو دیکھ۔ مجھ سے پوچھ کہ جب کسی اپنے کی جدائی دل پر قیامت ڈھاتی ہے تو

انسان کیسے کیسے فریب کھانے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ تب میرے صاحب جیسا سچا محبت کرنے والا اپنے من کی حسرتوں پر کیسے کیسے تالے لگاتا ہے۔ تب ان کی زبان سے نکلنے والے مسجد کے میناروں جیسے معصوم الفاظ کیسے خون رلاتے ہیں۔ میں جانتی ہوں، میں نے اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ایک شوہر کی اپنی محبوب بیوی سے محبت کیا ہوتی ہے؟ اس سے فراق کا زہر گھونٹ گھونٹ کیسے پیا جاتا ہے؟ پچھڑ جانے کا ڈکھ کیا ہوتا ہے اور اس ڈکھ میں مرمر کر جینا کیا ہوتا ہے؟ اپنی دنیا اجڑ جانے پر دنیا بنانے والے سے اس یقین کے ساتھ گلہ کیسے کیا جاتا ہے کہ وہی ہے جو ہر شے پر قادر ہے وہی ہے جو انہونی کو ہونی میں بدل سکتا ہے اور وہی ہے جو اپنے بندے کو آزمائش کے نام پر اپنی رضا کا امرت پلانا چاہتا ہے۔ اور اگر عشق مجازی سے بلند کسی رشتے، کسی تعلق سے آشنائی چاہے تو میرے صاحب کے ایمان پر نگاہ ڈال۔ تجھے پتہ چلے گا کہ ایک انسان کا معبود کیا ہوتا ہے اور اس کا بندہ کیا ہوتا ہے؟ کسی بھٹکے ہوئے انسان کے ایمان کی ڈور بھی کیسی مضبوط ہوتی ہے کہ وہ راہ بھول جانے والا انسان اسے چھوڑنے کے بجائے سارے رشتے، سارے ناطے توڑ دینے پر خوشی سے آمادہ ہو جاتا ہے۔ مگر نہیں۔۔۔ تیرے نصیب میں یہ سب کہاں؟“ اس کا لہجہ نفرت سے آلودہ ہوتا چلا گیا۔ ”تو آزمائش کے نام پر جسموں کی دلالی کرنے والا بت پرستوں کا وہ بے غیرت ٹھیکیدار ہے جس کی آنکھوں پر حرامزدگی کی پٹی بندھی ہے۔“

”کیا؟“ رزاتی کو اپنے کانوں کی پریقین نہ آیا۔ وہ بے اعتباری سے اپنے سامنے کھڑی راجیہ کے سراپے کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے یوں گھور رہا تھا جیسے کسی دھماکے کی آواز پر گہرے خواب سے بدحواس ہو کر جاگ گیا ہو اور اب اسے سمجھ نہ آ رہی ہو کہ ہوا کیا تھا۔ شمشان کی خاموشی پر بے یقینی کے بادل ایک دم چھائے اور گہرے ہوتے چلے گئے۔ سوامی بے اختیار رناج کر رہ گیا۔

”راجیہ۔۔۔“ رزاتی کے ہونٹوں سے حیرت بھری آواز نکلی جس کے دماغ میں راجیہ کی باتیں دھماکے پیدا کر رہی تھیں۔

”میں آپ کی راجیہ نہیں ہوں۔۔۔“ وہ رکی۔ چند لمحوں کے بعد اس کے کپکپاتے لب واہوئے اور بڑی پھینکی اور دل دہلا دینے والی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے کہا۔ ”مگر میرے صاحب آپ ہی ہیں۔۔۔ رزاتی بابو۔“ اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

”کرامزادی۔۔۔“ وہ خلق کے بل چیخا۔ اس کا جی چاہا کہ ہاتھ میں تھا مگر راجیہ کے سینے میں بھونک دے۔۔۔ مگر اسے رک جانا پڑا۔ راجیہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی تھیں اور ان آنکھوں میں کیسی بغاوت، نفرت اور جان دے دینے، جان لے لینے کا کیسا عزم جواں تھا یہ اس کے دھڑکتے دل کی دھک دھک اسے خوب سمجھا رہی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ خنجر لہراتا ہو اور راجیہ پر ٹوٹ پڑتا، کسی کی گونج دار آواز نے شمشان میں چھا جانے والے سناٹے کی چادر میں آگ لگا دی۔

”کیا؟“ سوامی جیسے لڑکھڑا کر رہ گیا۔ وہ بے یقینی سے راجیہ کو گھور رہا تھا۔

”ہاں۔۔۔ اب میں تیری بندی نہیں ہوں۔ تیری کائنات سے ملکت ہو گئی میں۔“ راجیہ کے دہکتے لہجے پر شبنم کا چھینٹا لگ گیا۔ اس نے نگاہوں کا رخ بدلا اور عجب والہانہ انداز میں رزاتی کو تکتے ہوئے بے اختیار کہا۔ ”آپ نے بہت اچھا کیا میرے صاحب۔۔۔ بہت اچھا کیا کہ اپنے ایمان کی قیمت پر مجھے حاصل کرنے سے انکار کر دیا۔ مجھ جیسی اربوں کھربوں آپ پر قربان۔۔۔ آپ کے قدموں پر نثار۔۔۔“

”یہ ٹھیک کہہ رہی ہے رزاتی۔۔۔ میری جان! یہ راجیہ بھالی نہیں ہے۔“

رزاتی اس آواز پر بری طرح چونکا۔ اچھل سا پڑا۔ سوامی نے گہرا کر آواز کی سمت دیکھا اور اس کا دل اچھل کر حلق میں آ رہا۔ راجیہ بھی چونکی مگر اس کے انداز سے کسی خوف کا اظہار نہ ہوا۔ اس نے بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں اس سمت دیکھا جدر سے آواز ابھری تھی۔

اسی وقت پنڈت اور اس کے پیلوں نے بھاگنے کے لئے پرتولے۔ فوراً ہی گولی چلنے کے اوپر

عمل شدید غصے کی شکل میں ظاہر ہو رہا تھا۔

شوکت نے مزید دیر کے بغیر اپنا ریو اور انگلی میں گھمایا اور سوامی کو کینہ تو زری سے گھورتا ہوا شمشان سے نکل گیا۔

راجیہ کسی مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس نے بائیں ہاتھ سے دایاں بازو دکائی کے آخر سے تھام رکھا تھا اور بالکل خاموش تھی۔ سوامی غلام حسین کی گرفت میں بے بسی سے ہاتھ اوپر کئے دائیں طرف چند فٹ کے فاصلے پر کھڑا کماری کو یوں گھور رہا تھا جیسے اُلوا چا تک اجالے میں آ کر بصارت سے محروم ہو گیا ہو۔ پھر اس نے ذرا سی گردن گھما کر مونس اور رزاتی کا جائزہ لیا اور اس قدر زور سے جبرے جھینچے کہ جبروں کی ہڈیاں ابھر آئیں۔ اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ ایک ایک کی ٹکابوٹی کر کے کسی بھوکے کی طرح خود ہی کھا جاتا۔

رزاتی کا جی نہ چاہ رہا تھا کہ مونس کے سینے سے الگ ہو۔ سکون کی ایک لہر تھی جو اسے اپنے ساتھ بہائے لئے جارہی تھی۔ وہ کسی معصوم بچے کی طرح اس سے لپٹا کھڑا رہا۔

”مونس۔۔۔ یہ سب کیا ہے؟“ رزاتی نے دھیرے سے سرگوشی کی۔

”بڑی تفصیل طلب بات ہے میری جان!“ مونس نے رزاتی کا ہاتھ تھپتھپایا۔ ”اطمینان سے بتاؤں گا۔ فی الحال اتنا جان لو کہ تمہارے سامنے یہ راجیہ بھائی نہیں، کماری کویتا کھڑی ہیں۔“

”کیا؟“ رزاتی ایک جھٹکے کے ساتھ کپکپا کر رہ گیا۔ اسے جیسے مونس کی بات پر یقین نہ آیا۔ گردن گھما کر اس نے زمین کو گھورتی اس پری ویش کی طرف دیکھا جس کا سر اٹھائے نہ اٹھ رہا تھا۔ اس کی کھنٹی زلفوں نے چاند چہرے پر بدلیوں کی سی چھاؤں کر رکھی تھی، جس کے پار اس کی کیفیات کا جائزہ لینا ذرا مشکل ہو رہا تھا۔

”سوامی دھیرج داس اور کماری ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔۔۔“ مونس نے رک کر ایک گہری سانس کے ساتھ کماری کے چہرے پر نگاہ مرکوز کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کی اصل صورت راجیہ بھابی سے اس قدر ملتی ہے کہ اسے راجیہ بھابی کی روح بنا کر تم سے خالق مگر میں مندر بنانے کے ناپاک منصوبے نے سوامی کے شیطانی دماغ میں جنم لیا۔“

”مگر مونس۔۔۔ یہ کیسے ممکن ہے؟“ رزاتی کے دماغ میں ہوتے دھماکے اب ہلکے ضرور ہو گئے مگر اب بھی وہ شش و پنج میں تھا۔ ”یہ تو اسٹک کے سہارے چلتی تھی اور پھر جس شکل صورت کے ساتھ یہ سب کے سامنے آتی تھی اس میں اسے کوئی بھی پہچان نہ پایا۔ کیوں؟“

”وہ سب میک اپ کی جدید ٹیکنیک کا کمال تھا یا۔۔۔“ مونس نے اسے مختصر بتایا۔ ”میک اپ ماسک اس وقت بھی بیلا کے کوارٹر میں ان کے سامان میں تمہیں مل جائے گا۔ ہوتا تو یہ ہے کہ کسی کی شکل

تین تین دھماکے ہوئے اور پنڈت اور اس کے دونوں چیلے چیختے ہوئے شمشان کی کچی زمین پر ڈھیر ہو گئے جبکہ کسی کے مضبوط ہاتھ نے بڑی بے رحمی سے سوامی کے ہاتھ سے خنجر چھین کر اسے بازو کی آہنی گرفت میں لے لیا۔

☆=====☆=====☆

”مونس۔۔۔“ رزاتی کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی آواز خارج ہوئی۔

”اپنا سایہ کہو سو ہنا۔۔۔ کیا بھول گئے کہ میں اندھیرے میں بھی تمہارے ساتھ رہتا ہوں۔“ بھاگتے دوڑتے قدموں کی آوازوں میں مونس دھواں اٹھتا ریو اور ہاتھ میں تھامے لپک کر اس کے قریب آیا اور اسے باہوں میں لے لیا۔ ساری جان سے کانپتا ہوا رزاتی بچوں کی طرح اس کے سینے میں منہ چھپا کر سسک پڑا۔

بازو کی گرفت میں آئے سوامی کی گدی پر غلام حسین کے ریو اور کی سر دھوک پیر تسمہ پا کی طرح سوار ہو چکی تھی۔ اسے چونکہ ایسے کسی اقدام کی توقع ہی نہیں تھی اس لئے اچانک پیدا ہو جانے والی صورتحال نے اسے بھونچکا کر دیا۔ وہ ذہنی طور پر مفلوج ہو کر رہ گیا۔ اسے سمجھ نہ آ رہی تھی کہ یہ سب ہوا کیا اور اب وہ کیا کرے؟

پنڈت اور اس کے دونوں چیلوں کو شوکت نے اپنے آدمیوں کے حوالے کر دیا جو انہیں لے کر فوراً ہی وہاں سے نکل گئے۔ خود شوکت ریو اور ہاتھ میں لئے شمشان کے ایک ایک کونے کھدے کی یوں تلاشی لینے میں مصروف ہو گیا جیسے اسے وہاں کی مٹی سے بھی پیر ہو۔ راجیہ کی طرف اس نے حیرت سے دیکھا نہ چونک کر۔ شاید وہ اس کھیل کی اونچ نیچ سے واقف تھا۔۔۔ اور یہی سچ تھا۔ مونس، غلام حسین، شوکت اور ان کے آدمی اس ناک کے بارے میں جو کچھ جانتے تھے رزاتی ابھی اس سے ناواقف تھا۔ پھر جب شوکت کو باریک بینی کے باوجود وہاں ایسا کچھ نہ ملا تو اس نے مونس کی جانب دیکھا۔

”تم مشترک ہستی کے ناکے پر چلے جاؤ شوکت۔ کسی ہستی والے کو اس طرف نہیں آنا چاہئے۔ فائرنگ کی آواز سے ہو سکتا ہے کچھ لوگ جاگ گئے ہوں۔“ مونس نے اپنا ریو اور بیلٹ میں اڑتے ہوئے ہندو ہستی کا نام بدل دیا۔

”مگر سر۔۔۔ یہاں صرف غلام حسین۔۔۔“ شوکت نے سوامی اور پھر راجیہ کی طرف تشویش سے دیکھتے ہوئے کہنا چاہا کہ اکیلا غلام حسین کہیں کم نہ پڑ جائے۔

”فکر نہ کرو شوکت۔۔۔ میں بھی موجود ہوں اور اب تمہارے رزاتی بابو بھی جاگ رہے ہیں۔“ اس کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔ ”تم اس چوہے کی طرف سے بے فکر ہو کر جاؤ۔“ مونس کا اشارہ سوامی کی جانب تھا، جس کا سیاہ چہرہ اس خطاب پر اور تاریک ہو گیا۔ شاید اب اس کے حواس لوٹ رہے تھے اور پہلا رد

غلام حسین کوچہ دے کر بازی اپنے ہاتھ میں لے لی اور اب انہیں کسی پاگل کتے کی طرح غرا کر یوں حکم دے رہا تھا جیسے اپنی بات نہ ماننے پر وہ کچھ بھی کر بیٹھے گا۔

”سنائیں تم لوگوں نے۔۔۔ اگر کسی نے ذرا بھی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو میں تمہارے اس سورے کا بھیجا اڑا دوں گا۔“ وہ بڑے سرد اور کڑوے لہجے میں گرجا۔ ان سب کو یقین ہو گیا کہ اگر انہوں نے چکر مچا کر تو وہ اپنی دھمکی پر عمل کرنے میں ایک پل کی دیر نہیں لگائے گا۔ ان سب نے اپنے اپنے ہاتھ سر سے بلند کر لئے۔ مونس کا دماغ بڑی تیزی سے بدلتی ہوئی صورتحال کا جائزہ لے رہا تھا جبکہ رزاتی غیض و غضب میں بھرا سوامی کو یوں گھور رہا تھا جیسے موقع ملتے ہی اس پر جھپٹ پڑے گا۔

”سوامی۔۔۔!“ اچانک کماری نے بڑے عجب سے لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

”بھونک کتیا۔“ نفرت سے سوامی نے زمین پر تھوک دیا اور اسے قہر آلود نظروں سے دیکھنے لگا۔ ”اپنا دھرم اپنا کرتو یہ سب کچھ بھول کر تو جو اس مسئلے کے گن گاری تھی ناں۔۔۔ وہ میں بھولا نہیں ہوں۔ میں تیری یہ غدار سی بہن نہیں کروں گا۔ تیری نظروں کے سامنے پہلے ان سب کا جیون ساپت کروں گا۔ پھر تیرے اس سند اور جادو بھرے شریر کو شمشان کی کچی خ زمین پر بچھا کر اس طرح روندوں گا کہ تیری آتما جنم جنم تک اپنی بربادی پر بال کھولے بین کرتی رہے گی۔۔۔ میں یہاں سے ناکام جاؤں گا تو تجھے اس طرح مرتوڑ دے کہ جاؤں گا کماری کہ تجھے تیری بہن خیتا۔“

”خاموش کتے۔۔۔“ کماری ایک دم آپے سے باہر ہو گئی۔ ”میں نے تجھے بار بار روکا ہے کہ میری معصوم بہن کا نام اپنی پلید زبان پر مت لایا کر مگروں باز نہیں آتا۔۔۔ کسی شخص سے کی اولاد۔۔۔ آج رات اس معصوم نے بنارس کے شانتی آشرم میں آتم ہتیا کر کے مجھے اس نرک سے مکتی دے دی جس میں تیرا ہر حکم مانتے ہوئے مجھے پل پل جتنا پڑتا تھا۔ اسی لئے۔۔۔ اسی لئے میں نے تیری بازی الٹ دی اور اب تیری جان لے کر نینا سے کیا ہوا اپنا وچن بھا کر رہوں گی۔“ وہ دیوانہ وار اس کی جانب جھپٹ پڑی۔

”رک جا کماری۔۔۔ ورنہ میں تیرا خون کر دوں گا۔ رک جا۔۔۔“ سوامی چیخا اور ریو الوور کا رخ اس کی جانب کر کے ٹریگر پر انگلی کا دباؤ قائم کر لیا۔

”چلا گولی۔۔۔ حرامی پلے چلا گولی۔۔۔“ کماری اتنی تیزی سے اس کی طرف بڑھی کہ سوامی کے لئے فائر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔۔۔ ٹھیک اسی وقت ایک کر مونس نے بیلٹ سے ریو الوور کھینچا اور سوامی کی طرف فائر جھونک دیا مگر۔۔۔ سوامی ایسا بھی ترنوالہ کہاں تھا؟ اس نے خود کو سیدھی آتی گولی سے بچانے کے لئے غلام حسین کو آگے کو دھکیل دیا۔ مونس کے ہاتھ سے چلی ہوئی گولی نے غلام حسین کا شانہ ادھیڑ دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے اوپر گرتے غلام حسین کے بوجھ تلے دب کر زمین پر چت ہو گیا۔ بے ہوش غلام حسین کے ہونٹوں سے تکلیف کے مارے کراہی نکل گئی اور وہ کسی وزنی بوری

اختیار کرنے کے لئے اپنی صورت بدلی جاتی ہے مگر یہاں معاملہ الٹ تھا۔ کماری کو اپنی اصل صورت جو راجیہ بھابی کا مکمل عکس تھا چھپانے کے لئے پلاسٹک میک اپ ماسک کا سہارا لینا پڑا۔ وہ جب تک دوسروں کے سامنے رہتی، کماری کے میک اپ میں رہتی اور جب راجیہ بھابی کی روح بن کر تمہارے سامنے آتا پڑتا تو ماسک اتار کر طاق پر رکھ دیتی۔“

”مگر مونس۔۔۔ اس کا اچانک وہ غائب ہو جانا۔۔۔ اور ابھی بھڑکتے الاؤ میں سے طلوع ہونا۔۔۔“ رزاتی کا لہجہ بچوں جیسا ہو رہا تھا۔

”تم سوامی کے زیر اثر ذہنی طور پر بہت کمزور ہو چکے ہو رزاتی! یہ بھی نہ جانچ سکے کہ جب کماری راجیہ بھابی کی روح کے طور پر الاؤ میں نمودار ہوئی تو دراصل وہ الاؤ کے اندر نہیں اس کے پار کھڑی تھی۔ پنڈت اور سوامی نے الاؤ کے لئے لکڑیاں اس طرح جٹی تھیں کہ جب وہ پچھلی طرف سے نمودار ہو کر لکڑیوں کے چھوٹے چھوٹے زینوں پر پاؤں رکھ کر آگے بڑھتی تو آگلی طرف سے جہاں تم اور سوامی بیٹھے تھے یہی لگتا کہ وہ آگ کے شعلوں میں سے برآمد ہو کر اوپر آ رہی ہے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ تمہیں یہی لگ رہا تھا کہ یہ الاؤ میں سے برآمد ہو رہی ہے۔ پھر جب یہ ایک مخصوص حد تک بلند ہو چکی تو سوامی نے کسی خاص کیمیکل کا چھینٹا دے کر الاؤ کی آگ کو بادلوں کا روپ دیا۔ تب یہ گہرے دھوئیں کی آڑ میں الاؤ کے سامنے کی طرف یوں آ کر زمین سے چپک گئی جیسے اسے روح پر بدن کا خول چڑھانے کے عمل سے نزع جیسی اذیت ہو رہی ہے۔ غلام حسین الاؤ کے دوسری طرف درخت کے عقب سے مجھے ایک ایک لمحے کی پینتا سنار ہاتھ اور میں اس دلچسپ فلم کا ایک ایک سین دیکھ کر مزہ لے رہا تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں کماری کو بتا۔۔۔؟“ مونس نے اسے بڑی سرد نگاہوں سے دیکھا اور چوہم کچلا ہوا پٹیں ایک طرف تھوک دیا۔

”آپ کیسے غلط کہہ سکتے ہیں مونس بابو۔۔۔؟“ اسی وقت سوامی کی طنزیہ آواز نے ان سب کو چونکا دیا۔ ساتھ ہی کوئی ہلکے سے کراہ کر زمین پر گرا۔ انہوں نے ایک ساتھ نظریں آواز کی سمت اٹھائیں اور ششدر رہ گئے۔

”سب لوگ ہاتھ اوپر اٹھا لو۔۔۔“ سوامی نے بیہوش غلام حسین کی گردن میں بایاں بازو ڈال کر اس طرح گرفت میں لے کر اسے اپنے سامنے ڈھال بنا رکھا تھا کہ اس کا ایک ہلکا سا جھکا بیہوش غلام حسین کی گردن توڑ دیتا۔ اس کے ہاتھ میں وہی ریو الوور با نظر آ رہا تھا جو چند لمحے پہلے اسے بے بس کئے ہوئے تھا اور اب جس کی نوک خود غلام حسین کی کنپٹی پر رکھی تھی۔

ہوا یہ تھا کہ ان لوگوں نے غلام حسین کو اس پر قابو پائے دیکھا تو اس طرف سے لا پرواہ ہو گئے۔ سوامی جیسے گھاگ کے لئے کسی بھی موقع کا ایک ہزارواں پل بھی کافی تھا۔ اس نے نجانے کب اور کیسے

خالی ریوالور کی ٹھک ٹھک رک ہی نہ رہی تھی۔ رکتی بھی تو کیسے؟ ہوش و حواس سے بیگانہ کماری اپنی دھن میں مسلسل سواری پر فائر کئے جا رہی تھی۔

اسی وقت بھاگتے ہوئے قدموں نے ایک بار پھر شمشان کی فضا میں اودھم مچا دیا۔ شوکت اور اس کے آدمی ہاتھوں میں ریوالور اور گتھیں لئے اندر داخل ہوئے اور باہوں میں اہولہانہ منوں کو سنبھالے بیٹھے رزاتی اور بیہوش پڑے زخمی غلام حسین کے گرد جمع ہو گئے۔ سواری کی کرچی کرچی لاش پر ایک نظر ڈال کر دوبارہ انہوں نے اس طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ البتہ شوکت کے اشارے پر اس کے چند آدمیوں نے شمشان میں پھیل کر پوزیشنیں ضرور سنبھال لیں۔

”مونس۔۔۔“ رزاتی دیوانوں کی طرح پکارے جا رہا تھا۔ اس کے منوں کے جسم سے خون پانی کی طرح بہ بہ کر زمین میں جذب ہو رہا تھا اور وہ کسی نادان کی طرح اس کے زخموں پر ہاتھ رکھ پگلوں کے سے انداز میں چھل چھل بہتے خون کو روکنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اس کے حواس جیسے اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ اسے سمجھ نہ آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے؟ شوکت کو لگ رہا تھا کہ رزاتی کا دماغ مونس کی حالت پر مفلوج ہو گیا ہے۔

”سر۔۔۔“ شوکت نے رزاتی کے پاس بیٹھتے ہوئے اس کا شانہ تھام کر تیزی سے کہا۔ ”مونس بابو شدید زخمی ہیں۔ انہیں ہاسپٹل لے جانا ہو گا۔ فوراً۔۔۔“ پھر اس نے ان دو آدمیوں کی جانب ہاتھ ہلایا جو زخمی غلام حسین کو جانچ رہے تھے۔ ”اے۔۔۔ فوراً جیپ لے آؤ اور۔۔۔ جلدی کرو۔ وقت ضائع بالکل مت کرو۔ جتنی جلدی ہو سکے مونس بابو اور غلام حسین کو ہاسپٹل پہنچانا ہو گا۔ جلدی کرو۔“ دونوں آدمیوں میں سے ایک اٹھا اور اس نے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔

”ہاسپٹل۔۔۔“ ایک دم رزاتی چونک کر رہ گیا۔ اس نے بڑی سہمی ہوئی نظروں سے شوکت کی جانب دیکھا۔ پھر اس کا سر بڑی شد و مد کے ساتھ نفی میں ہلا۔ ”ہرگز نہیں۔ ہاسپٹل نہیں لے جانا میرے مونس کو۔۔۔ وہاں تو میں پہلے ہی اپنی زندگی کا بہت بڑا جوابار چکا ہوں۔ اسے وہاں نہیں لے جانا۔۔۔“ اس نے مونس کو سینے سے لپٹا کر دونوں ہاتھوں سے یوں بھینچ لیا جیسے کسی قیمت پر کسی کو ہاتھ نہ لگانے دے گا۔ ”یہ بھی وہاں سے جیتا جاگتا لوٹ کر نہیں آئے گا۔ میں اسے ہاسپٹل نہیں لے جانے دوں گا۔ ہرگز نہیں۔۔۔“

”سر۔۔۔“ شوکت نے اسے بے بسی سے دیکھا۔ ”یہ بہت ضروری ہے۔ خون بہت زیادہ بہہ رہا ہے۔ مونس بابو کی جان خطرے میں ہے۔“

”تو اس کا مطلب ہے کہ میں اسے اپنے ہاتھوں ان بے حس کاٹھ کے پتلوں کے حوالے کر دوں جو کسی کی جان نہیں بچا سکتے۔ صرف ”آئی ایم سوری“ کہہ کر ایک طرف ہو جاتے ہیں۔“ وہ ہتھے سے

کی طرح منوں کے اوپر ڈھیر ہو گیا۔ گرتے گرتے منوں اپنے پیچھے کھڑے رزاتی سے ٹکرایا اور وہ گرتے گرتے بچا۔ پھر جب تک وہ سنبھلا، دو کام ہوئے۔

ایک تو اس دوران کماری بھاگ کر سواری کے سر پر پہنچ گئی اور سواری کے ریوالور والے ہاتھ پر قابو پانا چاہا۔ دوسرا کام یہ ہوا کہ اسی وقت رزاتی، جو اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا، اڑتا ہوا سواری کی طرف لپکا۔ سواری ایک دم تیزی سے پیچھے ہٹا اور کوئی قدم دور جا کھڑا ہوا۔ پھر اس نے رزاتی پر فائر کھول دیا مگر کماری نے چیخ کر رزاتی کو ایک طرف دھکا دے دیا اور خود اس کے نشانے پر آ گئی۔ سواری نے فوراً ہی رخ پھیر کر رزاتی کو پھر نشانے پر لے لیا مگر۔۔۔ سواری کے ریوالور سے اوپر تلے نکلی ہوئی تین گولیاں اپنی طرف لپکتے ہوئے منوں کو چھلی کرتی چلی گئیں جس نے بھاگ کر آتے ہوئے اپنے آپ کو رزاتی کے سامنے ڈھال بنا دیا تھا۔ دو گولیاں تو بائیں بازو میں اور تیسری گولی اس کے دائیں پہلو کو پھاڑ کر نکل گئی۔ منوں کے جسم کو جھکا سا لگا اور وہ دونوں بازو پیچھے کو پھیلا کر رزاتی کو اپنی آڑ میں لئے لڑ کھڑا کر زمین پر آ رہا۔

”مونس۔۔۔“ رزاتی کے حلق سے چیخ نکلی گئی اور وہ سب کچھ ٹھول کر اسے سنبھالنے میں لگ گیا۔ سواری نے منوں کو گرتے دیکھا تو ریوالور لہراتا ہوا پلٹا۔۔۔ مگر اسے دیر ہو چکی تھی۔ کماری تب تک غلام حسین کے نیچے سے نکلتی ہوئی منوں کے ہاتھ سے زمین پر گر کر ریوالور اٹھا چکی تھی۔ پھر جب تک سواری کچھ کر پاتا، کماری کی انگلی بڑھ کر پر د ب چکی تھی۔ پھر یکے بعد دیگرے چھ فائر ہوئے۔ ہر فائر پر کماری کے حلق سے ایسی دیوانگی بھری چیخ ابھرتی رہی کہ فضا دھل دھل گئی۔ سواری کے ہاتھ سے ریوالور نکل گیا۔ وہ ناک مٹھ سے خون اٹکنا پست کے مل شمشان کی چینی زمین پر گر کر اور آخری سانس تک کماری پر جھپٹ پڑنے کی کوشش کرتا رہا مگر چھلی ہوتے سینے کے گھاؤ ایسے نہیں تھے کہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو پاتا۔ کماری کے ریوالور سے آخری گولی سیدھی اس کے سیاہ ماتھے میں پیوست ہوئی اور اس کے چہرے کے اوپر آدھے حصے کے پر نچے اڑ گئے۔ ایک اذیت ناک جھٹکے کے ساتھ اس کا جسم تشع کے مریض کی طرح ایٹھٹھا اور وہیں مڑا ترارہ گیا۔ شمشان کی مٹی اس کے غلیظ خون سے اپنی سرزد بان تر کر رہی تھی اور پگلوں کے انداز میں کماری خالی ریوالور کا ٹریگر دبائے جا رہی تھی۔

”میری نینا کا بلا دیکھ کر کرنے کے بعد بھی تجھے اس پر رحم نہیں آیا کتے۔۔۔ اس مفلوج لڑکی نے تیرے ظلم کا شکار ہو کر آتم ہتیا کر لی مگر تو آج بھی مزے لے لے کر میرے سامنے اس کا نام لیتا ہے۔۔۔ تو مر کیوں نہیں جاتا حرامزادے۔۔۔ تو مر کیوں نہیں جاتا۔۔۔ اب تو میرے صاحب کی جان لینا چاہتا ہے۔۔۔ میرے ہر پیارے پر تیری گندی اور پلید نگاہ ٹھہر جاتی ہے۔۔۔ نینا کے بعد اب میرے صاحب کی جان لینا چاہتا ہے۔۔۔ یہ تو میں نہیں ہونے دوں گی۔۔۔ مار ڈالوں گی تجھے میں۔۔۔ مار ڈالوں گی۔۔۔“

☆=====☆=====☆

مسجد کے سامنے پہنچتے ہی رزاقی کے قدم تھم گئے۔

مونس اب بھی اس کے بازوؤں پر تھا۔ اسے لگا جیسے مونس نے اس کا گریبان کھینچ کر اسے رک جانے کو کہا ہو۔ اس کے سینے اور بازو سے بہتا خون رزاقی کے کپڑوں کو لالہ زار بنارہا تھا مگر وہ تھا کہ اپنے سائے کو اپنے ہاتھوں پر اٹھائے یہاں تک بھاگتا چلا آیا اور اب مسجد کے نیچے کھڑا سیڑھیوں کے پار اوپر بند دروازے کو کسی ایسے خام لوہے کی طرح گھور رہا تھا جسے مقناطیس نے اپنی جانب کھینچ لیا ہو۔

شوکت کے دو آدمی غلام حسین کو جیب میں ڈال کر ہاسپٹل لے جا چکے تھے۔

فائرنگ کی آواز سے گاؤں والے جاگ گئے تھے۔ ایک ایک دو دو کر کے لوگ باگ اکٹھے ہوتے جا رہے تھے۔ شوکت کے آدمیوں نے ہندو بستی کے گردنا کہ سخت کر رکھا تھا اس لئے ایک بھی ہندو اپنے گھر سے نکل نہ سکا اور اب انہیں کرفیو جیسی صورتحال کا سامنا تھا۔ ہاں خالق نگر کے باقی لوگ بھاگ بھاگ گھروں سے مسجد کی طرف ضرور چلے آ رہے تھے اور وہاں کا منظر دیکھ کر ان کی نگاہوں میں حیرت و مانگوں میں سوال اور زبانون پر خاموشی کا حجم بڑھتا جا رہا تھا۔ کوئی کس سے پوچھتا کہ کیا ہوا ہے؟ کوئی کسے بتاتا کہ کیا ہونے والا ہے؟

مسجد کے بند دروازے سے پلیٹ گر رزاقی کی نظر میں مونس کے لمحہ بے لمحہ زرد پڑتے چہرے پر آ گئیں۔ اسی وقت ایک ہلکی سی کراہ مونس کے لبوں سے خارج ہوئی اور اس کی پٹکوں میں حرکت پیدا ہوئی۔ رزاقی نے اسے تڑپ کر مخاطب کیا۔

”مونس۔۔۔“

جواب میں مونس نے تھر تھراتے پوٹوں کو بڑی مشکل سے وا کیا۔ پھر دھیرے سے آنکھیں کھولیں اور رزاقی کے ترتر چہرے کو دیکھا۔ اس کے ہونٹ مسکرانے کے انداز میں کپکپائے۔ ذرا سی گردن گھما کر اس نے مسجد کی جانب نظر ڈالی اور اس کے ہونٹ پوری طرح گلاب جیسے کھل اٹھے۔ اس کا لبو نہیں نہایا ہوا بایاں باز و حرکت میں آیا اور مسجد کے بند دروازے کی جانب اٹھ گیا۔

”مونس۔۔۔“ رزاقی کے ہونٹوں پر سرگوشی نے دم توڑا۔

جواب میں مونس کا سر آہستہ سے اثبات میں ہلا اور بازو بے جان ہو کر پہلو میں لٹک گیا۔ پلکیں مند گئیں اور گردن ڈھلک گئی۔

”مونس۔۔۔“ رزاقی کے لبوں پر ایک چیخ تھر تھرائی۔ فوراً ہی اس نے ایسی مضطرب نظروں سے مسجد کی جانب دیکھا کہ کیا کسی مرنے والے نے زندگی کی جانب دیکھا ہوگا۔ پھر جیسے اسے اپنے آپ پر قابو نہ رہا۔ وہ ہچکیوں اور آہوں کے ساتھ کسی ایسے بے بس شخص کی طرح روتا بلکتا سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا

اکھڑ گیا۔ ”اب ایسا نہیں ہونے دوں گا میں۔۔۔ میرا مونس ہاسپٹل نہیں جائے گا۔ اس نے میری طرف آتی موت کو اپنے سینے پر لے لیا ہے تو اب میں ہی اسے اپنی طرف زندگی کی طرف واپس لاؤں گا۔۔۔ میں اسے کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں لے جاؤں گا۔ خود ہی کروں گا جو کرنا ہے۔“

رزاقی نے شوکت کا ہاتھ ایک طرف جھکا اور مونس کو باہوں میں سنبھالتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں ہاتھوں پر یوں مونس کو ڈال لیا جیسے کوئی کسی بچے کو جھولا جھلانے جا رہا ہو۔ پھر بھاگتا ہوا شمشان سے باہر جانے والے راستے پر ہولیا۔

”مونس۔۔۔ یا رتم تو میرا سایہ ہو۔۔۔ اس طرح مجھے اندھیرے سے نکال کر اجالے میں اکیلا چھوڑ جاؤ گے تو میں کیا کروں گا یار۔۔۔ مجھے اکیلا چھوڑ کر نہ جانا۔“ خودکلامی کے انداز میں وہ جواباتیں کر رہا تھا وہ کسی پتھر کا جگر بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کے لئے کافی تھیں۔

”راجیہ اور جنت کا زخم تو میں سہہ گیا مگر تمہاری جدائی کا دکھ سہہ نہ پاؤں گا یہ تم جانتے ہو ناں۔۔۔ تو پھر جاگ جاؤ یار۔۔۔ اس قدر گہری نیند سونا ہی ہے تو دونوں ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈال کر سوئیں گے یار۔۔۔ دیکھو۔۔۔ میں تمہیں اس طرح اٹھا کر بہت دور تک نہیں جاسکوں گا۔۔۔ کوئی بچے ہو تم جو میں تمہیں گود میں اٹھائے اٹھائے پھروں۔“

اور کماری۔۔۔ جسے اس صدارے شوخ شراہے میں سب لوگ نظر انداز کر چکے تھے ریوڑ والا ہاتھ پہلو میں گرائے پال کھولے پگلیوں کی طرح ایک نلکے سواری کی ادھڑی ہوئی لاش کو گھورے جا رہی تھی۔

”لے کتے۔۔۔ آج میں نے تیرا بھولنا ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔“ اس نے نفرت سے زمین پر تھوک دیا۔ ”تو میرے صاحب کو کاٹ کھانے آیا تھا۔ میں نے تجھے اس نرک میں پہنچا دیا جہاں سے اب تیری تانترک و دیا بھی تجھے واپس نہیں لا سکے گی۔ نہیں لا سکے گی۔“ ٹھک سے اس کے ہاتھ سے خالی ریوڑ لور گر پڑا۔

”چلے۔“ شوکت اس کے عقب سے بولا تو کماری نے آہستہ سے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ چند لمحے خالی خالی نظروں سے اسے نکتی رہی۔ پھر دھیرے دھیرے اس کے حواس لوٹے۔ تب شوکت کے تیور دیکھ کر اسے اپنی اور اس کی پوزیشن کا احساس ہو گیا۔

”کہاں چلنا ہوگا؟“ اس کی سپاٹ سی آواز بتا رہی تھی کہ اس نے اپنے آپ کو حالات کے دھارے کے حوالے کر دیا ہے۔

”یہ بتانے کا حکم نہیں ہے مجھے۔“ اس نے صاف انکار کیا تو کماری خاموش ہو گئی۔ پھر چپ چاپ شوکت کے آگے آگے چل پڑی۔ لگتا تھا اس نے خود پر سے سارے اختیار اٹھائے ہیں۔ بے اختیار بے بس بے چاری۔۔۔ کماری کا یہ روپ کسی نے کب دیکھا تھا!

جن کا سب کچھ اس کے سامنے لٹا جا رہا ہو۔

کچھ لوگوں نے آگے بڑھنا چاہا۔ کچھ کہنا چاہا مگر گن بردار اقبال نے دونوں بازو پھیلا کر سب کو روک دیا۔ اس کے ہونٹ پھڑپھڑا رہے تھے۔ آنکھوں میں سادوں بھادوں کا ہوا تھا۔ اقبال کے روک دینے کے بعد کسی کو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہ رہی۔ لوگوں نے دل تھام لئے۔ آنکھیں بند تھیں یا کھلی ہوئی، بہر حال غم تھیں اور مسجد کا بند دروازہ ہر بصارت میں لرز رہا تھا۔

پھر ہاتھ جڑ گئے یا پھیل گئے، سر جھکے یا اٹھے، کٹھے رہ گئے، سینوں سے ہوک اٹھی یا ان میں درد جاگا، مقصد دعا ہی تھا۔ اپنے معبود کے آگے عرضداشت پیش کرنا ہی تھا۔۔۔ اپنے رزاقی بابو کے لئے۔ اپنے مونس بابو کے لئے۔

اور رزاقی۔۔۔

وہ سینہ فگار سیرھیاں طے کر کے اوپر پہنچا۔ مسجد کا بند دروازہ اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ اس کا مونس اس کے بازوؤں میں مدم مدم سانس لے رہا تھا۔ سانس لے بھی رہا تھا یا نہیں، کون جانے؟ ہچکیاں، آہیں، سسکیاں اور آنسو۔۔۔ ان سب کی زبان ایک ہی تھی۔ ندامت کی زبان۔ لوٹ آنے کی زبان۔ جھک جانے کی زبان۔ مٹ جانے کی زبان۔ اور یہی وہ زبان ہے جسے وہ خالق اول و آخر وحدہ لا شریک سب سے زیادہ پسند کرتا ہے۔ سنتا ہے اس کا منتظر رہتا ہے۔۔۔ اور اس زبان کے ایک حرف کے مقابلے میں دس بار لبتک کہتا ہے۔

رات کا پچھلا پہر۔۔۔

قبولیت درگزر اور عطا کے سب سے موثر لمحات دامن میں لئے اسی زبان میں بندے کے بات کرنے کا انتظار کرتا ہے۔

صبح کا بھولا شام ہونے سے پہلے لوٹا تو اپنا آپ مٹا کر لوٹا۔ ایک ہی پل نے اس کی ہر گتھی کھول دی۔ ہر گرہ کشادہ کر دی۔ ہر الجھن سلجھا دی۔

وہ گھٹنوں کے بل مسجد کے فرش پر گر گیا مگر مونس کے جسم کو ہاتھوں سے الگ نہ ہونے دیا بلکہ اسے سینے کے ساتھ بٹھنج لیا۔ پھر دھاروں دھار شبنم لٹاتی آنکھیں اٹھائیں اور مسجد کے بند دروازے کی جانب دیکھا۔ اس کے ہونٹ تھرائے اور مہک اٹھے۔

”اپنے حبیب کریم ﷺ کے صدمے میں مجھے معاف کر دے میرے مالک!۔۔۔ دیکھ۔ آج میں ایک بار پھر تیرے درِ غفور و کرم پر اپنا دریدہ دامن پھیلائے بیٹھا ہوں۔ مجھے آج پھر ناامید نہ لوٹانا۔ جو تھا سوتیرا تھا۔ ٹوٹنے لے لیا۔ میں نادان تھا کہ اسے اپنا سمجھ کر تجھ سے منہ موڑ لیا۔ جو ہے وہ بھی تیرا ہے مگر ابھی اسے مجھ سے مت چھین۔۔۔ یہ میرا سایہ ہے۔ کیا اپنے سائے کے بغیر میں جی سکوں گا۔ جیتا لگوں گا۔“

اس نے مونس کو بند دروازے کے سامنے مسجد کے فرش پر لٹا دیا۔۔۔ ہاتھ جوڑ لئے اور سر جھکا لیا۔ آنسو تھے کہ ندامت میں نہانے نھرنے ابل ابل کر اس کے چہرے اور مونس کے خون اگلنے سینے کو تر کر رہے تھے۔۔۔

زبان تھی کہ اسے پکار ہی تھی جس کا فرمان ہے ”مجھے پکارو میں تمہاری پکار سنتا ہوں۔“ دل تھا کہ آج کھل کر اس کے نام پر دھڑک رہا تھا جو ہر چاہنے والے دل میں اپنے حبیب ﷺ کے نام پر دھڑکنیں باٹھتا ہے۔

آج ہر سانس یقین سے عبارت تھی۔ آج ہر پل اعتماد سے مزین تھا۔ آج ہر لفظ اعتبار سے منور تھا۔ ”راجیہ اور جنت کی جدائی دی تُو اسے میرا سایہ بنا کر تُو نے مجھے کیلاراہ جانے کے عذاب سے محفوظ فرما دیا۔۔۔ آج یہ بھی مجھ سے چھن گیا تو میں اپنے قصور کی معافی کے لئے خود کو کیسے یقین دلا پاؤں گا؟ یہ تسکین کا وہ پیکر ہے میرے خالق! جس کا ہونا مجھے بتاتا رہے گا کہ میرے یہ آنسو تیرے حضور قبول ہو گئے۔ اور یہ کہ ”میرا صرف تیرا ہونا اور اپنا نہ ہونا“ تیرے سامنے ثابت ہو گیا۔ مجھے اپنے کرم غفور اور درگزر سے نواز دے میرے مالک!۔۔۔ مجھے معاف فرما دے۔ معاف فرما دے۔ معاف فرما دے۔۔۔“ بلکتا، ہچکیاں لیتا، رزاقی بے اختیار جھکتا چلا گیا یہاں تک کہ اس کی پیشانی مونس کے سینے سے جا لگی۔

یہ ایک ٹوٹے ہوئے، شکستہ دل کی وہ پکار تھی، یقین سے لہا لہا وہ صدا تھی جسے عرش پر بیٹھے اس مائیں جیسے شفیق عیوب پوش اور باپ جیسے باامید کرم پرور نے اپنے حضور اذن باریابی دینے میں ایک ٹانے کی دیر نہ کی۔ اس کے غمو کو گویائی عطا ہوئی:

”دیکھو میرے بندے کو۔۔۔ اس کی شکستہ دلی کو۔۔۔ اس کے یقین کی انتہا کو۔۔۔ وہ جانتا ہے کہ اس کی پکار کو میں نہیں سنوں گا تو اور کون سنے گا؟ اس کے شکستہ دل کو میں قرار نہیں دوں گا تو اور کون دے گا؟ اس کے بھروسے اس کے اعتماد اس کے اعتبار کی لاج میں نہیں رکھوں گا تو اور کون رکھے گا؟ وہ ساری دنیا سے منہ موڑ کر موت کی آغوش میں جاتا اپنا سایہ ہاتھوں پر اٹھائے میرے در پر آن گرا ہے اس یقین کے ساتھ کہ میں ہی ہوں جو زندگی کو موت اور موت کو زندگی میں بدل دینے پر قادر ہے۔ مجھے اس کی پکار کا مزہ لینے دو۔۔۔ اس کے آنسوؤں پر آتے پیار کا لطف لینے دو۔ اس کی داد رسی کے یقین سے بھر پور فریاد کے جواب میں ”لبیک میرے بندے۔ لبیک میرے بندے“ کا سرور لینے دو۔“

”مگر یہ کل تک تیرا وہ نافرمان بندہ تھا یا رب! جس نے تیرے گھر کا دروازہ اپنے ہاتھوں اپنے آپ پر اور ساری خلقت پر بند کر دیا تھا۔“ قدسیوں کی جبینیں شکن آلود ہوئیں۔

”آج وہی دروازہ اس کے شکستہ دل کی چچی پکار اس کی درد بھری فریاد کی کنجی سے کھل جائے گا۔“ خالق کا رحم جھوم اٹھا۔

”ہاں مونس۔۔۔ میری جان۔ میں تجھ پر قربان۔ ہاں۔۔۔“ وہ اسے یقین دلاتے دلاتے یوں بچل کریوں رویا کہ مونس کی آنکھیں بھی اشکبار ہو گئیں۔

”تو میں کامیاب ہو گیا۔۔۔“ ایک سرگوشی بھری مسکراہٹ مونس کے لبوں پر لہرائی اور اس نے اپنے خون سے سرخ ہاتھوں میں رزاقی کا ہاتھ بھیج کر پکلیں موند لیں۔

”میرے خالق۔۔۔ میرے مالک۔۔۔ میرے معبود۔۔۔“ رزاقی کے ہونٹ اور کوئی لفظ ادا کرنے سے جیسے قاصر ہو چکے تھے۔ اس نے مونس کو ہاتھوں پر اٹھایا اور مسجد کے صحن میں جا رکا۔ اب بھی اس کے آنسو رواں تھے مگر اب ان میں شکرانہ دک رہا تھا۔ معافی مل جانے کا احساس مہک رہا تھا۔ صحن میں مونس کو لٹا کر اس نے جبین سجدے میں رکھ دی۔

”میرے مالک۔ تو نے مجھے اپنے حبیب ﷺ کے صدقے میں معاف فرما دیا۔۔۔ یہ تیرا مجھ پر احسان ہے۔ میں اس قابل نہیں تھا مگر تو نے میری ندامت قبول فرمائی۔ میں اس کے لئے تیرا شکر ادا ہی نہیں کر سکتا میرے معبود۔۔۔ پھر بھی میرا یہ سجدہ شکر اس لئے قبول فرما لے کہ میں تیرے حبیب کریم ﷺ کا خطا کار ترین امتی ہوں۔ بے شک تیری رحمت تیرے غضب پر حاوی ہے اور میں اس کا زندہ ثبوت ہوں۔۔۔“ وہ سجدے میں اپنی پیشانی مسجد کے فرش پر گڑھ رہا تھا۔ اس کا بس نہ چل رہا تھا، سمجھ نہ آ رہی تھی کہ اپنا آپ اپنے اللہ پر کس طرح قربان کر دے! اسے میں قاری خادم حسین لپک جھپک مسجد میں آ پہنچے۔ لوگوں کی زبانی سارا ماجرا سن کر وہ ایسے آبدیدہ ہوئے کہ آسمان کی طرف دیکھ کر ان کے تھر تھراتے ہونٹوں سے شکرانے کے الفاظ کے سوا کچھ بھی ادا نہ ہو سکا۔

پھر وہ سجدے میں پڑے رزاقی کے پاس پہنچے اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ لرزاتے کانپتے رزاقی نے سجدے سے سر اٹھایا، قاری خادم حسین نے اسے پکڑ کر کھڑا کیا اور سینے سے لگا لیا۔ دونوں بچوں کی طرح روئے جا رہے تھے۔

”اپنے اللہ کو پکارے رزاقی بابو۔۔۔ اس کا نام بلند کیجئے۔ یہی وقت ہے اسے لوٹ لینے کا۔ اسے ٹھگ لینے کا۔“ قاری صاحب نے اپنا چارخانہ کارو مال گلے سے نکالا اور رزاقی کے سر پر ڈال دیا۔ رزاقی نے ایک ٹانے کو ان کی طرف دیکھا۔ پھر مدہوشی کے عالم میں مسجد کے شمالی گوشے میں اذان کے لئے بنی جگہ کی طرف بڑھ گیا۔

اس مسجد میں اذان ہمیشہ ہی دی جاتی رہی تھی مگر آج جواذن ان وہاں سے بلند ہوئی تو سارا خالق نگر جیسے مرنے کے بعد جی اٹھا۔ پانچ مہینے نہیں پانچ صدیوں کی نیند سے جاگ گیا۔

”اللہ اکبر اللہ اکبر۔“

”اس نے تجھے چھوڑ کر مشرکوں کا دامن تھام لینا چاہا تھا۔“ کڑویوں کا لہجہ بہت کڑوا تھا۔

”ہاں۔۔۔ مگر جب بات میرے اور اس کے تعلق کی آئی تو وہ سب کچھ بھول کر اپنی راجہ کو ساری دنیا کو مجھ پر میرے حبیب ﷺ پر شمار دینے پر تیار ہو گیا، کیا تم نے نہیں دیکھا تھا؟“ اپنے بندے کے شرک اور دوئی سے منہ موڑ لینے کا لمحہ کریم ازل کے سامنے سجدے میں پڑا تھا۔

”اس کا جرم بہت بڑا ہے۔“ کتنے ہی ملائک کو اب بھی اعتراض تھا۔

”میری رحمت میرے غضب پر حاوی ہے۔“ ہر وقت اس رحیم ابد کے سامنے ایسا وہ رہنے والے ستون نور پر لرزہ طاری ہو گیا۔

”بس۔۔۔“ غفاریت کے لئے مزید انتظار ممکن نہ رہا۔ ”جاے صباے رحمت۔ اس تڑپتے دل کو اپنی آغوش میں لے لے۔۔۔ اس کی تڑپ اس کی بے قراری اس کا اضطراب اب میرے کرم پر بار ہو رہا ہے۔۔۔ جا اور اس پر معافی کے پروانے کی چھاؤں کر دے۔ اس کی پکار کے جواب میں اب مجھے دیر کرنا گوارا نہیں۔۔۔“

ایک پل تھا ایک لمحہ تھا ایک ثانیہ تھا رزاقی کے لئے اس کا دورانیہ متعین کرنا ممکن نہ تھا۔ اس نے تو صرف یہ جانا کہ ایک دم عطر پیڑ ہوا کہیں ”لبیک لبیک لبیک“ کا شور مچاتی آئیں اور اس کے گرد قطرات ہو گئیں۔ اس کے کانوں میں اسی ایک لفظ کا شہرہ لپک رہا تھا۔ اس کے دل میں اسی ایک لفظ کے دیپ بنگم رہے تھے۔ اس کے جسم و جان پر اسی ایک لفظ کا نزول ہو رہا تھا۔۔۔ پھر جیسے اس کے بالوں میں کی ان دیکھے ہاتھ نے شانہ کیا۔ اس کا جھکا ہوا سر اٹھا۔

پھر وہ صرف اسی ایک کی حیرت رسیدہ آنکھ نہ تھی بلکہ وہاں موجود ہر نفس نے بھی یہ کرشمہ دیکھا کہ لہراتی، بل کھاتی، جھومتی ہواؤں کے ہاتھوں مسجد کے دروازے پر آویزاں ”معدرت نامہ“ کا کاغذ اپنی جگہ سے اٹھ کر ایک طرف اڑتا چلا گیا۔ ساتھ ہی مسجد کا بند دروازہ دھیرے دھیرے یوں کھلا جیسے خمار سے لڑکھڑا رہا ہو۔ ڈگمگا رہا ہو۔ جگمگاتی روشنیاں پہلے سے فزوں تر ہو گئیں۔ ایسی ایمان پرور انہونی کس نے دیکھی تھی اور کب دیکھی تھی! کتنے ہی اپنی اپنی جگہ کھڑے نہ رہ سکے اور وہیں سجدہ رہیں ہو گئے۔

ٹھیک اسی وقت مسجد کے دروازے کے سامنے فرش پر پڑے مونس نے آہستہ سے حرکت کی۔

”رزاقی۔۔۔ میری جان!“ اس کے ہونٹوں پر سب سے پہلے اسی کا نام آیا۔

”مونس۔۔۔“ رزاقی کے آنسو حیرت اور بے پایاں مسرت کے امتزاج سے گوہر ہو گئے۔ اس نے اسے بے اختیار رہا ہوں میں بھر کر سینے سے لگا لیا اور دیوانوں کی طرح اسے چومنے لگا۔

مونس نے نیم وا آنکھوں سے دائیں بائیں دیکھا اور جیسے اسے یقین نہ آیا۔

”رزاقی۔۔۔ یہ۔۔۔ میں۔۔۔ تم۔۔۔“ بے ربط الفاظ میں وہ سب کچھ کہہ گیا۔

اس نے لرزتے ہوئے جسم کے ساتھ ایک بار پھر اپنے رب کی بڑائی بیان کی۔
”لا الہ الا اللہ۔“

کہتا ہوا وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر گھٹنوں کے بل مسجد کے فرش پر گر پڑا۔ اس کا کپکپاتا ہوا بدن جھٹکے کھارہا تھا۔ بچکیاں، سسکیوں کا ساتھ نہ دے پا رہی تھیں۔ اور ایک وہی کیا، مسجد کے اندر باہر موجود ہر شخص کا یہی حال تھا۔

پھر ایک شور مچا۔ غلغلہ بلند ہوا۔ لوگ بے قابو ہو کر اوپر چلے آئے۔ گن بردار اقبال لوگوں کے درمیان سے ہٹ گیا۔ اس کا اپنا دل قابو میں نہیں تھا۔ لوگوں کے ساتھ جب وہ مسجد کے صحن میں داخل ہوا تو عین اس وقت باہر بی بی نے شوکت کے ساتھ پہلی سیڑھی پر قدم رکھا۔

شوکت اندر پہنچا اور لپک کر مونس کے قریب چلا گیا جو لوگوں کے موجیں مارتے ہجوم میں فرش پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اسے دیکھ کر لوگ کائی کی طرح چھٹ گئے۔ اس نے مونس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا جو بالکل ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ اسے مونس کا سرسوں کی طرح زرد پڑتا رنگ دیکھ کر رزاتی کے فیصلے پر افسوس ہونے لگا جس نے ابھی تک مونس کو ہاسپٹل نہیں لے جانے دیا تھا۔ ہونٹ کانٹے ہوئے اس نے کچھ دور گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھے رزاتی کی جانب دیکھا کہ مونس نے کراہ کر آنکھ کھول دی۔ شوکت اس پر جھٹکا چلا گیا مگر مونس نے اس کی طرف دھیان دینے بغیر رزاتی کی طرف نظر گاڑ دی۔

”رزاتی۔۔۔“ آہستہ سے مونس نے صدادی۔ رزاتی چونکا۔ اپنی جگہ سے اٹھا اور گردن گھما کر مونس کی جانب بے یقینی سے دیکھا جو سینے کے زخم پر ہاتھ رکھے اسے والہانہ دیکھ رہا تھا۔

”میرے پاس آؤ یا۔۔۔“ اس نے اپنا زخمی بازو پھیلایا۔ رزاتی دیوانہ وار مونس کے پاس چلا آیا۔ اس کے بازو میں سلایا اور اسے خود میں چھپالینا چاہا۔ مونس نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔

”رہائی مبارک ہو۔“ وہ مسکرایا۔

”مونس۔۔۔“ رزاتی بس اتنا ہی کہہ سکا۔

”اب کیا مجھے یہیں ٹھنڈ میں مار ڈالو گے۔ ہاسپٹل لے چلو مجھے۔ بہت خون بہہ گیا ہے۔“ مونس کے لبوں پر اب بھی بڑی جاندار مسکراہٹ تھی۔

تب اسے احساس ہوا کہ اب تک اللہ کے فضل اور اس کی بخشی ہوئی قوت ارادی کے بل پر مونس نے بہت سانس لے لئے تھے۔ تاہم جسمانی علاج کی اہمیت اپنی جگہ مسلم تھی۔

”باؤ۔۔۔ مونس بیٹا۔“ اسی وقت ایک آواز نے ان دونوں کو چونکا دیا۔ پھر اپنی جانب تیز تیز قدموں سے آتی بی بی اور اس کے عقب میں ڈاکٹر احسن کے ساتھ دو سیل زرسوں کو دیکھ کر وہ اچنبھے میں پڑ گئے۔

رزاتی کے کانپتے لبوں پر آنسوؤں میں بھیگی پکار نے جنم لیا۔ دھڑ دھڑ گاؤں بھر کے دروازے اور کھڑکیاں کھلتی چلی گئیں۔

”اشھد ان لا الہ الا اللہ۔“

اس سچے رب کا سچا نام ایک سچے دل کی گواہی کے دوش پر تیرتا چلا گیا۔ حویلی میں مصلے پر بیٹھی بی بی کو اپنے کانوں پر وہ ہم کا گمان ہوا۔

”اشھد ان محمد الرسول اللہ۔“

اللہ کے یکتا حبیب ﷺ کا نام اپنے محبت کے نام کے ساتھ فضاؤں میں مہک پھیلاتا چلا گیا۔
”ارے! یہ تو میرے باؤ کی آواز ہے۔“ بی بی نے حیرت سے سوچا اور ایک دم اس کا سارا جسم خون کی تیز ہوتی گردش سے دھک اٹھا۔ اس نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور بیتابانہ کمرے سے باہر کو چل دی۔

”حی علی الصلوٰۃ۔“

ہر عاقل و بالغ کلمہ گو کو پکارا جا رہا تھا۔ گاؤں کا ہر چھوٹا بڑا مسجد کی جانب دوڑ پڑا۔

”حی علی الفلاح۔“

شرک و کفر، جنم اور ہر عذاب سے نجات کے لئے دعوت کرم کا دھن مہکوں دیا گیا۔ بلائے نے کراہ کر آنکھیں کھولیں اور کمرے میں بیتابی سے شبہاتی پروین کو دیکھ کر اس کا مفلوج ذہن اپنے حواس میں آ گیا۔ ”پروین۔۔۔“ اس نے آہستہ سے پکارا تو وہ لپک کر اس کے پاس آ گئی۔ ”سنو بیلا سنو۔۔۔“ لگتا ہے انہونی ہو گئی۔ رزاتی بابو خالق مگر کی مسجد میں اذان دے رہے ہیں۔“

بیلا کو جیسے یقین نہ آیا مگر رزاتی نے جب دوسری بار ”فلاح“ کی طرف بلایا تو وہ تڑپ کر بستر سے نکل آئی اور پروین کے عقب میں لڑکھڑاتی ہوئی کمرے سے نکل کر صحن میں آ گئی جو از کر مسجد پہنچ جانا چاہتی تھی مگر مونس بابو کا حکم تھا کہ وہ بیلا کے ساتھ وہیں رکے۔ اس نے بیلا کو سینے سے لگایا اور ہولے ہولے اس کا شانہ تھپکنے لگی جو اذان کی آواز پر آنکھیں بند کئے جیسے کھڑے کھڑے کہیں گم ہو گئی تھی۔

”الصلوٰۃ خیر من النوم۔“

بھٹک جانے کی نیند سے جاگ گئے رزاتی کی آواز ٹوٹ گئی بیچکی بندھ گئی۔ الفاظ ادا کرنا مشکل ہو گئے۔ آنسو طلق میں گر رہے تھے۔ آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ رخساروں پر رواں تھے۔ جسم و جاں جیسے شبنم میں دھلے جا رہے تھے۔

مگر یہ کیسا رونا تھا جو تھم جائے دل ایسا چاہتا ہی نہ تھا۔ یہ کیسی آواز زاری تھی کہ جس سے جی بھر ہی نہ رہا تھا۔

”اللہ اکبر اللہ اکبر۔“

”بی بی صدقے بیٹا کیا ہوا؟“ رزاقی کی بلائیں لیتے لیتے مونس کے خون آلود جسم پر نظر پڑی تو بی بی نے سینہ پیٹ لیا۔

”جو ہونا تھا ہو چکا بی بی۔“ رزاقی نے اسے گھبراتا دیکھ کر تسلی دی۔ ”تمہاری دعاؤں سے مونس۔۔۔ وہ خاموش ہو گیا۔“

ڈاکٹر احسن آتے ہی مونس پر جھکا۔ چند لمحوں میں اس کے زخموں کا معائنہ کیا۔ پھر ”شکر ہے گولیاں گوشت پھاڑ کر نکل گئیں“ کہتے ہوئے اس نے مونس کو رزاقی کی گرفت سے نکال کر اپنے دونوں آدمیوں کے حوالے کیا جو اسے اٹھا کر مسجد سے باہر لے گئے۔ رزاقی نے ساتھ آنا چاہا۔

”رزاقی بابو۔۔۔ اب مونس بابو محفوظ ہاتھوں میں ہیں۔ آپ رکے۔“ ڈاکٹر احسن نے قاری خادم حسین کے اشارے پر اسے روکتے ہوئے کہا۔ ”میں انہیں حویلی لے جا رہا ہوں۔ وہیں ان کی ڈریسنگ کروں گا۔ یہ بھی شکر ہے کہ میری ڈیوٹی رات کی تھی۔ غلام حسین کے ساتھ ہاسپٹل آنے والے آدمیوں نے مجھے جونہی بتایا میں یہاں چلا آیا۔ قاری صاحب آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ آپ ان کی سنئے۔ اللہ حافظ۔“ ڈاکٹر احسن نے اسے کچھ بولنے ہی نہ دیا اور اپنی کہہ کر بی بی کا ہاتھ تھامے باہر کو چل دیا۔ لوگوں نے پھیل کر اسے رستہ دے دیا۔

جاتے جاتے بی بی اسے اب بھی مڑ مڑ کر دیکھ رہی تھی۔ ایک کے بعد ایک دعاؤں کے ساتھ اس کے ہونٹوں پر امنڈتی چلی آ رہی تھی۔ وہ چونکا تو جب جب قاری خادم حسین نے اس کے پاس آ کر کہا۔ ”رزاقی بابو۔۔۔ سب چاہتے ہیں کہ آج فجر کی امامت آپ کرائیں۔ وضو کر لیجئے۔“

”میں۔۔۔ آپ کے ہوتے ہوئے۔۔۔ وہ گڑ بڑا گیا۔

”ہاں رزاقی بابو۔۔۔ ہم سب کے ہوتے ہوئے۔۔۔ آج فجر کی نماز آپ پڑھائیے۔“

”مگر قاری صاحب۔۔۔ میں داڑھی منڈا۔۔۔“

”آپ ان باتوں کو چھوڑیے رزاقی بابو۔۔۔ آج جو آپ کی امامت میں نماز پڑھے گا وہ اس کا لطف ساری زندگی نہ بھول پائے گا۔ جلدت جو سرور آج آپ پر نازل ہوگا ہم سب اس میں سے اپنا اپنا حصہ چاہتے ہیں۔ خدا را ہمیں اس سے محروم نہ رکھے۔“

”قاری صاحب۔۔۔“ رزاقی نے اپنے ارد گرد بڑھتے جھگٹے پر نظر دوڑائی اور ہر نظر میں ایک ہی مطلب دیکھ کر سر جھکا لیا۔ قاری خادم حسین نے اس کا ہاتھ تھاما اور وضو خانے کی طرف لے گئے۔

پھر تقریباً پندرہ منٹ بعد خالق مگر کی اس مسجد میں ایک داڑھی منڈے کی امامت میں پورا گاؤں فجر کی نماز ادا کر رہا تھا۔

وہ کیسی نماز تھی کہ جس کے دوران ہر آنکھ اشکبار تھی۔ ہر تنفس کا سانس یوں گھٹ گھٹ کر احتیاط

کے ساتھ چل رہا تھا جیسے اسے یقین ہو کہ اس کا اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔ اگر رزاقی کی آواز قرأت کے دوران لرز رہی تھی تو ہر مقتدی کا دل کانپ رہا تھا۔ رکوع سے کھڑا ہونا دشوار تھا تو سجدے سے سر اٹھانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ رگ رگ میں حضوری کی کیفیت سرایت کئے ہوئے تھی تو نس نس میں اپنے خالق و معبود کی نظر سے چھپ نہ سکے کا احساس کچکی پیدا کر رہا تھا۔

قاری خادم حسین نے صبح کہا تھا کہ آج کی نماز کے سرور اور لذت میں خالق مگر کے ہر باسی کا حصہ تھا جسے اس تک پہنچانے کا فریضہ اس لاشریک نے رزاقی کو سونپ دیا تھا۔

ایسی بے مثل نماز سے فارغ ہوئے تو اشکبار رزاقی نے مزید رکنے سے معذرت کی جس پر سب لوگ قاری صاحب کی معیت میں اس کے ساتھ مسجد سے نیچے تک چلے آئے۔ شوکت اس وقت بھی رزاقی کے ساتھ تھا۔ کماری کو بی ایس ٹو کے کمرہ خاص میں اپنے آدمیوں کی نگرانی میں چھوڑ کر وہ فوراً ہی لوٹ آیا تھا اور اب چاہتا تھا کہ حویلی اس کے ساتھ ہی جائے۔ غلام حسین کو دو آدمیوں کے ساتھ ہاسپٹل چھوڑ کر ڈرائیور دلا اور ملک جیپ واپس لے آیا جو مسجد کے پہلو میں کھڑی تھی۔ شوکت نے چاہا کہ رزاقی جیپ میں حویلی چلے۔

رزاقی کو قاری صاحب اور دوسرے لوگوں سے ملنے ملانے میں چند منٹ لگ گئے۔ اس دوران شوکت جیپ کے پاس چلا آیا۔ ابھی اس نے دلا اور ملک کا سلام لے کر نماز کے دوران آف کیا گیا موبائل آن کیا ہی تھا بیل ہو گئی۔

”نہیں۔۔۔“ اس نے ایک طرف ہو کر کال ریسیو کی۔

”نظام بول رہا ہوں سر۔“

”ہاں بولو نظام۔ خیریت ہے ناں؟“

”جی سر۔۔۔ خیریت ہی ہے۔ کماری جاننا چاہتی ہے کہ مونس بابو کا کیا حال ہے اور رزاقی بابو کیسے ہیں؟ وہ مصر ہے کہ اس کی کم از کم آپ سے بات کرائی جائے۔“

”ہوں۔۔۔“ شوکت نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”کماری نے اور تو کچھ۔۔۔“

”نوسر۔۔۔ وہ بے حد کوآ پریٹو ہے۔ صرف اس کی تشویش بڑھتی جا رہی ہے۔ میں نے اس کے اصرار سے تنگ آ کر۔۔۔“

”کس کا فون ہے شوکت؟“ اس کے کانوں میں کماری کا لفظ پڑا تو رزاقی بے اختیار شوکت کے قریب چلا آیا۔

”سر۔۔۔“ شوکت الرٹ ہو گیا۔ اس نے ایک نظر رزاقی کے نثرے ہوئے چہرے پر ڈالی اور اسے یقین ہو گیا کہ اس وقت اس کے سامنے جو باوقار شخص کھڑا ہے وہ خالق مگر کا بابوش و حواس مالک

ہے۔ دیوانوں کی سی حرکتیں کرتے ہوئے وہ اٹھے اور ایک دوسرے کی دھڑکیاں اتارنے کی کوشش کرتے ہوئے بستی کی گلیوں میں دوڑنے بھاگنے لگے۔ لوگوں نے دودن ان کو بے شکل برداشت کیا پھر رسوں سے باندھ کر گاڑی میں ڈالا اور شہر کے مینٹل ہاسپٹل میں داخل کرا آئے۔ ہندو بستی کا مندر فی الحال یتیم و سیر تھا۔ پنڈت گردھاری لال کی جگہ ابھی تک کسی کو مندر کی ذمہ داری نہیں سونپی گئی تھی۔ ہاں ایک اور عجیب بات جو ساری بستی کے لئے اچھیجہ کا باعث بنی ہوئی تھی یہ تھی کہ مندرنی مسلسل مندر ہال کی کوٹھڑی کے بند دروازے کے ساتھ مانتھا ٹیکے آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی۔ نہ وہ کسی سے بولتی تھی نہ اپنی جگہ سے اٹھنے کے لئے تیار تھی۔ کوئی نہ جان پارہا تھا کہ وہ چاہتی کیا ہے؟ بس کبھی کبھی وہ ہاتھ اٹھا کر کوٹھڑی کے دروازے پر دستک دیتی اور پھر خاموشی کے نشیب میں اتر جاتی۔۔۔ اس بے حواس کو یہ بھی پتہ نہ چل رہا تھا کہ کوٹھڑی کے دروازے کی باہر سے کنڈی لگی ہے۔ وہ تو سوامی کے بلاوے پر ہر رات وہاں آنے پر مجبور تھی۔ اس رات بھی آئی مگر اس کے دستک دینے پر بھی جب کوٹھڑی کا دروازہ نہ کھلا تو وہ وہیں دھرنا دے کر بیٹھ گئی۔ سوامی کی تاریکیاں اس کے دل و دماغ پر ایسی مسلط ہو چکی تھیں جنہوں نے اس سے سوچ سمجھ اور شعور کی ساری طاقتیں چھین لی تھیں۔ لگتا یہی تھا کہ اب اس کا بھی اپنے حواس میں آنا ممکن نہیں رہا۔ سوامی ہی اسے اپنے دماغی اندھیرے کی گرفت سے آزاد کر سکتا تھا جو خود جنم کے سفر پر جا چکا تھا جہاں سے اس کی واپسی ناممکن تھی۔

کوٹھڑی کے اندر کچھ نہیں تھا۔ پہلی رات ہی شوکت کے آدمیوں نے مندر کی مکمل تلاشی لے لی تھی۔ وہاں سے سوائے مقامی کرنسی کی ایک بڑی مقدار ایک مورتی، چٹائی اور سوامی کے موبائل کے کچھ برآمد نہ ہوا تھا۔ ایسا انوکھا آدمی خالق مگر کی سرزمین نے کب دیکھا تھا جو مندر بنانے کے منصوبے کو کامیاب کرنے کے لئے خالی ہاتھ وہاں چلا آتا تھا۔

سارا آپریشن ایسی خاموشی کے ساتھ ہوا کہ کسی غیر متعلق آدمی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ ہندو بستی والے نہ تو فائرنگ کی وجہ جان سکے نہ انہیں اپنے آدمیوں کے غائب اور پاگل ہو جانے کا سبب معلوم ہو سکا۔ نور کے کوگاؤں واپس بلا لیا گیا مگر رزاقی کے آدمی سرحدی چوکی سے خالق مگر کے راستوں پر مستقل نگرانی کے لئے متعین کر دیے گئے تھے جن کا عام آدمی کے علم میں آ جانا ایک امر محال تھا۔

پروین، شہزادے کے ساتھ حویلی میں ہی چلی گئی۔ بیلا کی ساری ذمہ داریاں اس پر آ پڑی تھیں جنہیں وہ بخوبی بھاری تھی۔ شہزادے کو دیکھ کر رزاقی کو بڑی خوشگوار حیرت ہوئی اور ان تین دنوں میں دونوں بڑے اچھے دوست بن چکے تھے۔ بی بی نے یہ دیکھ کر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔

بیلا کے لئے دن رات مونس کے بستر سے بندھ جانا ایک ایسا کام تھا جس کے لئے وہ اپنے سات جنم قربان کرنے کو تیار تھی۔ اسے اپنا خیال تھا نہ کسی اور کا۔ ہر وقت مونس کے بستر کی پٹی سے لگی

فائق رزاقی ہی ہے۔ بے ساختہ اس کا دل جھوم اٹھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری اور مونس کی ساری ہدایات کا محور رزاقی ہو گیا۔

”میں نے پوچھا کس قانون تھا؟“ رزاقی نے نرمی سے اپنا سوال دہرایا۔

”بی ایس ٹو سے نظام کا قانون تھا سر۔“

”بی ایس ٹو سے؟“ رزاقی چونکا۔ ”وہاں کیا ہو رہا ہے؟“

”مونس بابو کے حکم پر کماری کو وہیں رکھ دیا گیا ہے سر۔ وہ آپ اور مونس بابو کے بارے میں بہت ٹینس ہو رہی ہے۔ جانا چاہتی ہے کہ کیا آپ دونوں خیریت سے ہیں؟“ شوکت نے کہا۔ ”باقی کی تفصیل میں آپ کو راتے میں بتاتا ہوں سر۔“

”ہوں۔ چلو۔“ رزاقی نے ایک گہرا سانس لیا۔ اس کی آنکھوں میں چند لمحے پہلے کے انہونے لمحات تیر گئے۔ اس نے جیب کی طرف قدم بڑھایا۔

”نظام کو کیا بتاؤں سر؟“ شوکت نے موبائل والا ہاتھ کان کی طرف لے جاتے ہوئے پوچھا۔

”صرف یہ کہ ہم دونوں خیریت سے ہیں اور بس۔۔۔“ رزاقی نے سپاٹ لہجے میں کہا اور جیب

کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

شوکت نے محسوس کیا کہ اس کے سارے جسم میں دوڑتے لہو میں گرمی کی اہل پڑی ہے۔ یہ لہجہ یہ انداز وہی تو تھا جسے سننے اور دیکھنے کے لئے ان کے کان اور آنکھیں پچھلے پانچ ماہ سے نہیں نہیں پانچ صدیوں سے ترس رہی تھیں۔

”یس سر۔۔۔“ جذبات سے شوکت کی آواز بھرا گئی۔ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا، رخ پھیر لیا اور سر تان کر نظام کو رزاقی کے پیغام سے آگاہ کرنے لگا۔

☆=====☆

خالق مگر کی رونقیں لوٹ آئیں۔

ہر طرف بہار ہی بہار کا سماں بندھ گیا۔

آج تیسرا دن تھا کہ وہاں کے حالات بالکل معمول پر آ گئے۔

ہندو بستی میں آیا ہوا سوامی دھیرج داس اچانک کہاں غائب ہو گیا، کسی کو علم نہ تھا۔ اب کون کے بتاتا کہ اس کے ناپاک مردہ وجود کو کوڑا کرکٹ اٹھانے والی گاڑی میں سرحدی چوکی اور وہاں سے پنڈت گردھاری لال اور اس کے دونوں چیلوں کے ساتھ جی ایچ کیور وائر کر دیا گیا تھا۔ نندکار دیوا اور دیو کیسے پاگل ہوئے، کسے معلوم تھا؟ بس فائرنگ کی رات جب اپنی صبح سے گلے ملی تو وہ تینوں ہندو بستی کے باہر کھنڈر مکان میں پڑے ملے۔ ہوش میں لایا گیا تو پتہ چلا کہ ان تینوں کا دماغی توازن خراب ہو چکا

”بیلا۔۔۔“ اس نے اپنے پاؤں کھینچ لینا چاہے۔

”میرے دیوتا۔۔۔ میرے دیوتا۔۔۔“ بیلا دونوں ہاتھوں سے اس کے پاؤں تھامے ہونٹوں سے چوم رہی تھی۔ آنکھوں سے چوم رہی تھی۔ ان سے بہتے آنسوؤں سے تر تر رخساروں سے چوم رہی تھی۔ مونس سن ہو کر رہ گیا۔

”بس۔۔۔ اب کچھ نہیں چاہئے مونس بابو۔ میرا جیون سہل ہو گیا۔ میں پوتر ہو گئی۔ اب اگلا سانس نہ بھی آئے تو غم نہیں۔“ بیلا نے ماتھا اس کے پیروں پر ٹیک دیا۔

”بیلا۔۔۔“ مونس نے پہلو کے زخم پر ہاتھ رکھ کر اپنی جگہ سے حرکت کرنا چاہی۔ اسے اندیشہ تھا کہ کوئی ان دونوں کو اس کیفیت میں دیکھ نہ لے۔ اس نے ایک بار پھر اپنے پاؤں بیلا کی گرفت سے چھڑانا چاہے۔۔۔ تب بیلا نے اس کے تلووں کا ایک نرم بوسہ لے کر سر اٹھایا۔ رخساروں پر بہتے آنسوؤں کی دھاریں رک سی گئی تھیں۔ مونس اس کی دھلی دھلی آنکھوں میں ڈوب سا گیا۔

”میں آپ کے قابل نہیں ہوں۔ یہ میں جانتی ہوں مونس بابو۔۔۔ مگر اس دل کا میں کیا کرتی جو آپ کے نام پر دھڑکتا ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے کماری دیدی کا دل رزاقی بابو کے نام کی مالا چلتا ہے۔ میں نہیں جانتی کب ایسا ہوا؟ کیسے ہوا مگر یہ ضرور جانتی ہوں کہ وہ بھی میری طرح چُپ چاپ خاموشی سے اندر ہی اندر اس اہمیت سے گھونٹ گھونٹ آتما کی قیمتی زمین کو بیچ رہی تھی جسے لوگ پرہیز کہتے ہیں۔ اس نے شمشان میں جو کچھ کیا وہ اسی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر کیا۔ اپنا دھرم اپنا کرتویہ اپنا تان من سب کچھ طاق پر دھڑ دیا۔ یاد رکھا تو صرف یہ کہ رزاقی بابو اس کے لئے سب کچھ ہیں۔ سواری سے بھڑ جانا ایسا آسان نہ تھا مگر اسے یہ سب اپنے رزاقی بابو کے سامنے بیچ محسوس ہوا۔ کمتر لگا۔ میں جب سوچتی ہوں کہ کماری دیدی نے رزاقی بابو کو بچانے کی خاطر سواری جیسے بیدوت کی جانب سے آتی موت کو خود پر لینا چاہا تو مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو جاتی ہے۔ تف ہے میرے جیون پر مونس بابو۔ لعنت مجھ جیتی ہوں میں خود پر جب خیال آتا ہے کہ میں اس رات آپ کو زخم آنے سے پہلے سواری کی گولی کے نشانے پر کیوں نہ آ سکی؟ تب جی چاہتا ہے اپنے دل کو سینے سے نوج کر پھینک دوں۔ کسی کتے کے آگے ڈال دوں اس ناکارہ گوشت کے ٹکڑے کو۔“ عجیب دکھ اور ملال سے کہتے ہوئے وہ جیتا کیے عالم میں اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ چند لمحے سسکتی رہی پھر آستین سے چہرہ اور آنکھیں خشک کیں اور مونس کی جانب دیکھا۔ ”مگر پھر ایک سوچ مجھے اپنا آپ مٹا دینے سے باز رکھے کے لئے دلا سہ دیتی ہے۔۔۔ آپ بس رہے ہیں ناں اس دل میں مونس بابو۔ تو پھر اسے کسی نجس کسی پلید کے آگے کیسے ڈال دوں؟“ وہ مسکرائی۔

مونس اسے چُپ چاپ نکلتا رہا۔ اس کے دماغ میں گولے سے اڑ رہے تھے۔ بیلا کی باتیں اسے سمجھ بھی آ رہی تھیں۔ کچھ سمجھا بھی رہی تھیں۔ اس نے کچھ کہنے کے لئے ہونٹ وا کئے۔

رہتی۔ مونس بابو کا کھانا پینا، کمرے کی صفائی، لباس بدلوانا، رات کو اس کے بستر کے پاس قالین پر پڑ رہنا اور جاگتے رہنا۔۔۔ یہی اس کے شب و روز تھے جنہوں نے اسے کملایا ہوا زرد پھول کر دیا۔ متورم ویران ویران آنکھوں کے گرد حلقے، بال خشک، چہرہ مٹا ہوا، ہونٹوں پر پڑیاں اور خاموشی۔۔۔ بیلا مر جھاتی جا رہی تھی۔

مونس ہوش میں تھا۔ رزاقی کے ساتھ والے کمرے میں اس کا بیڈ لگا دیا گیا تھا۔ بیلا کی جانفشانی سے مطمئن ہو کر ڈاکٹر احسن اگلے ہی دن دوپہر کو رخصت ہو گیا۔ اب وہ روزانہ شام کو آتا اور اس کے زخموں پر نئی ڈریسنگ کر جاتا۔

بیلا جس طرح مونس کے لئے ہلکان ہو رہی تھی بی بی رزاقی اور ڈاکٹر احسن سمیت اس پر اگر اس کے شکر گزار تھے تو اس سے زیادہ حیران تھے۔ ایسا تو کوئی اپنا سا نہیں کرتا جیسا بیلا کر رہی تھی۔۔۔ ایک پروین جان جانتی تھی کہ یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ مگر وہ کسی کو بتاتی تو کیا! اسے علم تھا کہ جس کے لئے سب ہو رہا ہے وہ جانتا ہے۔ سمجھتا ہے۔ محسوس کرتا ہے۔ یہی کافی تھا۔ یہی ضروری تھا۔

مونس نے دبی زبان سے بیلا کو اس قدر جان جو کھم سے منع کرنا چاہا تو اس نے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے مونس کی جانب بڑی پیاسی نظروں سے دیکھا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر سر جھکا لیا۔ اس کے ہونٹ کپکپاتے مگر آواز نہ نکلی۔ مونس کو اس کی آواز سے کیا لینا دینا تھا۔ اسے وہ زبان سمجھ آ رہی تھی جو بیلا کا جھکا ہوا سر، کپکپاتے ہونٹ اور آنکھیں بول رہی تھیں۔ اس نے بڑی گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ پھر پھلپھل ہونٹوں میں دبا کر رہ گیا۔

”لوگ اندھے نہیں ہیں بیلا۔“ ہو لے سے مونس نے کہا۔

”مجھے آپ کے سوا کچھ نظر نہیں آتا مونس بابو۔ میں کیا کروں؟“ بیلا کی بے بسی سے غم آنکھیں اٹھیں تو اس نے ایک ہی فقرے میں وہ سب کہہ دیا جو اس کے دل میں مدتوں سے شور مچا رہا تھا۔ ”پھر بھی کوئی رسوائی کا لمحہ سامنے آ گیا تو بیلا کے جسم میں اتنا خون تو ابھی ہے کہ اس لمحے کا داغ دھو سکے۔“

”پاگل ہوئی ہو۔“ ایک دم مونس کے لبوں سے نکلا۔ پھر پچل کر اس نے جن نظروں سے بیلا کی جانب دیکھا، بیلا کی روح تک سرشار ہو گئی۔ ”جاؤ یہاں سے۔“ مونس نے اپنے زخمی بازو کی ڈریسنگ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نظر پھیر لی۔ اس سے بیلا کا دل الہانہ پن سہانہ جا رہا تھا۔ ”جو منہ میں آتا ہے بک دیتی ہو۔ چلو۔ نکلو یہاں سے۔ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔“ مونس نے سر جھکا۔

”مونس بابو۔“ بیلا بس اتنا ہی کہہ سکی۔

جواب میں مونس نے سر اٹھایا نہ نظر۔ وہ دیواروں کو دیکھتا رہا جیسے ابھی وہ اس سے مخاطب ہوگی۔ پھر چونکا تو اس وقت جب بیلا کی ہلکی ہوئی آنکھوں نے اس کے پیروں کے کتنے ہی بوسے لے لئے۔

رزاتی اپنے کمرے میں تھا مگر اس کا دل اس کا دماغ پچھلے تین دن رات سے پیسمنٹ سیل ٹوکے اس کمرے میں جانے کو بیتاب تھا جہاں کماری کو رکھا گیا تھا۔

غلام حسین ابھی تک ہاسپٹل میں تھا۔ نور اسرحدی چوکی پر انوار الحق کے پاس تھا۔ جہاں وہ دونوں دوسرے فوجی افسران کے ساتھ مل کر یہ طے کر رہے تھے کہ مستقبل میں ایسا کیا کیا جائے کہ آئندہ خالق نمکری دیوار میں کوئی سواری نقب نہ لگا سکے۔ رزاتی نے کماری کے بارے میں شوکت اور نورے سمیت اپنے تمام آدمیوں کو مکمل زبان بندی کا حکم دے دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ ایٹھ اس کی نجی زندگی کے دوش پر سیکینڈل کی فضا میں محو سفر ہو جائے۔ انوار کو بھی اس معاملے سے خبر ہی رکھا گیا۔ کماری کے بارے میں ایسی کسی بات کو چھپانا اس لئے بھی ضروری تھا کہ اس کے سامنے آنے سے بی بی کو جو صدمہ ہوتا رزاتی اس کے لئے تیار نہ تھا۔ بی بی کے لئے کماری ایک بے حد صاف ستھرے کردار کی پڑھی لکھی عورت تھی جس کی اچھائی کے گہرے نقوش بی بی کے دماغ پر ثبت تھے۔ اس لئے بی بی کو یہی بتایا گیا کہ کماری کسی ضروری کام سے اچانک دلی واپس لوٹ گئی ہے۔ بی بی کو اس کے مل کرنے جانے کا افسوس سا لگ گیا۔

رزاتی کے ہوش سنبھالتے ہی نمونس اور شوکت سے سب حالات جاننے کے ساتھ ساتھ یہ سب تو بڑے احسن طریقے سے ہو گیا مگر۔۔۔ وہ خود کہاں کھڑا تھا؟ اس کے لئے یہ سب سے زیادہ اہم سوال تھا جس کا جواب اسے خود سے لینا تھا۔ خود کو بتانا تھا۔

نمونس کے کمرے اور آفس میں دن کا اکثر اوقات کا ایک پہر گزارنے کے بعد جب وہ اپنے کمرے میں آتا تو نیند اس کی آنکھوں سے روٹھ جاتی۔ بیلا اب بھی اس کے لئے کافی کا کپ بنا کر لاتی جسے وہ مسکرا کر تمام لیتا مگر اب اسے کافی پی کر بھی نیند نہ آتی۔ غنودگی کے نام پر بھی وہ چند لمحوں کے لئے پلکیں جھپکنے سے محروم ہو گیا۔ کھلی کھڑکی سے مسجد کی جانب نظر ڈالتا تو اس کا دل سکون سے بھر جاتا۔ سر تشکر سے جھک جاتا۔۔۔ اپنی توبہ کے مقبول ہونے کا لمحہ یاد آتا تو اسے اپنے اللہ پر ایسا پیار آتا کہ اس کے لئے اپنا آپ سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ راجیہ اور جنت کی تصویر پر نگاہ پڑتی تو اسے ان کے لبوں پر بڑی آسودہ مسکراہٹ کا احساس ہوتا۔۔۔ مگر ساتھ ہی کماری اس کے خیالوں میں در آتی۔ اس کا روح بن کر آنے کا خیال اس کی باتیں اور خاص طور پر شمشان میں کہا گیا ایک ایک لفظ اس کے جسم میں تھر تھری پیدا کر دیتا۔ اسے لگتا کہ کماری کے اس کے بارے میں کہے گئے ایک ایک لفظ کے پیچھے کچھ ایسا ہے جسے مان لینے جسے جان لینے سے وہ کتر رہا ہے۔ نظر چرا رہا ہے۔

اس کا جی چاہتا کہ نمونس سے بات کرے۔ پھر یہ سوچ کر رہ جاتا کہ ابھی وہ آسانی سے چلنے پھرنے کے قابل نہ ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے اس پر مکمل بنڈریسٹ کی پابندی لگا رکھی تھی۔ تبھی خیال آتا کہ نمونس

”کچھ مت کہئے نمونس بابو۔۔۔“ بیلا نے اسے التجا آمیز انداز میں دیکھا۔ ”کچھ مت کہئے۔ میں کچھ اندازہ کر سکتی ہوں کہ آپ کیا کہیں گے مگر میں چاہتی ہوں آپ کچھ نہ کہیں۔ میں زندگی اسی ایک بل کے نشے میں گزار دینا چاہتی ہوں جس میں آپ نے مجھے محسوس کیا۔ مجھے کچھ ایسا جانا جس کے مرنے کی بات نے آپ کو دکھ دیا۔ میں اسی دکھ کے آئینے میں بندھی رہنا چاہتی ہوں نمونس بابو۔ اس پھول کی طرح جسے اگر اس آئینے سے کھول لیا گیا تو وہ بکھر کر مٹی میں مل جائے گا۔۔۔ میں آپ کو پانا چاہتی تھی، میں نے آپ کو پایا۔ آپ کے نام پر اپنی مانگ کو آباد کرنا چاہتی تھی، کر رہی ہوں۔“ اس نے جھک کر نمونس کے پیر چموائے اور ہاتھ اپنی مانگ میں پھیر لیا۔ ”میں سدا سہاگن ہو گئی نمونس بابو۔“ وہ والہانہ پن سے مسکرائی۔ ”میری مانگ سے یہ سیندور کون چھینے گا؟ کوئی نہیں۔ چھینا وہ کچھ جاتا ہے جو نظر آئے۔ میں نے تو وہ پایا ہے جو صرف اور صرف میرا ہے۔ جس پر کسی کی نگاہ پڑ جائے ایسا ممکن ہی نہیں۔ اپنی منزل پر پہنچ کر کون جینا چاہے گا نمونس بابو۔۔۔ میں بھی نہیں چاہتی مگر آپ کی سیوا کے لئے سانس لینا چاہتی ہوں۔۔۔ اپنا دھرم نبھانا چاہتی ہوں۔ آپ جسے اپنی دہن بنا کر لائیں گے، اس پر جی جان سے نثار ہونا چاہتی ہوں۔ اس کے لئے بیج نہ سجا سکی یہ حسرت لے کر مرنا نہیں چاہتی۔ اسے ہر صبح آپ کے ساتھ ہنستا کھلتا بیدار ہوتا دیکھنا چاہتی ہوں۔۔۔ میں بہت پڑھی لکھی نہیں ہوں نمونس بابو۔ آتما سے آتما کاملن کیا ہوتا ہے جس میں اس سے آشنا نہیں ہوں مگر مجھے جو کچھ آج اس ایک پل کے سنبھالنا ہے بتایا ہے وہ یہی ہے کہ جس سے آتما کا بندھن ہے وہ مرنے لگے۔ دکھتا رہے۔ دیکھتا رہے۔ اپنا بتا رہے۔ اپنے چرن چھو لینے دیا کرنے یہی بہت ہے۔ یہی کافی ہے۔ یہی سب کچھ ہے۔۔۔ یہی سب کچھ ہے۔۔۔ ایک بار آپ میرے مقروض ہوئے تھے نمونس بابو۔ تب میں نے کہا تھا کہ میں حساب کی بڑی بد لحاظ ہوں یاد ہے ناں آپ کو۔۔۔“ بیلا کی آواز بھرا گئی۔ ”مجھے لیجئے آج میں اپنا وہ قرض وصول کر رہی ہوں۔ اپنے چرنوں میں پزار ہنے دیجئے مجھے اور بس۔۔۔“ وہ مخموری ہو گئی۔ نشے میں لڑکھڑا گئی۔ اس کے ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ اس نے آہستہ سے جھک کر ایک بار پھر نمونس کے پیروں کو آنکھوں سے مس کیا، ماتھے سے لگایا، بوسہ دیا اور سیدھی کھڑی ہو گئی۔ چند لمحے نمونس کو یوں تکتی رہی جیسے اسے دل میں اتار رہی ہو۔ پھر ہونٹوں پر بڑی دلاؤ ویز مسکراہٹ لئے کچھ کہے بغیر اٹھ پائوں دروازے سے نکل گئی۔

اور نمونس۔۔۔ اس کے سارے جسم و جاں میں ایک ہی لفظ کا ورد ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں ایک ہی سراپا جھوم رہا تھا۔ لبو میں ایک ہی رنگ گردش کر رہا تھا۔ اندر باہر چاروں طرف ایک ہی خوشبو رقصاں تھی۔۔۔ بیلا۔۔۔ بیلا۔۔۔ بیلا۔۔۔!

بیٹھ کر اس کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں لے کر تھپتھپانے لگا۔ ”اب کیسا لگ رہا ہے؟“ بڑی محبت سے اس نے پوچھا۔

”بالکل ٹھیک۔۔۔“ مونس ہشاش بشاش ہو گیا۔

”ڈاکٹر احسن بتا رہا تھا کہ بازو کا زخم تو کافی بہتر ہے مگر پہلو۔۔۔“

”وہ بھی ٹھیک ہی ہے یار۔۔۔ ان ڈاکٹروں کو ویسے ہی متا بگھارنے کا ہیضہ ہوتا ہے۔“ منہ بنا کر مونس نے کہا تو رزاقی قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

”ناشتہ کر لیا؟“

”ہاں۔۔۔ اور تم نے؟“ مونس نے پوچھا۔

”بیلا تمہاری ڈیوٹی پر ہے بھائی تو میں پروین کی ڈسپوزل پر ہوں۔ کسی کام کا ایک منٹ ادھر نہ ادھر۔“ بیچارگی سے رزاقی نے کہا۔ اب قہقہہ لگانے کی باری مونس کی تھی۔

”ہم دونوں ہنس تو رہے ہیں مونس۔۔۔ لیکن اگر ذرا سنجیدگی سے سوچیں ناں تو ہم جیسا خوش قسمت کم کم ہی ہوگا۔“ رزاقی نے آہستہ سے کہا۔ مونس نے ایسے سنجیدہ ہوتا محسوس کیا تو غور سے اس کی

طرف دیکھنے لگا۔ ”دیکھو ناں۔۔۔ یہ دو دو پگلیاں ہمارا جس طرح خیال رکھتی ہیں کوئی لگا ہوتا تو بھی شاید ایسا نہ کرتا۔ اب یہ قسمت کی خوبی تھی تو بے درندہ۔۔۔“

”ٹھیک کہتے ہو رزاقی۔“ مونس نے اقرار کیا۔ ”مجھے میں نہیں آتا ان کی محنتوں کا قرض ہم سے اتارا کیسے جائے گا؟“

”محبت کا قرض اتارنا ممکن نہیں ہوتا مونس۔۔۔“ رزاقی کا لہجہ عجیب سا ہو گیا۔ ”یہ قرض ایک بار چڑھ جائے تو بس پھر اس کے سود میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے۔ نہ سود ادا کیا جاتا ہے نہ اصل سے جان چھوٹی ہے۔“

”خیریت؟“ مونس نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ ”آج صبح ہی صبح محبت کا بخار کیوں چڑھ گیا؟“

”یہ بخار اترا ہی کب تھا مونس۔۔۔“ رزاقی نے ہاتھ کی لکیروں پر نگاہیں گاڑ دیں۔ ”بس طیب نہ رہا تو۔۔۔“ اس کی آواز ٹوٹ سی گئی۔

”خود کو سنبھالو یار۔۔۔“ مونس نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”اب تو تمہیں سمجھ جانا چاہئے کہ انسان کے لئے جو بہتر ہوتا ہے وہ صرف اس کے خالق کو پیہ ہوتا ہے۔“

”میں سمجھ بھی چکا ہوں مونس اور قبول بھی کر چکا ہوں۔“ رزاقی نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

”میں نے راجیہ کی موت کے بعد سے لے کر نجات کی رات تک کے ایک ایک لمحے کو جانچا ہے۔ پر کھا

کو زبان سے بات کرتی ہے دماغ سے سوچتا ہے دل سے محسوس کرنا ہے اس میں جسم کے زخم کیا رکاوٹ ہیں؟ اس پر فوراً ہی اسے اپنے خود غرض ہونے کا احساس ہوتا۔ دماغ کہتا اسے مونس کے صحت یاب ہونے کا انتظار کرنا چاہئے تھا۔ دل منہ بنا لیتا کہ اب ایسا بھی کیا کہ مونس جیسے جگر جان سے جی کی بات کرنے کے لئے انتظار کی سولی پر لٹکا رہا جائے۔ وہ کوئی فیصلہ نہ کر پا رہا تھا۔

ہسپتال میں ٹو میں کماری پورے آرام سے تھی۔ ایسا ہی تھا جیسے وہ کسی فائینسٹار ہوٹل کے فرنٹ ڈسک کے میں مقیم ہو۔ رزاقی نے اس کے لئے ہر قسم کی سہولت کا حکم دے رکھا تھا اور یہ مونس کے کہنے پر کیا گیا تھا۔

اس وقت بھی وہ اسی نگہکش میں گھر امونس کے پاس جانے کے لئے نکلا۔ اس کے کمرے کی کھڑکی کے قریب پہنچا تو اندر سے بیلا کی آواز کانوں میں پڑی۔ اپنا نام سن کر وہ ٹھٹھا اور رک گیا۔ پھر وہ

ہاں رکا ہی رہ گیا۔ اس کے سوالوں کے جواب سامنے آ رہے تھے۔ کماری پرت در پرت کھل رہی تھی۔ بیلا مہک رہی تھی۔ مونس کی خاموشی اس کے اور بیلا کے درمیان اس تعلق کو زبان دے رہی تھی جس کے

بارے میں جان کر رزاقی کا سارا بدن جھنجھٹا اٹھا۔ راجیہ سے اپنی محبت کی شدت یاد آئی تو اسے بیلا پر پیار آ گیا۔ کیسی بگلی ہے یہ؟ اس نے ایسے ہلکے کر سوچا کہ خود پر قابو پانا دشوار ہو گیا۔ چونکا تو اس وقت

جب کمرے کا دروازہ کھلنے کی آہٹ ہوئی۔ وہ لپک کر پیچھے ہٹا اور دسے پڑاؤں واپس اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔

بیلا جب حویلی کے زنان خانے میں چلی گئی تو اس نے سینے میں رکھا ہوا سانس خارج کیا۔ اس پر جو کھلا تھا اس نے اس کے اندر بہت سے روزن وا کر دیے تھے۔ وہ کمرے میں ٹپکنے لگا۔ سوچوں کو رستہ تو

مل گیا تھا۔ خیالوں کی باگیں تو اٹھادی گئی تھیں۔۔۔ مگر فیصلے کا اسپ ابھی تک صحیح سمت کا تعین نہ کر پا رہا تھا۔ کماری کی باتیں یاد آنے پر وہ جس پل سے نظر جڑا لیتا تھا جسے تسلیم کر لینے سے وہ جان بچاتا تھا وہ

پل بے ستر ہو کر اس کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ اب اسے اپنے دل سے اپنے دماغ سے اس کے لئے وہ لباس طلب کرنا تھا جو اس پل کو دلہن بنادے یا کفن اوڑھادے۔

بہت دیر بعد بھی جب وہ کسی فیصلے پر پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکا تو اس نے سر جھٹکا۔ ذہن و دل کو آزاد چھوڑا اور مونس کے کمرے میں جا دھمکا جو بستر پر نیم دراز آنکھیں بند کئے دایاں ہاتھ پیشانی پر

رکھے کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ آہٹ بن کر وہ چونکا۔ اسے اپنے قریب آتا دیکھ کر مونس کے چہرے پر چھایا غبار ایک دم دھل گیا۔ مسکراتے ہوئے اس نے اٹھنا چاہا۔

”آں ہاں۔۔۔“ رزاقی نے اسے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔ ”لیئے رہو۔ زیادہ بلو جلومت۔ ورنہ تمہاری وہ نرس بیلا ابھی جان کو آ جائے گی۔“ وہ مسکراتے ہوئے اس کے پاس آیا اور پاس پڑی کرسی پر

ہے۔ اپنے آپ کو آئینہ کر کے دیکھا ہے تب جا کر کھلا ہے کہ مجھ سے میری راجیہ کو میرے معبود نے دور کیوں کیا؟“

وہ ایک پل کو رکا۔ جیسے اپنے ذہن میں خیالات کو مجتمع کر رہا ہو۔ مونس نے اس کے شانے پر دھرا اپنا ہاتھ آہستہ سے کھینچ لیا اور اس کے چہرے پر نگاہیں جمادیں۔

”اگر میں اپنی راجیہ اور جنت سے حشر تک کی دوری کے دکھ سے دوچار نہ ہوتا۔۔۔ اپنے خدا سے خفا ہونے کی نادانی نہ کرتا۔۔۔ اس کے گھر کا در اپنے اوپر بند کر لینے کی انتہا تک نہ جاتا تو جانتے ہو مونس کیا ہوتا؟“

”جانتا ہوں۔۔۔ مگر تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں کہ تب کیا ہوتا؟“ مونس نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر جواب دیا۔

”ہاں۔۔۔“ رزاتی نے اسے بڑے افتخار سے دیکھا۔ ”میرا یقین ہے کہ تم سب کچھ جانتے اور سمجھتے ہو۔ تم میرا سایہ ہو مونس اور یہ تمہارے لئے نہیں میرے لئے فخر کی بات ہے۔ میں اس پر جتنا بھی اتراؤں کم ہے۔ بہر حال میں بتاتا ہوں کہ تب کیا ہوتا۔۔۔ تب یہ ہوتا مونس کہ سوامی جیسا حرامزادہ مجھ تک وہ رسائی حاصل نہ کر پاتا جس کے نتیجے میں راجیہ کو دوبارہ پالنے کے جنون نے مجھے ایسا کر لیا۔ تب یہ ہوتا کہ میں اپنے آپ سے چھپ کر اپنے آپ کو دھوکے میں رکھ کر اس کی ہر بات مان لینے کا اقرار نہ کرتا۔ تب یہ ہوتا کہ میں شمشان میں کھینچ کر اپنے ایمان کی پرکھ سے محروم رہ جاتا۔۔۔ میں کبھی نہ جان پاتا کہ مجھے ایک محرومی کے حوالے کر کے مجھے میرے اللہ نے کس امتحان کی گھڑی کے لئے تیار کیا تھا۔“ رزاتی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا سارا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ شاید نہیں بلکہ یقیناً اسے اپنی نجات کی رات کا ایک ایک منظر یاد آ رہا تھا۔ وہ آہستہ روی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔

”اس رات جب اس حرامی نے یہاں مندر بنانے کی بات کی ناں مونس۔۔۔ تو مجھے معلوم نہیں کیا ہوا۔ ایک پل میں میرے ذہن سے میری سوچ سے میرے خیال سے راجیہ جنت حتیٰ کہ میں خود بھی محو ہو گیا۔ مجھے لگا کہ سوامی نے مجھے ایسی گالی دی ہے جس کا جواب اس کی موت سے کم پر شروع ہی نہیں ہوتا۔ اس نے میرے اللہ کے بارے میں ہرزہ سرائی کی کوشش کی۔ میرے آقا و مولا ﷺ کے لئے طنز یہ لہجہ اختیار کیا تو مجھے پتہ چلا کہ میرے اندر میرے اللہ نے عقیدت کا کیسا الاؤ دہکا رکھا ہے۔ اس الاؤ کی جاگنداز آج پر میری روح نے یوں ہاتھ تپا پے مونس کہ میں اندر باہر سے تپ کر کندن ہو گیا۔“

وہ ٹہلتے ٹہلتے رکا۔ آنکھوں کے گوشے خشک کئے۔ پھر واپس کرسی پر آ بیٹھا۔ مونس اسے ایسی والہانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ کیا کسی نے کبھی اپنی عزیز تر شے کو دیکھا ہوگا۔ رزاتی نے اس کی نظروں کی تاب نہ لا کر ہاتھ گود میں ڈالتے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھا اور پھر کہنا شروع کیا۔

”اور تب یہ بھی تو ہوتا مونس کہ مجھے کبھی یہ علم نہ ہوتا کہ میں ایک عورت کے سحر کار حسن کی پلیٹ میں آ کر اپنی اصل سے اپنی بنیاد سے اپنے خمیر سے کتنا دور جا چکا تھا اور تب یہ بھی ہوتا کہ مجھے اپنے رب کے حضور اس سجدے کی توفیق کبھی نہ ملتی جس کے بعد میں یوں نہایا دھویا، نکھر اترتا ہوں سب کے سامنے آیا جیسے ابھی اپنی ماں کی کوکھ سے پیدا ہوا ہوں۔۔۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں مونس؟“ اس نے رک کر نم آنکھوں سے اس کی جانب دیکھا۔

جواب میں آنکھوں میں پھیلتی چمکیلی نمی کے پار اس کا لبو چھلکا تا چہرہ نظر کے حصار میں لئے مونس نے کہنا چاہا کہ ”ہاں رزاتی! ایسا ہی ہوتا میرے یار۔۔۔ اور تب یہ بھی تو ہوتا کہ تمہیں واپس لانے کا میرا دعویٰ دھڑلے کا دھرا رہ جاتا اور یہ میرے رب کو کیسے گوارا تھا۔۔۔ مگر وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے محض اثبات میں زور سے سر ہلا کر رہ گیا۔ نکلین پانی اس کے حلق میں اتر چکا تھا جو اسے بولنے ہی نہ دے رہا تھا۔

”جب یہ سب مجھ پر کھلا ناں مونس تو مجھے اپنے رب کی حکمت پر ایمان لاتے ہی بنی۔ زبردستی نہیں۔۔۔ نہ نہ۔۔۔ دل سے۔۔۔ کھلے دل سے میں نے اپنی نادانی پر شرمندگی کا اقرار کیا، اظہار کیا۔۔۔ اور یہ بھی تو ایسی ہی ہوئی تو فتنہ تھی ورنہ اگر اس وقت میری موت ماری جاتی، میں سوامی کے بہکاوے میں آ جاتا۔۔۔ اور میرا اللہ میری طرف سے رخ پھیر لیتا، میرا جرم معاف کرنے سے انکار کر دیتا تو میں کیا کر لیتا مونس؟“

”ایسا ممکن نہیں تھا رزاتی۔۔۔“ سرگوشی کے لہجے میں مونس نے کہا اور ہاتھ کی پشت سے آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ اس سے زیادہ سہناپ اس کی برداشت سے باہر ہو گیا تھا۔ ”میرے اور تمہارے رب کی رحمت انہی آنسوؤں کا تو انتظار کرتی ہے جو اس رات اس کے گھر میں تمہاری آنکھوں سے بہہ نکلے۔ وہ کیسے ان موتیوں کو خاک میں مل جانے دیتا جو زبان حال سے اس کے رحم، کرم اور غنودہ گزر کو پکار رہے تھے۔۔۔ وہ تمہاری پکار اس حال میں نہ سنتا تو شاید میرا ایمان ڈول جاتا۔۔۔ مگر۔۔۔ الحمد للہ کہ اس نے اپنے حبیب پاک ﷺ کے صدقے میں میرے ایمان، یقین، بھروسے اور تمہاری توبہ کی لاج رکھی۔“

”بالکل۔۔۔“ رزاتی کا چہرہ گلاب جیسا کھل اٹھا۔ ”تمہارے الفاظ نے میری بات کی تصدیق کر دی مونس۔۔۔ یہی یقین تو اس رات مجھ پر نازل ہوا۔ اپنی نادانی کی انتہا پر پہنچ کر بھی جب میں نے اس کی رحمت کو پکارا تو اس نے ایک پل کی دیر کے بغیر مجھے اپنے سامنے سجدہ پر ہر ہونے کا فاضل دے دیا۔۔۔ مجھے معاف کر دیا۔۔۔ مگر ایک دکھ، ایک خلش، ایک پھانس سی دل میں ٹیس بن کر رہ گئی ہے۔“

”مونس۔۔۔ سمجھ میں نہیں آتا اس کا کیا کروں؟“

”ایسی کیا بات ہے؟“ مونس نے اس کی جانب حیرت سے دیکھا۔

آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔ جواب میں رزاتی کی نظر جھک گئی تو وہ مسکرایا۔ ”تو پھر طے ہو گیا ناں کہ من کے چور کو اکیلے ہی اس کے پاس جانا چاہئے۔ جاؤ۔۔۔ جو کہنا ہے جا کر کھل کر کہہ دو اس سے۔ جو سننا چاہتے ہو شاید وہی سننے کو مل جائے۔“

چونکہ کر رزاتی نے مولس کی جانب دیکھا۔

جواب میں مولس نے اس کے ہاتھوں کو آہستہ سے اپنی جانب کھینچ کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ پھر نظر اٹھائی۔ دونوں کی نگاہیں ملیں۔ دھیرے سے مولس نے اثبات میں سر ہلایا جیسے اسے کماری کے پاس جانے کا گرین سگنل دے رہا ہو۔

چند لمحے کے لئے رزاتی نے کچھ سوچا۔ پھر اس کے لب ہلے۔

”اور اپنے بارے میں کیا سوچا تم نے؟“

”مجھے کیا سوچنا ہے؟“ مولس کا دل بڑے زور سے دھڑکا۔

”اپنے سائے سے ایسا بے خبر بھی نہیں ہوں میں مولس بابو۔۔۔“ معنی خیز لہجے میں رزاتی نے کہا اور ہاتھ کھینچ کر اٹھ گیا۔۔۔ ”خود کو میری واپسی تک ذہنی طور پر تیار کر لو۔ اگر تم مجھے بی ایس ٹو میں جانے کے لئے تیار کر سکتے ہو تو اتنی صلاحیت تو مجھ میں بھی ہے میری جان کہ تمہیں بیلا کی کلی کی پاکیزگی کا قائل کر لوں۔“

مولس بری طرح چونکا۔ اس کا بھید ایک دن کے لئے بھی صرف اس کا نہ رہ سکا۔ وہ مفلوج ذہن اور کج جسم کے ساتھ سوچتا رہ گیا۔

”چلتا ہوں۔۔۔“ رزاتی اس کی حالت پر زیر لب مسکرایا۔

”نہیں رزاتی۔۔۔“ ایک دم مولس بول پڑا اور قدم اٹھاتے رزاتی کا ہاتھ تھام کر روک لیا۔ ”اگر تم میری زندگی میں بہار دیکھنا چاہتے ہو تو ابھی اس بات کو سینے میں دفن رکھو۔ وقت آنے پر میں خود تمہیں اپنے کالر میں بیلا کا پھول بجانے کو کہوں گا یا رہا۔۔۔ مگر ابھی نہیں۔ پلیز۔۔۔“ اس کا لہجہ ملتجیانہ ہو گیا۔

”وعدہ۔۔۔؟“ رزاتی نے اس کے ہاتھ پر دوسرا ہاتھ رکھا۔

”نکا!“ مولس نے جلدی سے کہا۔

”میرے لئے دعا کرتے رہنا۔ اللہ حافظ۔“ رزاتی نے اس کی آنکھوں میں دیکھا جہاں کتنی ہی شمعیں روشن تھیں۔ مسکرا کر اس نے مولس کا ہاتھ دبایا اور چھوڑ دیا۔ پھر پلٹا اور کمرے سے نکل گیا۔

☆=====☆

”اس خبیث کو میرے ہاتھوں جہنم واصل ہونا چاہئے تھا یا مجھے اس کے ہاتھوں شہید ہونا چاہئے تھا۔۔۔ مگر یہ بازی اسی کی ہم مسلک ایک ایسی عورت نے جیت لی جو اول تا آخر مجھے فریب دیتی رہی۔ میری زندگی کے سب سے بڑے دکھ کو متاثر سمجھ کر مجھ سے کھینچتی رہی۔ محبت کی آڑ میں مجھے ایک ایسے کام کے لئے تیار کرنے میں اس حرام زادے کا ساتھ دیتی رہی جس کے بارے میں وہ جانتی تھی کہ یہ میرے رائے درگاہ ہو جانے کا سبب بھی بن سکتا ہے۔“

”مکراس نے آخری وقت میں جو کچھ کیا اس سے پہلے کیا تم نے اس کی آنکھوں میں اپنے لئے عقیدت کے وہ جلتے ہوئے چراغ نہیں دیکھے تھے رزاتی! جو کسی محبت ہی کا خاصا ہیں۔ کیا تم نے اس کے ایک ایک لفظ میں اپنے لئے محبت کی ان آفتابوں کا ترجمہ نہیں سنا تھا جو کسی فریبی کی زبان پر آ ہی نہیں سکتے۔ کیا وہ سوامی کی طرف سے تمہاری طرف آنے والی موت پر اس انداز میں چھٹ نہیں پڑی تھی جو کسی غیر کا نصیب ہو ہی نہیں سکتا۔۔۔ اگر یہ سب ہوا ہے رزاتی تو تم اسے فریب کار نہیں کہہ سکتے۔ وہ تمہارے دکھ سے کھینچنے والی ایک دھوکے باز عورت ہوتی تو سوامی کی جگہ وہاں تمہارے پر پٹے اڑانے سے اسے کون روک سکتا تھا؟ تمہارے ایمان کی پرکھ ہونے پر جس طرح وہ تم پر ناز کر رہی تھی ویسا ناز تو میرے بی بی اور پروین ہی کے حصے میں آ سکتا ہے۔“

”مگر مولس۔۔۔“ رزاتی نے بڑی کمزوری آواز میں کہنا چاہا۔

”تمہارے لہجے کی فضا بہت بتاتی ہے رزاتی۔۔۔ میرے یاد۔۔۔ کہ تم اندر سے میری ہر بات پر ایمان لا چکے ہو تو پھر باہر کی یہ ضد کیوں؟“ مولس نے اس کے تپتے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”محبت کرنے والے کم ظرف نہیں ہوتے جانی۔۔۔ اس نے تمہارے ایمان کی سلامتی پر جس طرح اپنی مسرت اور ناز کا اظہار کیا اس پر اسے داد دو۔ جس طرح اس نے تمہاری جان بچانے کے لئے لپکتی آتی موت کے سامنے اپنا سیدھ کھول دینے کی کوشش کی اس احسان کے لئے تمہاری زبان سے شکریے کے دو الفاظ تو اس کا حق ہیں سو ہونا۔۔۔ یا ایک مسلمان کے ناطے تم اپنی روایات سے ایسا شرمناک انحراف کرنا چاہو گے جو ہمیشہ تمہاری روح پر بوجھ بنا رہا ہے۔“

”نہیں مولس نہیں۔۔۔ میں ایسا کچھ نہیں چاہتا مگر۔۔۔“ رزاتی نے اس کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ ”میرے ساتھ چلو اس کے پاس۔۔۔ میں اکیلا۔۔۔“

”پلگے ہو تم۔“ مولس ہنسا۔ ”میں تمہارا سایہ ضرور ہوں رزاتی مگر میرے اس قدر عادی نہ ہو جاؤ کہ تمہاری قوت فیصلہ اور من کی بات کا اظہار بھی میرے محتاج ہو جائیں۔ یہ میں کبھی نہیں چاہوں گا۔ مجھے علم ہے کہ تم نے کماری کو بی ایس ٹو کے دی آئی پی روم میں کسی دی آئی پی شخصیت کے طور پر رہی رکھا ہے کیوں؟ کیا اس میں صرف میرے احکام کی آڑ کا ہاتھ ہے۔۔۔ نہیں ناں!“ مولس نے اس کی

کر انہیں نجات ملی کہ ”رزاقی اور مونس خیریت سے ہیں۔“ اس نے یہ پیغام لانے والے سے صرف ایک سوال اور کیا۔

”یہ بات کس نے بتائی؟“

”خود رزاقی بابو نے۔“ گن مین نظام نے جواب دیا اور دروازہ بند کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ ”کماری صاحبہ بہتر ہوگا کہ اب آپ ہمیں مزید تنگ نہ کریں۔ ہمیں آپ کے آرام کا ہر طرح سے خیال رکھنے کا حکم ہے لیکن اگر آپ خود کو بے آرام کرنا چاہیں تو ہم آپ کو روک نہیں سکتے تاہم اپنے آپ کو کوفت سے بچانے کے لئے شوکت بابو کے اس حکم پر عمل شروع کر دیں گے کہ کمرے کا دروازہ صرف ناشتے کھانے کے لئے کھولا جائے۔ اس کے علاوہ اپنے کان آپ کی دستک اور آواز کے لئے بند کر لئے جائیں۔“

”اب ایسا کچھ نہیں ہوگا۔“ کماری نے بڑے سکون سے ہاتھ اٹھا کر گن مین نظام سے کہا۔ ”مجھے جو جانتا تھا جان لیا اب میں کسی ضرورت کے علاوہ تم لوگوں کو بیزار نہیں کروں گی۔“

”شکریہ۔“ نظام نے کہا اور دروازہ بند کر دیا۔

تب سے اب تک اس نے ایک بار بھی دوبارہ دروازہ نہ کھٹکھٹایا تھا۔ اسے کوئی حاجت ہی نہیں تھی تو کیوں ان حکم کے بندوں کو تنگ کرتی! آج بھی ناشتے کے دوران حسب معمول اس نے تھوڑی دیر نی لی دیکھا۔ پھر جب نظام کے ساتھ آنے والا ملازم برتن لے گیا تو اس نے ٹی وی آف کیا اور کافی کا کپ لئے بستر پر آ بیٹھی۔ ایرانی گلدگدا کھل شانوں پر ڈالا اور چھوٹے چھوٹے سپ لینے لگی۔ کسی کھڑکی اور روشندان سے محروم الیکٹرک ہیئر سے مسلسل گرم رہنے والے کمرے کے شیف میں وقت گزاری کے لئے رسالوں اور کتابوں کی معقول تعداد موجود تھی جس نے اسے سوچ سوچ کر پاگل ہو جانے سے بچائے رکھا۔ کپ خالی کر کے اس نے تپائی پر رکھا اور ایک دم اس کا دل دھڑکتے دھڑکتے رک سا گیا۔

باہر سے کمرے کا لاک کھولا جا رہا تھا۔ یہ کوئی اچھنبھ کی بات نہیں تھی مگر کسی پہریدار کے آنے کا یہ وقت نہیں تھا اسی بات نے اسے چونکا دیا۔ پھر اس سے پہلے کی اس کا ذہن کسی نتیجے پر پہنچتا دروازہ کھلا اور۔۔۔ وہ بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے اپنی نگاہوں پر یقین نہ آیا۔ سانس قہم جاتا تو بھی کم تھا۔ دماغ خالی خالی ہو گیا اور حلق میں کانٹے سے آگ آئے۔ حیرت میں ڈوبی پیاس نے اسے سر سے پاؤں تک لپیٹ میں لے لیا۔۔۔ نہ بچنے والی رگ رگ میں تیش بھرتی، نس نس میں سنسناہٹ پیدا کرتی یہ بھلا۔۔۔ اسے سمجھ نہ آ رہی تھی کہ کیا کرے؟ وہ ریت اڑاتے گولوں کی زد میں تھی جو چیخنے چلاتے اس کے کانوں میں سیٹیاں بجا رہے تھے۔

کماری کی مدد بھری آنکھوں کے گرد تین دن رات ہی میں سیاہ حلقے نمودار ہو گئے تھے۔ پھول کی طرح کھلا رہنے والا چہرہ کھلایا ہوا دودھ اور سیندر میں گندمی ہوئی رنگت سرسوں، شب تاریکی یاد دلاتی زلفیں پریشاں آنچ دیتے گداز گلابی ہونٹ خشک۔۔۔ کماری کے پاس جیسے اپنا کچھ رہا ہی نہ تھا۔ سب کچھ سنگین وقت کی بھینٹ چڑھ گیا۔

اسے آج وہاں چوتھا دن تھا۔ وقت کا اندازہ اسے آسانی سے ہو جاتا تھا۔ کمرے میں موجود ٹی وی اس تنہائی میں اس کا سب سے بڑا دوست ثابت ہوا جسے وہ صرف اس وقت آن کرتی جب اسے خبریں سننے کی طلب ہوتی۔ یہی وہ وقت اور تاریخ بھی جان لیتی۔

یہاں اسے کوئی تکلیف دی گئی نہ اذیت۔ بس خاموشی اور اکیلے پن کے حوالے کر دیا گیا اور سہنے والے جانتے ہیں کہ تنہائی سے بڑی سزا کوئی نہیں ہوتی۔ تنہائی میں انسان ہر وقت اپنے ماضی کے کچوکے برداشت کرنے اور مستقبل کے خوف میں ڈوبا رہنے کے سوا کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ کماری کے لئے بھی یہاں کا اکیلا پن یہی سوغاتیں لے کر آیا۔ کھانے پینے نہانے لباس بدلنے کی ہر سہولت میسر تھی۔ اس کا وہ چھوٹا سا لٹچی اس کے یہاں آنے کے دو تین گھنٹے بعد ہی اس فرشتہ کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا جس میں اس کی ہر شے جوں کی توں پڑی تھی۔ ایک موبائل نہیں تھا جس کے بارے میں وہ جانتی تھی کہ وہ بیلا کے کوارٹر میں کمرے کے فرش پر گر پڑا رہ گیا تھا۔

سب سے پہلا کام جو اس نے یہاں آنے کے بعد کیا وہ رزاقی اور مونس کی خیریت معلوم کرنے کا تھا۔ کمرے کا دروازہ باہر سے بند تھا۔ اس نے کھٹکھٹایا تو ایک گن مین نے کھولا۔ جب اس نے رزاقی اور مونس کے بارے میں پوچھا تو اسے کوئی جواب دیے بغیر دروازہ بند کر دیا گیا۔ وہ ہونٹ کاٹ کر رہ گئی مگر یہ تو کوئی بات نہ تھی کہ وہ آرام سے بیٹھ جاتی۔ اس نے وقفے وقفے سے اتنی بار دروازہ کھٹکھٹایا اور دو گن مینوں پچاروں نے اتنی بار اس کے دستک دینے پر دروازہ کھولا کہ بالآخر رزاقی کا یہ فقرہ اس تک پہنچا

تھی۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی آنکھیں بند کر لیں۔ ”کاش! وقت یہیں تھم جائے اور مجھے موت آ جائے۔۔۔ اس کے سامنے جو مجھ میں اپنی محبوبہ تلاش کرتا ہے مر جانے سے اچھی موت کیا ہوگی؟“ اس کے دل نے دعا مانگی۔

”اس وقت کہا جب میں سر سے پاؤں تک تمہارے فریب میں غرق ہو چکا تھا۔ اس وقت کہا جب میرا اپنا میرے پاس کچھ بھی نہ رہا۔ اس وقت کہا جب میں آزمائش کے پل صراط پر پاؤں رکھ چکا تھا۔۔۔ کس کے لئے؟ اپنی راجیہ کے لئے۔ جانتی ہوں ناں۔ صرف اپنی راجیہ کے لئے۔۔۔ تمہارے لئے جس کی صورت میری راجیہ سے ملتی ہے اور بس۔۔۔ یہ صورت دکھا کر تم نے مجھے راندہ درگاہ کر دینا چاہا۔۔۔ وہ تو میرے رب نے مجھے تھام لیا ورنہ تم تو مجھے جہنم کا ایندھن بنا چکی تھیں۔۔۔ کماری کو بتا۔۔۔“ طر کے زہر میں بجھے تیر رزاقی نے اس کے کم کم دھڑکتے دل میں ترازو کرنے میں کوئی نرمی نہ برتی۔

وہ اسی طرح خاموش کھڑی رہی۔ اکھڑے اکھڑے گہرے سانس۔ ہونٹوں کے پھڑکتے گوشے۔ بند آنکھوں پر لرزتی پلکیں۔

ایک دم رزاقی نے اس کا سر دھوتا چہرہ دونوں ہاتھوں کے بالے میں لے لیا۔ ”اب بھی ہوناں کتم میری راجیہ ہو۔۔۔ ان شہد بھرے ہونٹوں سے مجھے آج بھی صاحب کہہ کر پکارو۔۔۔ جھوٹی بے قدری سے میری طرف دیکھ کر ان شرابی آنکھوں سے میری جدائی کے آنسو چھلکاؤ۔۔۔ نہ ختم ہونے والی فرقت کے نوے سناؤ۔۔۔ کبھی نہ ہو سکنے والے ملن کے گیت گاؤ۔۔۔ اب بھی کہو کہ صاحب! مجھے مت چھوئیے ورنہ میں جل کر بھسم ہو جاؤں گی۔ راکھ ہو جاؤں گی۔۔۔ کچھ تو بچ کہو راجیہ۔۔۔ کچھ تو جھوٹ بولو کماری۔۔۔“ ایک جھٹکے سے رزاقی نے سسک کر اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے حلقے سے آزاد کر دیا۔

کماری لڑکھڑا کر رہ گئی۔ سنبھلنا چاہا مگر نہ سنبھل سکی۔ بستر کی پٹی پر یوں گری کہ چہرہ زلفوں کے گرہن میں چھپ گیا۔

رزاقی جذبات سے بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ اس کی آواز میں گرج تھی تو ساتھ ہی ایسی بے بسی بھی تھی جو اس کے اندر ہوتی ٹوٹ پھوٹ کی آئینہ دار تھی۔ اسے دھوکا دینے والی اس کی راجیہ کی ہمشکل اس کے سامنے تھی۔ اس کے پاس تھی۔ اس کے بس میں تھی مگر۔۔۔ تھی تو اب بھی اس سے اتنی ہی دور جتنے فاصلے پر پہلی ملاقات میں تھی۔

”کتنی ظالم ہو تم کماری۔۔۔ کتنی بے درد ہو تم۔۔۔ ایک پل کو تم نے یہ نہ سوچا کہ میں بے بسی کے جن اذیت ناک لمحات میں سانس لینے کی سزا کاٹ رہا ہوں انہیں میرے لئے ایک سہانے فریب دیتے

دروازے میں کھڑا رزاقی اسے بڑی عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

دروازہ کھولنے والا سامنے ہی نہ آیا تھا۔ اس کے کاغذ دور سے لوٹ جانے کی آواز تک ابھری کب معدوم ہوئی اسے علم ہی نہ ہوا۔ اسے تو صرف یہ پتہ تھا کہ اس کے سامنے کھڑا رزاقی اسے ایک تک گھور رہا ہے۔ اس کی نظروں میں کیا تھا؟ کماری کے لئے سمجھنا مشکل نہ تھا۔ جو گلہ جو شکوہ جو شکایت جو درد اسے رزاقی کی آنکھوں میں تیرتے نظر آ رہے تھے وہ ان سے انجان نہ تھی۔ لمحہ بے لمحہ اسے اپنے جسم سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔۔۔ پھر یوں ہوا کہ اس کے لئے اپنے پیروں پر کھڑا رہنا ممکن نہ رہا۔۔۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ لہر اکراقلین پر گر پڑتی رزاقی کے ہونٹ ہلے۔

”میں کیسے مان لوں کہ تم راجیہ نہیں ہو؟“

یہ سرگوشی تھی یا درمیں ڈوبتی چیخ۔۔۔ آواز تھی یا آنسوؤں میں بھگی آہ۔۔۔ کماری کے لئے فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا تاہم یہ ہوا کہ وہ لڑکھڑا کر سنبھل گئی۔ کانپتی ٹانگوں نے بہر حال اس کا بوجھ سہا لیا۔ اس کی نظریں جھک گئیں اور نچلا ہونٹ بے اختیار دانتوں میں دب گیا۔ سارا بدن یوں سرد ہو گیا جیسے کوئی برفانی لہر اس سے آن پڑی ہو۔

”تم راجیہ ہی ہوناں؟“ رزاقی نے جیسے چل کر پوچھا اور اندر چلا آیا۔ اس کے لہجے سے لگتا تھا کہ وہ ایسا لڑا بچہ ہے جو چاہتا ہے کہ اس کی بات کی تردید نہ کی جائے۔

مگر۔۔۔ کماری کے لئے اب مزید سہنا مشکل تھا۔ اب تک وہ جو کتنی آئی تھی اپنی مرضی سے یا سوامی کے ساتھ مل کر سب پل پل یاد تھا اسے۔ اگر سب کچھ جان لینے کے بعد بھی رزاقی خود فریبی کا شکار رہنا چاہتا تھا تو اب وہ اسے لٹونے کو تیار نہ تھی۔ آہستہ سے جھکا ہوا سر اٹھا کر اس نے اپنی جانب نگراں رزاقی کی جانب دیکھا اور اس کا دل بڑے زور سے دھڑکا۔ ان نظروں میں اسے سوائے طر کے کچھ نہ دکھائی دیا۔۔۔ رزاقی کا لہجہ اسے دھوکا دے گیا تھا یا وہ فقرہ کہنے کے بعد رزاقی اپنے آپ میں آ گیا تھا وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکی تاہم یہ طے تھا کہ وہ اب کسی فریب کا شکار نہیں تھا۔ ایک گہرا سانس اس کے لبوں سے خارج ہوا اور اس نے حالات کے سامنے سر ڈالنے کی آخری کوشش کا سوچ لیا۔ سپر بھی تو اس کے سامنے ڈالنا تھی ناں جو اسے کب کا فتح کر چکا تھا۔ بس اسے اپنی مفتوحہ جاگیر کا علم تھا نہ اس فتح کا وہم۔

”میں بتا چکی ہوں رزاقی بابو کہ میں آپ کی راجیہ نہیں ہوں۔“ بڑی ٹوٹی ہوئی آواز میں اس نے

دھیرے سے کہا۔

”کب کہا تم نے ایسا۔۔۔ ہاں۔۔۔ کب کہا تم نے ایسا۔۔۔؟“ وہ لپک کر اس کے پاس چلا آیا اتنا پاس کہ وہ اس کے بے قابو ہوتے درد بھرے شکستہ سانسوں کی تپش اپنے چہرے پر محسوس کر سکتی

میں زندگی کی نوید سنا دی گئی ہو۔ سکون اطمینان اور تسکین مٹ جانے کے احساس میں لپٹا، ایک رنگ سا لہرایا اور کماری کے چہرے پر بکھر گیا۔ اس کا جھکا ہوا سر کچھ اور جھک گیا۔ یوں جیسے داسی کا سر دیوتا کے چروں میں جھک جائے۔

”اٹھو۔۔۔“ صدیوں پر محیط چند لمحوں بعد حکم دیا گیا۔

کسی کثیر طرَح، چپ چاپ، بغیر کوئی عذر کئے وہ آہستہ سے اٹھی اور نگاہیں اس کے قدموں پر جمائے کھڑی ہو گئی۔

”اپنے دل پر ہاتھ پڑا تو کیسے تڑپ اٹھی ہو۔“ لہجہ شکستہ ضرور تھا مگر اب اس میں طنز کی تفتی نہ تھی۔ تب ایک آہ نے سانس توڑا۔۔۔ ”میں نہیں جانتا۔۔۔ تمہارا مجھے صاحب کہنا، کس حد تک سچائی کا آئینہ دار ہے مگر تم نے میرے ساتھ جو کیا۔۔۔“ اس کی آواز ایک بار پھر بھر ا گئی۔۔۔ ”اس کے لئے۔۔۔ میرا دل نہیں چاہتا۔۔۔ کہ تمہیں۔۔۔ معاف کروں!“ رک رک کر آنسوؤں کی لڑیاں ٹوٹیں۔

لرزتے کانپتے، دو سفید براق ہاتھ حرکت میں آئے اور دیر سے رزاتی کے سامنے جُو گئے۔ پھر وہ صبح پیشانی ان پر آن لگی جس کے پاس ہی مانگ میں رزاتی کے جوتوں کا غبار سیندور جیسا دمک رہا تھا۔

”سزا تو دے سکتے ہیں۔۔۔ یا میں اس قابل بھی نہیں ہوں۔“ سلگتے لہجے میں ایک بچکی نے دم توڑا۔ ”کسے سزا دوں۔۔۔؟“ ”راجہ کو۔۔۔ یا۔۔۔ کماری کو؟“ سوال تھا کہ خیر جو جیتی جاگتی کماری کے دل میں تراؤ ہو گیا۔

”اپنی داسی کو۔۔۔ میرے صاحب!“ وہ یوں تڑپ کر روئی اور یوں چل کر اس کے قدموں پر گری کہ رزاتی کا سینہ پھٹنے کو آ گیا۔

وہ ضبط کی کوشش میں چھلک رہا تھا۔

کماری بکھر جانے کے لئے برس رہی تھی۔

پھر جب سہنا ممکن نہ رہا تو اس نے جھک کر اسے شانوں سے تھام لیا۔ اٹھایا اور سینے میں چھپا لیا۔ باہوں میں جملز لیا۔ ہچکیاں آہیں، سسکیاں، کس کس برسات سے ذل کے داغ ڈھل رہے تھے۔ کس کس تار سے جگر کے چاک سل رہے تھے۔

”راجے۔۔۔“ رزاتی نے ہنستے ہوئے اس کی زلفوں پر رخسار رکھ دیا۔

”میرے صاحب۔۔۔“ کماری اس سے عشق پیچاں کی تیل جیسی لپٹی جا رہی تھی۔

اور۔۔۔

ٹھیک اسی لمحے اپنے کمرے میں بستر پر نیم دراز کماری اور رزاتی کے خیالوں میں ڈوبے مونس

خواب میں بدل کر تم مجھے جس دردناک انجام سے دوچار کرنے جا رہی ہو اس کے لئے میں کسی بھی طرح کسی بھی پہلو سے کبھی بھی تمہارا مجرم نہیں رہا۔۔۔“ اس کی آواز بھر ا گئی۔ ”موت کا انتظار کرتی ایک فراق گزیدہ لاش کے دل میں تم نے اپنی خود غرضی کا جواز ہر بلا خنجر پیوست کیا ہے کماری! اس کے لئے تمہیں کبھی معافی نہیں ملے گی۔ نہ مجھ سے نہ اپنے آپ سے۔۔۔ میں تمہیں بد دعا نہیں دے سکتا کہ تم میری راجیہ کی صورت پر ہو مگر۔۔۔ اتنا تو کہہ ہی سکتا ہوں کماری کہ تمہیں بھی کسی سے محبت ہو جائے اور وہ تمہارے سامنے میری طرح زندہ لاش بن کر رہ۔۔۔“

”بھگوان کے لئے رزاتی بابو۔۔۔ اپنے خدا کے لئے۔۔۔ ایسا نہ کہئے۔ ایسا کچھ نہ کہئے۔۔۔“ وہ ایک دم تڑپ کر اٹھی اور رزاتی کے قدموں سے لپٹ گئی۔ ساون بھادوں سی برتی آنکھوں سے اس کی جانب دیکھا اور سراپا التجا ہو گئی۔ سر تا پا فریاد میں ڈھل گئی۔ اس کی آواز میں وہ جھپٹیں تھیں جن سے رزاتی کا پچھلے پانچ مہینوں سے دن رات واسطہ رہا تھا۔

”مجھے جان سے مار دیجئے۔ زندہ جلا دیجئے۔۔۔ کتوں کے آگے ڈال دیجئے۔۔۔ صلیب دے دیجئے۔۔۔ مگر اس کے لئے کوئی بد فال زبان سے نہ نکالے جس کے نام پر میں نے اپنا تن من وارد کیا ہے۔ جس کی ایک جھلک پر میں آخری سانس تک بچھاؤ کرنے کو تیار ہوں۔۔۔ اس کے بدلے میں حاضر ہوں ناں۔۔۔ مجھے برباد کر دیجئے۔ جس طرح آپ کی تسلی ہوتی ہے ویسے مجھے ٹوٹ لیجئے مگر اسے کچھ مت کہئے۔۔۔ کچھ مت کہئے۔۔۔“ روتے روتے اس نے رزاتی کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ ”آپ کو اپنی راجیہ کا واسطہ۔۔۔ میرے صاحب کو کچھ مت۔۔۔“ ایک دم اس کی زبان پر تالا پڑ گیا۔ اس نے گہرا کر اس زور سے زبان دانتوں میں دبائی کہ کٹ کر رہ گئی۔ خون کی ایک باریک لکیر اس کے ہونٹوں پر چھلک آئی۔ اس نے دونوں ہاتھ رزاتی کے پیروں پر رکھے اور بے بسی سے سر جھکا لیا، جیسے اپنا سب کچھ ہار بیٹھی ہو۔ وہ کہہ گئی ہو جسے چھپانے کی کوشش میں اب تک مٹیں کر رہی تھی۔

رزاتی اسے ایک نگ گھور رہا تھا۔

اس کے کانوں میں کماری کے آخری الفاظ صور اسرافیل کی سی گونج پیدا کر رہے تھے۔

”میرے صاحب کو کچھ مت۔۔۔ میرے صاحب کو کچھ۔۔۔ میرے صاحب کو۔۔۔ میرے

صاحب کو۔۔۔ میرے صاحب کو۔۔۔“

”پاؤں چھوڑو میرے۔“ کتنی ہی دیر بعد ایک سپاٹ سی بے روح آواز نے کمرے کا سناٹا درہم

برہم کیا۔

بغیر کسی ضد کے، کماری نے خاموشی سے اس کے چچھاتے جوتوں سے ہاتھ ہٹائے۔ پھر دائیں ہاتھ کی انگلیاں اپنی مانگ میں پھیرتے ہوئے یوں گہرا سانس لیا جیسے کسی مرنے والے کو آخری لمحات

نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔

خالق نگر کی اکلوتی مسجد سے ظہر کی اذان کے لئے ”اللہ اکبر اللہ اکبر“ کی صدا بلند ہو رہی تھی۔

اس نے غیر ارادی طور پر کھڑکی سے باہر دیکھا۔

سورج کی اجلی اجلی دھوپ میں دور مسجد کی عمارت مسکراتی ہوئی اسے کچھ بتاتی ہوئی اس

سے کچھ کہتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

”الحمد للہ۔۔۔“ بے اختیار اس کا سر جھک گیا۔ آنکھیں نم ہو گئیں۔۔۔ آزمائش ختم ہو چکی تھی۔

عذاب ٹل چکا تھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ شام سے پہلے گھر لوٹ آنے والے رزاقی کو اس کی توبہ کا انعام مل

چکا ہے، کماری کی صورت میں جو راجیہ کا پرتو تھی۔

شکرانے کے آنسو اس کی پلکوں پر چراغوں کی طرح روشن ہو گئے:

”بے شک۔ میرا رب اپنے بندوں کی پکار سنتا ہے۔“

اس کا رواں رواں سر شارئی بے خودی اور مدہوشی کے عالم میں گواہی دے رہا تھا۔

www.digestpk.com

☆=====ختم شد=====☆